ہکل بری فن کے کارنامے

مارک ٹوین

ہکل بری فن
کے
کارنامے

مصنف :- مارک ٹوین

مترجم :- راج کمار

پبلشرز

انڈین اکیڈمی ع ۲۹ نریندرا پلیس، نئی دہلی

Title of the original : ADVENTURES OF
HUCKLEBERRY FINN

Author : Mark Twain

Original publisher : Harper and Brothers

بار اوّل

قیمت دو روپے

یونین پریس دہلی

فہرست

آپ کا مخلص
ہک فن

۱۔ ہیکل بری فن کا سُدھار ـ مس واٹسن ـ منتظر ٹام سائر

اگر آپ نے "ٹام سائر کے کارنامے" نہیں پڑھے تو شائد آپ مجھ سے واقف نہ ہوں گے۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ یہ کتاب مارک ٹوین نے لکھی تھی۔ اس میں بیان کئے گئے بیشتر واقعات سچے ہی تھے۔ ممکن ہے کہیں کہیں سچائی کے ساتھ مصنف کی خیال آرائی کو بھی دخل ہو، تاہم زیادہ تر قصے سچے ہی تھے۔ اور پھر اگر اس نے چند ایک باتوں میں مبالغہ آرائی کر بھی لی ہو تو حرج ہی کیا ہے؟ مجھے تو آج تک کوئی ایسا شخص نہیں ملا جس نے زندگی بھر جھوٹ نہ بولا ہو۔ اگر نہیں بولا تو شائد پولی خالہ نے، یا بیوہ نے، یا پھر شائد میری نے۔ پولی، میرا مطلب ہے ٹام کی خالہ پولی ـــ اور میری، اور بیوہ ڈگلس وہی ہیں جن کا ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے ـــ وہی کتاب جس میں بیشتر باتیں سچی ہیں۔ سوائے ان چند واقعات کے جن میں، جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، ممکن ہے کسی حد تک مبالغہ آرائی ہو۔

ہاں، تو وہ کتاب یوں ختم ہوتی ہے، جب ہم دونوں نے، یعنی میں نے اور ٹام نے، وہ خزانہ ڈھونڈ نکالا جسے ڈاکوؤں نے غار میں چھپا رکھا تھا، تو ہم امیر کبیر ہو گئے۔ ہمارے حصے میں چھ چھ ہزار ڈالر آئے اور وہ بھی سونے کے! جب ہم نے ان سکوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا تو خاصہ بڑا انبار لگ گیا۔ خیر، وہ رقم ہم نے جج تھیچر کو دے دی اور اس نے اسے سود پر لگا دیا۔ اس سے ہمیں ایک ایک ڈالر روزانہ کی مستقل آمدنی ہونے لگی۔ یہ رقم اتنی زیادہ تھی کہ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے کیسے خرچ کریں۔ اس کے بعد بیوہ ڈگلس

نے مجھے اپنا بیٹا بنا لیا۔ اس کی خواہش تھی کہ مجھے سدھار کر انسان بنا دے۔ لیکن اس کا ہر کام اتنا سلجھا ہوا ہوتا تھا، اور وہ اس قدر نیک تھی کہ چند ہی دنوں میں وہ گھر مجھے کاٹنے کو دوڑنے لگا۔ آخر جب برداشت کی حد ہو گئی تو میں وہاں سے نکل بھاگا اور ایک بار پھر وہی پھٹے پرانے کپڑے پہن کر اپنے اسی پیپے میں رہنے لگا جو کبھی چینی کا ذخیرہ جمع کرنے کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اب میں ایک بار پھر آزاد تھا، اور بے فکر۔ لیکن بُرا ہو ٹام سائر کا جس نے مجھے وہاں بھی آن پکڑا اور کہنے لگا۔ میں ڈاکوؤں کا ایک گروہ بنانے والا ہوں۔ اگر تم واپس بیوہ کے پاس چلے جاؤ اور وعدہ کرو کہ وہاں تمیز سے رہو گے تو میں تمہیں بھی اس گروہ میں شامل کر لوں گا۔ اب میں کیا کرتا؟ طوعاً کرہاً مجھے واپس جانا پڑا۔

جب میں واپس گھر پہنچا تو بیوہ نے مجھے گلے سے لگا لیا اور زار زار رونے لگی۔ "میرا بھٹکا ہوا بچہ" "بدقسمت کا بیٹا" "نادان بالک" اور نہ جانے اس قسم کے کتنے ہی کوسنے اس نے مجھے دے ڈالے۔ لیکن میں نے بالکل برا نہ مانا۔ یہ سب باتیں تو پیار میں کہی گئی تھیں ناں۔ قصہ کوتاہ ایک بار پھر مجھے نئے کپڑے پہنا دیئے گئے، ایک بار پھر میرا دم گھٹنے لگا اور میں پسینے میں تر بتر ہو گیا۔ وہی پرانا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ یعنی شام کے کھانے کے وقت بیوہ گھنٹی بجاتی اور مجھے عین وقت پر میز پر حاضر ہونا پڑتا اور اس پر طرہ یہ کہ میز پر آنے کے بعد میں فوراً کھانا شروع نہیں کر سکتا تھا۔ بلکہ مجھے تب تک انتظار کرنا پڑتا جب تک کہ بیوہ سر جھکا کر کھانے کی چیزوں کو تکتے ہوئے زیر لب کچھ بڑبڑا نہ لے۔ پتہ نہیں وہ کیوں بڑبڑایا کرتی تھی؟ مجھے تو ان کھانوں میں کبھی کوئی نقص نظر نہ آیا۔ اگر کوئی نقص ان میں تھا تو صرف یہ کہ ہر چیز علیحدہ علیحدہ پکی ہوتی جس سے سارا مزا کرکرا ہو جاتا۔ اس طرح کھانے میں بھلا وہ لطف کہاں آتا ہے جو اس صورت میں آتا ہے اگر سب کی سب چیزیں ایک ہی برتن میں انڈیل دی جائیں۔ اور وہ بھی کچھ اس طرح کہ ان کے شوربے آپس میں گڈمڈ ہو جائیں۔

کھانے کے بعد وہ اپنی کتاب نکال لیتی اور مجھے موسیٰ اور سرکنڈوں والے ٹوکرے

کا قصہ سنانے لگتی۔ ان قصوں کو سُن کر موسیٰ کے بارے میں میرا اشتیاق بڑھنے لگا۔ مگر کچھ عرصے کے بعد جب بیوہ نے مجھے بتایا کہ موسیٰ تو کبھی کا مر چکا ہے تو اُس میں میری دلچسپی یکسر ختم ہو گئی۔ بات یہ ہے کہ گڑے مُردے اُکھیڑنے کی میری عادت نہیں۔

کچھ ہی دیر بعد میری طبیعت تمباکو پینے کو چاہی۔ جب میں نے بیوہ سے اجازت مانگی تو اس نے مجھے جھڑک دیا اور بولی: "یہ بہت بُری عادت ہے، اور بُری ہی کیا ــ گندی بھی!" ــــ لہذا مجھے تمباکو پینے کی ممانعت کر دی گئی۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کئی لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ بنا جانے بوجھے اچھی بھلی چیزوں کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ اس بیوہ ہی کو لیجئے۔ موسیٰ نہ تو اس کا کوئی رشتہ دار تھا، اور نہ ہی وہ اسے تو کیا، کسی کو بھی کوئی فائدہ پہنچا سکتا تھا کیونکہ اُسے مرے ہوئے تو مدتیں گذر چکی تھیں۔ مگر یہ بیوہ تھی کہ ہر وقت اسی کا قصہ لے بیٹھتی۔ اس کے برعکس اگر میں نے تمباکو پینے کی بات کی جس کا کچھ فائدہ بھی تھا، تو لگی ناک بھوں چڑھانے۔ اور پھر ستم ظریفی تو دیکھئے کہ مجھے تو تمباکو نوشی سے منع کر رہی ہے اور خود نہایت مزے سے نسوار چڑھائے جا رہی ہے۔ لیکن اس میں شاید کوئی ہرج نہ تھا کیونکہ یہ علّت مجھے نہیں اسے تھی۔

انہی دنوں اس کی بہن مس واٹسن بھی وہاں آ گئی۔ یہ دبلی پتلی کنواری بڑھیا عینک لگاتی تھی۔ اسے اور کچھ نہ سوجھا تو ہجوں کی کتاب لے کر مجھ پر مسلط ہو گئی اور ایک گھنٹے تک میرا مغز کھاتی رہی۔ یہ سلسلہ جانے کب تک چلتا۔ وہ تو بھلا ہو اس بیوہ کا جس نے ہم دونوں کو اس عذاب سے چھٹکارا دلا دیا۔ میں خود بھی تنگ آیا بیٹھا تھا۔ چلو چھٹی ہوئی لیکن اس کے بعد کا ایک گھنٹہ اس حد تک اکتا دینے والا تھا کہ جی اوب جائے۔ مجھے بے چینی سی ہونے لگی۔ اُدھر مس واٹسن تھی کہ بولے جا رہی تھی۔ "ہکل بری! پاؤں وہاں مت رکھو" یا "ہکل بری! یوں اکڑوں مت بیٹھو۔ سیدھے کیوں نہیں بیٹھتے؟" یا "ہکل بری! یوں انگڑائیاں مت لو، اس طرح منہ کھول کر مت بیٹھو! تمہیں تمیز سے بیٹھنا نہیں آتا کیا؟" وغیرہ وغیرہ اس کے بعد وہ دوزخ کا ذکر لے بیٹھی۔ لیکن جب میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ کاش میں وہاں

ہونا! تو وہ جل بھن کر کوئلہ ہی تو ہو گئی۔ بہر حال میرا ارادہ اسے تنگ کرنے کا ہرگز نہیں تھا۔ میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح یہاں سے نکل جاؤں، کہیں اور چلا جاؤں، چاہے کہیں بھی "۔ ایسا مت کہو"۔ اس نے مجھے تو دنیا کی ساری نعمتیں بھی دے دی جائیں تو بھی میں ایسی بات ہرگز زبان پر نہ لاؤں۔ وہ تو ایسی زندگی گزارنا چاہتی تھی جس سے اُسے جنت میں جگہ مل سکے۔ لیکن خدا گواہ ہے مجھے اس کی جنت میں کوئی خوبی نظر نہ آئی لہٰذا میں نے دل ہی دل میں ارادہ کر لیا کہ میں وہاں جانے کی کبھی کوشش نہ کروں گا۔ البتہ یہ بات میں نے اسے بتائی نہیں۔ بیکار جھگڑا کھڑا کرنے سے فائدہ؟۔

ایک بار شروع ہونے کے بعد وہ بھلا کیسے رک سکتی تھی؟ اب اس نے جنت کے بارے میں میری معلومات میں اضافہ کرنا شروع کر دیا۔ مثلاً یہ کہ جنت میں پہنچ جانے کے بعد آدمی کو کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا۔ بس سارا دن مزے سے بیٹھے بربط بجاتے رہو۔ اب اس پروگرام میں مجھے بھلا خاک دلچسپی ہو سکتی تھی۔ لیکن میں چپ رہا۔ البتہ میں نے یہ ضرور پوچھا۔ کیا ٹام سائر کبھی وہاں ہو گا؟ امید تو نہیں۔ اس نے جواب دیا ــــ یہ سن کر میں بے حد خوش ہوا۔ بھی تو میں چاہتا تھا کہ ہم جہاں رہیں اکٹھے رہیں۔

اور یوں مس واٹسن مجھے پریشان کرتی رہی۔ میں بے حد اکتا گیا تھا۔ تنہائی کا احساس مجھے کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ خدا خدا کر کے انہوں نے حبشی غلاموں کو اندر بلایا اور دعا شروع کی۔ اس کے بعد سب اپنے اپنے بستروں میں چلے گئے۔ میں نے بھی موم بتی اٹھائی اور اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے موم بتی میز پر رکھ دی اور کھڑکی کے پاس کرسی پر جا بیٹھا۔

میں کوئی ایسا واقعہ یاد کرنا چاہتا تھا جس سے میرے پریشان دماغ میں خوشی کی لہر پیدا ہو۔ لیکن سب بے سود۔ میں اس قدر اداس تھا کہ رہ رہ کر مجھے یہ خیال آنے لگا کہ ایسی زندگی سے تو موت ہی بھلی۔ باہر ستارے جگمگا رہے تھے۔ جنگل میں ہوا پتوں میں یوں سرسرا رہی

تھی جیسے ہوئے ہوئے رو رہی ہو۔ دور کوئی اُلّو جیسے کسی کی موت پر ماتم کر رہا تھا۔ ایک چمگادڑ اور ایک کتا یوں رو رہے تھے جیسے کوئی بستر مرگ پر پڑا ہو۔ ہوا میرے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی تھی۔ کیا کہہ رہی تھی؟ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ شدت خوف سے میرے جسم میں کپکپی ہونے لگی۔ اور پھر دفعتاً مجھے جنگلوں سے آتی ہوئی ایک آواز سنائی دی۔ یہ آواز کسی ایسی روح کی تھی جو کسی سے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن چونکہ وہ اپنی بات کسی کو سمجھانے سے قاصر تھی لہذا اسے قبر میں سکون نہیں مل رہا تھا، اور اسے ہر رات اسی طرح رونا چیخنا پڑتا تھا۔ میرا دل ڈوبنے لگا اور میں خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔ کاش کوئی اس وقت میرے پاس ہوتا! تھوڑی دیر بعد ایک مکڑی میرے کندھے پر رینگنے لگی۔ میں نے انگلی سے اسے اُڑایا اور وہ موم بتی پر جا گری۔ بیشتر اس کے کہ میں اسے بچاتا، وہ جل کر راکھ ہو چکی تھی۔ اس کا یوں جل جانا بلاشبہ ایک بہت بڑی بدشگونی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب کوئی آفت آنے والی ہے۔ مارے خوف کے میری بری حالت ہو گئی اور میں تھر تھر کانپنے لگا۔ میں نے کرسی سے اٹھ کر تین بار الٹے پاؤں چکر کاٹے اور ہر چکر پر اپنی چھاتی پر صلیب کا نشان بنایا۔ اس کے بعد میں نے اپنے بالوں کی چند لٹیں دھاگے سے باندھ دیں تاکہ بھوت اور چڑیلیں میرے پاس نہ پھٹک سکیں۔ اس کے باوجود میری تسلّی نہ ہوئی۔ ہوتی بھی کیسے؟ یہ نسخے تو صرف اس وقت کارگر ہوتے ہیں جب آپ کسی بڑی آفت میں مبتلا نہ ہوں۔ مثلاً اس وقت جب گھوڑے کے سُم کو جو آپ نے کہیں پڑا پایا تھا، دروازے پر ٹھونکنے کی بجائے آپ اُسے کھو دیں۔ لیکن بدقسمتی سے اگر آپ کے ہاتھوں کوئی مکڑی مر گئی ہو تو آنے والی بلا ان چیزوں سے نہیں ٹل سکتی۔

میں پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ خوف کے مارے میرا بُرا حال تھا۔ میں نے اپنا پائپ نکال لیا۔ مکان پر چونکہ قبرستان کی سی ویرانی طاری تھی لہذا بیوہ کو میری تمباکو نوشی کا علم کیسے ہو سکتا تھا؟ تھوڑی دیر بعد دور شہر سے گھڑیال بجنے کی آواز آئی۔ ٹن۔ ٹن۔ ٹن ..... بارہ دفعہ

شور مچانے کے بعد گھڑیال خاموش ہوگیا۔ اس کے چپ ہوتے ہی سناٹا پہلے سے بھی کہیں گہرا ہوگیا۔ چند لمحوں بعد ایک ٹہنی ٹوٹنے کی آواز آئی۔ یہ آواز درختوں کے اس جھنڈ کی طرف سے آئی تھی جو اندھیرے میں لپٹے ہوئے تھے۔ یقیناً کوئی چیز حرکت کر رہی تھی۔ میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔ پھر "میئوں میئوں" کی مدھم سی آواز آئی۔ اتنی مدھم کہ میں بمشکل ہی اسے سن پایا۔ میری جان میں جان آگئی۔ میں نے بھی جواب میں ہولے سے "میئوں میئوں" کہا اور بتی بجھادی۔ پھر کھڑکی سے کود کر شیڈ کی چھت پر چلا گیا اور وہاں سے چھلانگ لگا کر نیچے زمین پر آن رہا۔ درختوں میں رینگتا ہوا جب میں تھوڑی دور آگے بڑھا تو میں نے ٹام سائر کو اپنا منتظر پایا۔ اندھیرے کے باوجود میں نے اسے پہچاننے میں غلطی نہیں کی تھی۔ یقیناً یہ ٹام سائر ہی تھا۔

۲۔ جم کے پنجے سے رہائی۔ ٹام سائر کا گروہ۔ دانشمندانہ منصوبے

دبے پاؤں چلتے ہوئے ہم اس پگڈنڈی پر ہولئے جو درختوں میں سے ہوتی ہوئی بیوہ کے باغ کے دوسرے سرے پر جا نکلتی تھی۔ درختوں کی ٹہنیاں کافی نیچی تھیں لہذا اس ڈر سے کہ کہیں ہم ان سے ٹکرا نہ جائیں، ہم سارا راستہ کبڑے ہو کر چلتے رہے۔ جب ہم باورچی خانے کے پاس سے گذر رہے تھے تو اچانک میں ایک درخت کی جڑ سے ٹکرایا اور دھڑام سے گر پڑا۔ مس واٹسن کا ہٹا کٹا حبشی غلام جم اس وقت باورچی خانے کے دروازے میں بیٹھا تھا اور چونکہ روشنی اس کے پیچھے تھی، لہذا وہ ہمیں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ شور سن کر

اس نے فوراً کان کھڑے کر لئے اور نہایت چوکنا ہو کر سننے لگا۔ ہم دبک کر بیٹھ گئے اور سانس روک کر انتظار کرنے لگے۔ ایک منٹ بعد وہ اُچک کر بیٹھ گیا اور گردن بڑھا کر بولا:

"کون ہے؟"

ہم خاموش رہے۔ کوئی جواب نہ پا کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور دبے پاؤں چلتا ہوا اس طرف بڑھنے لگا جہاں ہم چھپے بیٹھے تھے۔ ہماری موجودگی سے بےخبر وہ عین ہمارے درمیان آ کر کھڑا ہو گیا اگر ہم چاہتے تو ہاتھ بڑھا کر اسے چھو لیتے۔ نہ جانے کتنے منٹ گذر گئے۔ اور پھر یکایک میرے ٹخنے میں بڑے زور کی کھجلی ہونے لگی۔ لیکن مارے خوف کے کھجلانے کی ہمت نہ ہوئی۔ ٹخنوں کے بعد کان پر سوئیاں سی چبھنے لگیں، اور اس کے فوراً ہی بعد پیٹھ پر یعنی دونوں کندھوں کے عین درمیان کھجلی نے بھرپور وار کیا۔ اب مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ اگر میں نے ناخنوں کا استعمال نہ کیا تو شاید یہ کھجلی مجھے قبر کا راستہ دکھا دے۔ بہر حال میں اس کا عادی ہوں۔ جب کبھی آپ بڑے آدمیوں کے پاس بیٹھے ہوں، یا جنازے کے ساتھ ہوں، یا پھر آپ کو نیند نہ آ رہی ہو، اور آپ سونے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہوں —— یعنی ایسے موقعوں پر جب آپ ناخنوں کا بے دریغ استعمال نہ کر سکتے ہوں وہ کھجلی اٹھتی ہے، وہ کھجلی اٹھتی ہے کہ خدا کی پناہ اور پھر ایک آدھ جگہ ہو تو آدمی نمٹ بھی لے یہ کمبخت تو ہزار جگہوں پر حملہ کرتی ہے۔

ہاں تو، جیسا کہ میں کہہ رہا تھا، خاصی دیر انتظار کرنے کے بعد جم بولا:

کیوں بھئی، کون ہو؟ کہاں چھپے بیٹھے ہو؟ بولتے کیوں نہیں؟ —— اور جب پھر اسے کوئی جواب نہ ملا، تو وہ کہنے لگا "قسم خدا کی، میں نے ابھی ابھی کسی کی آواز سنی ہے خیر بیٹا کوئی بات نہیں، میں بھی یہاں سے ٹلنے والا نہیں"!

تو جناب وہ وہیں زمین پر میرے اور ٹام کے درمیان آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی پیٹھ درخت کے تنے کے ساتھ ٹکالی اور ٹانگیں یوں پھیلا دیں کہ اس کی ایک ٹانگ تو قریب قریب میری ٹانگ کو چھونے لگی۔ کرنا خدا کا، کہ ادھر تو یہ موت کا فرشتہ سر پر سوار تھا

ہی، اُدھر میری ناک پر اس شدّت سے کھجلی ہوئی کہ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ لیکن بن آئی موت کون بلائے؟ میں مُردے کی طرح بدن اکڑائے پڑا رہا۔ پر وہ بھی ایک ڈھیٹ نکلی۔ ناک سے ہٹ کر اس نے قمیض کے اندر جسم پر، اور پھر نیچے پیٹ پر پاؤں پسارنے شروع کر دیئے۔ میری سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کروں تو کیا کروں۔ چھ سات منٹ میری وہ بری حالت رہی کہ بس یوں لگتا تھا جیسے برسوں سے اس عذاب میں مبتلا ہوں۔ اور عذاب بھی وہ کہ خدا کی پناہ! میرے جسم کے گیارہ انگ زبان حال سے چیخ چیخ کر ناخنوں کے استعمال کا مطالبہ کر رہے تھے اور معاملہ برداشت کی حد سے باہر ہو چکا تھا۔ آخر میں کب تک اپنے آپ کو روک سکتا تھا؟ زیادہ سے زیادہ ایک منٹ اور صبر کر لیتا تاہم میں نے دانت بھینچ لئے اور جی کڑا کر کے پڑا رہا۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ اسی وقت جم کی سانسوں کی آواز گہری ہو گئی اور پھر فوراً ہی وہ خراٹے بھرنے لگا۔ موقع کا فائدہ اٹھا کر میں نے پورے جسم کو کھجلا ڈالا۔

جب ہمیں یقین ہو گیا کہ جم تو مُردوں سے بازی لگانے کی سوچ رہا ہے تو ٹام نے آہستہ سے ٹخ کی آواز نکالی۔ میں نے اشارہ سمجھ لیا اور ہم ہاتھ پاؤں کے بل رینگتے ہوئے وہاں سے کھسک آئے۔ دس فٹ پرے پہنچ کر ٹام رک گیا اور بولا: "کیوں نہ اس حبشی کو درخت سے باندھ دیں؟ خوب تماشہ رہے گا ——" لیکن میں نے انکار کر دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر کہیں جم جاگ اٹھا اور اس نے شور مچانا شروع کر دیا تو میری خیر نہیں۔ کیونکہ اس سے ان لوگوں کو پتہ چل جائے گا کہ میں گھر سے کھسک آیا ہوں —— اس کے بعد ٹام کہنے لگا: "میرے پاس تو صرف تھوڑی سی موم بتیاں ہیں۔ ذرا ٹھہرو۔ میں لپک کر باورچی خانے میں سے دو ایک موم بتیاں اٹھا لاؤں" —— میں نے اسے پھر روک دیا کیونکہ اس دوران میں اگر کہیں جم جاگ اٹھتا اور باورچی خانے میں آنکلتا، تو ——؟ لیکن ٹام نے میری ایک نہ سنی اور بولا: "کچھ بھی ہو، یہ خطرہ تو مول لینا ہی ہوگا۔ بنا موم بتی کے چارہ بھی تو نہیں!" لہٰذا ہم چپکے سے باورچی خانے میں داخل ہو کر تین موم بتیاں اٹھا لائے۔ چلتے وقت ٹام

نے مرہم بتیوں کی قیمت کے طور پر پانچ سینٹ کا ایک سکہ میز پر رکھ دیا۔ میں نے ٹام سے بہتیرا کہا کہ مزید دیر کرنا خطرے سے خالی نہیں لیکن اس پر تو یہی دُھن سوار تھی کہ سوئے ہوئے جم کے ساتھ کوئی نہ کوئی شرارت ضرور ہونی چاہیئے۔ خیر، وہ تو ادھر جم کی طرف رینگنے لگا اور میں وہاں بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ اور تنہائی مجھے کاٹنے کو دوڑ رہی تھی۔

ٹام کے واپس آتے ہی ہم اس پگڈنڈی پر ہو لئے جو باغ کی باڑ کے ساتھ ساتھ جاتی تھی۔ چلتے چلتے ہم گھر کے دوسری طرف واقع ایک پہاڑی کی چوٹی پر جا چڑھے وہاں پہنچ کر ٹام نے مجھے بتایا کہ اس نے جم کے ساتھ یہ شرارت کی تھی کہ اس کا ہیٹ اس کے سر سے اتار کر اوپر درخت کی ٹہنی پر لٹکا دیا تھا۔ جم ہلا جلا تو ضرور، مگر خیریت گزری کہ جاگا نہیں لیکن اس بات کا جو بتنگڑ جم نے بنایا' اس کا جواب نہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ اس رات اس نے چڑیلوں کو دیکھا اور پھر وہ ساری رات اس کی پیٹھ پر سوار ہو کر ریاست کی سیر کرتی رہیں۔ سیر سے فارغ ہو کر وہ اسے واپس اسی درخت کے نیچے چھوڑ گئیں' اور نشانی کے طور پر اس کا ہیٹ اوپر ٹہنی پر لٹکا گئیں ——— یہی نہیں۔ اگلی بار جب اس نے اس قصے کو بیان کیا تو اتنی ترمیم اور کر دی کہ چڑیلوں کو اپنی پیٹھ پر لاد کر نیو اور لینز تک کی سیر کروا دی۔ اور اس کے بعد جتنی بار بھی یہ قصہ دُہرایا گیا چڑیلوں کی سیر کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا' حتیٰ کہ ایک دن جم نے یہاں تک کہہ دیا کہ چڑیلیں اس کی پیٹھ پر سوار ہو کر ساری دنیا کا طواف کرتی رہی تھیں۔ اس سواری کا ثبوت وہ یہ دیا کرتا تھا کہ جب وہ سو کر اٹھا تو تھک کر چور ہو چکا تھا اور اس کی پیٹھ پر جگہ جگہ زخم ہو گئے تھے بالکل ویسے ہی جیسے گھوڑے کی پیٹھ پر آٹھوں پہر زین کسے رہنے سے ہو جاتے ہیں۔ چڑیلوں کے ساتھ اپنے اس تعلق پر وہ اس قدر نازاں تھا کہ دوسرے حبشیوں کو اب اس نے خاطر میں لانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اور ان حبشیوں کی بھی ایک ہی کہی وہ میلوں دور سے جم کے درشن کرنے آتے تاکہ اس کی کہانی اس کی زبانی سُن سکیں۔ رفتہ

رفتہ اس کی عزت ایک برگزیدہ ہستی کے طور پر ہونے لگی۔ ہر روز اس کے ارد گرد حبشیوں کی بھیڑ سی لگی رہتی اور جب وہ آپ بیتی سناتا تو فرطِ حیرت سے ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ جاتا۔ ان حبشیوں کا یہ معمول تو ہونا ہی ہے کہ رات کو آتشدان کے گرد بیٹھ کر چڑیلوں، بھوتوں کی باتیں کرتے ہیں۔ مگر اب تو حالت یہ ہو گئی تھی کہ ادھر بھوت پریت کا ذکر چھڑتا، اور ادھر جم راوی کو یہ کہکر ٹوک دیتا کہ تم کیا جانو، چڑیلوں کو؟ —— یہ سُن کر قصہ گو یوں خاموش ہو جاتا جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ یہی نہیں، اس کے علاوہ جم نے ایک اور ڈھونگ رچا رکھا تھا یعنی پانچ سینٹ کے اس سکے کو جو ہم باورچی خانے میں رکھ آئے تھے، دھاگے میں پرو کر اس نے اپنے گلے میں ڈال لیا تھا اور یہ مشہور کر دیا تھا کہ یہ تعویذ خود حضرت ابلیس نے اسے دیا ہے۔ اس تعویذ سے دو کرامتیں منسوب کر دی گئیں۔ ایک تو یہ کہ اس سے ہر مرض دفع ہو جاتا ہے، اور دوسری یہ کہ اس کی مدد سے جم جب چاہے ایک منتر پڑھ کر بھوتوں کو بلا سکتا ہے۔ یہ منتر کیا تھا؟ یہ راز جم نے کسی کو نہ بتایا۔ اس خبر کا پھیلنا تھا کہ قرب و جوار کے تمام حبشی اس کے پاس آنے لگے۔ ہر وقت ان کا تانتا بندھا رہتا۔ پانچ سینٹ کے اس سکے کا دیدار کرنے کیلئے وہ جم کو منہ مانگی قیمت دے دیتے۔ البتہ دیدار وہ دور ہی سے کرتے۔ اسے چھو کر دیکھنے کی انہیں ہمت نہ ہوتی۔ چھوتے کیسے؟ حضرت ابلیس کے ہاتھ جو لگ چکے تھے اس پر! قصہ کوتاہ، جم کا کاروبار خوب چمک اٹھا۔ اور حضرت ابلیس اور بھوتوں کے ساتھ اپنے تعلقات کی وجہ سے وہ اس قدر بگڑ گیا کہ اپنی آقا کی خدمت کرنے کی بھی اس کے پاس فرصت نہ رہی۔

ہاں تو، پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر جب ہم نے نیچے نگاہ دوڑائی تو ہمیں تین چار روشنیاں ٹمٹماتی ہوئی نظر آئیں۔ شاید ان گھروں میں کسی کی طبیعت ناساز تھی۔ اوپر آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے۔ گاؤں کے اس طرف دریا تھا جس کا پاٹ ایک میل سے کم نہیں ہوگا۔ اتنی بلندی پر پہنچ کر بھی ہم اس سے مرعوب ہوئے بنا نہ رہ سکے۔ وہاں سے جب ہم پہاڑی کے دوسری طرف اترے، تو جو ہارپر، بین روگرز اور دو تین اور لڑکے چمڑا رنگنے کے کارخانے میں چھپے ہمارا انتظار

کررہے تھے۔ ہم نے فوراً ایک کشتی کھولی اور اس میں سوار ہو کر اسے دریا کے بہاؤ پر چھوڑ دیا۔ تقریباً ڈھائی میل تک چلتے رہنے کے بعد ہم اس جگہ تک پہنچ گئے۔ جو ہمیں دور سے پہاڑی کے دامن پر لگا ہوا داغ سا دکھائی دیتی تھی۔ ہم نے کشتی روک لی اور ساحل پر اتر گئے۔

ہم جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں چلے گئے۔ وہاں ٹام نے ہر لڑکے سے حلفیہ وعدہ لیا کہ وہ یہ راز کسی پر ظاہر نہیں کرے گا۔ پھر اس نے ہمیں پہاڑی پر ایک کھوہ دکھائی جو گنجان جھاڑیوں کے پیچھے چھپی ہوئی تھی اور کسی کو نظر نہیں آسکتی تھی۔ ہم نے موم بتیاں جلائیں اور ہاتھ پاؤں کے بل رینگتے ہوئے اس کھوہ کے اندر داخل ہو گئے۔ دو سو گز آگے جا کر یہ غار قدرے کشادہ ہو گئی۔ اور چند گلیاں سی اس میں سے نکلتی ہوئی دکھائی دیں۔ ٹام گھوم پھر کر ان گلیوں کا جائزہ لیتا رہا اور پھر دفعتاً اچھل کر دیوار کے نیچے غائب ہو گیا۔ ہم بھی اس کے پیچھے پیچھے اس کھوہ میں داخل ہو گئے۔ یہ کھوہ اتنی چھوٹی تھی کہ کسی کو اس کی موجودگی کا خیال تک نہ آسکتا تھا۔ شروع شروع میں تو گلی کافی تنگ رہی، لیکن تھوڑی دور جا کر ہمیں یوں لگا جیسے ہم ایک کمرے میں کھڑے ہوں، پھر ہمیں سیلن، حبس، اور سردی کا احساس ہونے لگا۔ وہاں جا کر ٹام نے ہمیں یوں مخاطب کیا۔

"تھوڑی ہی دیر میں ڈاکوؤں کا گروہ بنانے کا ہمارا دیرینہ خواب ایک حقیقت بن جائے گا۔ اس گروہ کا نام "ٹام سایر کا گروہ" ہوگا، اور ہر اس شخص پر جو اس گروہ میں شامل ہونا چاہتا ہو۔ یہ لازم ہوگا کہ وہ ایک حلف اٹھائے۔ اور اس حلف نامے پر اپنے خون سے دستخط کرے"

سب نے اس تجویز کو لبیک کہا۔ اس کے بعد ٹام نے وہ حلف نامہ نکالا اور اسے پڑھ کر ہمیں سنانے لگا۔ اس کا مضمون یوں تھا:-

"ہر لڑکا گروہ کا وفادار رہے گا۔ اور کبھی گروہ کے راز کسی غیر شخص پر ظاہر نہ کرے گا۔ اگر کبھی کوئی شخص اس گروہ کے کسی فرد کو کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچائے گا تو اسے اس کے

خاندان سمیت ختم کر دیا جائے گا۔ اور جس لڑکے کے ذمہ انہیں ختم کرنے کا فرض لگایا جائے گا اس پر تب تک کھانا پینا اور سونا حرام ہو گا جب تک کہ وہ انہیں قتل کر کے ان کے سینے پر صلیب کا نشان نہ بنا آئے۔ صلیب اس گروہ کا نشان ہو گا۔ اس گروہ کے ممبروں کے سوا کسی دوسرے شخص کو اس نشان کے استعمال کی اجازت نہ ہو گی اگر کوئی شخص اس نشان کا استعمال کرتا ہوا پکڑا جائے، تو اس کے خلاف پہلے تو دعویٰ دائر کیا جائے گا اور اگر وہ پھر بھی باز نہ آئے تو اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا اگر کوئی فرد گروہ کے راز دوسروں پر ظاہر کرے گا تو اس کا سر کاٹ دیا جائے گا اور اس کی لاش کو جلا کر اس کی راکھ زمین پر بکھیر دی جائے گی۔ گروہ کی فہرست میں سے اس کا نام خون سے مٹا دیا جائے گا۔ اور اس کے بعد گروہ کا کوئی فرد کبھی اس کے نام کو اپنی زبان پر نہ لائے گا۔ یہ نام مطعون قرار دیا جائے گا اور اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھلا دیا جائے گا۔"

سبھی کی رائے میں یہ حلف نامہ لاجواب تھا۔ ہم نے پوچھا: "کیا یہ تم نے خود ہی لکھا ہے؟" اس نے جواب دیا: "اس کا کچھ حصہ تو میں نے ہی لکھا ہے۔ تاہم بہت سے نکتے ڈاکوؤں اور سمندری لٹیروں کی کتابوں میں سے لئے گئے ہیں۔ ہر اچھے گروہ کے لئے یہ لازمی ہوتا ہے کہ اس کا اپنا حلف نامہ ہو۔"

چند ممبروں کی رائے تھی کہ جو لڑکے افشائے راز کے مرتکب ہوں ان کے تمام خاندان کو موت کے گھاٹ اتار دینا چاہیئے۔ چونکہ خود ٹام بھی اس تجویز سے متفق تھا۔ لہذا اس نے پنسل لے کر حلف نامے میں اس مد کا بھی اضافہ کر دیا۔ اس پر بین روگرز نے اعتراض اٹھایا "لیکن ہک فن کا تو کوئی خاندان ہے ہی نہیں۔ اس کا کیا کرو گے؟"

"اس کا باپ تو ہے،" ٹام سائر نے جواب دیا۔ "ہے تو سہی مگر آج کل نہ ہے کہاں! کسی کو اس کا پتہ بھی ہے؟ پہلے بھی وہ سارا سارا دن شراب پی کر چمڑے کے کارخانے میں آوارہ سوروں کے ساتھ لیٹا رہتا تھا۔ اور گزشتہ ایک برس سے تو وہ بالکل ہی لاپتہ ہے۔"

کچھ دیر تک اسی موضوع پر بحث ہوتی رہی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ میرا نام ہی گروہ سے خارج ہونے لگا۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، گروہ میں شامل ہونے کے لیے یہ لازمی تھا کہ میرا کوئی خاندان ہو، یا کوئی ایسا رشتہ دار ضرور ہو جسے بوقت ضرورت قتل کیا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ مجھے ممبر بنانے سے باقی ممبروں کے ساتھ ناانصافی ہوتی تھی۔ لیکن کیا بھی کیا جا سکتا تھا؟ لہٰذا سب لاچار اور بے بس تھے۔ ادھر میری یہ حالت تھی کہ اب رویا کہ رویا۔ اچانک مجھے ایک ترکیب سوجھی میں بولا: "مس واٹسن جو ہے۔ اگر ضرورت پڑے تو اسے قتل کر لینا۔" فوراً ہی سب بول اٹھے: "بالکل ٹھیک۔ مس واٹسن سے کام چل جائے گا۔ ہک کو شامل کیا جا سکتا ہے۔"

اس کے بعد ہر لڑکے نے اپنی انگلی میں سوئی چبھو کر اس حلف نامے پر اپنے خون سے دستخط کر دیے۔ میں نے بھی اس کاغذ پر دستخط کر دیے۔ جب یہ کارروائی ختم ہو گئی تو بین روگرز بولا:

"اچھا، تو اس گروہ کا کام کیا ہو گا؟"

"بس یہی، ڈاکہ ڈالنا، قتل کرنا، وغیرہ وغیرہ۔"

"لیکن ڈاکہ ڈالیں گے کس پر؟ مکانوں پر؟ مویشیوں پر۔۔۔۔؟ ۔۔۔۔ یا۔۔۔۔؟"

"مویشیوں پر نہیں، مال پر،" ٹام سائر نے کہا۔ "جو لوگ مویشیوں کی چوری کرتے ہیں، وہ ڈاکو نہیں کہلاتے، وہ چور ہوتے ہیں۔ اور ہم چور تھوڑے ہی ہیں؟ ـــــ ہم تو ڈاکو ہیں۔ ہمارا کام تو یہ ہو گا کہ چہروں پر نقاب ڈال کر شاہراہوں پر چلنے والی گاڑیوں پر ڈاکہ ڈالیں۔ اور لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار کر ان کی گھڑیاں اور رقم وغیرہ لوٹ لیں۔"

"لیکن کیا یہ لازمی ہے کہ لوگوں کو موت کے گھاٹ ہی اتارا جائے؟"

"یقیناً ـــــ یہی طریقہ تو بہترین ہے۔ اگرچہ کچھ کتابیں اس طریقہ کار کے خلاف ہیں تاہم اکثریت کی رائے یہی ہے کہ لوگوں کو ختم کر دینا ہی مناسب ہوتا ہے۔ ہاں، البتہ جن

لوگوں کا تاوان ہوتا ہو، انہیں تو زندہ رکھنا ہی پڑے گا۔ لہٰذا انہیں یہاں غار میں لا کر تب تک قید رکھا جائے گا جب تک کہ ان کا تاوان نہ ہو جائے۔"

"تاوان؟ ـــــ وہ کیا بلا ہوتی ہے؟"

"علم تو مجھے بھی نہیں۔ لیکن جیسا کہ میں نے کتابوں میں پڑھا ہے، ڈاکو لوگ کرتے یہی کچھ ہیں۔ لہٰذا ہم بھی یہی کچھ کیا کریں گے۔"

"لیکن اگر ہمیں یہ علم ہی نہیں کہ تاوان ہے کس چڑیا کا نام، تو ہم یہ کچھ کریں گے کیسے؟"

"اس سے کیا؟ ہمیں تو وہی کچھ کرنا ہے، جو ڈاکو کرتے ہیں۔" میں نے کہا "یہ بات کتابوں میں لکھی ہے کیا تم چاہتے ہو کہ ہم ان مسلمہ اصولوں کی خلاف ورزی کریں اور بنا بنایا کھیل بگاڑ دیں؟"

"لیکن بھیا ٹام سائر، کہنا آسان ہے، کرنا مشکل۔ ذرا یہ تو بتاؤ کہ یہ بیل کیسے سرے چڑھے گی۔ جب ہمیں یہ تک تو علم ہی نہیں کہ تاوان کہتے کس بلا کو ہیں؟ ـــــ میں چاہتا ہوں کہ یہ مسئلہ حل ہو جائے تو بہتر ہوگا ـــــ بھلا تمہارے خیال میں اس کا کیا مطلب ہوگا؟"

"وثوق سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن شاید اس کا مطلب یہ ہو کہ ہم ان لوگوں کو تب تک اپنے پاس رکھیں جب تک کہ وہ مر نہ جائیں۔"

"اندازہ تو میرا بھی یہی ہے اور شاید اس کا مطلب ہوگا بھی یہی، لیکن تم بھی واقعی عجیب آدمی ہو۔ یہ بات تم نے پہلے ہی کیوں نہ بتا دی؟ بس اب ٹھیک ہے۔ ان لوگوں کو ہم تب تک یہیں رکھیں گے جب تک کہ انہیں موت نہ آ جائے ـــــ لیکن، یار، ذرا سوچو تو۔ اس میں ایک نقصان ہے اور وہ یہ کہ جو کچھ ہم لایا کریں گے، وہ سب تو یہی لوگ کھا جائیں گے۔ پھر ہمارے لئے کیا بچے گا؟ اور یہی نہیں وہ تو بھاگ جانے کی کوشش بھی کیا کریں گے۔"

"واہ بین رو گرز۔ تم بھی کیسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔ جب ان پہ پہرا لگا ہوگا، تو وہ

بھاگیں گے کیسے؟ اگر انھوں نے ایک قدم بھی ادھر اُدھر کیا تو پہرے دار انہیں گولی نہ مار دے گا؟"

"پہرا؟ - واہ بھئی واہ! یہ بھی خوب رہی یعنی ایک آدمی ساری ساری رات جاگتا رہا کرے گا اور وہ بھی صرف ان لوگوں کی نگرانی کے لئے۔ نہ بھئی نہ! میری رائے تو یہ ہے کہ تاوان وغیرہ کا جھمیلا محض حماقت ہے۔ کیوں نہ ایک آدمی لاٹھی لے کر ان کے سر پھوڑ دے تاکہ یہاں پہنچتے ہی ان کا تاوان ہو جائے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟ ایسا کرنا تو کتابوں کی خلاف ورزی ہو گی۔ اور بین روگرز! یہ بات ذہن نشین کر لو کہ یہاں ہر چیز ضابطے سے ہو گی۔ تم سمجھتے ہو کہ وہ لوگ جنہوں نے کتابیں لکھی ہیں، یہ تک نہیں جانتے تھے کہ کونسی کارروائی مناسب ہے اور کونسی نہیں؟ تم ان سے زیادہ لائق ہو گیا؟ میں پھر کہے دیتا ہوں کہ ہم تو ان کا تاوان ویسے ہی کریں گے جیسے کتابیں کہتی ہیں۔"

"اگر تم یہی مناسب سمجھتے ہو، تو یہی سہی۔ لیکن میرا خیال اب بھی یہ ہے کہ یہ نری حماقت ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ، کیا عورتوں کو بھی مار ڈالنا ہو گا؟"

"لو، اور سنو! —— ہم تمہاری طرح جاہل ہیں کیا؟ بالفرض اگر میں تمہاری طرح جاہل ہوتا بھی، تو بھی یہ کام ہرگز ہرگز نہ کرتا۔ عورتوں کا مارنا! یہ کس کتاب میں لکھا ہے؟ انہیں تو ہم اس غار میں رکھیں گے اور ان کے ساتھ نہایت ادب سے پیش آیا کریں گے۔ اور پھر رفتہ رفتہ جب وہ ہم لوگوں سے محبت کرنے لگیں گی تو انہیں گھر لوٹنے کا خیال تک نہ آئے گا۔"

"اگر یہ بات ہے تو چلو یونہی سہی۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ یہ فیصلہ مجھے کچھ اچھا نہیں۔ ذرا یہ تو سوچو کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔ چند دنوں میں ہی یہ غار ان عورتوں اور مردوں سے بھر جائے گا جن کا تاوان ہونا ہے اور ہم ڈاکوؤں کے لئے پیر دھرنے تک کی جگہ نہ رہے گی۔ لیکن خیر تم اپنا کام کرو۔ مجھے اب کچھ نہیں کہنا ——"

اس بحث کے دوران میں ننھے ٹامی بارلس کو نیند آگئی۔ جب اُسے جگایا گیا تو وہ رونے لگا اور ضد کرنے لگا "مجھے فوراً میری ماں کے پاس پہنچا دو۔ مجھے میری ماں کے پاس پہنچا دو۔ میں ڈاکو نہیں بننا چاہتا"

پھر کیا تھا لگے سب اس کا مذاق اڑانے۔ اس سے وہ اور بھی چڑ گیا اور بولا: ذرا مجھے گھر پہنچنے دو۔ ابھی جا کر تمہارا بھانڈا پھوڑتا ہوں' ــــــ لیکن ٹام نے پانچ سینٹ کی رشوت دے کر اس کا منہ بند کر دیا۔ اس کے بعد فیصلہ یہ ہوا کہ آج کی کارروائی ختم کی جائے اور سب لوگ گھر لوٹ جائیں۔ اگلے ہفتے پھر میٹنگ ہوگی اور اس میٹنگ میں ڈاکہ ڈالنے اور قتل کرنے کا باقاعدہ پروگرام بنایا جائے گا۔

لیکن اس میں ایک مشکل اور آن پڑی۔ بین روگرز کو اتوار کے سوا اور کسی دن فرصت نہیں ہوتی تھی۔ لہٰذا اس کی تجویز یہ تھی کہ پروگرام پر اگلے اتوار سے ہی عمل درآمد شروع کر دیا جائے۔ اس کے برعکس باقی سب لڑکوں کی رائے تھی کہ اتوار کے روز ایسا کام کرنا گناہ ہوگا۔ نتیجتاً اتوار کا پروگرام منسوخ ہو گیا اور اس کی بجائے فیصلہ یہ ہوا کہ مزید ایک میٹنگ کر کے کوئی دوسرا مناسب سا دن مقرر کر لیا جائے۔ برخاست ہونے سے پہلے ٹام سائر کو سردار کے عہدے کے لئے اور جو ہارپر کو نائب سردار کے عہدے کے لئے منتخب کر لیا گیا۔

جب میں گھر پہنچا تو تڑکا ہونے کو تھا۔ میں چپکے سے شیڈ کی چھت پر چڑھ گیا اور کھڑکی سے کود کر اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ میرے نئے کپڑے میلے اور روغن آلود ہو گئے تھے اور تھکن کے مارے میرا بُرا حال تھا۔

۳- ہک کی مرمت – دُعا کی فتح – ٹام سائر کا ایک جھوٹ

صبح جب بوڑھی مس واٹسن نے میرے کپڑوں کی ناگفتہ بہ حالت دیکھی تو اس نے میری خوب خبر لی۔ ظاہر ہے کہ بیوہ کو بھی میری حرکتوں سے کافی دکھ پہنچا تھا، لیکن وہ بچاری کچھ نہ بولی۔ اور نہایت خاموشی سے میرے کپڑوں سے کیچڑ وغیرہ صاف کرتی رہی۔ اس کو اداس دیکھ کر میں نے تہیہ کر لیا کہ جہاں تک ممکن ہو گا، میں راہ راست پر چلنے کی کوشش کروں گا اس کے بعد مس واٹسن مجھے ایک کوٹھڑی میں لے گئی اور لگی دعا مانگنے لیکن سب بے سود اس کی دعاؤں کا کچھ بھی نتیجہ نہ نکلا۔ اس کے باوجود اس نے مجھے یہ نصیحت کی کہ میں بھی ہر روز دعا مانگا کروں کیونکہ اس سے مرادیں پوری ہوتی ہیں۔ خیر، میں نے اس نسخے کو بھی آزمایا لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ یاروں کو کچھ بھی تو حاصل نہ ہوا۔ ہاں، البتہ ایک بار مچھلی پکڑنے کی بنسی ضرور مل گئی۔ خدا کی ستم ظریفی تو دیکھیے کہ بنسی تو دی لیکن بغیر کانٹے کے۔ اب بھلا یہ میرے کس کام آ سکتی تھی؟ میں نے تین چار بار کانٹے کے لیے دعا کی لیکن کچھ شنوائی نہ ہوئی بالآخر ایک روز میں نے مس واٹسن سے درخواست کی کہ وہی میرے لیے کوشش کر دیکھے لیکن بجائے میری مدد کرنے کے اس نے مجھے ڈانٹ دیا۔ اور بولی: تم بھی نرے احمق ہو! لیکن میں احمق کیونکر ہوں اس کی اس نے بالکل وضاحت نہ کی۔ میں نے بہت سوچا لیکن میری سمجھ میں نہ آیا کہ آخر اس میں حماقت کی کون سی بات تھی۔

سوچتا سوچتا ایک دن میں جنگل میں نکل گیا۔ اور بہت دیر تک وہیں بیٹھا اس مسئلے پر غور کرتا رہا۔ میں نے اپنے آپ سے پوچھا: اگر دعا کرنے سے واقعی مرادیں پوری ہو جاتی ہیں تو ڈیکین دِن کو وہ رقم کیوں واپس نہ مل گئی جس کا خسارہ اسے گوشت کے کاروبار میں

ہوا تھا؟ یا پھر بیوہ چاندی کی وہ ڈبیا کیوں واپس نہیں مانگ لیتی جو چوری ہو گئی تھی؟ (بیوہ اس ڈبیا میں نسوار رکھا کرتی تھی) یا مس واٹسن موٹی کیوں نہیں ہو جاتی؟ ——— ان سوالوں کا خاطر خواہ جواب نہ پا کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ سب ڈھکوسلا ہے اور اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ گھر پہنچ کر جب میں نے اپنے یہ شکوک بیوہ کے سامنے رکھے تو اس نے جواب دیا کہ دعا کرنے والوں کی روحانی نعمتیں میسر ہوتی ہیں۔ اب یہ روحانی نعمتوں والی بات میری سمجھ سے بالکل ہی باہر تھی۔ لہذا بیوہ نے ان کی تشریح شروع کر دی۔ یعنی یہ کہ میں دوسروں کی مدد کیا کروں، لوگوں کے کام آنے کی حتی الوسع کوششیں کیا کروں، اپنی ضرورتوں کی بجائے سدا دوسروں کی ضرورتوں کا دھیان رکھوں، وغیرہ وغیرہ ——— میری سمجھ میں تو صرف یہی آیا کہ جن لوگوں کی خدمت کرنے کی مجھ سے توقع کی جا رہی تھی۔ ان میں مس واٹسن بھی شامل ہے خیر، میں باہر جنگل میں جا بیٹھا اور بہت دیر تک اس کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس تمام کارروائی میں کوئی فائدہ نظر نہ آیا۔ یعنی اگر کوئی فائدہ تھا تو صرف دوسرے لوگوں کو، مجھے نہیں ——— لہذا میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس نصیحت کے متعلق پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اور بہتر یہی ہو گا کہ اُسے بھلا دیا جائے۔ گاہے گاہے بیوہ مجھے ایک طرف لیجا کر خدا کا ذکر کچھ اس طرح کرنے لگتی کہ میرے منہ میں پانی بھر آتا لیکن اگلے ہی دن مس واٹسن اس کے کئے کرائے پر پانی پھیر دیتی۔ اس سے میری سمجھ میں تو یہی آیا کہ خدا دو ہیں۔ ایک بیوہ والا اور دوسرا مس واٹسن والا۔ مجھ جیسے شخص کو اگر کہیں بیوہ والا خدا مل جائے تو وارے نیارے ہو جائیں۔ لیکن بدقسمتی سے اگر کہیں میں مس واٹسن کے خدا کے ہتھے چڑھ گیا تو خیر نہیں۔ میں نے اس مسئلے پر بھی کافی غور کیا اور آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ یاروں کو صرف بیوہ ہی کا خدا راس آ سکتا ہے۔ لہذا اگر کبھی اپنے آپ کو کسی خدا کے ساتھ وابستہ کرنا ہی پڑا تو یہ شرف بیوہ کے خدا ہی کو بخشا جائے گا بشرطیکہ وہ مجھے قبول کر لے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ مجھ جیسے جاہل اور نکمے آدمی سے بھلا خدا کو کیا فیض پہنچ سکتا ہے؟

ہاں، جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، میرے ابّا کا پچھلے ایک برس سے کچھ اتا پتہ نہ تھا اور یہ امر میرے لئے باعثِ سکون تھا۔ دراصل میں تو اب اس کا منہ بھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ بات یہ تھی کہ وہ تو ہر وقت نشے میں دھت رہتا تھا اور اگر بدقسمتی سے کسی دن ہوش میں ہوتا تو میری خوب پٹائی کرتا حالانکہ جب کبھی وہ گاؤں میں ہوتا تو مجھے زیادہ عرصہ جنگل ہی میں ڈیرا ڈالنا پڑتا ــــــ ہاں تو، اب کی بار اس کی لاش قصبے سے بارہ میل اوپر دریا میں سے ملی تھی۔ کم از کم لوگوں کو بھی یقین تھا کہ یہ لاش میرے ابّا ہی کی ہے کیونکہ میرے باپ کا ڈیل ڈول بھی ایسا ہی تھا۔ اس کے علاوہ یہ شخص پھٹے پرانے کپڑے پہنے تھا؟ اور اس کے بال غیر معمولی حد تک لمبے تھے۔ اور یہ سب نشانیاں میرے ابا جان ہی کی تھیں۔ تاہم اس مردے کے چہرے کی شناخت نہیں ہو سکی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بہت دیر تک پانی میں ڈوبے رہنے کی وجہ سے لاش کا چہرہ مسخ ہو گیا تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ لاش پیٹھ کے بل پانی میں بہہ رہی تھی۔ خیر، لاش کو تو دریا کے کنارے پر لا کر دفنا دیا گیا۔ البتہ مجھے پھر بھی چین نہ آیا۔ ایک شبہ بار بار میرے دل میں اُٹھ رہا تھا۔ میں اس امر سے بخوبی واقف تھا کہ ڈوبا ہوا مرد پیٹھ کے بل کبھی نہیں بہتا، بلکہ پیٹ کے بل بہتا ہے۔ لہذا مجھے یقین تھا کہ وہ لاش میرے ابا کی نہیں ہو سکتی۔ یہ ضرور کسی عورت کی لاش ہو گی، جس نے مردوں کے ایسے کپڑے پہن رکھے تھے۔ یہ خیال آتے ہی میری تشویش کا ٹھکانہ نہ رہا کیونکہ اُس صورت میں کسی وقت بھی میرے ابّا کے ٹپک پڑنے کا امکان تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ میں اُس کی صورت دیکھنے کا قطعاً خواہشمند نہ تھا۔

ایک ماہ تک ہم گاہے گاہے ڈاکوؤں کا کھیل کھیلتے رہے۔ اس کے بعد میں نے استعفا دے دیا۔ میں نے ہی نہیں سبھی نے دے دیا۔ وجہ یہ تھی کہ نہ تو ہم نے کہیں ڈاکہ ڈالا اور نہ کوئی قتل کیا۔ ہمارے ڈاکے بھی نقلی ہوتے تھے اور قتل بھی یعنی ہم جنگلوں میں چھپے رہتے، اور جب کوئی گلّہ بان سوروں کا ریوڑ لئے ادھر سے گزرتا، یا کوئی عورت سبزی کا چھکڑا لئے منڈی

کو جاتی دکھائی دیتی، ہم ان پر دھاوا بول دیتے۔ ان حملوں میں ہمیں کبھی ان سے کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ البتہ ٹام سارے سوروں کو جھریں بنا اور شلغموں کو گھینے کہتا۔ اس کے بعد ہم غار میں چلے جاتے اور اپنے کارنامے پر تبصرہ کرتے؛ اور اس بات پر پھولے نہ سماتے کہ ہم نے اتنے 'آدمی' قتل کر ڈالے یا اتنے 'آدمیوں' کے سینے پر اپنا نشان کندہ کیا۔ ان تمام ہنگاموں میں مجھے کوئی فائدہ نظر نہ آیا۔ ایک دفعہ ٹام نے ایک لڑکے کے ہاتھ میں مشعل دے کر کہا کہ اس مشعل کو سارے شہر میں گھما لائے۔ وہ اس کارروائی کو 'نعرے' کا نام دیتا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ گروہ کا ہر فرد فوراً غار میں پہنچ جائے۔ جب سب لوگ آ گئے تو ٹام نے ہمیں بتایا کہ اس کے جاسوس نے اسے خبر دی ہے کہ کل ہسپانوی سوداگروں اور امیر عربوں کا ایک قافلہ 'کیو ہالو' (CAVE HOLLOW) میں پڑاؤ ڈالے گا۔" ان کے پاس دو سو ہاتھی، چھ سو اونٹ اور ہزار سے زیادہ باربردار خچریں ہیں۔ اور یہ سب ہیروں سے لدی ہوئی ہیں۔ ان کے ہمراہ صرف چار سو پہرے دار ہیں۔ ہم ان پر اچانک حملہ کر کے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیں گے اور سامان لوٹ لیں گے" ——— اس کے بعد اس نے حکم دیا کہ ہم اپنی تلواریں اور بندوقیں تیار رکھیں وہ خود ان حملوں میں حصہ نہیں لیتا تھا شلغموں کے چھکڑوں کو لوٹتے وقت بھی وہ ساتھ نہ ہوتا۔ لیکن اس کا حکم تو دیکھئے کہ تلواریں اور بندوقیں چمکا کر رکھی جائیں ان تلواروں' اور 'بندوقوں' کی بھی ایک ہی رہی۔ یہ ہتھیار تھوڑے ہی تھے۔ یہ تو جھاڑو اور ڈنڈے تھے۔ خواہ انہیں رگڑتے رگڑتے آپ کا دم ہی کیوں نہ نکل جائے یہ دہی کے دہی رہیں گے۔ ان میں رتی بھر چمک نہیں آئے گی۔ مختصر یہ کہ مجھے بالکل یقین نہیں تھا کہ ہم ہسپانویوں اور عربوں کے اتنے بڑے ہجوم پر قابو پا سکیں گے۔ تاہم ہاتھیوں اور اونٹوں کو دیکھنے کی تمنا میرے شکوک پر غالب آ گئی۔ اور میں بھی اگلے روز یعنی سنیچر کو ان کے ساتھ اس دھاوے میں شریک ہو گیا۔ حکم ملتے ہی ہم درختوں کے جھنڈ میں دوڑتے ہوئے پہاڑی سے اتر آئے۔ لیکن وہاں نہ ہسپانوی تاجر تھے، نہ عرب سوداگر۔ اور اونٹوں اور ہاتھیوں

کا دور دور تک نشان نہ تھا۔ وہاں تو صرف "سنڈے سکول" کے وہ بچے تھے جو تفریح کے لئے آئے ہوئے تھے؛ اور وہ بھی پہلی جماعت کے۔ ان کی پکنک کو ہم نے تحس نحس کر دیا اور ان کے بھاگنے پر ہم تب تک ان کا تعاقب کرتے رہے جب تک کہ وہ پہاڑی پر نہ چڑھ گئے ——— اب یہ سنئے کہ مالِ غنیمت ہمیں کیا ملا! ——— صرف چند میٹھی روٹیاں اور مربہ۔ ہاں البتہ بین روگرز کو کپڑوں کی بنی ایک گڑیا ضرور ہاتھ لگی، اور جو ہارپر کو دعا کی کتاب اور ایک رسالہ ہاتھ آیا۔ اسی اثنا میں بچوں کی استانی بھی آ پہنچی اور اس نے ہم پر یلغار کر دی۔ بس پھر کیا تھا؛ مالِ غنیمت کو وہیں چھوڑ ہم سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلے۔ ہیرے جواہرات تو مجھے کہیں دکھائی نہ دئے تھے۔ اپنے اس شک کا اظہار جب میں نے ٹام سے کیا تو وہ کہنے لگا کہ وہاں تو ہیرے جواہرات کا انبار لگا تھا۔ اور عرب بھی تھے اور ہاتھی، اور خزانہ بھی۔ میں نے پوچھا کہ اگر یہ سب کچھ وہاں تھا تو ہمیں نظر کیوں نہ آیا؟ وہ بولا: اگر تم جاہل نہ ہوتے اور تم نے "ڈان کوکساٹ" نامی کتاب پڑھی ہوتی تو اس قسم کا سوال نہ پوچھتے۔ وہ سب سامان جادو کے ایک کرشمے کی نذر ہو گیا۔ برا ہو ہمارے دشمنوں کا، یعنی ان حاسد جادوگروں کا جنھوں نے اتنے بڑے کارواں کو سنڈے سکول کے بچوں کی پکنک میں بدل دیا ——— میں نے کہا: "تو پھر ہمیں ان جادوگروں کو ختم کر دینا چاہئے"۔ لیکن ٹام سائر نے جواب دیا: "تم تو نرے بدھو ہو۔ دیکھو نا، ان جادوگروں کے قبضے میں ہزاروں جن ہوتے ہیں۔ جن کے جسم درخت جتنے لمبے اور گرجا کی عمارت جتنے چوڑے ہوتے ہیں۔ یہ جن پلک جھپکتے ہی تمہارا قلع قمع کر کے رکھ دیں"۔

میں نے کہا: "یہ بات ہے تو پھر ہم بھی کیوں نہ ان جنات کو اپنی مدد کے لئے بلا لیں؟ تب تو وہ دشمن ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔"

"لیکن ہم انھیں بلائیں کیسے؟"

"مجھے کیا پتہ؟ ——— وہ لوگ انہیں کیسے بلا لیتے ہیں؟"

"ان کے پاس ٹین کا ایک پرانا دیا یا لوہے کی انگوٹھی ہوتی ہے۔ اور جب وہ اسے رگڑتے ہیں تو جنات کی ایک فوج رعد کڑکاتی، بجلیاں چمکاتی، اور دھواں پھیلاتی ہوئی بھاگم بھاگ ان کے حضور آن کھڑی ہوتی ہے۔ اور جو کچھ جادوگر کہتا ہے اس کی فوراً تعمیل ہو جاتی ہے۔ ان جنات کے لئے کوئی بھی کام ناممکن نہیں ہوتا۔ وہ تو مینار کو بنیادوں سے اکھاڑ لیں اور اسے سنڈے سکول کے سپرنٹنڈنٹ یا کسی بھی شخص کے سر پر دے ماریں۔" "لیکن وہ ہے کون جو اس طرح ان پر حکم چلاتا ہے؟" "ہر وہ شخص جو دیئے کو یا انگوٹھی کو رگڑتا ہے جس کے پاس دیا یا انگوٹھی ہو۔ یہ اس کے بس میں رہتے ہیں اور جو حکم وہ دے انہیں اس کی تعمیل کرنی ہی پڑتی ہے۔ یعنی اگر وہ کہے کہ چالیس میل لمبا ایک محل بنا دو جس کی دیواریں ہیرے کی ہوں اور اس محل کو چیونگ گم، یا ایسی ہی کسی من پسند چیز سے بھر دو، اور اس میں رہنے کے لئے چین کی شہزادی کو لے آؤ، تاکہ میں اس سے شادی کر لوں، تو انہیں یہ بھی کرنا پڑتا ہے۔ یہی نہیں۔ انہیں یہ سب کچھ سورج نکلنے سے پہلے پہلے کرنا پڑے گا۔ ہاں، اور اگر تم اس محل میں بیٹھ کر پورے ملک کی سیر کرنا چاہو تو وہ اسے لئے لئے پھرتے رہیں گے۔" "میرا خیال ہے" میں نے کہا، "کہ یہ جن لوگ نرے احمق ہوتے ہوں گے۔ اس طرح مارے مارے پھرتے رہنے کی بجائے وہ اس محل میں خود ہی کیوں نہیں رہتے؟ اگر میں جن ہوتا اور کوئی آدمی مجھے پرانا سا دیا رگڑ کر بلاتا، تو اپنا سب کام کاج چھوڑ کر اس کے حضور میں پیش ہونے کی بجائے میں پہلے اسے ہی جہنم پہنچا دیتا۔" "تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو، ہک فن! اگر تم جن ہوتے اور کوئی شخص دیا رگڑ کر تمہیں بلاتا، تو تمہیں آنا ہی پڑتا۔ اس میں تمہاری اپنی مرضی کو کوئی دخل نہ ہوتا۔"

"مجھے آنا ہی پڑتا! یعنی اس درخت جتنے اونچے، اور گرجے جتنے چوڑے آدمی کی کوئی مرضی نہ ہوتی!! اچھا، اگر میں آتا بھی، تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ بلانے والا ملک کا سب سے اونچا درخت ڈھونڈتا پھرتا ———"

"چھوڑ بھی، ہک فن! ــــ تمہارے ساتھ تو بات کرنا ہی فضول ہے۔ پتہ تو تمہیں ہے کچھ نہیں۔ نرے بدھو ہو بابا"

دو تین دن تک میں ان باتوں پر غور کرتا رہا اور پھر میں نے سوچا کہ کیوں نہ خود اُسے آزما کر دیکھا جائے۔ میں نے ایک پرانا سا دیا اور لوہے کی ایک انگوٹھی لی اور جنگل میں چلا گیا۔ وہاں جا کر میں نے انہیں خوب رگڑا۔ رگڑتے رگڑتے میرا پسینہ نکل گیا۔ میرا ارادہ تھا کہ ایک محل بنوا کر اسے بیچ ڈالا جائے۔ لیکن صاحب، میری سب کوششیں بے سود نکلیں۔ کوئی بھی جن حاضر نہ ہوا۔ لہٰذا مجھے یقین ہو گیا کہ یہ سب ٹام سائر کی لاف زنی ہے۔ ممکن ہے اسے عرب اور ہاتھی دکھائی دیئے ہوں لیکن کم از کم مجھے تو وہ محض پکنک ہی نظر آئی تھی۔

۴- ہک اور جج ــ اوہام پرستی

اسی طرح تین چار مہینے گذر گئے۔ جاڑے کبھی کے شروع ہو چکے تھے۔ اس دوران میں میں باقاعدہ سکول جاتا رہا تھا اور ہجے کرنا اور پڑھنا سیکھ گیا تھا۔ تھوڑا بہت لکھ بھی لیتا تھا پہاڑے بھی اتنے یاد ہو گئے تھے کہ چھ سات پینتیس تک بول لیتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں ابد تک بھی لگا رہتا تو شاید اس سے آگے نہ بڑھ پاتا۔ بات یہ ہے کہ حساب میں مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔

پہلے پہل تو مجھے سکول سے کافی نفرت رہی۔ لیکن رفتہ رفتہ میں اس کا عادی ہو گیا جب کبھی میں بہت زیادہ اکتا جاتا تو سکول سے ڈبکی لگا لیتا۔ اگلے روز جو مار پٹتی تو طبیعت بشاش ہو جاتی۔ نتیجتاً جوں جوں میں سکول جاتا رہا پٹنے کا خوف میرے دل سے مٹتا گیا۔ ادھر میں بیوہ کی عادات سے بھی واقف ہوتا جا رہا تھا اور اب وہ مجھے کوئی خاص تکلیف نہیں

دیتی تھی۔ گھر میں رہنا، اور چارپائی پر بستر بچھا کر سونا میرے لئے کافی مشکل تھا۔ لہٰذا جاڑوں سے پہلے کبھی کبھی میں رات کو گھر سے کھسک جاتا اور باہر جنگلوں میں جا کر سو رہتا۔ اس سے مجھے سکون ملتا۔ ویسے تو مجھے اپنی پرانی ڈگر ہی پسند تھی۔ لیکن اب میں نئے طور طریقوں کا بھی کچھ کچھ عادی سا ہو گیا تھا۔ بیوہ اپنی جگہ خوش تھی کہ میں آہستہ آہستہ راہِ راست پر آ رہا ہوں۔ اب وہ میرے طور اطوار سے کافی مطمئن تھی اور یہاں تک کہہ دیا کرتی تھی کہ اسے میری وجہ سے کہیں خفت نہیں اٹھانی پڑتی۔

ایک روز ناشتے کے وقت میں نے نمک دانی اُلٹ دی اور سارا نمک میز پر بکھر گیا۔ فوراً ہی میں نے چٹکی بھر نمک اٹھایا اور اُسے اپنے بائیں کندھے کے اوپر سے پھینکنے لگا تاکہ اس ٹونے سے آنے والی مصیبت ٹل جائے۔ لیکن مِس واٹسن نے مجھے بیچ میں ہی ٹوک دیا اور بولی:

"ہکل بری، اپنے ہاتھ کندھوں پر سے ہٹاؤ! تم ہمیشہ کوئی نہ کوئی اُلٹی سیدھی حرکت کرتے رہتے ہو۔" بیوہ نے میری طرف سے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس سے بھلا آفتیں ٹلتی ہیں کیا؟ خیر، ناشتے کے بعد میں گھر سے نکل پڑا۔ مجھے بہت تشویش ہو رہی تھی کہ نہ جانے کون سی آفت مجھے کہاں آ دبوچے۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ مصیبتیں تدبیر سے ٹل جاتی ہیں مگر یہ تو ویسی مصیبت نہیں تھی۔ لہٰذا میں نے پیش بندی کرنے کی کوشش ہی نہ کی اور یوں ہی اداس اداس ادھر ادھر پھرتا رہا۔ البتہ میں آنے والے خطرے سے پوری طرح چوکس تھا۔

میں سامنے والے باغ میں سے ہوتا ہوا اس جگہ جا پہنچا جہاں ایک اونچی سی باڑ کو پھلانگنے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ میں ان سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ اس روز کم از کم ایک انچ برف گری تھی۔ اس برف پر کسی کے قدموں کے نشان تھے جو یہ ظاہر کرتے تھے کہ کوئی شخص پتھر کی کان کی طرف سے ہوتا ہوا اس جگہ آیا اور پھر سیڑھیوں کے پاس تھوڑی دیر کھڑا رہ کر باڑ کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ تعجب یہ تھا کہ وہ شخص اتنی دیر وہاں کھڑا انتظار تو کرتا رہا لیکن باغ کے اندر نہ گھسا۔ اگرچہ یہ معمہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تاہم مجھے یقین تھا کہ اس میں کوئی نہ کوئی راز ضرور ہے۔ لہٰذا میں نے ارادہ کیا کہ ان قدموں کا پیچھا کروں۔ روانہ ہونے

سے پہلے میں نے ایک بار جھک کر ان نشانوں کو دیکھا۔ پہلے تو مجھے کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ لیکن جب میں نے دوبارہ غور سے دیکھا تو میرے ہوش گم ہو گئے۔ اس شخص نے اپنے بائیں بوٹ کے تلوے میں بڑے بڑے کیل گاڑ کر صلیب کا نشان بنایا ہوا تھا تا کہ شیطان کی زد سے محفوظ رہے۔

میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اور اگلے ہی لمحے سرپٹ بھاگتا ہوا پہاڑی سے نیچے اترنے لگا۔ گاہے گاہے میں مڑ کر پیچھے بھی دیکھ لیتا تھا۔ لیکن مجھے کوئی شخص نظر نہ آیا۔ جب میں حتی المقدور تیز بھاگتا ہوا جج ٹھیچر کے ہاں پہنچا تو وہ بولا: "کیوں بیٹے، تمہارا سانس کیوں پھولا ہوا ہے؟ کیا اپنا سود لینے آئے ہو؟"

"نہیں جی" میں نے کہا۔ "میرا کچھ سود نکلتا ہے کیا؟"

"ہاں، ہاں — ابھی کل رات ہی تو ششماہی قسط آئی ہے۔ رقم ڈیڑھ سو ڈالر سے کچھ اوپر ہی ہے۔ اور تمہارے لئے تو اتنی رقم قارون کے خزانے سے کیا کم ہو گی؟ لیکن سنو، اگر تم کہو تو میں اسے بھی ان چھ ہزار ڈالروں کے ساتھ ہی تمہارے نام میں جمع کروا دوں مجھے خدشہ ہے کہ اگر یہ رقم تمہیں دے دی گئی تو کہیں تم اسے اُڑا نہ دو۔"

"نہیں جی۔ میں اسے بالکل خرچ نہیں کرنا چاہتا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں اسے وصول ہی نہیں کرنا چاہتا۔ اسے تو کیا، ان چھ ہزار ڈالروں کو بھی نہیں — دراصل میں تو یہ چاہتا ہوں کہ آپ ہی اس رقم کو لے لیں۔ میں آپ کو یہ بطور تحفہ دینا چاہتا ہوں — ساری کی ساری رقم۔ وہ چھ ہزار ڈالر بھی اور یہ بھی —"

اس کا منہ فرطِ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

وہ بولا:

"کیوں؟ تم کہنا کیا چاہتے ہو بیٹے؟؟"

میں نے جواب دیا "بس آپ یہ رقم لے لیجئے اور مجھ سے کوئی سوال مت پوچھئے

لے لیجئے نا۔ یہ رقم ——"

وہ بولا: بھئی یہ معمہ میری سمجھ میں بالکل نہیں آرہا۔ کوئی خاص بات ہوئی ہے کیا؟"

"بس آپ یہ رقم لے لیجئے" میں نے کہا "اور مجھ سے مزید کچھ مت پوچھئے۔ کہیں ایسا نہ ہو مجھے آپ سے جھوٹ بولنا پڑے"

چند لمحے وہ اس صورتِ حال پر غور کرتا رہا۔ پھر بولا:

"اوہو! بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آگئی ہے۔ یعنی تمہارا مقصد تحفہ دینا نہیں بلکہ تم اپنی تمام پونجی کو میرے ہاتھ بیچ دینا چاہتے ہو۔ یہی نا؟"

اس کے بعد اس نے ایک کاغذ پر خدا جانے کیا لکھا اور پھر مجھے یہ تحریر پڑھ کر سناتے ہوئے بولا: "سنو، اس میں لکھا ہے کہ تم نے اپنی پونجی مجھے کسی سودے کے تحت دی ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ میں نے اسے خرید لیا ہے اور اس کی قیمت چکا دی ہے۔ یہ لو، ایک ڈالر۔ اب اس پر دستخط کردو"

میں نے دستخط کئے اور چلا آیا۔

مس واٹسن کے حبشی نوکر جم کے پاس بالوں کی بنی ہوئی ایک گیند تھی جو مٹھی جتنی بڑی ہوگی۔ جم کا کہنا تھا کہ اس نے یہ گیند ایک بیل کے چوتھے معدے میں سے نکالی تھی۔ اس کی مدد سے وہ عالم غیب کی باتیں بتایا کرتا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق اس گیند کے اندر کسی روح کا مسکن تھا اور اس روح کو ہر بات کا علم رہتا تھا۔ لہٰذا اس رات میں جم کے پاس گیا اور اسے اطلاع دی کہ میرا ابا واپس آگیا ہے۔ اور یہ کہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے برف پر اس کے قدموں کے نشان دیکھے ہیں۔ میرا مقصد اب یہ جاننا تھا کہ اس کے ارادے کیا ہیں؟ کیا وہ یہیں رہے گا؟ —— جم نے گیند نکالی اور اسے تکتے ہوئے کچھ بڑبڑانے لگا۔ اس کے بعد اس نے اپنا بازو اونچا اٹھا کر اسے نیچے فرش پر پھینک دیا۔ ٹھک کی آواز کے ساتھ یہ گیند لڑھک کر قریباً ایک انچ پرے چلی گئی۔ پھر جم نے اسے اٹھا لیا اور دوبارہ

اسی طرح پھینکا اور اس کے بعد تیسری بار پھر پھینکا۔

لیکن ہر بار گیند اسی طرح لڑھک کر ایک انچ پرے کھسک جاتی۔

تب جم نے دوزانو ہو کر اپنے کان اس کے ساتھ یوں لگا دیئے جیسے کچھ سن رہا ہو لیکن سب بے سود۔ تب جم نے مجھے بتایا کہ یہ گیند یوں نہیں بولے گی کیونکہ کبھی کبھی یہ ضد میں آجاتی ہے اور بغیر معاوضہ لئے لب نہیں کھولتی۔ میرے پاس چوتھائی ڈالر کا ایک بہت پرانا گھسا ہوا جعلی سکہ تھا۔ لیکن اس سے کیسے کام چلتا؟ چاندی کے ملمع کے نیچے اس کا پیتل صاف نظر آرہا تھا۔ اگر پیتل نظر نہ بھی آتا تو بھی یہ سکہ چل نہیں سکتا تھا۔ یہ اس قدر گھس چکا تھا کہ ہاتھ میں پکڑنے پر چکنا چکنا سا لگتا تھا۔ اس سے اس کے کھوٹے ہونے کا راز فوراً ظاہر ہو جاتا تھا۔ (میں نے سوچا یہ بہتر ہوگا کہ اس ڈالر کا، جو جج تھیچر نے مجھے دیا تھا، ذکر جم سے نہ کیا جائے) میں نے کہا: سکہ تو یہ بالکل کھوٹا ہے، تاہم ممکن ہے کہ یہ گیند اسے قبول کرے کیونکہ شاید اسے کھرے اور کھوٹے میں تمیز نہ ہو' —— جم نے سکہ لے کر پہلے تو اسے سونگھا؛ پھر اسے دانتوں تلے رکھا؛ اس کے بعد اس کو گھس کر دیکھا اور بولا: دیکھو کوشش کرتا ہوں۔ شائد گیند اسے کھرا ہی سمجھ لے' —— اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ اس سکے کو رات بھر کچے آلو کے اندر دبا رہنے دے گا۔ جس سے صبح تک ایک تو اس کا پیتل چھپ جائے گا اور دوسرے چکناہٹ دور ہو جائے گی۔ یہ تو خیر مجھے بھی علم تھا کہ کچے آلو کے اندر رہنے سے سکہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ لیکن اس وقت یہ بات میرے ذہن سے بالکل اتر گئی تھی۔

جم نے وہ سکہ زمین پر گیند کے نیچے رکھ دیا۔ اور اس کے ساتھ کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر بولا:۔

"اب ٹھیک ہے۔ اگر چاہو، تو اپنی قسمت کا سارا حال پوچھ لو" —— میں نے کہا۔ "اچھا شروع کرو" —— بس پھر کیا تھا، گیند جم کے ساتھ محو کلام ہو گئی اور جم یہ سب باتیں مجھے بتاتا گیا —— "تمہارے ابا نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

کبھی اسے یہ خیال آتا ہے کہ چلا جائے، اور کبھی یہ کہ یہیں رہے۔ لیکن تم کچھ فکر نہ کرو۔ اور جو کچھ وہ کرتا ہے اسے کرنے دو۔ اس وقت دو فرشتے اس کے اردگرد منڈلا رہے ہیں۔ ان میں سے ایک تو گورے رنگ اور نورانی چہرے والا ہے، اور دوسرا کالے رنگ کا ہے۔ گورے رنگ کا فرشتہ اسے نیکی کے راستے پر چلنے کی تلقین کرتا ہے لیکن کالے رنگ کا فرشتہ فوراً اس کے اثر کو ملیامیٹ کر دیتا ہے۔ وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کون سا فرشتہ بالآخر اس پر حاوی ہو گا۔ البتہ تمہیں کوئی خطرہ نہیں —— تمہاری زندگی میں کافی مصیبتیں آئیں گی اور مسرتیں بھی تمہیں چوٹیں بھی لگیں گی، اور بیماریاں بھی۔ لیکن ہر بار تم تندرست ہو جاؤ گے۔ تمہاری زندگی میں دو لڑکیاں آئیں گی جن میں سے ایک کا رنگ نکھرا ہوا ہے اور دوسری کا سانولا ایک امیر ہے، دوسری غریب۔ پہلے تم غریب لڑکی سے شادی کرو گے، لیکن کچھ عرصے بعد وہ امیر لڑکی تمہاری بیوی بن جائے گی۔ پانی سے حتی الامکان بچنے کی کوشش کرو۔ اور کبھی کوئی ایسا ویسا کام مت کرو۔ کیونکہ تمہاری قسمت کہتی ہے کہ تمہیں پھانسی پر لٹکنا پڑے گا۔

واپس آ کر میں نے موم بتی جلائی اور سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ وہاں پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں کہ ابا جان بہ نفس نفیس تشریف فرما ہیں۔

۵۔ بک کا ابا۔ ابا کی شفقت۔ سُدھار۔

ہوا یہ کہ جونہی میں دروازہ بند کر کے مڑا تو اپنے سامنے ابا حضور کو صحیح و سلامت پایا۔ میں ان سے ویسے ہی ہر وقت خائف رہتا تھا کیونکہ وہ میری خاصی مرمت کیا کرتے تھے اس وقت بھی مجھے سب سے پہلا احساس خوف ہی کا ہوا۔ لیکن ایک ہی منٹ بعد مجھے محسوس ہوا کہ یہ میری غلطی تھی۔ ایک منٹ سے میری مراد پہلے صدمے کے گزر جانے سے ہے۔ یہ

حقیقت ہے کہ اسے یوں اچانک وہاں پاکر میری گھگی بندھ گئی تھی۔ لیکن اس ابتدائی صدمے کے فوراً بعد ہی میں سنبھل گیا اور مجھے یوں لگا کہ اب مجھے اس سے مطلق خوف نہیں۔

میرے ابا کی عمر تقریباً پچاس برس کی تھی شکل وصورت بھی وہ پچاس ہی کا نظر آتا تھا۔ اس کے لیئے چکنے، اور الجھے ہوئے بال اس کے چہرے پر یوں پڑے رہتے تھے کہ ان کے پیچھے چمکتی ہوئی اس کی آنکھوں سے یہ ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ انگوروں کی بیل کے پیچھے سے جھانک رہا ہو۔ ویسے اس کے بال سیاہ تھے اور ان میں ایک بھی سفید نہیں ہوا تھا۔ اس کے گل مچھے بھی سیاہ اور گھونگریالے تھے۔ اس کے چہرے کا۔ (یعنی چہرے کے اس حصے کا جہاں بال نہیں تھے) کوئی رنگ نہ تھا۔ یہ سفید تھا لیکن عام سفید نہیں بلکہ ایسا سفید کہ اسے دیکھ کر آدمی کا جی متلانے لگے اور جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ یوں سمجھئے کہ اس کا رنگ کھمبیوں سا، یا مچھلی کے پیٹ ایسا سفید تھا جہاں تک اس کے لباس کا تعلق ہے، یہی کہہ دینا کافی ہوگا کہ اسے لباس کہنا ہی زیادتی ہوگی وہ تو محض چیتھڑے تھے۔ اس نے ایک ٹخنہ دوسرے گھٹنے پر رکھا ہوا تھا۔ اور اس کے پھٹے ہوئے بوٹ میں سے پیر کی دو انگلیاں باہر نکلی ہوئی تھیں جنہیں وہ گاہے گاہے مروڑ دیتا تھا۔ اس کا ہیٹ نیچے فرش پر رکھا تھا ــ یہ بوسیدہ سا کالے رنگ کا ہیٹ یوں پچکا ہوا تھا جیسے کوئی ڈھکنا اندر کی طرف بیٹھ جائے۔

میں وہیں کھڑا اس کی طرف تکتا رہا۔ اس کی کرسی ذرا پیچھے کی طرف جھکی ہوئی تھی اور وہ اس پر بیٹھا میری طرف تک رہا تھا۔ میں نے موم بتی رکھدی اور اس کے ساتھ ہی پہلی بار میرا دھیان کھڑکی کی طرف گیا، جو کھلی تھی ظاہر ہے کہ حضرت سیڑھی کی چھت پر سے تشریف لائے تھے۔ خاصی دیر تک مجھے ٹکٹکی باندھ کر تکتے رہنے کے بعد وہ بولا: "کپڑوں کو خوب کلف لگا رکھا ہے تم نے! بہت امیر سمجھنے لگ گئے ہو اپنے آپ کو ــ ہے نا؟"

"سمجھوں یا نہ سمجھوں، تمہیں کیا؟" میں نے جواب دیا: "دیکھو، میرے سامنے یوں

بک بک مت کرو۔“ وہ بولا ”میری غیر حاضری کے دوران میں تمہارے دماغ میں کچھ زیادہ ہی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں جلد ہی انہیں نکال پھینکوں گا۔ اور ہاں میں نے یہ بھی سنا ہے کہ تم نے پڑھنا لکھنا سیکھ لیا ہے۔ کیوں؟ اب تو تم اپنے آپ کو اپنے باپ سے بھی زیادہ عقلمند سمجھنے لگ گئے ہو گے؟ تمہارا باپ ان پڑھ ہے نا! لیکن ان غلط فہمیوں کو اپنے دماغ سے نکال ہی دو تو اچھا ہے —— ذرا یہ تو بتاؤ کہ یہ احمقانہ خیالات تمہارے دماغ میں بھرے کس نے تھے؟ کس نے تمہیں بتایا تھا کہ تم اپنے باپ سے آگے نکل سکتے ہو؟

”بیوہ نے۔ اسی نے مجھے یہ بات سمجھائی تھی“

”بیوہ نے؟ اچھا، اور بیوہ سے کس نے کہا تھا کہ خواہ مخواہ دوسروں کے معاملے میں اپنی ٹانگ اڑاتی پھرے۔“

”کسی نے بھی نہیں“

”خیر، کوئی بات نہیں۔ اسے بھی بتا دوں گا کہ دوسروں کے معاملات میں دخل کیسے دیا جاتا ہے۔ اور ہاں، کان کھول کر سن لو۔ آج سے یہ سکول کا دھندا چھوڑ دو۔ میں ان لوگوں سے بھی نمٹ لوں گا جو بیٹیوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ وہ اپنے باپ سے بہتر ہیں۔ آج کے بعد اگر میں نے تمہیں سکول کے آس پاس بھی کہیں دیکھ لیا تو یاد رکھنا وہ مرمت کروں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔ تمہاری ماں بھی تو ان پڑھ تھی۔ اسے بھی تو مرتے دم تک لکھنا پڑھنا نہیں آیا تھا۔ اور وہی کیا، ہمارے خاندان میں کسی کو بھی مرتے دم تک لکھنا پڑھنا نہیں آیا مجھے اب بھی نہیں آتا۔ لیکن ایک تم ہو کہ چار حرف پڑھ کر اتراتے پھرتے ہو۔ یہ بات مجھے بالکل پسند نہیں۔ سمجھے؟ اچھا ذرا ہمیں بھی تو بتاؤ کہ تم پڑھنے کیا ہو؟“

میں نے ایک کتاب اٹھالی اور جنرل واشنگٹن کا اور ان لڑائیوں کا حال پڑھ کر سنانے لگا جو اس نے لڑی تھیں۔ مجھے پڑھتے ہوئے ابھی آدھا منٹ ہی ہوا ہو گا کہ اس

نے زور سے دو منتر مار کر کتاب چھینی اور اسے کھڑکی سے باہر اچھال دیا۔ اس کے بعد بولا:
"تو وہ ٹھیک ہی کہتے تھے۔ تمہیں واقعی پڑھنا آ گیا ہے۔ پہلے تو مجھے شک تھا لیکن یہ بات ٹھیک ہی نکلی۔ اچھا، اب کان کھول کر سن لو۔ آج سے یہ سلسلہ ختم ہو جانا چاہیئے۔ میرے ساتھ چالاکی مت برتنا۔ میں تمہاری ہر حرکت پر نگاہ رکھوں گا اور اگر کبھی تم سکول آتے جاتے پکڑے گئے تو کھال ادھیڑ کے رکھ دوں گا۔ ابھی تو شروعات ہی ہیں۔ کیا پتہ کل کو تم بھگتی عبادت کا بکھیڑا بھی شروع کر لو۔ کیسا نالائق بیٹا پلے پڑ گیا ہے!"

اس کے بعد اس نے وہ تصویر اٹھا لی جس میں نیلے اور پیلے رنگوں میں چند گائیں بنی ہوئی تھیں اور ایک لڑکا ان کے پاس کھڑا تھا، اور بولا۔

"یہ کیا ہے؟"

"یہ مجھے انعام میں ملی تھی کیونکہ میں نے سبق اچھی طرح یاد کیا تھا۔" اس نے تصویر پھاڑ دی اور بولا: "میں تمہیں اس سے بہتر انعام دوں گا۔ میں تمہیں کوڑے ماروں گا۔"

ایک منٹ تک وہ یونہی بڑبڑاتا رہا، پھر بولا!

"کیا ٹھاٹھ بنا رکھے ہیں تم نے! چارپائی! بستر! آئینہ! فرش پر قالین!! کیا خوب!! اور ادھر یہ تمہارا باپ ہے کہ اسے چمڑے کے کارخانے میں سوروں کے ساتھ لیٹنا پڑتا ہے۔ کیسے ناخلف بیٹے ہو تم! اب کی بار جانے سے پہلے مجھے تمہاری یہ غلط فہمیاں دور کرنی ہی پڑیں گی۔ تمہاری بدماغی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں رہا۔ مجھے تو یہ بھی پتہ چلا ہے کہ آج کل جناب کے پاس پیسے بھی ہیں! ــــــ کیوں، ٹھیک ہے نا؟"

"خاک ٹھیک ہے! جھوٹ بکتے ہیں وہ۔"

"سنو، میرے ساتھ بات کرتے وقت زبان کو قابو میں رکھا کرو۔ میں کافی برداشت کر چکا ہوں اور اب برداشت کی حد ہو چکی ہے۔ لہذا اب مجھے غصہ مت دلانا۔ شہر میں آئے مجھے دو دن ہوئے ہیں اور اس دوران میں ہر جگہ تمہارا ہی چرچا سنتے سنتے کان پک گئے ہیں

ہر کوئی یہی کہتا ہے کہ تم بہت امیر ہو گئے ہو۔ یہی نہیں۔ یہ خبر تو دریا کے اس پار بھی مجھ تک پہنچ گئی تھی تبھی تو میں آیا ہوں۔ چلو اب جلدی سے وہ رقم میرے حوالے کر دو۔ مجھے اس کی ضرورت ہے۔"

"میرے پاس کوئی رقم نہیں۔"

"جھوٹ مت بولو۔ مجھے یہ بھی علم ہے کہ تمہاری رقم جج تھیچر کے پاس جمع ہے۔ چلو جاؤ۔ اس سے سب پیسہ لے آؤ۔ مجھے اس کی ضرورت ہے۔"

"کہہ جو دیا میرے پاس کوئی پیسہ نہیں۔ بے شک جا کر جج تھیچر سے پوچھ لو۔ وہ اس کی تصدیق کر دے گا۔"

"اس سے بھی پوچھ ہی لوں گا۔ اور پوچھ کیا' اگلوا کر چھوڑوں گا۔ مجھے پتہ لگنا چاہیئے کہ رقم کیا ہوئی؟ اچھا اس وقت تمہاری جیب میں کیا ہے؟ نکالو۔ مجھے چاہیئے۔"

"میرے پاس صرف ایک ڈالر ہے۔ اور مجھے خود اس کی ضرورت ہے۔" ——

"تمہاری ضرورت بعد میں دیکھی جائے گی۔ لاؤ، نکالو وہ ڈالر"

اس نے وہ ڈالر لے لیا اور اسے دانتوں تلے لے کر دیکھنے لگا کہ آیا کھرا بھی ہے یا نہیں۔ پھر بولا: "میں شہر جا رہا ہوں، وہسکی لینے —— سارا دن ایک گھونٹ خراب، حلق سے نیچے نہیں اُتری" —— شیڈ کی چھت پر اتر کر اس نے اپنا سر کھڑکی کے اندر کر کے مجھے ایک بار پھر میری بد دماغی پر اور اپنے باپ سے آگے نکل جانے کی کوشش کرنے پر لعن طعن کی۔ یہیں پر بس نہیں۔ جب میں نے سوچا کہ اب تو وہ چلا ہی گیا ہوگا' اس کا سر پھر کھڑکی اندر نمودار ہوا اور بولا: "اور ہاں، وہ سکول کی بات مت بھولنا۔ اگر میں نے تمہیں کبھی وہاں دیکھ لیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

اگلے دن وہ نشے میں مدہوش جج تھیچر کے ہاں جا پہنچا اور خوب شور مچا مچا کر اس رقم کا مطالبہ کیا۔ لیکن جب جج نے ایک نہ سُنی تو لگا دعویٰ دائر کرنے کی دھمکیاں دینے۔

اس کے بعد جج اور بیوہ نے عدالت میں درخواست دے دی کہ مجھے قانوناً میرے ابا سے الگ کر دیا جائے اور ان دونوں میں سے کسی ایک کو میرا سرپرست بنا دیا جائے۔ لیکن بد قسمتی سے یہ درخواست ایک ایسے جج کے سامنے پیش ہوئی جو نیا نیا آیا تھا اور میرے باپ کی کرتوتوں سے ناواقف تھا۔ اس نے فیصلہ دیا کہ عدالتوں کو ان معاملوں میں مداخلت کرنے اور خاندان کے افراد کو ایک دوسرے سے الگ کرنے سے حتی الامکان گریز کرنا چاہیئے لہٰذا اس نے کہا کہ وہ بیٹے کو باپ سے الگ کرنے کے حق میں نہیں ہے۔ بس پھر کیا تھا جج تھیچر اور بیوہ اپنا سا مُنہ لے کر رہ گئے۔

اس فیصلے سے میرا ابا پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اس نے مجھے الٹی میٹم دے دیا کہ اگر میں نے اس کے لیئے کچھ رقم فراہم نہ کی تو وہ کوڑے مار مار کر میرے جسم پر نیل ڈال دے گا۔ مرتا کیا نہ کرتا میں نے جج تھیچر سے تین ڈالر ادھار لے کر اس کے حوالے کیئے۔ وہ جا کر ان کی شراب پی آیا۔ اور سارا دن بکتا جھکتا اور گالیاں دیتا رہا۔ وہ ٹین کا ایک ڈبہ لے کر سارے شہر میں منادی کرتا رہا۔ آدھی رات کو پولیس نے اسے پکڑ کر حوالات میں بند کر دیا۔ اگلے دن وہ عدالت میں پیش ہوا اور اسے ایک ہفتے کی قید ہوئی۔ اس کے باوجود وہ نہایت خوش تھا کہنے لگا: "اب میں مطمئن ہوں۔ کم از کم یہ تو ثابت ہوا کہ مجھے اپنے بیٹے پر پورا پورا حق حاصل ہے۔ اب میں اس سے بھی نمٹ لوں گا۔"

جب وہ جیل سے رہا ہو کر آیا تو نئے جج کو یہ دھن سمائی کہ اس کا سدھار کرنا چاہیئے۔ لہٰذا وہ اسے اپنے گھر لے گیا اور اچھے کپڑے پہننے کو دیئے۔ اور اپنے خاندان کے ساتھ اسے ناشتہ، پھر دوپہر کا کھانا اور اس کے بعد رات کا کھانا کھلایا۔ بس یوں سمجھیئے کہ وہ اس کے ساتھ بہت شائستگی اور مہذبانہ طریقے سے پیش آیا۔ رات کے کھانے کے بعد جج نے اسے شراب بندی اور ایسی ہی دوسری نیک باتوں کی تلقین کی۔ اس کی باتیں سن کر ابا رونے لگا اور بولا۔ "مجھ سے بہت بڑی بھول ہوئی ہے۔ میں نے ساری زندگی فضول ہی گنوا دی۔ لیکن آج سے

میں نئی زندگی کا آغاز کروں گا اور ایسا نیک بن جاؤں گا کہ کسی کو میری وجہ سے خفت نہیں اٹھانی پڑے گی ـــــ" اس نے جج صاحب سے یہ بھی درخواست کی کہ وہ ان نیک ارادوں میں اس کی مدد کریں اور اس کی کوتاہیوں کو معاف کر دیں۔ یہ سن کر جج کی مسرت کا ٹھکانہ نہ رہا وہ بولا: "تمہارے نیک ارادوں کو دیکھ کر میرا جی چاہتا ہے کہ تمہیں گلے سے لگا لوں" ـــــ یہ کہہ کر وہ بھی رونے لگا اور اس کی بیوی بھی۔ تب میرا ابا بولا: "دراصل دنیا مجھے غلط ہی سمجھتی رہی ہے" ـــــ

"بجا فرمایا آپ نے" جج نے جواب دیا۔

"میرے جیسے گرے ہوئے آدمی کو اگر کسی شے کی ضرورت ہوتی ہے تو ہمدردی کی" جج نے پھر اس کی تائید کی اور اس کے بعد ان دونوں نے ایک بار پھر رونا شروع کر دیا۔ جب رات کافی گزر گئی تو میرے ابا نے اٹھ کر اپنا ہاتھ مصافحہ کے لئے پیش کرتے ہوئے کہا!

"حضرات و خواتین! میرا یہ ہاتھ مصافحے کے لئے حاضر ہے۔ اب تک یہ ہاتھ ایک کمینے شخص کے جسم کا حصہ تھا لیکن اب یہ اس شخص کے جسم کا حصہ ہے جو زندگی کا نیا باب شروع کرنے والا ہے، اور اب وہ مرتے دم تک پرانی ڈگر پر دوبارہ قدم نہ رکھے گا۔ میرے ان الفاظ کو یاد رکھئے اور اس ہاتھ کو پکڑ کر اس سے مصافحہ کیجئے۔ اب یہ پاک ہے۔ ڈریئے نہیں۔"

سب نے باری باری اس سے مصافحہ کیا جج کی بیوی نے تو اس کے ہاتھ کو چوم ہی لیا۔ اس کے بعد ابا جان نے ایک حلف نامے پر دستخط کئے۔ دستخط کرنا تو خیر اس کے بس کا نہ تھا۔ بس کاغذ پر ایک نشان سا بنا دیا۔ جج نے اس لمحے کو "مبارک ترین موقع" یا اسی قسم کا کوئی نام دیا۔ اس کارروائی کے بعد ابا جان کا بستر ایک خوبصورت سے کمرے میں لگا دیا گیا جو خالی پڑا تھا۔ لیکن رات کے وقت حضرت کو شراب کی جو پیاس محسوس ہوئی، تو کھڑکی کے راستے اُتر کر ڈیوڑھی کی چھت پر آ رہے۔ وہاں سے جناب ستون کے راستے نیچے اُتر آئے اور اپنا نیا کوٹ بیچ کر خوب جی بھر کر شراب پی اور اسی راستے سے واپس اپنے کمرے میں جا کر مزے سے

لیٹ گئے۔ تڑکے کے وقت وہ ایک بار اور پینے کی نیت سے نیچے اُترنے لگے۔ نشے میں تو تھے ہی، ڈیوڑھی کی چھت سے جو لڑھکے تو بازو کی ہڈی دو جگہ سے ٹوٹ گئی۔ صبح ہونے تک جناب وہیں بے ہوش پڑے رہے۔ جب انھیں اٹھایا گیا تو سردی سے قریب قریب جم چکے تھے۔ اس کے بعد لوگ ان کے کمرے پر پہنچے۔ لیکن وہاں یہ عالم تھا کہ پیر دھرنے کے لئے بھی سو طرح کے جتن کرنے پڑتے تھے۔

جج کو ابّا کی اس حرکت سے بڑا رنج ہوا۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ ان حضرت کا علاج بندوق کی گولی ہو تو ہو، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

۶۔ جج تھیچر سے مٹھ بھیڑ ــــ رفو چکر ہونے کا فیصلہ۔ سیاسی اقتصادیات ــ تلملاہٹ۔

خیر کچھ ہی دن بعد ابّا تندرست ہو گیا۔ تندرست ہوتے ہی سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ جج تھیچر کے خلاف رقم کی ادائیگی کے لئے دعویٰ دائر کر دیا۔ اس سے فارغ ہو کر اس نے میری خوب مرمت کی کیونکہ میں نے سکول جانا بند نہیں کیا تھا۔ دو ایک بار تو اس نے مجھے عین موقع پر ہی پکڑ لیا اور خوب پٹائی کی۔ تاہم میں برابر سکول جاتا رہا۔ اگر کبھی وہ مجھے دیکھ لیتا تو اول تو میں اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل جاتا۔ لیکن اگر وہ پیچھے پڑ ہی جاتا تو میں اتنا تیز بھاگتا کہ وہ مجھ تک پہنچ نہ پاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا اپنا جی بھی سکول سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ لیکن ابّا کو چڑانے کے لئے بدستور جاتا رہا۔ مقدمے کا فیصلہ ہوتے میں ہی نہ آ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کبھی پیشی ہوگی ہی نہیں۔ لہٰذا گاہے گاہے مجھے جج تھیچر سے دو تین ڈالر قرض

لے کر اباّ کی نذر کرنے پڑتے تاکہ مرمت سے بچا رہوں۔ اب یہ اس کا معمول بن گیا تھا کہ جب بھی رقم اس کے ہاتھ آتی، وہ فوراً نشے میں دُھت ہو جاتا؛ اور جب بھی وہ نشے میں ہوتا، تو سارے قصبے میں گالیاں بکتا پھرتا؛ اور جب بھی وہ گالیاں بکتا، اسے جیل میں ڈال دیا جاتا۔ لیکن یہ معمول اس کے لئے نیا نہیں تھا۔ بلکہ یہ تو اس کے مزاج کے عین مطابق تھا۔

اب وہ زیادہ تر بیوہ کے گھر کے اردگرد ہی منڈلاتا رہتا۔ بالآخر ایک دن تنگ آ کر بیوہ نے اسے الٹی میٹم دے دیا کہ اگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا، تو نتیجہ اچھا نہیں ہو گا۔ دھمکی سُن کر اس کا دہ پارہ چڑھا کہ خدا کی پناہ! وہ بولا: "میں احمق نہیں ہوں۔ دیکھ لوں گا کہ ہُک فِن پر میرا حق ہے یا کسی اور کا۔" بہار کے دنوں میں ایک روز وہ میری ٹوہ میں لگا رہا اور جونہی میں اس کے ہتھے چڑھا، مجھے ایک ناؤ میں بٹھا کر شہر سے تین میل دور دریا کے پار اوپر کی طرف لے گیا۔ یہ جگہ ریاست الی ناسیڈن میں تھی۔ یہاں جنگل ہی جنگل تھے۔ اور دور دور تک کوئی مکان نظر نہ آتا تھا۔ صرف ایک جھونپڑی درختوں کے ایک گنجان سے جھنڈ میں یوں چھپی ہوئی تھی کہ اگر آپ اس کی جائے وقوع سے واقف نہ ہوں، تو شاید اسے ڈھونڈنا آپ کے لئے ممکن ہی نہ ہو۔

ہر وقت وہ سائے کی طرح میرے ساتھ رہتا اور مجھے اتنا موقع ہی نہ دیتا کہ بھاگنے کی سوچ بھی سکوں۔ وہی بوسیدہ سی جھونپڑی ہمارا مسکن تھی۔ رات کو وہ دروازے کو تالا لگا کر چابی اپنے سر کے نیچے رکھ لیتا۔ اس کے پاس ایک بندوق بھی تھی جو اس نے ضرور کہیں سے چرائی ہو گی مچھلیاں پکڑ کر اور شکار کر کے ہم پیٹ بھرتے کبھی کبھی وہ مجھے جھونپڑی میں بند کر کے تین میل دور ایک دوکان پر چلا جاتا جو گھاٹ پر واقع تھی۔ وہاں سے وہ مچھلیوں اور شکار کے عوض شراب خرید لاتا۔ اسے پی کر وہ بدمست ہو جاتا اور میری خوب مرمت کرتا۔ ہوتے ہوتے بیوہ کو بھی میری جائے رہائش کا علم ہو گیا۔ اس نے مجھے رہائی دلانے کے لئے ایک آدمی بھیجا لیکن ابا کی بندوق دیکھ کر اسے قریب پھٹکنے کی جرأت نہ ہوئی، خیر چند ہی دنوں میں میں

اس جگہ سے مانوس ہو گیا۔ میرا مطلب ہے کہ پٹائی کے سوا مجھے یہاں کی ہر شے بھا گئی۔
زندگی کافی مزے سے گزر رہی تھی۔ نہ کام نہ کاج۔ سارا دن پڑے پڑے پائپ پیتے رہو اور مچھلیاں پکڑتے رہو۔ نہ کتاب، نہ پڑھائی، نہ لکھائی۔ اسی عالم میں دو مہینے گزر گئے۔ میرے کپڑے پھٹ کر چیتھڑے بن گئے تھے۔ اور میلے چکٹ ہو گئے تھے۔ اب میں حیران تھا کہ آخر بیوہ کے گھر میں میرا جی لگ کیسے گیا۔ یعنی جہاں ہر روز منہ ہاتھ دھونا پڑتا تھا، پلیٹ میں کھانا پڑتا تھا، بالوں کو کنگھی کر کے سنوارنا پڑتا تھا، وقت پر سونا، وقت پر جاگنا، سدا کتاب کے مطالعے میں مصروف رہنا —— اور اس پر طرہ یہ کہ ہر وقت مس واٹسن کی ڈانٹ ڈپٹ —— میں نے تہیہ کر لیا کہ اب لوٹ کر نہ جاؤں گا۔ بیوہ کے گھر میں رہ کر میں نے گالیاں تک بکنی چھوڑ دی تھیں کیونکہ اسے یہ بات پسند نہیں تھی۔ لیکن اب میں نے دوبارہ یہ عادت اختیار کر لی تھی کیونکہ ابا کو اس پر مطلق اعتراض نہ تھا۔ ان سب باتوں کے پیش نظر یہ ماننا ہی پڑے گا کہ یہاں زندگی واقعی مزے سے گزر رہی تھی۔

کچھ دنوں بعد ابا نے بات بات پر مجھے کوڑے مارنے شروع کر دیئے۔ میرا صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میرے جسم پر جگہ جگہ نیل پڑ گئے تھے۔ یہی نہیں۔ اب وہ اکثر باہر جانے لگا۔ جاتے وقت وہ مجھے کوٹھڑی میں بند کرنا نہ بھولتا! ایک بار وہ تین دن تک نہ لوٹا۔ اکیلے میں میرا جی گھبرانے لگا۔ میں نے سوچا شاید وہ کہیں دریا میں گر کر ڈوب گیا ہوگا، اور مجھے اس قید سے نکالنے کے لئے اب کوئی نہیں آئے گا۔ میرا جی بیٹھنے لگا۔ لہٰذا میں نے ارادہ کیا کہ جیسے بھی ہو، یہاں سے نکلنے کی کوئی تدبیر کرنی چاہیے۔ ویسے تو پہلے بھی کئی بار میں نے کوٹھڑی سے باہر نکلنے کی کوشش کی تھی، لیکن ناکام رہا تھا۔ اس جھونپڑی میں تو کوئی ایسی کھڑکی بھی نہیں تھی جس میں سے انسان تو کیا، کتا بھی باہر نکل سکے۔ دودکش بہت ہی تنگ تھا، اور اس کے راستے باہر آنا قطعاً ممکن نہ تھا۔ دروازے کے تختے برگد کی مضبوط لکڑی کے بنے تھے اور بہت موٹے تھے۔ ویسے بھی ابا اتنا محتاط تھا کہ باہر جاتے وقت چاقو یا اس قسم کی کوئی چیز جھونپڑی میں نہ چھوڑ جاتا۔

میں نے کم از کم سو بار جھونپڑی کی تلاشی لی ہوگی۔ مطلب یہ کہ جب بھی وہ مجھے اندر بند کر جاتا میں اس کا کونہ کونہ چھاننے لگتا۔ اس کے علاوہ پہاڑ سا وقت کاٹنے کا اور کوئی ذریعہ بھی نہیں تھا لیکن اس بار میری کوششیں بار آور ہوئیں۔ اور بالآخر مجھے مطلوبہ شے مل ہی گئی۔ یہ ایک پرانا زنگ آلود آرا تھا اور وہ بھی بغیر دستے کے۔ یہ آرا چھت کے تختوں اور کڑی کے درمیان رکھا تھا۔ خیر میں نے اس پر تیل لگایا اور اپنا کام شروع کر دیا۔ جھونپڑی کے ایک سرے پر میز کے پیچھے ایک بڑا سا تختہ تھا۔ اس تختے میں ایک بڑا سا کیل ٹھونک کر اس کے ساتھ گھوڑے کی پیٹھ پر ڈالنے والا ایک کمبل لٹکا دیا گیا تھا تاکہ دراڑوں میں سے آتی ہوئی ہوا کے جھونکے موم بتی کو بجھا نہ سکیں۔ میں اس میز کے نیچے گھس گیا اور کمبل اٹھا کر تختے کے نچلے حصے پر مصروف کار ہو گیا۔ میرا مقصد یہ تھا کہ کم از کم اتنا بڑا سوراخ ضرور بن جائے جس میں سے میں باہر نکل سکوں۔ کام کافی تھا اور اس میں خاصا وقت لگ گیا۔ بالآخر جب میں اپنے مقصد میں کامیاب ہونے ہی والا تھا، تو دور جنگل میں ابا کی بندوق چلنے کی آواز آئی۔ میں نے جھٹ اپنے کارنامے کے سارے نشان مٹا دیئے اور کمبل کو ٹھیک ٹھاک کر کے آرے کو چھپا دیا۔ کچھ ہی دیر بعد ابا جھونپڑی کے اندر داخل ہوا۔

آج اس کا پارہ بہت چڑھا ہوا تھا۔ بہ الفاظ دگر آج وہ اپنے اصلی رنگ میں تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ شہر گیا تھا اور یہ کہ سارا کام چوپٹ ہو گیا ہے۔ اس کے وکیل کو یقین تھا کہ اگر ایک بار مقدمہ شروع ہو جائے تو جیت انہی کی ہوگی لیکن مقدمے کی سماعت ہونے میں ہی نہ آتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جج تھیچر سماعت ملتوی کرانے کے ہتھکنڈوں سے بخوبی واقف تھا۔ اس کے علاوہ ابا نے یہ بھی سنا تھا کہ ایک اور مقدمہ دائر ہونے والا ہے تاکہ مجھے ابا کی تحویل سے نکال کر بیوہ کے سپرد کر دیا جائے۔ اب کی بار وہ لوگ خاصے پرامید تھے۔

—— یہ خبر سن کر میرے پیروں سے زمین نکل گئی۔ میں بیوہ کے پاس ہرگز واپس نہیں جانا چاہتا تھا جہاں جا کر پھر میرا دم گھٹنے لگے۔ یعنی جہاں جا کر ان لوگوں کی زبان

ہیں) مجھے مہذب بنانے کی کوششیں ازسرنو شروع کر دی جائیں۔ یہ ماجرا سُنا کر ابا گالیاں بکنے لگا۔ اس نے ہر چیز اور ہر شخص کو کوس ڈالا۔ اور جب کچھ کوسنے کو نہ رہا تو نئے سرے سے پھر انھیں کو ایک بار اور کوسنے لگا تاکہ کوئی شخص یا کوئی شے کوسنوں سے بچ نہ جائے۔ آخر میں اس نے ان سب کو ایک بڑی سی گالی دے ڈالی۔ اس گالی میں ان لوگوں کو بھی شامل کر لیا گیا تھا جن کے نام سے وہ واقف نہ تھا۔ (یعنی نام گنواتے وقت ان لوگوں کو وہ کیا نام؟ کیا نام؟ کہہ کر گالی دیتا رہا)۔

ادھر سے فارغ ہو کر وہ بولا: "دیکھ لوں گا اس بیوہ کو! کیسے حاصل کرتی ہے وہ تمہیں! میں چوکس رہوں گا اور اگر انہوں نے دھوکے سے تمہیں لے جانے کی کوشش کی، تو میں تمہیں کسی دوسری جگہ چھپا دوں گا۔ وہ جگہ یہاں سے چھ سات میل دور ہے اور اگر وہ ساری عمر بھی لگے رہیں تو بھی تمہیں ڈھونڈ نہ پائیں گے۔" یہ سن کر مجھے پھر تشویش ہوئی لیکن میں جلد ہی سنبھل گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے اس نئی تجویز کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے ہی میں یہاں سے رفوچکر ہو چکا ہوں گا۔

اس کے بعد ابا نے مجھے حکم دیا کہ میں کشتی سے وہ سامان اتار لاؤں جو وہ شہر سے لایا تھا۔ ایک پچاس پونڈ وزنی آٹے کی بوری؛ گوشت، کارتوس؛ شراب کا چار گیلن والا جگ؛ ایک پرانی سی بوسیدہ کتاب؛ دو اخبار جن سے دراڑیں بند کرنے کا کام لیا جاتا تھا؛ اور رسی۔ ایک پھیرا جھونپڑی میں پہنچا کر میں کشتی کے پیندے میں جا بیٹھا تاکہ ذرا آرام کر لوں بیٹھے بیٹھے میں نے اپنی سکیم پر نظر ثانی کی اور اس فیصلے پر پہنچا کہ جاتے وقت بندوق اور مچھلی پکڑنے کی چند ڈوریاں ساتھ لے جاؤں گا اور سیدھا جنگل میں جا چھپوں گا۔ میرا ارادہ تھا کہ کسی ایک جگہ کو مستقل جائے رہائش بنانے کی بجائے سارے ملک میں گھوموں گا۔ سفر رات کے وقت ہی کیا کروں گا۔ شکار کر کے یا مچھلیاں پکڑ کر پیٹ بھر لیا کروں گا۔ اور اس طرح یہاں سے اتنی دور چلا جاؤں گا کہ ابا اور بیوہ کسی کو میرا کچھ اتا پتا نہ مل سکے۔ ارادہ یہ تھا کہ اگر ابا آج رات شراب نوشی فرمائیں تو میں آج رات ہی باقی کا تختہ چیر کر بھاگ نکلوں گا۔

مجھے یقین تھا کہ حضرت آج ضرور شغل فرمائیں گے۔ خیر، میں اپنے ان منصوبوں میں اس قدر محو ہو گیا کہ مجھے وقت کا دھیان ہی نہ رہا۔ اور پھر جب ابّا نے زور سے چلّا کر مجھے ڈانٹ بتائی:
"کیوں، سو گئے ہو یا دریا میں گر پڑے ہو؟" ——— تو میں چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

جب میں جھونپڑی میں سامان پہنچا کر فارغ ہوا تو شام گہری ہو چکی تھی۔ میں کھانا بنانے میں لگ گیا اور ابا جان جام چڑھانے میں مصروف ہو گئے۔ جب نشہ چڑھنے لگا تو حضرت نے گالیاں بکنی شروع کر دیں۔ گزشتہ رات بھی وہ شراب پی کر شہر کی بدررو میں پڑا رہا تھا۔ اس وقت اس کی حالت واقعی دیکھنے کے قابل رہی ہو گی۔ اس کا سارا بدن یوں کیچڑ سے لت پت تھا کہ اسے دیکھ حضرت آدم کا دھوکا ہوتا ہو گا۔ ویسے بھی شراب پی کر سرکار کو کوسنا اس کا معمول تھا۔ اب کی بار وہ یوں گوہر افشاں ہوا:

"تو یہ ہے سرکار! ذرا اس کی کرتوتیں تو دیکھو! باپ سے بیٹا چھین لینا ان کا قانون ہے۔ جی ہاں، اس کا اپنا سگا بیٹا جسے پالنے پوسنے میں اس نے نہ جانے کتنی مصیبتیں جھیلی ہوں گی اور کتنی رقم خرچ کی ہو گی۔ اور اب جب کہ وہ بیٹا بڑا ہو کر اس قابل ہوا ہے کہ کام کاج کرے اور باپ کا ہاتھ بٹائے تو جناب قانون صاحب آدھمکتے ہیں۔ تف ہے ایسی سرکار پر! اسی پر بس نہیں۔ اسی قانون کا سہارا لے کر جج تھیچر مجھے میری پونجی دینے سے انکار کر رہا ہے۔ تو یہ ہیں اس قانون کی کارگزاریاں! یعنی وہ شخص جو چھ ہزار ڈالر سے بھی اوپر رقم کا مالک ہے، وہ تو اس ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی میں پڑا سڑ رہا ہے، اور ایسے چیتھڑے پہنے جو سور بھی پہننے سے انکار کر دے!! لعنت ہے ایسی سرکار پر جو انسان کو اس کے حقوق بھی نہ دلوا سکے۔ میرا جی تو چاہتا ہے کہ اس ملک کو ہی چھوڑ دیا جائے۔ جی ہاں، صاحب۔ میں نے ان سے کہہ بھی دیا ہے کہ میں اب اس ملک میں نہیں رہوں گا۔ یہ بات تو میں نے جج تھیچر کے منہ پر کہہ دی تھی۔ اور علی اعلان کہی تھی۔ سب کے سامنے کہی تھی، سب نے سنی تھی۔ میں نے کہا: "تانبے کے دو سکوں کے عوض میں اس ملک سے نکل جانے کو تیار ہوں اور پھر

اس نکمے ملک میں کبھی قدم نہ دھروں گا"۔ بالکل یہی کچھ کہا تھا میں نے! میں نے کہا: "یہ دیکھو میرا ہیٹ! ہیٹ کہتے ہیں آپ اسے؟ جب میں اسے پہنتا ہوں تو میرا سر تو اس میں سے باہر نکل آتا ہے اور ہیٹ ٹھوڑی کے نیچے ڈھلک جاتا ہے۔ ہیٹ کہیں گے آپ اسے؟ اسے ہیٹ کہنا ستم ظریفی ہے۔ جب میں اسے پہنتا ہوں، تو یوں لگتا ہے جیسے میرا سر دود کش میں پھنسا ہوا ہو۔ لیکن یہی ہیٹ میرے سر کی زینت ہے! میرے سر کی!! میں — جو شہر کے امیر ترین لوگوں میں سے ہوں۔ میرا مطلب ہے امیر لوگوں میں سے ہوتا اگر میرا حق مجھ کو مل جاتا۔"

جی ہاں، صاحب! توبہ ہے آپ کی سرکار۔ کیا خوب! ذرا غور فرمائیے وہاں ایک حبشی بھی کھڑا تھا جو اوہیو سے آیا تھا۔ یہ دوغلا تھا اور اس کا رنگ گوروں کی طرح سفید تھا اس کی قمیص اتنی سفید تھی کہ اس پر نظر نہ ٹکتی تھی اور اس کا ہیٹ وہاں کھڑے سب لوگوں کے ہیٹوں سے زیادہ چمکیلا تھا۔ سارے شہر میں کسی کے کپڑے اس جیسے نہیں تھے اس نے طلائی گھڑی اور سونے کی زنجیر پہن رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بید پکڑا تھا جس کی مٹھی چاندی کی تھی۔ سفید بالوں والا یہ بڈھا حبشی کچھ ایسے رعب سے کھڑا تھا جیسے وہ اس ریاست کا نواب ہو۔ اور سنو! وہ کسی کالج میں پروفیسر تھا، اور کئی زبانیں بول سکتا تھا، عالم فاضل تھا یہی نہیں۔ لوگ تو یہاں تک کہتے تھے کہ اپنے علاقے میں اسے ووٹ دینے کا حق بھی حاصل تھا۔ ہاں تو، یہ سن کر میں اُبل ہی تو پڑا۔ میں نے سوچا: "کیا بنے گا اس ملک کا!" اس دن الیکشن ہو رہے تھے اور اگر میں نشے میں نہ ہوتا تو ووٹ ڈال ہی آتا۔ لیکن جب مجھے پتہ لگا کہ اس ملک میں ایسی ریاست بھی ہے جہاں حبشی ووٹ دے سکتے ہیں تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ ووٹ نہیں دوں گا۔ یہی نہیں۔ میں نے قسم کھالی کہ آئندہ کبھی ووٹ نہیں ڈالوں گا۔ یہ قسم میں نے سب کے سامنے کھائی۔ مجھے کس کا ڈر ہے؟ بھاڑ میں جائے یہ ملک۔ میں زندگی بھر کبھی ووٹ نہیں ڈالوں گا۔ اور صاحب! ذرا اس حبشی کی ڈھٹائی

تو دیکھئے۔ اگر میں زبردستی اسے ایک طرف نہ دھکیل دیتا تو شاید وہ مجھے راستہ تک دینے کو تیار نہ ہوتا۔ میں نے ان لوگوں سے پوچھا: "تم اس حبشی کو نیلام کیوں نہیں کرتے؟ بولو جواب دو!" ــــ اور فوراً ان کا جواب تو سنئے۔ کہنے لگے: "جب تک اسے یہاں آئے چھ مہینے نہ ہو جائیں، اس کی نیلامی نہیں ہو سکتی۔ اور اسے آئے ابھی چھ مہینے نہیں ہوئے ــــ" دیکھ لیا! تو یہ ہے ہماری سرکار! یہ ہے اس کے کارناموں کا نمونہ۔ یہ کس قسم کی سرکار ہے کہ ایک حبشی یوں اس کی سرحدوں کے اندر دندناتا پھرے اور اس میں ہمت نہیں کہ چھ مہینے سے پیشتر اس کو فروخت کر ڈالے۔ تو جناب یہ ہے آپ کی سرکار! یہ اپنے آپ کو سرکار کہتی ہے۔ اور کہتی ہی نہیں، دعوے کرتی ہے کہ اسے سرکار تسلیم کیا جائے۔ بزعمِ خود سرکار بنی پھرتی ہے۔ لیکن پورے چھ مہینے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہے گی۔ اس میں اتنی طاقت بھی نہیں کہ اس آوارہ، چور، ذلیل، سفید پوش حبشی کو، جو یوں آزاد پھر رہا ہے، پکڑ کر ــــ"

بس اسی رَو میں بکتا جھکتا وہ اِدھر سے اُدھر، اور اُدھر سے اِدھر گھومتا رہا۔ اسے اتنا علم بھی نہیں تھا کہ اُس کی بوڑھی، کمزور ٹانگیں اس کو کہاں لئے جا رہی ہیں۔ آخر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ چلتے چلتے وہ اس ٹب میں جا گرا جس میں نمک لگا گوشت پڑا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں چھل گئیں۔ اس حادثے کے بعد اس کی زبان سے وہ گرما گرم لاوا بہا ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ حبشی اور سرکار اس کی گالیوں کا ہدف تو تھے ہی، اب ٹب بھی نوازا جانے لگا۔ خاصی دیر تک وہ کبھی اس ٹانگ کو اور کبھی اس ٹانگ کو پکڑ کر کمرے میں اچھلتا کودتا رہا اور پھر بائیں پیر کو گھما کر اس نے ٹب کو زور سے لات جو ماری تو وہ بچارا لڑھکتا لڑھکتا اُدھر لڑھک گیا۔ لیکن ابا کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ یہ وہی پاؤں تھا جس کی دو انگلیاں بوٹ سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ ٹھوکر مارتے ہی وہ خود یوں دہاڑنے لگا کہ سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اسی طرح چیختا چلاتا اور انگلیوں کو سہلاتا وہ وہیں دھول میں پٹخنیاں کھانے لگا۔ کیا گالیاں دی تھیں اُس نے! یہ گالیاں اس قدر معیاری تھیں کہ ان کے سامنے اگلی پچھلی سب

گالیاں ماند پڑ گئیں۔ جوانی میں اس نے کہیں سوبری ہاگن کا ذکر سنا تھا۔ بعد میں اس نے خود اس بات کی تائید کی تھی کہ اس کی اس روز کی کارکردگی ہاگن سے بھی دو قدم آگے تھی لیکن میرا خیال ہے کہ یہ محض اس کی بڑ تھی۔

شام کے کھانے سے فارغ ہو کر آیا نے شراب کا جگ اٹھایا اور بولا: "اس میں کافی شراب ہے۔ اتنی تو ضرور ہے کہ دو آدمی بدمست اور ایک بے خود ہو سکے۔" یہ اس کا تکیہ کلام تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ گھنٹے بھر میں حضرت نشے میں اوندھے ہو جائیں گے اور تب یا تو میں چابی کھسکا لوں گا یا تختہ چیر کر نکل جاؤں گا۔ خیر آنجناب پیتے رہے اور خوب پیتے رہے لیکن لعنت ہے میری قسمت پر! ادھر اُدھر کمبلوں پر ہی لوٹتا رہا۔ کم بخت کو نیند آ ہی نہیں رہی تھی۔ وہ بہت بےچین تھا۔ کبھی آہیں بھرنے لگتا، کبھی ہلے ہائے کرنے لگتا، کبھی ہچکیاں کھانے لگتا۔ میں کب تک انتظار کرتا؟ بالآخر نیند نے مجھ پر غلبہ پا لیا اور لاکھ کوششوں کے باوجود میں آنکھوں کو بند ہونے سے نہ روک سکا۔ دوسرے ہی لمحہ میں اتنی گہری نیند سو گیا کہ مجھے بتی گل کرنے تک کی سُدھ نہ رہی۔

نہ جانے میں کب تک سویا رہا۔ اچانک ایک چیخ سُن کر میں بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ یہ آیا ہی تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی وحشت چھائی ہوئی تھی۔ وہ شور مچاتا، چیختا چلاتا ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر اچھل کود رہا تھا، اور زور زور سے "سانپ"، "سانپ" چلا رہا تھا۔ وہ کہتا: "دیکھو، سانپ میری ٹانگوں پر اوپر سرک رہا ہے۔" اور پھر چیخ مار کر ایک جست لگاتا اور کہتا۔ "دیکھو، سانپ نے مجھے گال پر کاٹ کھایا ہے۔" میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ لیکن مجھے کوئی سانپ وانپ نظر نہ آیا۔ وہ بدستور جھونپڑی میں چکر کاٹتا اور چلا چلا کر کہتا رہا۔ "اس سانپ کو ہٹاؤ، خدا کے لئے اسے ہٹاؤ۔ یہ مجھے کاٹ رہا ہے۔" اس کی آنکھوں میں وہ وحشت تھی کہ خدا کی پناہ! جلدی وہ تھک کر گر گیا اور ہانپنے لگا۔ پھر وہ تیزی سے۔ ادھر ادھر لوٹنے لگا۔ جو چیز بھی راستے میں آتی، اسے ٹھوکر مار کر ادھر اُدھر پھینک دیتا۔ اور ہاتھوں سے کبھی ہوا پکڑنے کی کوشش کرتا، کبھی ہوا میں مکے مارتا اور ساتھ ساتھ چیختا جاتا کہ

شیطانوں نے اسے جکڑ رکھا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ تھک گیا اور بے حس و حرکت لیٹ کر کراہنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ آواز آنی بھی بند ہو گئی اور وہ بالکل بے سدھ ہو گیا۔ دور جنگل میں الوؤں اور بھیڑیوں کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن جھونپڑی میں خوفناک سناٹا طاری تھا۔ ابا اُدھر ایک کونے میں لیٹا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کہنی کے بل اٹھ کر سر کو ایک طرف موڑ کر غور سے کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر ہولے سے بولا:؛

"دگڑ، دگڑ، دگڑ —— یہ مُردوں کے قدموں کی آواز ہے۔ دگڑ، دگڑ، دگڑ —— وہ مجھے لینے آ رہے ہیں۔ لیکن میں ہرگز ان کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ لو، وہ آن پہنچے۔ مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔ اپنے ہاتھ دور رکھو۔ تمہارے ہاتھ سرد ہیں۔ چھوڑ دو مجھے۔ کیوں مجھ غریب کو تنگ کرتے ہو؟"

اس کے بعد وہ ہاتھ پاؤں کے بل فرش پر اِدھر اُدھر رینگنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ گڑگڑاتا بھی رہا "مجھے مت ستاؤ، مجھے مت ستاؤ" پھر اس نے ایک کمبل اپنے اردگرد لپیٹ لیا اور اسی طرح گڑگڑاتا ہوا صنوبر کی لکڑی سے بنی میز کے نیچے جا کر دُبکنے لگا۔ اس کے بعد اس نے رونا شروع کر دیا۔ اس کے رونے کی آواز کمبل میں سے مجھ تک پہنچ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ پھر میز کے نیچے سے باہر لڑھک آیا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں وحشتناک ہو رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف لپکا۔ اب یہ عالم تھا کہ میں آگے آگے دوڑ رہا تھا اور وہ ہاتھوں میں کمانی دار چاقو لئے میرا پیچھا کر رہا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر تک ہم یونہی جھونپڑی کے اندر چکر کاٹتے رہے۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا: "تم ہی میرے ملک الموت ہو۔ میں تمہارا کام تمام کر کے ہی دم لوں گا۔ تاکہ پھر تم کبھی میری روح قبض کرنے نہ آسکو۔" میں نے لاکھ کہا کہ میں موت کا فرشتہ نہیں ہیں تو بک ہوں۔ لیکن یہ سُن کر وہ ہنس دیتا۔ اس کی ہنسی کیا تھی، ایک خوفناک سی چیخ تھی۔ پھر وہ زور زور سے دہاڑتے اور گالیاں بکنے لگتا۔ اور اپنی رفتار اور بھی تیز کر دیتا۔ ایک بار تو یوں ہوا کہ میں نے دفعتاً مڑ کر اس کے بازو کے نیچے سے نکلنے کی کوشش جو کی تو اس نے لپک کر میرا کوٹ دونوں کندھوں کے درمیان سے پکڑ لیا۔ میں نے

سوچا کہ بس اب کھیل ختم ہوا۔ تاہم میں نے بجلی کی سی پھرتی سے کوٹ اتار دیا اور بال بال بچ گیا تھوڑی ہی دیر میں اس کا سانس پھول گیا اور وہ دروازے سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا اور بولا:

"ذرا ایک منٹ سستا لوں، پھر تمہارا کام تمام کرتا ہوں" اس نے چاقو اپنے نیچے رکھ لیا اور بولا:

"ذرا سو لوں تاکہ طاقت عود کر آئے۔ پھر نبٹوں گا تم سے!"

اس کے فوراً بعد وہ اونگھنے لگا۔ میں نے تھوڑی دیر انتظار کیا اور پھر کرسی پر چڑھ کر اس کرسی کی نشست ٹوٹی ہوئی تھی) اپنا آہستہ کئے بندوق اتاری۔ میں نے نالی میں گز ڈال کر دیکھا۔ بندوق بھری ہوئی تھی۔ اسے شلغموں سے بھرے پیپے پر ٹکا کر میں نے نالی کا منہ ابا کی طرف کر دیا اور اس کے پیچھے بیٹھ کر انتظار کرنے لگا کہ وہ ہلے اور میں بندوق داغوں۔ پتہ نہیں میں کب تک انتظار کرتا رہا۔ وقت تھا کہ گزرنے میں ہی نہ آتا تھا۔

۶۔ گھات میں بیٹھنا۔ کوٹھڑی میں قید۔ لاش کو دریا میں پھینکنا۔ سستانا

"اٹھو! —— یہ سب کیا ہے؟"

میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں اور ارد گرد کا جائزہ لینے لگا۔ مجھے کچھ یاد نہ آ رہا تھا کہ کہاں ہوں۔ دھوپ سر تک آ پہنچی تھی۔ ظاہر ہے میں خاصی گہری نیند سو رہا تھا۔ ابا میرے اوپر جھکا تھا اور بڑے غصے میں تھا۔ وہ کچھ بیمار سا لگتا تھا —— اس نے پوچھا:

"بندوق سے کیا کر رہے تھے؟"

اس کی اس بات سے میں نے اندازہ لگایا کہ حضرت اپنے کارناموں سے بالکل

بے خبر ہیں۔ لہٰذا میں نے جواب دیا:

"رات کوئی شخص جھونپڑی کے اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اسی کی تاک میں بیٹھا تھا۔"

"مجھے کیوں نہ جگایا؟"

"میں نے کوشش تو کی تھی مگر آپ جاگے ہی نہیں۔ آپ تو بالکل بے سدھ پڑے تھے۔"

"اچھا، اچھا ——— اب سارا دن یہیں کھڑے مغز چاٹتے رہو گے کیا؟ جاؤ جا کر دیکھو کہ ناشتے کے لئے کانٹوں میں کچھ مچھلیاں بھی پھنسی ہیں یا نہیں۔ میں ابھی ایک منٹ میں آتا ہوں"

یہ کہکر اس نے دروازہ کھول دیا اور میں باہر نکل کر دریا کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ دریا میں درختوں کی ٹہنیاں وغیرہ بہتی چلی آ رہی تھیں کہیں کہیں جال بھی تیرتی ہوئی نظر آ جاتی تھی۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ دریا کا پانی چڑھ رہا ہے۔ میں نے سوچا اگر میں اس وقت شہر میں ہوتا تو بڑا لطف رہتا۔ جون کا سیلاب میرے لئے ہمیشہ نیک فال ہوا کرتا تھا کیونکہ طغیانی میں بڑی بڑی شہتیریاں بہتی چلی آیا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی تو درجن درجن شہتیریوں کے گٹھے آ نکلتے تھے۔ ہمارا کام صرف اتنا ہوتا تھا کہ انہیں پکڑ کر لکڑی کی دکانوں پر یا آرا کشوں کے پاس بیچ آئیں۔

دریا کے کنارے چلتے چلتے کبھی تو میں پیچھے مڑ کر یہ دیکھتا کہ کہیں ابا تو نہیں آ رہا اور کبھی دریا کی طرف ایک نظر ڈال لیتا کہ شاید کوئی اچھی سی شے لڑھکتی ہوئی چلی آئے دفعتاً میری نگاہ ایک کشتی پر پڑی۔ کشتی بڑی خوبصورت تھی۔ یہ کوئی تیرہ چودہ فٹ لمبی تھی اور یوں شان سے بہتی چلی آ رہی تھی جیسے بطخ کلیلیں کر رہی ہو۔ کپڑے اتارے بغیر میں نے کنارے سے مینڈک کی طرح سر کے بل چھلانگ لگائی اور سیدھا کشتی کی طرف تیرنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ کشتی کے پیندے میں کوئی شخص لیٹا ہوگا۔ عموماً لوگ، دوسروں کو بیوقوف بنانے

کے لئے کشتی کے پیندے میں لیٹ جاتے ہیں اور کشتی کو دریا کے بہاؤ پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کشتی کو لاوارث سمجھ کر اسے پکڑے تو لیٹا ہوا آدمی فوراً اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس کا مذاق اڑانے لگتا ہے۔ لیکن اس کشتی میں کوئی شخص نہیں تھا۔ یہ تو واقعی لاوارث تھی۔ خیر میں اس میں جا چڑھا اور اسے کھے کر کنارے پر لے آیا۔ میرا خیال تھا کہ ابا اسے دیکھ کر خوش ہوگا کیونکہ کشتی کم از کم دس ڈالر میں تو ضرور بک جاتی۔ لیکن جب میں کنارے پر پہنچا تو ابا ابھی تک جھونپڑی میں سے ہی نہیں نکلا تھا۔ میں کشتی کو لے کر ایک ننھی سی خلیج کی طرف چل پڑا جو جھکی ہوئی بیلوں اور بید کی جھاڑیوں کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ راستے میں مجھے ایک نیا خیال سوجھا میں نے سوچا کہ کشتی کو چھپا ہی کیوں نہ دوں، تاکہ جب میں یہاں سے بھاگوں تو جنگلوں میں مارا مارا پھرنے کی بجائے اس میں سوار ہو کر کہیں پچاس ساٹھ میل دور چلا جاؤں اس سے کم از کم پیدل چلنے کی زحمت سے تو چھٹکارا نصیب ہوگا۔

یہ جگہ جھونپڑی کے قریب ہی تھی اور ہر دم مجھے یہی کھٹکا لگا رہا کہ ابا اب آیا کہ آیا۔ بالآخر میں اسے چھپا دینے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ ادھر سے فارغ ہو کر جب میں واپس آیا اور بید کی جھاڑیوں میں سے جھانک کر دیکھا تو ابا پگڈنڈی پر چلا آ رہا تھا ابھی ابھی اس نے ایک چھرے سے کسی پرندے کا شکار کیا تھا۔ میں مطمئن ہو گیا۔ ابا کو کسی بات کا علم نہیں ہوا تھا۔

جب وہ میرے قریب آیا تو میں زور زور سے ایک ڈوری کو کھینچنے لگا۔ لیکن جب اس نے یہ دیکھا کہ میں ابھی پہلے ہی کانٹے کی ڈوری کھینچ رہا ہوں تو اس نے بہت گالیاں دیں۔ میں نے بہانہ بنایا کہ کنارے پر چلتے چلتے میں دریا میں گر گیا تھا اسی لئے مجھے ڈوریاں کھینچنے میں دیر ہو گئی ہے۔ میرے بھیگے ہوئے کپڑوں کو دیکھ کر اس نے ویسے بھی جرح تو کرنی ہی تھی اب میں نے اس جرح کی پیش بندی بھی کر لی تھی۔ ہم نے پانچ مچھلیاں کانٹے سے نکالیں اور گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

تھکے ہوئے تو ہم تھے ہی۔ ناشتہ کر کے دونوں لیٹ گئے۔ میں سوچنے لگا کہ کوئی ایسا

بندوبست کیا جائے کہ جب میں بھاگ نکلوں تو نہ تو ابا میرا پیچھا کرے، نہ بیوہ۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوتا کہ مجھے تسلی رہتی کہ اب ان کے ہاتھے نہیں چڑھوں گا۔ ورنہ مجھے صرف اپنی قسمت پر ہی بھروسہ کر کے کسی ایسی جگہ کا رخ کرنا پڑتا۔ جہاں یہ لوگ میرا پیچھا نہ کر سکیں۔ لیکن اس میں کسی بھی وقت کوئی نہ کوئی رخنہ پڑ سکتا تھا۔ میں نے بہت سوچا لیکن مجھے کوئی راہ نظر نہ آئی

تھوڑی دیر بعد ابا پانی کا ایک اور لوٹا انڈیلنے کے لیئے اٹھا اور مجھے مخاطب کر کے بولا۔

"اگلی بار اگر کوئی شخص یوں ادھر آئے تو فوراً مجھے جگا دینا۔

سنا تم نے! جو کوئی بھی یہاں آیا تھا، اس کی نیت ٹھیک نہیں تھی۔ اگر میں جاگ رہا ہوتا تو اسے گولی مار دیتا۔ اگلی بار مجھے ضرور جگا دینا۔ سن رہے ہو؟"

وہ پھر سو گیا۔ اس کی باتوں سے فوراً ایک ترکیب میرے ذہن میں آگئی۔ میں نے سوچا "بس، اب ٹھیک ہے۔ اب کوئی شخص میرا پیچھا نہیں کرے گا۔"

بارہ بجے کے قریب ہم جھونپڑی سے نکلے اور دریا کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ پانی تیزی سے چڑھ رہا تھا۔ اور سیلاب میں بہت سی لکڑیاں بہتی چلی آ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد شہتیروں کا ایک گٹھا ادھر آ نکلا۔ ہم فوراً اپنی کشتی لے کر ادھر بڑھے اور اسے اس کے پیچھے باندھ کر کنارے پر لے آئے۔ اس کے بعد ہم نے کھانا کھایا۔ ابا کی جگہ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو سارا دن وہیں کنارے پر کھڑا انتظار کرتا رہتا کہ شاید کچھ اور لکڑیاں ہاتھ لگ جائیں۔ لیکن ابا کی بات ہی اور تھی۔ فی الحال یہ شہتیر یاں ہی اس کے لیئے کافی تھیں۔ اس نے اسی پر اکتفا کی اور انہیں بیچنے کے لیئے شہر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ لہذا کوئی ساڑھے تین بجے کے قریب مجھے جھونپڑی میں بند کر کے وہ ان شہتیروں کو کشتی کے پیچھے باندھ کر شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرا اندازہ تھا کہ رات بھر وہ شہر میں ہی رہے گا۔ میں نے تھوڑی دیر انتظار کیا تاکہ وہ کافی دور نکل جائے۔ اس کے بعد آرا لے کر ستون کو چیرنے میں مصروف ہو گیا۔ ابا ابھی دوسرے کنارے پر بھی نہ پہنچا ہو گا کہ میں اس سوراخ کے راستے باہر نکل آیا۔ دور پانی پر وہ اور اس کی کشتی ایک دھبے ایسے لگ رہے تھے

میں نے آٹے کی بوری اٹھائی اور اس طرف چل پڑا جہاں کشتی چھپی تھی بیلیں اور ٹہنیاں ادھر ادھر کرکے میں نے راستہ بنایا اور بوری کو کشتی کے اندر لے جا کر رکھ دیا۔ اس کے بعد میں گوشت اٹھا لایا اور پھر شراب کا جگ بھی۔ جھونپڑی کے اندر جتنی بھی کافی اور چینی تھی، میں نے وہ سب کی سب اٹھا لی میں نے تمام کارتوس بھی سمیٹ لئے اور اخبار، بالٹی، کشکول، گلاس، ٹین کا پیالہ آری، دونوں کمبل، کافی بنانے کی کیتلی، اور دیگچی بھی اٹھالی۔ غرضیکہ میں ہر وہ چیز اٹھا لایا۔ جو کسی بھی کام آسکتی تھی۔ اب جھونپڑی بالکل خالی تھی۔ میں چاہتا تھا کہیں سے کوئی کلہاڑا بھی ہاتھ لگ جائے لیکن جھونپڑی میں کلہاڑا تھا ہی نہیں۔ صرف ایک کلہاڑی تھی اور وہ باہر لکڑیاں توڑنے والی جگہ پر رکھی تھی۔ اور پھر مجھے اس سے ابھی ایک اور کام لینا تھا۔ لہذا میں نے اسے وہیں رہنے دیا اور بندوق اٹھا کر چل پڑا۔ میرا کام ختم ہو چکا تھا۔

سوراخ میں سے نکلنے کی وجہ سے اور اتنی ساری چیزوں کو اٹھا کر آنے جانے میں زمین پر میرے قدموں کے جا بجا نشان پڑ گئے تھے۔ جہاں تک باہر کے نشانوں کا تعلق تھا، میں نے مٹی ڈال کر انہیں مٹا دیا۔ اس طرح وہ برادہ بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا جو ستون چیرنے سے ادھر ادھر بکھر گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے ستون کو یوں جوڑ دیا کہ وہ ہو بہو پہلے کی طرح نظر آنے لگا۔ لیکن اس میں تدرے خم آگیا تھا اور اب یہ زمین سے ذرا سا اوپر اٹھ گیا تھا۔ میں نے دو پتھر اس کے نیچے رکھ دیئے اور ایک تیسرے پتھر کا سہارا دے کر اسے مضبوطی سے کھڑا کر دیا کہ کہیں گر نہ پڑے۔ اب اگر کوئی شخص چار پانچ فٹ کے فاصلے سے اسے دیکھتا تو اسے کچھ پتہ نہ چلتا سو لیسے بھی یہ جھونپڑی کا پچھواڑہ تھا اور کسی کے ادھر آنکلنے کا کوئی امکان نہ تھا۔

یہاں سے کشتی تک کے تمام راستے پر گھاس اُگی ہوئی تھی۔ لہذا میرے قدموں کے نشانوں کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس کے بعد میں ادھر اُدھر گھوم پھر کر صورتِ حال کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے کنارے پر کھڑے ہو کر دریا پر دور تک نگاہ دوڑائی۔ سب ٹھیک تھا۔

میں نے بندوق اٹھائی اور جنگل میں کچھ اور آگے نکل گیا اور پرندوں کا شکار کرنے لگا۔ اچانک میری نظر ایک آوارہ سؤر پر پڑی (یہ سؤر گیاہستان کے کھیتوں سے بھاگ کر ادھر آجاتے ہیں اور آوارہ بھٹکنے لگتے ہیں) میں نے اسے مار گرایا اور اٹھا کر اپنے کیمپ میں لے آیا۔

اس کے بعد میں نے کلہاڑا لے کر جھونپڑی کا دروازہ توڑ دیا۔ ضربیں مار مار کر میں نے دروازے کی حالت کافی خستہ کر دی۔ پھر میں نے سؤر کی لاش اٹھائی اور اسے میز کے قریب لٹا کر کلہاڑے سے اس کی شہ رگ کاٹ دی اور اسے وہیں زمین پر پڑا رہنے دیا تاکہ خون اچھی طرح بہہ جائے (زمین کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا ہے کیونکہ وہ واقعی زمین ہی تھی۔ اس جھونپڑی کو تو تختوں کا فرش بھی میسر نہیں تھا)۔ اس کے بعد میں نے ایک پرانی بوری لے کر اس میں اتنے سارے پتھر بھر لئے کہ وہ خاصی وزنی ہو گئی۔ اتنی وزنی کہ میں بمشکل ہی اسے گھسیٹ سکتا تھا۔

میں اس بوری کو سٹور کے پاس سے گھسیٹ کر دروازے تک لے آیا اور وہاں سے گھسیٹتا ہوا درختوں کے بیچ میں سے گزر کر دریا پر آپہنچا اور اسے پانی میں پھینک دیا۔ فوراً ہی یہ نظروں سے غائب ہو گئی۔ اس کارروائی کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ کوئی شے گھسیٹ کر دریا تک لائی گئی ہے میں سوچنے لگا کاش ٹام سائر یہاں ہوتا۔ اسے اس قسم کی باتوں میں خاصی دلچسپی تھی۔ لہٰذا وہ اس سکیم کو اور بھی بہتر رنگ دے سکتا تھا۔ ان کاموں میں کوئی بھی شخص ٹام سائر کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

آخر میں میں نے کلہاڑے کو خون میں اچھی طرح تر کر کے اپنے کچھ بال اکھیڑ کر اس کی پشت سے چپکا دیئے اور اسے ایک کونے میں ٹکا دیا۔ اس کے بعد میں نے سؤر کو کوٹ میں لپیٹ کر اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا تاکہ خون زمین پر نہ گرنے پائے۔ اسے اسی طرح اٹھائے اٹھائے میں جھونپڑی سے کافی دور نکل آیا۔ اور پھر اسے دریا میں پھینک دیا

اسی اثنا میں مجھے ایک اور بات یاد آگئی۔ واپس کشتی میں آکر میں نے آٹے کی بوری اور آرا اٹھایا اور جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔

آٹے کی بوری کو اس کی مخصوص جگہ پر رکھ کر میں نے آرے سے اس کے پیندے میں ایک چھید کر دیا۔ اس کام کے لئے مجھے آرے ہی سے کام لینا پڑا کیونکہ گھر میں کانٹا یا چھری قسم کی کوئی شے نہیں تھی۔ (ابا ر سوئی سے متعلق ہر کام کے لئے چاقو ہی استعمال کیا کرتا تھا)۔ پھر میں نے وہ بوری اٹھائی اور کوئی سو گز تک گھاس پر چلتا رہا پھر وہاں سے بید کی جھاڑیوں میں سے ہوتا ہوا اس جھیل کی سمت چل پڑا جو جھونپڑی کے مشرق میں واقع تھی یہ جھیل خاص گہری نہ تھی۔ اس کا پاٹ تقریباً پانچ میل کے قریب تھا۔ اور اس میں سر کنڈے ہی سر کنڈے اُگے ہوئے تھے۔ ہاں، البتہ مرغابیوں کے موسم میں یہاں بہت مرغابیاں ہوتی ہوں گی۔ جھیل کے اس طرف ایک نالہ سا نکلتا تھا جو کئی میل تک بہنے کے بعد خدا جانے کہاں گرتا تھا۔ مجھے اتنا یقین تھا کہ یہ نالہ کہیں بھی گرتا ہو، کم از کم دریا میں نہیں گرتا۔ سارا راستہ آٹا بوری میں سے نکل نکل کر زمین پر بکھرتا رہا اور جھونپڑی سے لیکر جھیل تک آٹے کی ایک پتلی سی لکیر بن گئی۔ راستے میں میں نے ابا کا چقماق پتھر بھی گرا دیا۔ لیکن کچھ اس صفائی سے کہ دیکھنے والے کو یہی پتہ لگے کہ پتھر قصداً نہیں گرایا گیا بلکہ سہواً گر گیا ہے۔ جھیل کے پاس پہنچ کر میں نے بوری کا سوراخ رسی سے باندھ دیا تاکہ اور آٹا ضائع نہ ہو اور بوری اور آری کو اٹھا کر کشتی میں لوٹ آیا۔

اب اندھیرا ہو چلا تھا۔ میں کشتی کو دریا میں دھکیل کر اس جگہ لے گیا جہاں بید کی گنجان جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور چاند کے نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔ کشتی کو بید کی ایک جھاڑی سے باندھ کر میں نے تھوڑی سی روٹی کھائی اور کشتی میں لیٹ گیا اور پائپ پیتے پیتے مستقبل کے بارے میں منصوبے بنانے لگا۔ میں نے سوچا "بوری والی لکیر دیکھ کر وہ یہی سمجھیں کہ کوئی شخص مجھے گھسیٹ کر دریا میں پھینک آیا ہے۔ وہ پہلے تو دریا میں جال ڈال ڈال کر میری لاش کو

ڈھونڈیں گے، پھر آٹے کی لکیر کا سراغ پاکر جھیل پر جا پہنچیں گے۔ اور اس نالے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ان ڈاکوؤں کا پتہ لگانے کی کوشش کریں گے جو ان کے خیال میں مجھے قتل کر کے دریا میں پھینک گئے ہوں گے۔ دریا کے اندر انہیں صرف میری لاش کی ہی جستجو ہو گی جو انہیں ملے گی نہیں بالآخر تھک ہار کر وہ میرا خیال چھوڑ دیں گے۔ اس کے بعد میری چھٹی ہی چھٹی ہے۔ جہاں جا ہوں جاؤں، جہاں چاہوں رہوں۔" میں نے فیصلہ کیا کہ فی الحال جیکسن جزیرے پر ہی رہائش اختیار کی جائے۔ اس کے دو فائدے تھے۔ ایک تو یہ کہ میں اس کے چپے چپے سے واقف تھا۔ اور دوسرا یہ کہ کسی غیر شخص کے ادھر آنکلنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ میں نے سوچا کہ رات کو کشتی میں بیٹھ کر شہر چلا جایا کروں گا اور چپکے چپکے ادھر اُدھر گھوم کر ضرورت کی چیزیں لے آیا کروں گا۔ جیکسن جزیرہ ہی مناسب رہے گا۔

چونکہ میں بہت تھک گیا تھا، مجھے جلد ہی نیند آگئی۔ جب میں جاگا تو ایک منٹ تک تو مجھے پتہ ہی نہ لگا کہ میں کہاں ہوں۔ کچھ خوفزدہ سا ہو کر میں اپنے گردوپیش کا جائزہ لینے لگا۔ تب جیسے اچانک مجھے کچھ یاد آگیا۔ دریا کا پاٹ میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ چاندنی اتنی نکھری ہوئی تھی کہ میں ان ملگجی شہتیریوں کو بھی گن سکتا تھا جو بغیر آواز کئے کنارے سے سینکڑوں گز پرے بہتی چلی جا رہی تھیں۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ رات کافی بیت چکی ہے یا حول بس رات کے پچھلے پہر کی خوشبو سی ہوئی تھی۔ میں اس کیفیت کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا لیکن شاید آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔

دو ایک جمائیاں اور انگڑائی لے کر میں نے کشتی کھولی اور روانہ ہونے لگا۔ دفعتاً مجھے دور پانی پر سے کوئی آواز آتی سنائی دی۔ میں ہمہ تن گوش ہو گیا لیکن جلد ہی یہ راز میری سمجھ میں آگیا۔ رات کے سناٹے میں جب کوئی شخص چپّو چلا رہا ہو تو اس کی آواز کافی دور تک سنائی دیتی ہے۔ میں نے بید کی جھاڑیوں کی اوٹ سے جھانکا۔ میرا اندازہ درست

نکلا۔ دور ایک کشتی میری طرف چلی آ رہی تھی۔ البتہ اندھیرے میں مجھے یہ نظر نہ آسکا کہ اس میں کتنی سواریاں بیٹھی ہیں۔ جب کشتی میرے نزدیک پہنچی تو میں نے دیکھا کہ اس میں صرف ایک ہی شخص سوار ہے۔ میں نے سوچا شاید آبا ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے یوں جلد لوٹ آنے کی مجھے ہرگز توقع نہ تھی۔ دھارے کے ساتھ ساتھ بہتی ہوئی یہ کشتی میرے نچلے ہاتھ پر آ گئی اور پھر قدرے ساکن پانی میں تیرتی ہوئی ساحل کی طرف مڑ گئی۔ کشتی میرے اتنے نزدیک سے گزری کہ اگر میں چاہتا تو ہاتھ بڑھا کر اس میں بیٹھے آدمی کو چھو لیتا۔ یہ ابا ہی تھا اور جس چابکدستی سے وہ چپو چلا رہا تھا اس سے ظاہر تھا کہ وہ نشے میں نہیں۔

ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر میں کشتی کو بہاؤ کے ساتھ ساتھ خاموشی سے مگر تیز تیز چلانے لگا۔ کنارے پر اُگے درختوں کے سایوں کا حتی الامکان فائدہ اٹھاتا میں دو ڈھائی میل نکل آیا اور پھر کنارا چھوڑ کر دریا میں کوئی چوتھائی میل دور چلا گیا۔ بات یہ تھی کہ اب گھاٹ آنے ہی والا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی مجھے دیکھ لے کشتی کو بہتی ہوئی شہتیریوں کے درمیان لا کر میں خود بیندے میں لیٹ گیا کشتی بہتی رہی اور میں آرام سے لیٹا پائپ پیتا رہا اور اوپر آسمان کو تکتا رہا۔ مطلع بالکل صاف تھا۔ اس رات پہلی بار مجھے یہ احساس ہوا کہ اگر آپ چاندنی رات میں اوپر کی طرف منہ کئے لیٹے ہوں تو آسمان اور بھی زیادہ گہرا دکھائی دیتا ہے۔ اور یہ بھی کہ ایسی رات میں پانی پر پھسلتی ہوئی آواز بہت دور تک سنائی دیتی ہے۔ میرے کانوں میں گھاٹ پر کھڑے ہوئے لوگوں کی آوازیں آتی رہیں یہی نہیں مجھے ان کی باتیں صاف سمجھ میں آ رہی تھیں۔ ایک شخص کہہ رہا تھا کہ اب دن لمبے اور راتیں چھوٹی ہونے لگی ہیں۔ دوسرا بولا: "مگر آج کی رات تو چھوٹی نہیں"۔۔۔ اور پھر وہ دونوں ہنسنے لگے۔ تب اس نے یہی بات ایک بار پھر دہرائی اور وہ ایک بار پھر ہنسے۔ اس کے بعد انہوں نے ایک تیسرے آدمی کو جگایا اور اسے یہ بات سنا کر ایک بار پھر ہنسنے لگے۔ لیکن وہ تیسرا آدمی ان کی ہنسی میں شریک نہ ہوا بلکہ ایک موٹی سی گالی دے کر

بولا! مجھے سونے دو" ـــــ پھر وہ پہلا شخص کہنے لگا! "میں یہ بات اپنی بیوی کو سناؤں گا۔ اسے سُن کر وہ بہت محظوظ ہو گی۔ ہاں البتہ یہ بات ویسی مزیدار نہیں جو کبھی کسی زمانے میں میں اسے سنایا کرتا تھا" ـــــ اس کے بعد ایک اور آواز آئی کوئی کہہ رہا تھا: "تین بجنے والے ہیں۔ اب سے ایک ہفتہ بعد اس وقت اجالا ہوا کرے گا" پھر یہ آوازیں رفتہ رفتہ دور ہوتی گئیں۔ حتیٰ کہ مجھے آواز تو سنائی دیتی لیکن الفاظ سمجھ میں نہ آتے۔ ہاں کبھی کبھی کوئی قہقہہ بھی سنائی دے جاتا مگر وہ بھی اتنا دھیما جیسے بہت دور سے آرہا ہو۔

جب کشتی گھاٹ سے کافی آگے نکل آئی تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میری نظروں کے سامنے جیکسن جزیرہ پھیلا ہوا تھا۔ مجھ میں اور اس جزیرے میں اب صرف دو ڈھائی میل کا فاصلہ تھا۔ یہ جزیرہ دریا کے عین درمیان میں واقع تھا۔ اس پر درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ اُگے ہوئے تھے دور سے یہ جزیرہ اتنا بڑا اور ملگجا اور ٹھوس دکھائی دیتا تھا جیسے کوئی جہاز بتیاں بجھا کر ساکت ہو گیا ہو۔ وہ ریتلی پٹڑی جو اس کے سرے پر ہوا کرتی تھی، اب کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ اب اس کے اوپر پانی ہی پانی تھا۔

مجھے وہاں پہنچتے دیر نہ لگی۔ دھارے کا بہاؤ اتنا تیز تھا کہ میں پلک جھپکتے پٹڑی کو پار کر گیا۔ آگے جا کر پانی بالکل ساکن تھا۔ میں نے کشتی اس طرف موڑی جدھر دریا کے اس پار الی نائیس ریاست کا علاقہ تھا، اور سیدھا اس کٹاؤ کا رخ کیا جس سے میں بخوبی واقف تھا۔ وہاں پہنچنے کے لئے مجھے بید کی ٹہنیوں کے بیچ میں سے راستہ بنانا پڑا۔ بالآخر جب میں نے لنگر ڈالا تو میں ایک ایسی جگہ پہنچ چکا تھا جہاں باہر سے دیکھنے والے کو یہ گمان تک نہ ہو سکتا تھا کہ یہاں کوئی کشتی چھپی ہوئی ہے۔

میں کشتی سے اتر آیا اور جزیرے کے سرے پر پڑی ہوئی ایک شہتیری پر بیٹھ کر دریا کے چوڑے پاٹ کو تکنے لگا جس میں ملگجی لکڑیاں بہتی چلی آرہی تھیں۔ سامنے اُس کنارے پر کوئی تین میل پرے شہر تھا جہاں تین چار روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ ادھر کوئی ایک

میل پرے شہتیریوں کا بنا ایک بہت بڑا بیڑا بہتا چلا آرہا تھا جس کے وسط میں لالٹین رکھی تھی۔ میں اسے اپنی طرف آتے دیکھتا رہا اور جب یہ عین میرے مقابل آپہنچا تو میں نے ایک آدمی کی آواز سنی: ''تیز تیز چپو چلاؤ، کشتی کو پہلو کے رُخ کرلو''۔۔۔ یہ الفاظ اتنے صاف تھے جیسے بولنے والا میرے پاس ہی بیٹھا ہو۔

اس اثنا میں آسمان پر پو پھٹنے لگی تھی۔ میں واپس درختوں کے جھنڈ میں لوٹ آیا تاکہ ناشتے سے پہلے ذرا سستالوں۔

۸۔ جنگل میں نیند ۔۔ مُردے کی تلاش ۔۔ جزیرے کی چھان بین۔ جم سے مُلاقات ۔۔ جم کا فرار ۔۔ بدشگونیاں ۔۔ بالم

جب میں سو کر اُٹھا تو دھوپ سر تک آپہنچی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وقت آٹھ سے اوپر ہی ہوگا۔ میں وہیں سائے میں گھاس پر لیٹ گیا اور نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ اب نہ مجھے تھکن کا احساس تھا، اور نہ کوئی فکر۔ میں اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ درختوں کی گھنی ٹہنیوں میں دو ایک شگاف تھے جن میں سے گاہے گاہے سورج نظر آجاتا تھا۔ ہر طرف درخت ہی درخت تھے اور درختوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا اس جنگل میں ہر وقت جھٹپٹے کا سا عالم رہتا تھا۔ کبھی کبھی پتّوں میں سے چھن چھن کر آتی ہوئی دھوپ سے زمین پر چنگیری سی شکلیں بن جاتی تھیں۔ اور جب کبھی یہ چنگیری شکلیں آپس میں گڈمڈ ہو جاتیں تو میں سمجھ لیتا کہ ہوا چل رہی ہو گی۔ ایک پیڑ کی شاخ پر دو ایک گلہریاں بیٹھی نہایت دوستانہ انداز سے میرا منہ چڑا رہی تھیں۔

میری ہڈیوں میں تو جیسے پانی پڑ گیا تھا۔ اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ اٹھ کر کھانا ہی بچاؤں
میں پھر اونگھنے لگا۔ اچانک مجھے ایسا لگا جیسے کہیں دھماکا ہوا ہو۔ یہ آواز دریا کے
منبع کی طرف سے آئی تھی۔ میں کہنیوں کے بل ذرا سا اُٹھ کر غور سے سننے لگا۔ فوراً ہی بعد
ایک دھماکہ اور ہوا۔ میں اچھل پڑا اور پتوں کی اوٹ میں سے جھانکنے لگا۔ دور دریا کے
منبع کی طرف، گھاٹ کے قریب پانی پر دھواں سا اٹھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ایک
کشتی اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ کشتی میں بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ
یہ آواز کیا تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک دھماکہ اور ہوا اور کشتی کے پہلو میں سے سفید سفید
سا دھواں اٹھنے لگا۔ یہ لوگ پانی کے اندر گولے پھینک پھینک کر میری لاش کو اوپر
سطح پر لانے کی کوشش کر رہے تھے۔

مجھے اب خاصی بھوک لگی تھی لیکن اس وقت آگ جلانا خواہ مخواہ خطرہ مول
لینا تھا۔ اگر اُن لوگوں نے دھواں اٹھتا دیکھ لیا تو؟ ——— لہٰذا میں وہیں بیٹھا دھماکے
سنتا رہا اور دھواں دیکھتا رہا۔ اُس جگہ دریا کا پاٹ کوئی ایک میل چوڑا تھا۔ اور گرمیوں کے
دنوں میں صبح کے وقت تو یہاں کا منظر نہایت سہانا ہوا کرتا تھا۔ انہیں اس طرح اپنی
لاش کو ڈھونڈتے دیکھ کر میں بہت محظوظ ہوا۔ تکلیف صرف یہ تھی کہ میرے پیٹ میں
چوہے دوڑ رہے تھے۔ دفعتاً مجھے یاد آیا کہ لاشوں کو ڈھونڈنے کا ایک طریقہ یہ بھی تو ہے کہ
روٹی میں پارہ بھر کر اسے دریا میں بہا دیتے ہیں اور یہ روٹی ڈوبے ہوئے شخص کے پاس
جا کر رک جاتی ہے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا: "اب میں تاک میں رہوں گا۔ اور جونہی
ان لوگوں نے روٹی دریا میں بہائی میں بھی انہیں اپنا کرتب دکھاؤں گا۔" لہٰذا میں اس
ساحل کی طرف چلا گیا جو الی نائس ریاست کے بالمقابل تھا اور انتظار کرنے لگا کہ دیکھے
قسمت یاوری کرتی ہے یا نہیں۔ میری توقعات بے بنیاد نہ تھیں۔ ایک بہت بڑی روٹی بہتی
ہوئی میری طرف آنکلی۔ میں نے ایک لمبی سی چھڑی سے اسے پکڑنے کی کوشش کی اور

اسے پکڑ لیا ہی ہوتا لیکن میرا پاؤں پھسل گیا اور روٹی آگے نکل گئی۔ میں اس جگہ بیٹھا تھا جہاں دھارے کا رُخ ساحل کی طرف تھا، کیونکہ مجھے پتہ تھا کہ یہی جگہ موزوں رہے گی۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور روٹی بہتی ہوئی آئی اور اس بار میں اسے پکڑ لینے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے اس کے اُس سوراخ کا ڈھکنا ہٹا دیا جس میں پارہ رکھا تھا اور روٹی کو زور زور سے جھٹکے دیکر پارے کو باہر پھینک دیا۔ واہ! کیا لذیذ روٹی تھی! یہ گھر کی روٹی نہ تھی۔ جو گھٹیا آٹے کی بنتی ہے، بلکہ نانبائی کی دُکان سے خریدی گئی معلوم ہوتی تھی۔

میں نے درختوں کے جھنڈ میں ایک عمدہ سی جگہ ڈھونڈلی اور ایک کٹے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھ کر روٹی چبانے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ میں کشتی کی حرکات وسکنات کا بھی مشاہدہ کرتا رہا۔ اب میں مطمئن تھا۔ مجھے ایک خیال سوجھا۔ میں نے سوچا: "دیکھو نا، بیوہ نے، یا پادری نے، یا کسی اور شخص نے دعا کی ہو گی کہ یہ روٹی مجھ تک پہنچ جائے۔ اور دیکھئے صاحب! روٹی بالآخر مجھ تک پہنچ ہی گئی۔ لہٰذا اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ دعا میں اثر ضرور ہوتا ہے۔ یعنی دعا سنی تو جاتی ہے بشرطیکہ یہ دعا بیوہ، یا پادری جیسا کوئی شخص مانگے۔ لیکن اگر دعا مانگنے والا شخص میرے جیسا ہو، تو اس میں کوئی اثر نہیں ہوتا لہٰذا یہ نتیجہ نکلا کہ صرف اچھے آدمیوں کی دعا ہی قبول ہوتی ہے۔"

میں نے پائپ سلگا لیا۔ بہت دیر تک میں پائپ پیتا رہا اور کشتی کو دیکھتا رہا۔ کشتی دھارے کے رُخ بہہ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ جب یہ کشتی قریب آئے گی تو میں یہ دیکھنے کی کوشش کروں گا کہ اس میں کون کون بیٹھا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس دھارے میں بہتی ہوئی روٹی اتنی قریب آ گئی تھی تو کشتی بھی قریب ہی سے ہو کر گزرے گی۔ خیر جب کشتی نزدیک آ گئی تو میں نے پائپ بجھا دیا اور پھر اسی جگہ چلا گیا جہاں بیٹھ کر میں نے روٹی پکڑی تھی۔ میں ایک کٹے ہوئے درخت کے پیچھے لیٹ گیا اور اس کی شاخوں میں سے جھانکنے لگا جہاں سے سامنے کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کشتی آپہنچی کشتی ساحل کے اتنی قریب تھی کہ اگر وہ لوگ چاہتے تو ایک تختہ رکھ کر خشکی پر آسکتے تھے۔ میرے جاننے والوں میں تقریباً سب لوگ اس میں سوار تھے، یعنی ابّا، آنٹ تھیچر، بیکی تھیچر، جو ہارپر، اور ٹام سایر، اور اس کی بوڑھی خالہ پولی، اور سڈ، اور میری اور دوسرے کئی لوگ وہ سب اسی قتل کا چرچا کر رہے تھے۔ لیکن کپتان نے ان کو ٹوک دیا اور کہا: "اب ذرا غور سے دیکھتے رہو۔ اس جگہ دھارا ساحل کے بالکل قریب سے ہو کر جاتا ہے ہو سکتا ہے کسی لہر نے لاش کو کنارے پر لا پھینکا ہو۔ اور اب وہ لاش کہیں ٹہنیوں اور پتوں میں اٹکی ہوئی ہو۔ کم از کم مجھے تو یہی امید ہے۔"

لیکن مجھے اس کی کوئی امید نہیں تھی۔ تاہم وہ سب لوگ کشتی کے جنگلے پر جھک گئے وہ میرے اس قدر نزدیک تھے کہ اگر وہ ہاتھ بڑھالیں تو مجھے چھو لیں۔ وہ خاموش کھڑے نہایت غور سے ادھر ادھر تکتے رہے۔ مجھے وہ صاف نظر آرہے تھے لیکن، خدا کا شکر ہے کہ میں انہیں نظر نہیں آیا۔ پھر کپتان نے حکم دیا: "پرے ہٹ جاؤ" اور اس کے ساتھ ہی توپ داغی گئی۔ دھماکہ اتنا زبردست تھا کہ مجھے یوں لگا جیسے میرے کانوں کے پردے پھٹ گئے ہوں۔ اور اس میں سے جو دھواں نکلا اس نے تو قریب قریب مجھے اندھا ہی کر ڈالا۔ مجھے یوں لگا کہ بس اب کام تمام ہوا ہی چاہتا ہے۔ اگر اس توپ کے اندر گولیاں بھری ہوتیں تو انہیں یقیناً وہ لاش ہاتھ آجاتی جس کو پانے کے لئے وہ اس قدر بے چین تھے۔ خیر، خدا کا شکر ہے کہ مجھے کوئی چوٹ نہیں آئی۔ کشتی آگے چلتی گئی۔ حتے کہ وہ موڑ مڑ گئی اور آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ اس کے بعد بھی توپ داغنے کی آواز متواتر آتی رہی۔ البتہ یہ آواز دور سے دور تر ہوتی گئی ——— اور پھر ایک گھنٹے کے بعد یہ آواز بالکل بند ہو گئی ——— یہ جزیرہ تین میل لمبا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ لوگ اب نچلے سرے پر پہنچ گئے ہوں گے اور ناامید ہو کر تلاش چھوڑ دیں گے۔ لیکن میرا اندازہ غلط نکلا وہ موڑ کاٹ کر مسوری والے ساحل کی طرف سے واپس آگئے۔ اب کشتی کا رخ چونکہ بہاؤ کے الٹ تھا لہذا انہوں نے انجن چلا دیا تھا اور گاہے گاہے توپ بھی داغ دیتے تھے

میں بھی اسی طرف چلا گیا اور تماشہ دیکھنے لگا۔ جزیرے کے سرے پر پہنچ کر انہوں نے توپ داغنا بند کر دیا اور تھوڑی دور اور آگے جا کر مستوری کے ساحل پر جا اُترے اور واپس شہر جا کر اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

اب مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔ جن لوگوں نے مجھے تلاش کرنا تھی، کر لیا۔ اب اور کوئی نہیں آئے گا۔ میں نے کشتی میں سے اپنی چیزیں نکالیں اور گھنے جنگل میں ڈیرا جما دیا سب سے پہلے میں نے کمبلوں کو تان کر ایک خیمہ سا بنایا اور سامان اس کے نیچے رکھ دیا تاکہ بارش سے محفوظ رہے۔ اس کے بعد ایک مچھلی پکڑی اور آری سے اس کا پیٹ چاک کیا۔ شام کے وقت میں نے آگ جلا کر کھانا پکایا اور ادھر سے فارغ ہو کر کانٹے دریا میں ڈال دیئے تاکہ ناشتے کے لئے مچھلی وغیرہ کا بندوبست ہو جائے۔

جب اندھیرا ہو گیا تو میں وہیں آگ کے پاس بیٹھ کر نہایت اطمینان سے پائپ پینے لگا لیکن فوراً ہی میں تنہائی سے اُکتا گیا۔ اور اٹھ کر ساحل پر جا بیٹھا، اور لہروں کے ساحل کے ساتھ ٹکرانے کا گیت سننے لگا۔ میں کبھی ستاروں کو، کبھی دریا میں بہتی ہوئی شہتیریوں کو اور کبھی لکڑی کے گٹھوں کو گننے لگتا۔ اس کے بعد میں سو گیا۔ تنہائی کے احساس کو دور کرنے کا اس سے بہتر طریقہ اور کوئی نہیں۔ احساس تنہائی دیرپا تو ہوتا نہیں۔ کچھ ہی دیر بعد ہم اسے جھٹکنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

تین دن اور تین راتیں میرا معمول یہی رہا۔ ایک دن کے معمول اور دوسرے دن کے معمول میں رتی بھر فرق نہ تھا۔ لیکن چوتھے دن میں نے جزیرے کی کھوج کرنی شروع کی۔ میں اس جزیرے کا بادشاہ تو تھا ہی۔ یہ دھرتی اب میری ملکیت تھی۔ لہٰذا میں چاہتا تھا کہ اس سے اچھی طرح واقف ہو جاؤں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ مجھے وقت بھی تو کاٹنا تھا۔ ہاں تو، میری کھوج کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے بہت سی بیریاں ایسی ملیں جن کے بیر خوب پکے ہوئے تھے۔ اس جزیرے میں ہرے ہرے انگور اور ہری ہری رس بھریاں بھی تھیں۔ اور درختوں پر ہری ہری گوندنیاں بھی آنی شروع ہو گئی تھیں "ٹھیک ہے"

میں نے سوچا "دھیرے دھیرے یہ سب کھانے کے قابل ہو جائیں گی۔

ہاں تو، میں یونہی احمقوں کی طرح جزیرے میں گھومتا رہا۔ حتیٰ کہ اپنے اندازے کے مطابق میں اس کے پرلے سرے پہنچ گیا۔ ویسے تو بندوق میرے پاس تھی لیکن ابھی تک میں نے اسے شکار کے لئے استعمال نہیں کیا تھا۔ یہ تو صرف حفاظت کے لئے تھی ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ڈیرے کے قریب پہنچ کر کسی جانور کا شکار کروں گا کہ دفعتاً میری نظر ایک بہت بڑے سانپ پر پڑی جو میرے پاؤں کے نیچے آنے ہی والا تھا۔ سانپ بھاگ کر گھاس اور پھولوں میں چھپ گیا اور میں بھی بندوق لئے اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا تاکہ موقع ملتے ہی اُسے گولی مار دوں۔ میں یونہی اس کا پیچھا کرتا چلا جا رہا تھا کہ ناگاہ الاؤ کی راکھ کے ایک ڈھیر سے ٹکرا گیا۔ اس میں سے اب تک دھواں اٹھ رہا تھا۔

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ مزید چھان بین کا ارادہ ترک کر کے میں نے بندوق نیچی کر لی اور پنجوں کے بل بھاگتا ہوا الٹے پاؤں واپس ہو لیا۔ گاہے گاہے میں ایک سیکنڈ کے لئے رُک کر بنوں میں چھپ جاتا اور غور سے سننے لگتا۔ لیکن میرا سانس اس قدر زور زور سے چل رہا تھا کہ مجھے کچھ سنائی نہ دیتا۔ میں پھر بھاگنے لگتا اور تھوڑی دور جا کر پھر سننے کی کوشش کرتا اور پھر بھاگ اٹھتا۔ میری حالت یہ تھی کہ درخت کا ہر تنا مجھے آدمی نظر آنے لگتا تھا۔ اور اگر کوئی ٹہنی میرے پاؤں تلے آ کر چرمرا جاتی تو میرا نیچے کا سانس نیچے اور اوپر کا اوپر رہ جاتا۔

جب میں اپنے ڈیرے پر پہنچا تو میرے حوصلے پست ہو چکے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ یوں آوارہ گھومنا مناسب نہیں۔ میں نے اپنا سب سامان واپس کشتی میں رکھ دیا تاکہ کسی کو میری موجودگی کا علم نہ ہو۔ اس کے بعد میں نے آگ بجھا کر اس کی راکھ ادھر اُدھر بکھیر دی تاکہ دیکھنے والا یہ سمجھے کہ یہ راکھ اس آگ کی ہے جو کبھی پچھلے سال یہاں جلی ہو گی۔ اس سے فارغ ہو کر میں ایک درخت پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ میرا خیال ہے میں تقریباً

دو گھنٹے تک درخت پر چڑھ کر بیٹھا رہا لیکن نہ تو مجھے کوئی شے نظر آئی، نہ کوئی آواز سنائی دی۔ اس کے باوجود میری حالت یہ تھی جیسے میں نے ہزاروں قسم کی چیزیں دیکھی ہوں اور ہزاروں آوازیں سنی ہوں۔ خیر، ساری رات میں درخت پر ٹنگا نہیں رہ سکتا تھا۔ بالآخر میں نیچے اُتر آیا اور گھنے جنگل میں بیٹھ کر نہایت چوکسی سے پہرا دینے لگا۔ کھانے کے لئے میرے پاس بیروں اور صبح کے ناشتے کے بچے کھچے چند ٹکڑوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

رات تک بھوک کے مارے میرا بُرا حال ہو گیا۔ لہٰذا جب اندھیرا گہرا ہو گیا تو میں نے چاند نکلنے سے پہلے پہلے کشتی پانی میں ڈالی اور اسے اتی نامئس کی ساحل کی طرف کھینا شروع کیا۔ جو وہاں سے چوتھائی میل دور تھا۔ جنگل میں جا کر میں نے آگ جلائی اور کھانا پکایا۔ کھانا کھا کر میں ابھی یہ ارادہ کر ہی رہا تھا کہ رات یہیں گزاروں گا کہ اچانک مجھے گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی اور اس کے فوراً بعد کچھ آوازیں آنے لگیں۔ میں نے جلدی سے سارا سامان کشتی میں لادا اور خود جنگل کے اندھیروں میں رینگ گیا تاکہ دیکھوں کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ ابھی میں تھوڑی ہی دور گیا ہوں گا کہ مجھے ایک آواز سنائی دی۔ ایک آدمی کہہ رہا تھا:

"بہتر یہی ہے کہ کوئی اچھی سی جگہ ڈھونڈھ کر یہیں پڑاؤ ڈال دیا جائے۔ گھوڑے کا دم پھول گیا ہے۔ آؤ دیکھیں، شاید کوئی مناسب جگہ مل جائے۔"

میں نے مزید انتظار کرنا مناسب نہ سمجھا اور فوراً آ کر کشتی میں بیٹھ گیا اور اسے دھیرے دھیرے کھینے لگا تاکہ چپوؤں کی آواز ان تک نہ پہنچے۔ اپنی پرانی جگہ پہنچ کر میں نے کشتی باندھ دی اور اسی میں سو گیا۔

میں زیادہ دیر تک نہ سو سکا۔ میرا دماغ تو سوچنے میں مصروف تھا، نیند کیسے آتی؟ جب کبھی میری آنکھ کھلتی مجھے یہی محسوس ہوتا۔ جیسے کوئی آدمی میرا گلا گھونٹ رہا ہے۔ لہٰذا نیند سے مجھے کوئی سکون نہ ملا۔ میں نے سوچا کہ "یوں کتنے

دن چلے گا۔ کیوں نہ یہ پتہ لگاؤں کہ آخر وہ حضرت ہیں کون، جو میرے علاوہ اس جزیرے پر قیام پذیر ہیں۔ مجھے یہ پتہ لگانا ہی چاہیئے ورنہ یوں ڈرتے رہنے سے تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔" یہ ارادہ کرتے ہی میرا دل کچھ سنبھل سا گیا۔

میں نے چپو اٹھایا اور ایک دو قدم پانی میں چل کر کشتی میں جا بیٹھا اور اسے کھینے لگا۔ میں نے یہ احتیاط ضرور برتی کہ کشتی درختوں کے سایوں میں ہی رہے۔ چاند چمک رہا تھا اور سایوں کے پرے یوں لگتا تھا جیسے دن نکلا ہوا ہو کشتی قریباً ایک گھنٹہ چلتی رہی۔ ہر شے چٹانوں کی طرح ساکت تھی جیسے ساری کائنات گہری نیند سو گئی ہوئی ہو۔ جب میں جزیرے کے سرے پر پہنچا تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی جس سے سطح دریا پر لہریں ناچنے لگیں۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ صبح اب ہوا ہی چاہتی ہے۔ میں نے چپو سے کشتی کو ایک ٹھوکہ دیکر اس کا منہ ساحل کی طرف پھیر دیا۔ اس کے بعد میں نے بندوق لی اور گنجان درختوں میں چلتا چلتا جنگل کے سرے پر پہنچ گیا۔ وہاں میں ایک تنے پر بیٹھ گیا اور درختوں کے اس پار دیکھنے لگا۔ چاند غروب ہو چکا تھا اور تاریکی کی چادر نے دریا کو ڈھانپ لیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھے درختوں کے جھنڈوں کے اوپر سے آتی ہوئی ایک روشنی کی لکیر سی دکھائی دی جو اس بات کی علامت تھی کہ دن نکلنے ہی والا ہے۔ میں بندوق اٹھا کر اس سمت کو چل پڑا جہاں کل مجھے وہ راکھ کا ڈھیر دکھائی دیا تھا۔ ہر دو منٹ بعد میں دم سادھ کر ہمہ تن گوش ہو جاتا لیکن میری محنت اکارت گئی اور وہ جگہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ خیر، تھوڑی دیر بعد مجھے درختوں کے اس پار دھواں سا اٹھتا دکھائی دیا۔ میں نہایت احتیاط سے اس سمت چل پڑا اور جب میں نزدیک پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک آدمی زمین پر سو با پڑا ہے۔ اسے دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے۔ اس نے سر پر کمبل اوڑھ رکھا تھا اور اس کا سر آگ کے اتنا قریب تھا کہ یوں لگتا تھا کہ بس اب اسے آگ لگی کہ لگی۔ میں جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھ کر ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے لگا۔ میرے اور اس کے درمیان قریباً چھ فٹ کا

فاصلہ تھا۔ اب اجالا ہو چکا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے جمائی لی اور انگڑائی لے کر کمبل اُتار دیا۔ کمبل کے ہٹتے ہی میں نے دیکھا کہ یہ شخص تو وہی مِس واٹسن کا حبشی غلام جم ہے۔ خدا گواہ ہے کہ اسے دیکھ کر مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ میں کود کر جھاڑیوں سے باہر نکل آیا اور بولا۔

"ہیلو! جم!"

اس غیر متوقع آواز کو سُن کر وہ جیسے اُچھل پڑا اور وحشتناک نظروں سے ٹکٹکی باندھ کر مجھے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے دو زانو ہو کر ہاتھ جوڑے اور بولا۔

"خدا کے لئے مجھے مت ستاؤ۔ میں نے کبھی روحوں کو دُکھ نہیں دیا۔ مجھے تو مُردے اچھے لگتے ہیں۔ اور میں تو سدا انہیں خوش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جاؤ، جاؤ، واپس دریا میں چلے جاؤ جہاں کے تم باسی ہو۔ اور بیچارے جم کو کچھ نہ کہو۔ وہ تو آخر تک تمہارا دوست تھا۔"

اسے یہ یقین دلانے میں مجھے دیر نہ لگی کہ میں مرا نہیں بلکہ زندہ ہوں۔ اور یہ کہ اسے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے اور میری تنہائی کا مداوا ہو گیا ہے۔ میں نے اسے یہ بھی کہا کہ مجھے اس پر اتنا بھروسہ ضرور ہے کہ وہ کسی کو میرا راز نہیں بتائے گا۔ میں بولتا رہا اور وہ میرے چہرے پر نظریں گاڑے سنتا رہا، اور منہ سے کچھ نہ بولا۔ بالآخر میں نے کہا:

"اب تو کافی دن چڑھ آیا ہے۔ آؤ ناشتہ کر لیں۔ آگ کو ذرا تیز کر دو۔"

"اگر بیر کھا کر ہی گزر کرنا ہے تو آگ جلانے سے فائدہ؟ تمہارے پاس تو بندوق ہے۔ کیوں نہ کوئی اور چیز پکائیں؟"

"بیر؟ کیوں؟ کیا تم انہی پر گزر کرتے رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اور کیا کرتا؟ مجھے تو اس کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں لگا" اس نے جواب دیا۔

"ارے!" میں نے کہا "خیر، جم! بھلا تم کب سے اس جزیرے پر رہ رہے ہو؟"

"میں تو تمہاری موت کے اگلے ہی دن چلا آیا تھا"

"کیا کہا؟ ـــــ اور تب سے تم یہیں ہو؟"

"بالکل۔"

"اور تمہیں ان بیروں کے سوا اور کچھ کھانے کو نہیں ملا؟"

"کچھ بھی تو نہیں۔"

"تب تو تم فاقے ہی کرتے رہے ہو۔"

"فاقے؟ میرا حال تو یہ ہے کہ بس چلے تو سالم گھوڑا کھا جاؤں۔ ہاں ہاں، واقعی کھا جاؤں۔ اچھا یہ تو بتاؤ تم کب آئے؟"

"اسی رات جب میرا قتل ہوا تھا"

"واقعی؟ ـــــ تم کیا کھاتے رہے ہو؟ ـــــ لیکن تمہارے پاس تو بندوق ہے۔ بہت خوب! تم جا کر کچھ شکار کر لاؤ۔ اتنے میں، میں آگ جلاتا ہوں۔"

ہم وہاں سے اٹھ کر اس جگہ چلے آئے۔ جہاں میری کشتی بندھی تھی۔ جم جنگل میں ایک کھلی جگہ دیکھ کر آگ جلانے میں مصروف ہو گیا اور میں کشتی میں سے آٹا، گوشت، اور کافی کی کیتلی، اور فرائنگ پین، چینی اور پیالے اٹھا لایا۔ اتنا سارا سامان دیکھ کر جم بھونچکا رہ گیا اس کا خیال تھا کہ یہ سب کچھ میں نے جادو کے زور سے فراہم کیا ہے۔ اس کے بعد میں نے ایک بہت بڑی مچھلی پکڑی جسے جم نے اپنے چاقو سے صاف کر کے بھون لیا۔

جب ناشتہ تیار ہو گیا تو ہم وہیں فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے اور گرم گرم کھانے سے محظوظ ہونے لگے۔ جم کے جبڑے نہایت تیزی سے کام کر رہے تھے۔ بچارا کئی دنوں کا بھوکا تھا نا ـــــ جب ہمارا پیٹ بھر گیا تو ہم وہیں لیٹ کر سستانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد جم بولا! "لیکن یہ تو بتاؤ ہک! آخر وہ تھا کون جو اس روز جھونپڑی میں قتل ہوا تھا؟ اس میں تو خیر کوئی شبہ نہیں کہ تم وہ نہیں تھے۔"

میں نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ اسے سن کر وہ بولا: "واقعی تم نے نہایت ہوشیاری سے

کام لیا ہے۔ اتنی اچھی اسکیم تو ٹام سائر بھی نہ بنا سکتا۔"

میں نے کہا "لیکن جم! تم یہاں کیسے آئے؟ اور یہاں تک پہنچ کیونکر گئے؟"

میرا سوال سُن کر وہ گھبرا گیا اور ایک منٹ خاموش رہنے کے بعد بولا: "اگر میں نہ بتاؤں تو؟"

"لیکن کیوں؟"

"اس کی بھی وجہ ہے۔ لیکن بالفرض اگر میں تمہیں ساری بات بتا دوں، تو تم کسی سے اس کا ذکر تو نہ کرو گے؟"

"قسم لے لو۔"

"نہیں۔ مجھے تم پر اعتبار ہے ہَک! میں بھاگ آیا ہوں۔"

"جم!"

"لیکن تم نے وعدہ کیا ہے، ہَک! تم نے قسم کھائی ہے کہ کسی سے کچھ نہ کہو گے"

"میں نے وعدہ کیا ہے۔ اور میں اپنے وعدے پر کاربند رہوں گا۔ مجھے قسم ہے میں اپنا وعدہ پورا کروں گا۔ درست ہے کہ لوگ مجھے غلامی کا مخالف کہہ کر گالیاں دیں گے اور مجھ سے نفرت کریں گے کہ میں نے ایک بھاگے ہوئے غلام کی مخبری نہ کی۔ لیکن اس سے کیا؟ میں یہ راز کبھی افشا نہ کروں گا۔ اور ویسے بھی اب میں شہر جانے سے تو رہا۔ خیر، تم بات تو بتاؤ۔"——

"بات یہ ہے کہ میری مالکن یعنی مِس واٹسن سارا دن میرا ناک میں دم کئے رکھتی تھی، اور میرے ساتھ بہت سختی برتا کرتی تھی۔ تاہم مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے کبھی اورلینز کی منڈی میں جا کر بیچے گی نہیں۔ لیکن ہوا یہ کہ کچھ دنوں سے غلاموں کا ایک تاجر گھر کے چکر کاٹ رہا تھا۔ اس سے مجھے تشویش ہونے لگی۔ ایک رات میں چپکے سے دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ دروازہ پوری طرح بند نہیں تھا، اور میں اندر کی آواز سن سکتا تھا۔ مالکن بیوہ سے کہہ رہی تھی "میں اسے اورلینز لے جا کر بیچ دوں گی۔ بیچنا تو میں نہیں چاہتی لیکن اس کے

مجھے آٹھ سو ڈالر مل جائیں گے اور یہ اتنی بڑی رقم ہے کہ میرا جی نہیں چاہتا کہ اسے یونہی چھوڑ دوں' ــــــ میرے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ میں نے پوری بات بھی نہ سنی اور فوراً وہاں سے بھاگ نکلا۔ میں سیدھا پہاڑی کی طرف گیا اور بھاگتا بھاگتا اس کے دوسری طرف اتر گیا۔ میرا ارادہ تھا کہ شہر کے اوپر کی طرف ــــــ وہاں جہاں کشتیاں بندھی رہتی ہیں ــــــ جا کر ایک کشتی چرا دوں گا لیکن بات کچھ بنی نہیں سو وہاں ابھی تک لوگ آ جا رہے تھے۔ میں برتنوں والی دکان میں، جو دریا کے کنارے بنی ہوئی ہے، جا چھپا۔ اور انتظار کرنے لگا کہ کب یہ لوگ یہاں سے ٹلیں اور کب میں کشتی لے کر بھاگوں، میں ساری رات وہاں پڑا رہا لیکن ہر وقت کوئی نہ کوئی شخص وہاں موجود ہی رہا۔ صبح چھ بجے کے قریب کشتیوں کی آمد و رفت پھر شروع ہو گئی۔ اور آٹھ نو بجے کے قریب تو جو بھی کشتی ادھر سے گزری اس میں صرف ایک ہی چرچا تھا اور وہ یہ کہ کس طرح تمہارے ابا نے شہر آ کر تمہارے قتل کی خبر سنائی تھی۔ یہ سب کشتیاں عورتوں اور مردوں سے کھچا کھچ بھری تھیں جو جائے واردات دیکھنے کے لیے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی کشتی ساحل پر رک جاتی تا کہ لوگ اس پار جانے سے پہلے ذرا آرام کر لیں۔ ان کی بات چیت سے مجھے تمہارے قتل کی پوری تفصیلات معلوم ہو گئیں۔ مجھے تمہاری موت کا بہت دکھ ہوا تھا۔ لیکن اب میں خوش ہوں۔"

سارا دن میں دھات کے برادے میں پڑا رہا۔ بھوک کے مارے میرا برا حال تھا۔ لیکن مجھے اتنی تسلی ضرور تھی کہ میرے بھاگنے کا فی الحال کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ناشتے کے فوراً بعد میری مالکن نے بیوہ کے ساتھ کسی میٹنگ پر چلے جانا تھا اور شام تک وہیں رہنا تھا۔ انہیں یہ بھی پتہ تھا کہ میں صبح سویرے مویشیوں کو لے کر چلا جاتا ہوں۔ لہٰذا میری غیر حاضری کسی کو نہیں کھٹک سکتی تھی۔ اور کم از کم شام تک تو ان کو مطلق شک نہ ہوتا۔ رہے دوسرے نوکر۔ وہ خود بھی ان خواتین کے گھر سے نکلتے ہی موقع کا فائدہ اٹھا کر چھٹی منانے والے تھے۔ لہٰذا انہیں بھی میری غیر حاضری کا علم نہیں ہو سکتا تھا۔

"خیر، جب رات ہو گئی تو میں دریا کے کنارے کنارے سڑک پر چل پڑا اور دو تین میل دور اس جگہ چلا گیا جہاں کوئی آبادی نہ تھی۔ اب میں نے اپنا پروگرام طے کر لیا تھا۔ بات یہ تھی کہ اگر میں پیدل چلتا رہتا تو یقیناً کتے میرا تعاقب کرتے کرتے مجھے آ لیتے۔ اگر میں کشتی چُرا لیتا تو یقیناً انہیں کشتی کی گمشدگی کا علم ہو جاتا اور انہیں یہ بھی اندازہ ہو جاتا کہ میں سامنے ساحل پر کس جگہ اُترا ہوں گا۔ وہاں سے وہ کھوج لگاتے لگاتے مجھے آ پکڑتے۔ میں نے سوچا بہتر یہی ہوگا کہ میں چپکے سے کسی بیڑے پر بیٹھ جاؤں۔ کیونکہ بیڑے تو کوئی نقش نہیں چھوڑتے۔

اسی اثناء میں موڑ پر ایک روشنی دکھائی دی جو آہستہ آہستہ میری ہی طرف آ رہی تھی۔ میں فوراً پانی میں اتر گیا اور ایک لکڑی پکڑ کر اس کے سہارے بہتے بہتے دریا کے وسط میں پہنچ گیا جہاں بہت سی لکڑیاں بہتی چلی آ رہی تھیں۔ میں بھی ان میں گڈمڈ ہو گیا اور سر نیچا کر کے دھارے کے خلاف تیرنے لگا۔ یونہی تیرتے تیرتے میں نے اس بیڑے کو جا لیا۔ عین اس وقت آسمان پر بادل چھا گئے اور تھوڑی دیر تک گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا رہا۔ اس تاریکی کا فائدہ اٹھا کر میں بیڑے پر چڑھ گیا اور ایک طرف کو ہو کر تختوں پر لیٹ گیا۔ بیڑے کے مالک مجھ سے خاصی دور بیڑے کے وسط میں بیٹھے تھے جہاں لالٹین جل رہی تھی۔ پانی چڑھا ہوا تھا۔ اور دھارے کی رفتار بھی خاصی تیز تھی۔ میرا خیال تھا کہ صبح چار بجے تک میں یہاں سے کوئی پچیس میل دور پہنچ جاؤں گا۔ پھر اجالا ہونے سے پہلے ہی چپکے سے بیڑے سے اُتر کر تیرتا ہوا کنارے پر پہنچ جاؤں گا اور الی نائیس کے جنگلوں میں جا چھپوں گا۔" لیکن تقدیر نے میرا ساتھ نہ دیا۔ جب ہم اس جزیرے کے پاس سے گذر رہے تھے تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک آدمی لالٹین لئے لکڑیوں پر چلتا ہوا میری طرف آ رہا ہے۔ مزید ٹھہرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ میں چپکے سے پانی میں اتر گیا اور اس جزیرے کا رُخ کیا۔ میرا خیال تھا کہ جزیرے پر جہاں جا ہوں گا چلا جاؤں گا۔ مگر میرا اندازہ غلط نکلا۔ ساحل اتنا اونچا تھا

کہ میرے لئے کنارے پر پہنچنا مشکل ہو گیا۔ موزوں جگہ کی تلاش میں میں نے پورے جزیرے کا چکر کاٹ ڈالا۔ خیر، خشکی پر پہنچ کر میں سیدھا جنگل میں چلا آیا۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ جب تک ان بیڑوں میں لٹیرے ہیں میں ان سے کوئی واسطہ نہ رکھوں گا۔ پائپ میں ساتھ لے آیا تھا اور تھوڑا سا تمباکو بھی۔ چند ایک دیا سلائیاں بھی میری ٹوپی میں محفوظ تھیں اور خدا کے فضل سے ابھی تک خشک تھیں۔ بس اس کے بعد خیریت ہی خیریت تھی۔"

"اور تب سے تم نے روٹی گوشت نہیں دیکھا؟ کوئی کچھوا وغیرہ ہی پکڑ لیتے۔"

"پکڑتا کیسے؟ دبے پاؤں اس کے پیچھے سے جا کر پکڑنا تو ممکن نہیں۔ اور اگر اسے پتھر سے ہی مارنا ہے تو رات کو نشانہ کیسے لگے؟ دن کو میں ساحل پر جا کر کچھوے پکڑنے سے رہا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ خیر، تم نے اچھا ہی کیا کہ جنگل میں چھپے رہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ تم نے توپیں داغنے کی آواز سنی تھی؟"

"ہاں ہاں سنی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ لوگ تمہیں ہی ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ وہ یہیں سے گزر کر گئے تھے۔ میں نے جھاڑیوں میں سے انھیں دیکھا تھا۔"

اس اثنا میں کئی ننھے ننھے پرندے ہمارے اردگرد آ کر پھدکنے لگے تھے۔ وہ دو ایک گز اڑتے پھر زمین پر آ رہتے۔ جم نے کہا کہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ بارش آنے والی ہے۔ جب بارش آنے والی ہو تو ننھے ننھے چوزے اسی قسم کی حرکتیں کیا کرتے ہیں لہٰذا جم کا خیال تھا کہ ان پرندوں کی حرکتوں کا مطلب بھی یہی ہے۔ میں نے سوچا کیوں نہ دو ایک پرندوں کو پکڑ لوں، مگر جم نے منع کر دیا۔ وہ بولا:

"نہ۔ نہ۔ ایسا مت کرو۔ کہیں یہ پرندہ ہماری موت کا باعث ہی نہ بن جائے۔ ایک بار جب میرا باپ بیمار تھا تو ہمارے گھر میں سے کوئی شخص ایک پرندہ پکڑ لایا۔ اسے دیکھتے ہی

میری دادی بولی کہ بس اب مریض کی خیر نہیں۔ اور وہی ہوا جبھی میرے باپ کی موت ہو گئی۔"
جم نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ہمیں یہ کبھی نہیں گننا چاہیئے کہ کھانے کے لئے کتنی چیزیں پکیں گی
یہ بدشگونی ہوتی ہے۔ شام کے وقت میز پوش کو جھاڑنا بھی بدشگونی ہوتی ہے۔ اگر کسی
آدمی کے پاس شہد کا چھتّہ ہو اور وہ آدمی مر جائے تو ان مکھیوں کو فوراً اس کی موت کی اطلاع دے
دینی چاہیئے ورنہ مکھیاں کمزور ہو کر کام کرنا بند کر دیں گی اور مر جائیں گی۔ جم کا کہنا تھا کہ شہد کی مکھیاں
احمقوں کو ڈنک نہیں مارتیں۔ لیکن مجھے اس کی بات پر یقین نہ آیا۔ کیونکہ کئی بار میں نے مکھیوں
کو اپنے جسم پر رکھا تھا مگر انہوں نے مجھے کبھی ڈنک نہیں مارا تھا۔ ان میں سے کچھ باتیں تو میں نے پہلے بھی
سن رکھی تھیں لیکن کئی باتیں میرے لئے نئی تھیں۔ جم کو توجیسے ہر فال کا پتہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے تقریباً ہر چیز کا علم ہے
لیکن میرا خیال ہے کہ اسے صرف بدشگونیوں ہی کا علم تھا۔ میں نے پوچھا:
"تمہیں نیک فال وغیرہ کا بھی کچھ پتہ ہے، یا ہمیشہ بدشگونیوں ہی کی ٹوہ میں رہتے ہو؟"
وہ بولا: "اچھے شگون ہوتے ہی کتنے ہیں؟ اور جو ہیں بھی ان کا کیا فائدہ؟ تم یہ جان کر
کیا کرو گے کہ نیک فال کیا ہے؟ کیا اس لئے کہ انھیں بھگا دو؟" —— اس کے بعد اس
نے مجھے بتایا "اگر کسی شخص کی چھاتی اور بازوؤں پر بال ہوں تو یہ اس بات کی نشانی ہے
کہ اس کے پاس کافی روپیہ ہوگا۔ ان نشانیوں کا تو خیر کوئی فائدہ بھی ہے۔ کیونکہ یہ دور کی
بات بتاتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ روپیہ آنے سے پہلے اس آدمی پر اتنی غربت آجائے کہ وہ خودکشی
کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ ایسی صورت میں یہ نشانی اس کی ڈھارس بندھا سکتی ہے
کہ کچھ مدت بعد اس کی غربت دور ہو جائے گی اور وہ امیر ہو جائے گا"
"جم! کیا تمہاری چھاتی اور بازوؤں پر بال ہیں؟"
"یہ سوال پوچھنے کی بھی کیا تک ہے؟ تمہیں نظر نہیں آتے یہ بال؟"
"تو پھر تمہارے پاس پیسہ ہے؟"
"نہیں تو —— ہاں البتہ کوئی زمانہ تھا جب میں امیر تھا۔ اور وقت آئے گا

جب میں پھر امیر بن جاؤں گا۔ ایک مرتبہ میرے پاس چودہ ڈالر تھے۔ لیکن میں نے سٹہ کھیلا اور اپنا ستیاناس کر لیا۔"

"لیکن جم! تم نے سٹہ کیا کھیلا؟"

"سب سے پہلے میں نے مال خریدا ——"

"مال؟ کونسا مال؟"

"زندہ مال۔ اور کیا؟ یہی مویشی۔ یعنی میں نے دس ڈالر کی رقم سے ایک گائے خریدی تھی لیکن اب میں نے توبہ کر لی ہے کہ آئندہ کبھی مال نہیں خریدوں گا۔ وہ گائے میرے یہاں پہنچتے ہی مر گئی۔"

"یعنی تمہیں دس ڈالر کا نقصان اٹھانا پڑا؟"

"نہیں، پورے دس کا تو نہیں۔ البتہ نو ڈالر کا نقصان ضرور ہوا۔ گائے کا چمڑا اور چربی بیچ کر میں نے ایک ڈالر اور دس سینٹ کی رقم وصول کر لی تھی۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارے پاس پانچ ڈالر اور دس سینٹ باقی بچے۔"

"ہاں —— تم اس لنگڑے حبشی کو تو جانتے ہونا، وہی جو بڈھے مسٹر بریڈش کا غلام ہے، ہاں تو اس نے ایک بنک کھول رکھا تھا اور کہا کرتا تھا کہ جو کوئی اس کے بنک میں ایک ڈالر جمع کروائے گا، ایک سال بعد اسے ایک کے بدلے میں پانچ ڈالر مل جائیں گے۔ سب حبشیوں نے اس میں پیسہ جمع کروا دیا۔ لیکن ان کے پاس کوئی خاص رقم تو تھی نہیں۔ صرف میں ہی ایسا تھا جس کے پاس رقم تھی۔ لہذا میں نے مطالبہ کیا کہ مجھے چار ڈالر سے کچھ زیادہ سود ملنا چاہیئے —— میں نے یہ دھمکی بھی دی کہ اگر میرا مطالبہ منظور نہ ہوا تو میں اپنا علیحدہ بنک شروع کر دوں گا۔ وہ حبشی چاہتا تھا کہ میں اس کے مقابلے پر نہ آؤں۔ اتنا کاروبار تو تھا نہیں کہ ایک ساتھ دو بنک چل سکیں۔ بالآخر وہ اس بات پر راضی ہو گیا کہ اگر میں اپنے پانچ ڈالر اس کے بنک میں جمع کروا دوں تو

وہ مجھے سال کے خاتمے پر پینتیس ڈالر دے گا۔

"تو جناب، میں نے وہ رقم جمع کروادی۔ میرا ارادہ تھا کہ سال کے خاتمے پر ان پینتیس ڈالروں کو پھر جمع کروا دوں گا۔ اس طرح میری رقم بڑھتی ہی رہے گی ـــــ انہی دنوں بابب نامی ایک حبشی کہیں سے لکڑیاں ڈھونے کا ایک چھکڑا لے آیا۔ اس کے مالک کو اس کا علم نہ تھا۔ میں نے یہ چھکڑا اس سے خرید لیا اور اس سے کہہ دیا کہ اس کے عوض وہ ایک سال بعد پینتیس کے پینتیس ڈالر وصول کر لے۔ لیکن کرنا خدا کا، کہ اسی رات کوئی شخص یہ چھکڑا چرا لے گیا اور اس سے اگلے دن وہ لنگڑا حبشی آکر یہ اطلاع دے گیا کہ بنک کا دیوالہ نکل گیا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ نہ تو بابب کو پیسے ملے، نہ مجھے۔"

"اور وہ جو دس سینٹ باقی بچے تھے ان کا کیا ہوا؟"

"ارادہ تو میرا تھا کہ انہیں خرچ کر دوں۔ لیکن ایک دن میں نے خواب دیکھا جس میں مجھے یہ تلقین کی گئی کہ میں یہ رقم بالم نامی حبشی کو دے دوں لوگوں نے اس کا نام بالم کا گدھا رکھا ہوا ہے۔ اور ہے بھی وہ بدھو۔ لیکن کہتے ہیں اس کی قسمت بڑی تیز ہے۔ اور جہاں تک میری اپنی قسمت کا تعلق ہے، وہ تو خراب ہے ہی۔ خواب میں مجھ سے کہا گیا تھا کہ اگر بالم اس رقم کو میری طرف سے جمع کروا دے تو اس میں کافی اضافہ ہو جائے گا۔ خیر بالم نے وہ رقم لے لی۔ ایک دن جب وہ گرجا گیا تو وہاں اس نے پادری کا وعظ سنا۔ پادری کہہ رہا تھا" جو کوئی اپنا پیسہ غریبوں کو دیتا ہے، وہ دراصل خدا کو قرض دیتا ہے، اور خدا اس رقم کو سو گنا کر کے لوٹائے گا" بس پھر کیا تھا۔ بالم نے وہ دس سینٹ نکالے اور غریبوں میں بانٹ دیئے۔ اور انتظار کرنے لگا کہ دیکھیں اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔"

"اس کا کچھ نتیجہ نکلا بھی؟"

"نتیجہ کیا خاک نکلتا۔ نہ مجھے کوڑی وصول ہوئی، نہ بالم کو۔ اب میں نے کانوں کو ہاتھ لگا لیا ہے کہ آئندہ کسی کو بغیر ضمانت کے دمڑی ادھار نہ دوں گا۔ اس پادری کے بھی کیا

کہنے! کہتا تھا تمہاری رقم سوگنا ہو کر واپس ملے گی! اگر مجھے میرے دس سینٹ ہی واپس مل جائیں تو غنیمت جانوں اور سمجھوں کہ بھر پایا۔"

"چلو، پھر کیا ہوا۔ ایک نہ ایک دن تو تمہیں امیر بننا ہی ہے۔"

"ہاں، یوں تو میں اب بھی خاصا امیر ہوں۔ یعنی میں اپنا خود مالک ہوں، اور میری قیمت ہے آٹھ سو ڈالر۔ کاش یہ رقم میرے پاس نقدی کی صورت میں ہوتی۔ پھر مجھے کسی چیز کی ضرورت نہ رہتی۔

۹۔ غار۔ بہتا ہوا مکان

میں نے سوچا کہ اب ذرا اس جگہ کا جائزہ بھی لے ہی لیا جائے۔ جہاں میں پچھلے روز اچانک جا نکلا تھا۔ لہذا میں اور جم جزیرے کے وسطی حصّے کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ جگہ وہیں تھی۔ فاصلہ کچھ خاص زیادہ نہیں تھا۔ ہم جلد ہی وہاں پہنچ گئے۔ فاصلہ ہو بھی کتنا سکتا تھا۔ جزیرے کا طول فقط تین میل تھا، اور عرض تقریباً چوتھائی میل۔

یہ ایک لمبی سی پہاڑی تھی جس کی اونچائی کوئی چالیس فٹ کے قریب ہوگی۔ ہمیں چوٹی تک پہنچنے میں کافی دقت ہوئی۔ ایک تو چڑھائی سیدھی اور پھر سارا راستہ گنجان جھاڑیوں سے اٹا ہوا۔ ہمیں اوپر چڑھنے کے لئے تقریباً ساری پہاڑی کا چکر کاٹنا پڑا۔ تھوڑی دیر بعد ہمیں چٹانوں میں ایک غار نظر آئی جو چوٹی کے پاس، الی نائیس ساحل کے بالمقابل تھی۔ یہ غار اتنی لمبی چوڑی تھی کہ اس میں سے دو تین کمرے بآسانی نکل سکتے تھے۔ اس کی چھت اتنی اونچی تھی کہ جم اس میں سیدھا کھڑا ہو سکتا تھا۔ اندر خنکی تھی۔ جم کا خیال تھا کہ سامان فوراً یہاں جما دیا جائے۔ مگر میں نے کہا کہ یہاں رہنے میں نقصان یہ ہوگا کہ سارا دن اوپر

نیچے چڑھنا اترنا لگا رہے گا۔

جم کی ایک تجویز یہ بھی تھی کہ اگر ہم کشتی کو کسی اچھی سی جگہ چھپا دیں اور سامان یہاں غار میں لے آئیں تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اگر کبھی کوئی شخص جزیرے کی طرف آتا نظر آیا تو ہم فوراً بھاگ کر غار میں آ چھپیں گے۔ اور غار میں بغیر شکاری کتوں کی مدد کے کوئی شخص ہمیں ڈھونڈ نہ پائے گا۔ اور پھر ہمیں پرندوں کی حرکات سے یہ پتہ بھی لگ چکا تھا کہ بارش آنے والی ہے۔ لہذا اگر سامان باہر رہتا تو اس کے بھیگ جانے کا خطرہ تھا۔

ہم واپس آئے اور کشتی کو کھے کر اس جگہ لے آئے جو غار کے عین سامنے تھی۔ سامان ڈھو کر غار میں رکھ دیا گیا۔ ادھر سے فارغ ہو کر ہم کسی ایسی موزوں سی جگہ کی تلاش کرنے لگے جہاں کشتی چھپائی جا سکے۔ بالآخر کشتی کو بید کی جھاڑیوں میں باندھ کر ہم نے کانٹوں سے لگی ہوئی مچھلیاں اتار دیں اور کھانے کی تیاری کرنے لگے۔ کانٹے دوبارہ لگا دیے گئے تاکہ کچھ اور مچھلیاں ہاتھ آ جائیں۔

غار کا دہانہ خاصا بڑا تھا۔ اتنا کہ ایک پیپا تو بآسانی اس میں سے گزر سکتا تھا۔ دروازے کے اندر ایک طرف فرش کا پتھر ذرا باہر کو نکلا ہوا تھا اور چپٹا ہونے کی وجہ سے آگ جلانے کے لئے نہایت موزوں تھا۔ اسی پر آگ جلا کر کھانا بنا لیا گیا۔

ہم نے فرش پر غالیچوں کی جگہ کمبل بچھا دیئے اور کھانا شروع ہوا۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم نے تمام سامان پچھلی دیوار کے ساتھ ٹکا دیا تاکہ بوقت ضرورت کسی قسم کی دقت پیش نہ آئے۔ ابھی ہم سامان لگا کر بیٹھے ہی تھے کہ مطلع تاریک ہو گیا اور بجلی چمکنے اور کڑکنے لگی۔ پرندوں کا اندازہ غلط نہ تھا۔ بارش واقعی شروع ہو گئی۔ اور بارش بھی ایسی موسلا دھار جیسے آسمان پھٹ پڑا ہو۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ ایسا طوفان کم از کم میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ گرمیوں کی بارش تھی اور گرمیوں کی برسات میں بادل یوں گھر آتے ہیں جیسے رات ہو گئی ہو۔ گھپ اندھیرے کا منظر بھی کیا سہانا ہوتا ہے اور اس کے بعد

یوں جم کر بارش ہوتی ہے کہ چند ہی گز کے فاصلے والے درخت بھی مکڑی کے جالوں کی طرح دھندلے دھندلے سے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ پھر طوفان آجاتا ہے اور اس زور سے آتا ہے کہ پیڑ دوہرے ہونے لگتے ہیں۔ اور ان کے پتوں کا سیدھا سبز رنگ والا حصّہ نظروں سے اوجھل ہوجاتا ہے اور الٹا، زردی مائل حصہ ہوا میں پھڑپھڑانے لگتا ہے۔ اس کے بعد تند ہوا چلتی ہے اور شاخیں یوں بازو پھیلا پھیلا کر ناچنے لگتی ہیں جیسے ان پر جنون طاری ہوگیا ہو۔ اور پھر عین اس وقت جب تاریکی اپنے عروج پر ہوتی ہے، دفعتاً یوں اجالا ہوجاتا ہے جیسے ہر طرف نور سا چھا گیا ہو۔ دور سامنے جہاں ایک سیکنڈ پہلے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا درختوں کی ناچتی ہوئی ٹہنیاں ایک لحظے کے لئے نظر آتی ہیں۔ جی ہاں، صرف ایک ہی لحظے کے لئے۔ کیونکہ اس کے بعد پھر گھپ اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اور بجلی اس زور سے کڑکنے لگتی ہے کہ دل دہل جاتا ہے۔ اور پھر گڑگڑ کی یہ آواز آسمان سے پھسلتی ہوئی یوں پاتال میں اتر جاتی ہے جیسے کوئی شخص خالی پیپوں کو سیڑھیوں سے لڑھکا دے اور سیڑھیاں کافی لمبی ہوں اور پیپے خوب اچھل اچھل کر لڑھکتے جارہے ہوں —

میں نے جم سے کہا: "جم! دیکھو، کیسا خوبصورت سماں ہے۔ خدا کی قسم، میں اس جگہ کو چھوڑ کر اور کہیں نہیں جاؤں گا۔ ذرا وہ مچھلی کا ٹکڑا اور گرم روٹی تو دینا" ——

"جم کو دعائیں دو جس نے تمہیں اس جگہ پہنچا دیا۔ ورنہ تم تو اس وقت وہیں اس جنگل میں بھوکے پیاسے پڑے ہوتے اور پانی میں قریب قریب ڈوب گئے ہوتے۔ میں نے کہا تھا، کہ چوزوں اور پرندوں کو بارش کی آمد کی اطلاع پہلے ہی سے مل جاتی ہے۔"

دس بارہ روز تک دریا کا پانی مسلسل چڑھتا رہا حتّٰے کہ کنارے نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ جزیرے پر بھی نشیبی حصّوں میں تین چار فٹ پانی آگیا تھا اور الی نائس کی طرف کا ساحل تو پانی میں بالکل ڈوب گیا تھا۔ اس طرف پانی میلوں تک پھیلا ہوا تھا لیکن مسوری کی طرف دریا کا پاٹ وہی آدھ میل ہی تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ادھر کا ساحل تو البتہ تھا

جیسے چٹانوں کی ایک دیوار سی کھڑی کر دی گئی ہو۔

ہمارا معمول یہ تھا کہ دن کو ہم کشتی میں بیٹھ کر سارے جزیرے کی سیر کرتے۔ جہاں جنگل گنجان ہوتے وہاں سایوں میں کافی خنکی رہتی حالانکہ باہر سورج اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہا ہوتا۔ ہم کبھی درختوں کے سائے میں ہوتے اور کبھی بل کھاتی ہوئی راہوں کے چکر کاٹ کر باہر دھوپ میں آ جاتے۔ کئی جگہ تو لٹکتی ہوئی بیلیں اتنی گنجان ہوتیں کہ ان میں سے گزر کر جانا ہمارے لئے ناممکن ہو جاتا، اور ہم واپس مڑ کر کسی دوسرے راستے پر ہو لیتے۔ وہ سال خوردہ درخت جو گر پڑے تھے، خرگوشوں اور سانپوں کا مسکن بن گئے تھے۔ جزیرے میں پانی بھر جانے کی وجہ سے یہ مخلوق اپنی خوراک سے محروم ہو گئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو ہی روز میں خرگوش اتنے اصیل ہو گئے کہ اگر آپ کشتی لے کر ان کے پاس چلے جائیں اور ہاتھ بڑھا کر انہیں پکڑ لیں، تو بھی یہ کچھ نہ کہیں۔ البتہ سانپ اور کچھوے ڈر کے مارے پانی میں کھسک جاتے۔ اب تو وہ پہاڑی بھی جہاں ہماری غار تھی، ان جانوروں سے اٹی پڑی تھی۔ اور اگر ہم چاہتے تو درجنوں کے حساب سے انہیں پال لیتے۔

ایک رات ایک اچھا سا بیڑا ادھر سے بہتا ہوا گزرا۔ ہم نے اسے پکڑ لیا۔ یہ چیڑ کی لکڑیوں کا بنا تھا اور اس کا ہر تختہ تقریباً بارہ فٹ چوڑا اور پندرہ سولہ فٹ لمبا ہو گا۔ اس کی اوپری سطح چھ سات انچ پانی سے باہر تھی۔ اور ٹھوس اور ہموار ہونے کی وجہ سے بخوبی فرش کا کام دے سکتی تھی۔ ویسے تو دن بیسیوں ایسے بیڑے بہتے چلے آتے تھے مگر ہم انہیں پکڑنے کی کبھی کوشش نہ کرتے۔ اگر کوئی دیکھ لیتا تو ------- ؟

ایک اور رات کا ذکر ہے کہ ہم جزیرے کے سرے پر بیٹھے تھے۔ تڑکے کا وقت تھا۔ اچانک ہماری نظر لکڑی کے ایک مکان پر پڑی جو مغرب کی طرف سے بہتا چلا آ رہا تھا۔ یہ مکان دو منزلہ تھا اور ایک طرف کو کچھ زیادہ ہی جھکا ہوا تھا۔ ہم کشتی کھیتے کھیتے اس کے قریب پہنچ گئے اور اچکہ، کر اس پر سوار ہو گئے۔ پھر ہم بالائی منزل کی کھڑکی پر چڑھ گئے۔ ابھی اجالا نہیں

ہوا تھا اور ہمیں کچھ ٹھیک طرح سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لہٰذا ہم نے کشتی باندھ دی اور مکان کے اندر بیٹھ کر دن نکلنے کا انتظار کرنے لگے۔ ابھی ہم نے جزیرہ پار بھی نہ کیا تھا کہ اُجالا ہو گیا ہم نے جھانک کر اندر دیکھا۔ کمرے کے اندر ایک چارپائی، ایک میز، اور دو پُرانی کرسیاں رکھی تھیں۔ فرش پر چیزیں بکھری پڑی تھیں اور دیوار کے ساتھ کپڑے ٹنگے تھے۔ دور کونے میں کوئی شئے یوں فرش پر پڑی تھی جیسے کوئی آدمی لیٹا ہو۔ جم نے پکارا! "ہلو، بھئی! سنو تو!"

لیکن وہ آدمی ویسے ہی بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اس کے بعد میں نے زور سے آواز دی۔ اور جب وہ پھر بھی اسی طرح لیٹا رہا تو جم بولا:

"یہ آدمی سویا ہوا نہیں۔ بلکہ مر چکا ہے۔ تم ذرا یہیں ٹھہرو۔ میں اندر جا کر دیکھتا ہوں۔"

اندر جا کر اس نے جھک کر بڑے غور سے اس کو دیکھا۔ پھر بولا! "ہاں یہ تو واقعی مرا ہوا ہے۔ اور ننگا بھی۔ اس کی پیٹھ میں گولی لگی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اسے مرے ہوئے دو تین دن ہو گئے ہیں۔ ہک! تم بے شک اندر آ جاؤ۔ لیکن اس کے چہرے کی طرف مت دیکھنا۔ بہت گھناؤنا ہے۔"

میں نے لاش کی طرف دیکھا تک نہیں۔ ویسے تو جم نے احتیاط کے طور پر اس کے چہرے کو میلے کچیلے کپڑوں سے ڈھانپ دیا تھا۔ مگر اس کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی۔ مجھ میں اتنی جرأت ہی کہاں تھی کہ اس کے چہرے کو دیکھ لیتا۔ فرش پر جا بجا تاش کے میلے کچیلے پتّے اور شراب کی پرانی بوتلیں بکھری پڑی تھیں۔ سیاہ کپڑے کے دو ایک نقاب بھی وہاں پڑے تھے۔ دیواروں پر کوئلے سے عجیب و غریب شکلیں اور حروف بنے ہوئے تھے۔ دیوار کے ساتھ دو میلے سے سوتی لباس، ایک ہیٹ، عورتوں کے کچھ زیر جامے، اور کچھ مردانہ کپڑے ٹنگے تھے۔ یہ سب سامان ہم نے کشتی میں بھر لیا۔ شاید کبھی کام آ جائے۔ تیلیوں کا بنا ایک ہیٹ بھی فرش پر پڑا تھا۔ جس پر نقطے نقطے سے بنے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ کسی لڑکے کا ہیٹ ہے۔ میں نے اسے بھی سنبھال لیا۔ دودھ کی ایک بوتل بھی فرش پر پڑی تھی جس کے

مُنہ میں کپڑے کی چوسنی ٹھنسی تھی۔ ہم شائد اسے بھی لے لیتے مگر یہ ٹوٹی ہوئی نکلی۔ کمرے میں ایک پرانی بوسیدہ سی الماری اور ایک ٹرنک بھی تھا جس کے قبضے ٹوٹے ہوئے تھے۔ الماری اور ٹرنک کھلے پڑے تھے۔ میں نے ان کی تلاشی لی مگر کوئی کام کی چیز ہاتھ نہ لگی۔ اس بے ترتیبی سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ لوگ کافی عجلت میں تھے اور ان کے پاس سامان اٹھا کرلے جانے کا کوئی بندوبست نہ تھا۔

جو سامان ہمارے ہاتھ لگا اس کی فہرست یوں ہے: ایک عدد پُرانی لالٹین، ایک بے دستے کا بڑا چاقو، ایک بالکل نیا چاقو جس کی قیمت کسی بھی دکان پر دو ڈالر سے کم نہ ہوگی، چربی کی کچھ موم بتیاں، ٹین کا ایک شمعدان۔ کشکول، ٹین کا پیالہ، ایک پھٹی پرانی رضائی جو ہم نے چارپائی سے اٹھالی تھی، ایک تھیلہ جس میں سوئیاں، سلائیاں، موم، دھاگہ بٹن، وغیرہ سب سامان تھا، ایک کلہاڑی، کچھ کیل، مچھلی پکڑنے کی ایک ڈوری جو میری انگلی جتنی موٹی تھی اور جس کے ساتھ بڑے بڑے کانٹے لگے تھے، ہرن کی ایک کھال، کُتّے کا پٹہ (چمڑے کا)، گھوڑے کا سُم، دوائی کی کچھ شیشیاں جن پر کوئی لیبل نہ تھا؛ ——
اور آخر میں جب ہم چلنے لگے تو میری نظر گھوڑے صاف کرنے والی ایک کنگھی پر جا پڑی جو قدرے اچھی حالت میں تھی۔ جم کو بربط بجانے والا ایک پرانا ساگز اور لکڑی کی ایک ٹانگ ہاتھ لگی۔ ٹانگ کے فیتے ٹوٹے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ اس میں اور کوئی نقص نہ تھا۔ البتہ یہ ٹانگ نہ تو میرے کام کی تھی کیونکہ میرے لئے قدرے لمبی تھی۔ اور نہ جم کے کام کی تھی کیونکہ اس کے لئے قدرے چھوٹی تھی۔ اس کے باوجود ہم نے دوسری ٹانگ کی بہت کھوج کی مگر وہ نہ ملی۔

قصہ کوتاہ، ہمیں کافی سامان ہاتھ لگا۔ بالآخر جب ہم سارا سامان سمیٹ کر فارغ ہوئے تو جزیرہ کوئی چوتھائی میل پیچھے رہ گیا تھا۔ دن بھی نکل آیا تھا۔ میں نے جم کو کشتی کے پیندے میں لٹا کر اسے رضائی سے ڈھانپ دیا۔ ورنہ لوگ دور سے پہچان لیتے کہ یہ تو حبشی ہے۔ میں

کشتی کو کھے کر اپی نا آبیس کی طرف والے ساحل پرے گیا۔ وہاں تک پہنچنے میں کوئی آدھ میل کا فاصلہ طے کرنا پڑا۔ ساحل کے پاس پہنچ کر جہاں پانی بالکل ساکن تھا میں کشتی سے اُتر پڑا اور اسے گھسیٹ کر کنارے پر لے گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ نہ تو کوئی حادثہ پیش آیا، نہ ہی کسی نے ہمیں دیکھا۔ ہم صحیح سلامت گھر پہنچ گئے۔

۱۰.. مال ہاتھ لگنا۔ بوڑھا ہینک بنکر بھیس بدلنا

ناشتے کے بعد میرا جی چاہتا تھا کہ جم کے ساتھ اس لاش کے بارے میں بات چیت کروں کہ وہ شخص کون تھا اور اس کا قتل کیونکر ہوا۔ لیکن جم تھا کہ چپ سادھے بیٹھا رہا۔ اسے ڈر تھا کہ لاش کے بارے میں بات چیت کرنا بدشگونی ہوگی اور کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا بھوت ہمارے ہی پیچھے لگ جائے۔ جم کا کہنا تھا کہ وہ مردہ جو دفنایا نہیں جاتا، بھوت بن کر ادھر اُدھر بھٹکتا رہتا ہے۔ لیکن جن مُردوں کا کفن دفن ہو گیا ہو اور وہ تین چار فٹ مٹّی کے نیچے پڑے ہوں، وہ آرام سے لیٹے رہتے ہیں۔ اس کی بات معقول تھی لہذا میں نے بہتری اسی میں سمجھی کہ اس قتل کا ذکر نہ کیا جائے۔ تاہم میرے دل میں کھد بدسی لگی رہی اور میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ آخر اس شخص کا قاتل کون تھا اور انہوں نے یہ قتل کیوں کیا؟

ہم نے ان کپڑوں کی تلاشی لی جو ہم اٹھا لائے تھے۔ کمبل کے بنے اوورکوٹ میں سے ہمیں چاندی کے آٹھ ڈالر ہاتھ لگے، جو استر کے اندر سلے ہوئے تھے۔ جم کا خیال تھا کہ یہ اوورکوٹ اس مکان میں رہنے والوں کا اپنا نہیں تھا۔ بلکہ انہوں نے بھی اسے کہیں سے چرایا ہوگا۔ اگر

یہ کوٹ ان کا اپنا ہوتا تو انہیں یہ بھی پتہ ہوتا کہ اس کے اندر رقم ہے اور اگر انہیں اس رقم کا علم ہوتا تو وہ اسے یوں چھوڑ کر نہ جاتے۔ میں نے کہا: "تو ہو سکتا ہے کہ وہی لوگ اس کے قائل ہوں۔" لیکن جم تو اس موضوع پر گفتگو کرنے کے لئے قطعاً تیار نہ تھا۔

بالآخر میں بولا: "ارے واہ! تم کہتے ہو یہ بدشگونی ہوگی۔ ایسی ہی بدشگونی کی بات تم نے تب بھی کہی تھی جب پرسوں پہاڑی پر مجھے سانپ کی کینچلی ملی تھی۔ تم نے اس وقت بھی یہی کہا تھا کہ سانپ کی کینچلی کو چھونا سب سے بڑی بدشگونی ہوا کرتی ہے۔ لیکن ذرا اس بدشگونی کا نتیجہ تو دیکھو! اتنا سارا سامان ہمارے ہاتھ لگ گیا ہے۔ اور جو آٹھ ڈالر نقد ملے ہیں۔ وہ الگ۔ کاش ایسی بدشگونیاں روز ہوا کریں!"

"ذرا صبر کرو۔ تھوڑے دن انتظار کرو۔ اس طرح بے صبر ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ برے دن بھی آنے ہی ہوں گے۔"

اور برے دن واقعی آ گئے۔ یہ گفتگو منگل کے روز ہوئی تھی۔ جمعہ کے دن کھانے کے بعد ہم پہاڑی پر جا لیٹے۔ پائپ میں تمباکو ختم ہو چکا تھا لہذا میں غار میں تمباکو لینے چلا گیا لیکن جونہی میں نے اندر قدم رکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سانپ وہاں براجمان ہے۔ میں نے جھٹ اسے مار دیا۔ اب مجھے ایک شرارت سوجھی۔

میں نے اس کی کنڈلی سی بنا کر اسے جم کے بستر کی پائینتی یوں رکھ دیا کہ یہ بالکل زندہ دکھائی دیتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ جب جم اسے دیکھے گا تو خاصا مذاق رہے گا۔ خیر، رات تک یہ بات میرے ذہن سے بالکل اتر گئی۔ غار میں واپس آ کر میں تو دیا سلائی جلانے میں لگ گیا اور جم اپنے بستر پر لیٹنے کی تیاری کرنے لگا۔ مگر جونہی اس نے بستر پر پاؤں رکھا اس سانپ کی مادہ نے اسے فوراً کاٹ کھایا۔

جم تڑپ کر اچھلا اور لگا چلانے۔ جب میں اس کی طرف مڑا تو دیا سلائی کی روشنی میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہ مادہ سانپ پھن اٹھائے دوبارہ ڈنک مارنے کی تیاری کر رہی ہے۔

میں نے ایک چھڑی اٹھائی اور چشم زدن میں اسے ہلاک کر دیا۔ ادھر جم نے آبا کی شراب والا جگ اٹھایا اور غٹاغٹ اسے پینا شروع کر دیا۔

جم پاؤں سے ننگا تھا اور ناگن نے اسے ٹھیک ایڑی پر کاٹا تھا۔ بیوقوفی میری ہی تھی۔ مجھے یہ دھیان ہی نہ رہا تھا کہ جب بھی کوئی سانپ مرتا ہے تو اس کی مادہ اسے ڈھونڈتی ہوئی وہیں آنکلتی ہے اور کنڈلی مار کر اس کے گرد بیٹھ جاتی ہے ــــ خیر، جم نے کہا: "اس کا سر کاٹ کر پھینک دو اور اس کے بعد اس کا دھڑ چیر کر ایک ٹکڑا بھون کر مجھے دو" اس کا خیال تھا کہ سانپ کا بھنا ہوا گوشت کھانے سے وہ صحتیاب ہو جائے گا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ سانپ کی دم کاٹ کر اس کی کلائی پر باندھ دوں کیونکہ یہ زہر کا اثر زائل کر دیتی ہے۔ ادھر سے فارغ ہو کر میں چپکے سے باہر نکل آیا اور دونوں سانپوں کو لے جا کر جھاڑیوں میں پھینک دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جم کو یہ علم ہو جائے کہ سب میری ہی غلطی کا نتیجہ ہے۔ میری کوشش یہ تھی کہ وہ اس کے سبب سے لاعلم ہی رہے۔

تھوڑے تھوڑے وقفے بعد جم شراب کا جگ اٹھاتا اور چسکی لے لیتا۔ کبھی کبھی تو وہ مارے درد کے اس حد تک آپے سے باہر ہو جاتا کہ بے اختیار ادھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارنے لگتا اور زور زور سے چیخنا شروع کر دیتا۔ مگر وہ جلد ہی سنبھل جاتا اور پھر جگ اٹھا کر ایک چسکی لے لیتا۔ اس کا پیر سوج کر کپا ہو گیا تھا اور ٹانگ بھی سوج گئی۔ لیکن رفتہ رفتہ شراب اثر کرنے لگی جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ اب اسے قدرے افاقہ ہے۔ ویسے سچی بات تو یہ ہے کہ اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو آبا کی زہریلی شراب کی بجائے سانپ ہی کے زہر کو ترجیح دیتا۔

چار دن اور چار راتیں جم بستر پر پڑا رہا۔ رفتہ رفتہ سوجن دور ہو گئی اور وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔ میں نے توبہ کی کہ آئندہ کبھی سانپ کی کینچلی کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔ میرے لئے اتنا ہی سبق کافی تھا۔ اب تو جم کو بھی موقعہ مل گیا۔ بولا: "اب تو تمہیں میری بات کا یقین آگیا ہو گا۔ کیوں، آگیا ہے یا نہیں؟ ــــ میں نے کہا تھا نا، کہ کینچلی کو چھونا بہت بڑی

بد شگونی ہوا کرتی ہے - خدا جانے اب بھی ہماری مصیبتوں کا خاتمہ ہوا ہے یا بُرے دن ابھی باقی ہیں ــــ ویسے تو بائیں کندھے کے اوپر سے چاند کو دیکھنا بھی بہت بڑی بد شگونی ہے - تاہم میں ہزار بار یہ حرکت کرنے کو تیار ہوں ــــ لیکن سانپ کی کینچلی! - اسے تو ایک بار بھی نہ چھوؤں" ــــ اور جم ہی کیا - میرا اپنا بھی اب یہی خیال تھا - اب تک تو میں یہی سمجھتا رہا تھا کہ بائیں کندھے کے اوپر سے چاند کو دیکھنا محض ایک حماقت ہے - بوڑھے ہینک بنکر نے ایک بار یہ بیوقوفی کی تھی اور نہ صرف کی تھی بلکہ بڑی شان سے اپنی اس حماقت کا چرچا بھی کیا تھا - آخر اسے اس کا خمیازہ بھگتنا ہی پڑا - دو ہی سال کے اندر اندر جناب نشے میں بے ہوش ایک بُرجی پر سے گر پڑے اور یوں چکنا چور ہوئے کہ ان کی ہڈی پسلی تک نظر نہ آئی - ان کی لاش کی جگہ صرف گوشت پوست کی ایک چادر سی فرش پر بچھی ملی اور لوگوں نے اس چادر کو تابوت میں رکھنے کی بجائے دروازے کے دو کواڑوں کے درمیان بچھا سما دیا اور یہ کواڑے جا کر قبر میں دفنا آئے - یہ تو بہ سُنی سنائی بات - میں نے خود اپنی آنکھوں سے اس کا حشر تو دیکھا نہیں لہٰذا میں اس کے صحیح ہونے کی قسم نہیں کھاتا - اور ویسے بھی یہ بات مجھے ابا نے بتائی تھی خیر کچھ بھی ہو - یہ تو حقیقت ہے ہی کہ اس کے اس حشر کا باعث صرف یہ تھا کہ اس نے بائیں کندھے کے اوپر سے چاند کو دیکھنے کی حماقت کی تھی -

دن گزرتے گئے - دریا کا پانی اتر کر پھر کناروں سے نیچے ہو گیا - ہم نے ایک بڑا سا کانٹا لے کر اس پر ایک سالم خرگوش ٹانک دیا - اور اسے پانی میں ڈال دیا - جو مچھلی ہم نے پکڑی اس کا ڈیل ڈول کم از کم آدمی جتنا ضرور ہو گا - یعنی اس کی لمبائی چھ فٹ دو انچ اور وزن دو سو پاؤنڈ سے بھی زیادہ تھا - وہ تو ہم سے سنبھالی نہ جاتی تھی اور یوں تڑپتی تھی کہ اگر اس کا ایک وار بھی ہم پر پڑ جاتا تو ہم اچھل کر الی نائیس میں گر گئے ہوتے - ہم تو کنارے پر بیٹھے بیٹھے اس کا تماشہ دیکھتے رہے - بالآخر اس نے دم توڑ دیا اور پانی میں ڈوب گئی جب اس کا پیٹ چاک کیا گیا تو اس میں سے پیتل کا ایک بٹن، ایک گیند، اور ایسی ہی کئی چیز

نکلیں۔ جب ہم نے کلہاڑی سے گیند کو توڑا، تو اس کے اندر سے سوت کا ایک گولا نکلا۔ جم کا خیال تھا کہ یہ گولا کافی مدت سے مچھلی کے پیٹ میں تھا اور اتنا عرصہ گزشت کے اندر پڑے رہنے کی وجہ سے اس پر ربڑ کی تہہ سی جم گئی تھی ـــــ میرا خیال تھا کہ اتنی بڑی مچھلی آج تک کسی نے مسّسیپی سے کبھی نہ پکڑی ہوگی۔ جب میں نے اس کا ذکر جم سے کیا تو اس نے میری تائید کی اور کہنے لگا کہ خود اس نے اس سے بڑی مچھلی کبھی نہیں دیکھی۔ اگر ہم شہر میں ہوتے، تو یہ مچھلی کافی پیسے دے جاتی۔ اتنی بڑی مچھلی تو بازار میں سیر پاؤ کے حساب سے بکتی ہے اور ہر آدمی حسب ضرورت ایک ایک ٹکڑا خرید کرلے جاتا ہے۔ اس کا گوشت برف کی طرح سفید تھا اور اسے تل کر کھانے میں بہت لطف رہتا۔

اگلے روز میں نے جم سے کہا: "زندگی بہت بے کیف ہوگئی ہے۔ اب کوئی ہنگامہ ہونا چاہیئے۔ کیوں نہ میں دریا پار جاکر وہاں کا حال چال دیکھ آؤں؟" جم کو یہ تجویز پسند آئی۔ وہ بولا: "بہتر ہوگا رات کو جاؤ اور خوب ہوشیاری سے رہو۔" پھر اس نے اس سکیم پر مزید غور کیا اور کہنے لگا: "یوں کیوں نہیں کرتے کہ پرانے کپڑے پہن لو اور لڑکی کا بھیس بدل لو۔" بات نہایت معقول تھی۔ ہم نے سوتی گاؤن کو کانٹ چھانٹ کر چھوٹا کیا۔ پھر میں نے اپنی پتلون کے پائنچے لپیٹ کر اور گھٹنوں تک چڑھا لئے اور یہ گاؤن پہن لیا۔ جم نے ہُک لگا کر اسے پیچھے سے یوں کس دیا کہ یہ مجھے بالکل فٹ آگیا۔ اس کے بعد میں نے ہیٹ پہنا اور اس کے فیتے کو نیچے ٹھوڑی پر باندھ لیا۔ اب میرا حلیہ یہ تھا کہ اگر کوئی میرے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کرے تو اسے یوں لگے جیسے وہ کسی دودکش کے اندر جھانک رہا ہو۔ جم کو یقین تھا کہ اگر کوئی مجھے دن میں بھی اس لباس میں دیکھے تو پہچان نہ پائے کہ میں لڑکی ہوں یا لڑکا۔ سارا دن میں مشق کرتا رہا تاکہ لڑکیوں ایسی باتیں سیکھ لوں۔ رفتہ رفتہ مجھے خاصی مہارت ہوگئی۔ مگر جم کا خیال تھا کہ ویسے تو سب ٹھیک ہے لیکن ایک کمی پھر بھی رہ گئی ہے اور وہ یہ کہ میری چال لڑکیوں ایسی نہیں۔ وہ بولا: "گاؤن اوپر اٹھا کر پتلون کی جیب میں ہاتھ

ڈالنے کی عادت چھوڑ دو۔" میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور نتیجہ کافی تسلی بخش رہا۔

رات ہوتے ہی میں نے کشتی لی اور الی نائس کے ساحل کی طرف روانہ ہو گیا۔ گھاٹ سے ذرا ادھر ہی میں نے کشتی کا رُخ اس ساحل کی طرف کر دیا جہاں دریا کے اُس پار شہر واقع تھا۔ دھارے کے ساتھ بہتا بہتا میں کنارے پر اس جگہ جا لگا جہاں شہر کی آبادی ختم ہو جاتی تھی۔ میں نے کشتی باندھ دی اور کنارے کنارے چلنے لگا۔ تھوڑی دور جا کر مجھے ایک جھونپڑی میں روشنی نظر آئی۔ یہ جھونپڑی کافی عرصے سے غیر آباد پڑی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ یہ کون شخص ہے جس نے یہاں رہائش اختیار کر لی ہے۔ خیر، دبے پاؤں چلتا چلتا میں جھونپڑی کے قریب جا پہنچا اور کھڑکی میں سے جھانکنے لگا۔ اندر ایک عورت بیٹھی تھی جس کی عمر لگ بھگ چالیس برس کی ہوگی۔ وہ میز پر رکھی موم بتی کی روشنی میں کچھ بُن رہی تھی۔ اس کا چہرہ میرے لئے اجنبی تھا۔ شہر کے باشندوں میں ایسا کوئی نہ تھا جسے میں نہیں جانتا۔ اس اجنبی چہرے کو دیکھ کر میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ شہر کے سب لوگ میری آواز تو پہچانتے ہی تھے لہٰذا میں جس سے بھی بات کرتا، وہ فوراً مجھے پہچان لیتا۔ اسی لئے اب مجھے کچھ کچھ ڈر سا لگنے لگا تھا۔ لیکن میں نے سوچا کہ خواہ اس عورت کو آئے دو ہی دن کیوں نہ ہوئے ہوں، ہمارا شہر اتنا چھوٹا سا ہے کہ اب تک اسے ساری خبروں کا علم ہو گیا ہوگا۔ ممکن ہے اس سے بات چیت کر کے مجھے سب باتوں کا پتہ چل جائے۔ میں نے دروازے پر دستک دی اور دل ہی دل میں یہ سبق دھرانے لگا۔

"میں لڑکی ہوں۔ میں لڑکی ہوں۔"

۱۱۔ ایک اور عورت ۔ تلاش ۔ ٹال مٹول ۔

گوشن کی طرف کوچ

"اندر چلے آؤ"، عورت نے کہا۔ میں اندر چلا گیا۔

"کرسی لے لو" وہ بولی۔

میں بیٹھ گیا۔ اس کی چمکدار آنکھوں نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا پھر وہ بولی: "کیا نام ہے تمہارا؟"

"سارہ ویمز"

"کہاں رہتی ہو؟ یہیں پڑوس میں؟"

"جی نہیں ہُکر وِیل میں۔ یہ قصبہ یہاں سے سات میل دور نشیبی حصے میں واقع ہے میں سارا راستہ پیدل چل کر آئی ہوں، اور تھک کر چور ہو گئی ہوں"

"بھوک بھی لگی ہو گی؟ دیکھوں۔ شاید کچھ کھانے کو مل جائے"

"جی نہیں۔ اس وقت تو بھوک نہیں۔ دراصل مجھے اتنی بھوک لگی تھی کہ میں دو میل ادھر ہی ایک فارم پر رک گئی اور وہاں کچھ کھا پی لیا۔ اب مجھے بھوک نہیں۔ اسی میں تو مجھے دیر ہو گئی۔ میری ماں کو بخار آ گیا ہے اور ہمارے پاس ایک پیسہ بھی نہیں۔ میں اپنے چچا ابنر مور کو خبر دینے آئی ہوں۔ ماں نے بتایا تھا کہ وہ شہر کے اس سرے پر رہتا ہے۔ میں پہلے کبھی شہر نہیں آئی۔ آپ تو انہیں جانتی ہوں گی"

"نہیں تو ـــــ مجھے یہاں آئے کل دو ہفتے تو ہوئے ہیں۔ اس لئے سب سے تعارف نہیں ہو سکا۔ شہر کا وہ حصہ تو یہاں سے خاصا دور ہے۔ تم رات یہیں کیوں نہیں رہ جاتیں؟

ہیٹ اتار لو اور آرام سے بیٹھو۔"

"جی نہیں۔ میں ذرا سستا لوں، پھر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاؤں گی۔ میں اندھیرے سے نہیں ڈرتی۔"

لیکن وہ مُصر تھی کہ مجھے اکیلی نہیں جانے دے گی۔ بولی:

"میرا شوہر آنے ہی والا ہے۔ شاید گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں آ جائے۔ میں اس سے کہوں گی کہ تمہیں چھوڑ آئے۔"

اس کے بعد وہ اپنے شوہر کی باتیں کرنے لگیں اور پھر اپنے ان رشتہ داروں کی جو دریا کے اُدھر رہتے تھے اور اس کے بعد ان رشتہ داروں کی جو دریا کے اِدھر رہتے تھے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ کسی زمانے میں وہ بہت امیر ہوا کرتے تھے۔ اور یہ کہ شہر آ کر شاید انہوں نے غلطی کی ہے۔ انھیں وہیں اپنی پرانی جگہ پر ہی رہنا چاہیے تھا ——— بس وہ یونہی باتیں کرتی رہی، کرتی رہی، حتیٰ کہ مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ غلطی میری ہی ہے کہ شہر کے حالات جاننے کے لئے اس کے پاس چلا آیا۔ خیر تھوڑی دیر بعد اس کی باتوں کا رُخ پلٹا اور وہ ابّا کا اور میرے قتل کا ذکر لے بیٹھی۔ یہی تو وہ موضوع تھا جسے سننے کے لئے میں اس قدر بے تاب تھا۔ میں نہایت انہماک سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس نے بتایا کہ کس طرح تمام سائے کو اور مجھے چھ ہزار ڈالر ہاتھ لگے تھے۔ (البتہ اس کے بیان میں یہ رقم چھ ہزار کی بجائے دس ہزار ڈالر بن گئی تھی) پھر ابّا کا ذکر کرتے ہوئے اس نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ اس کی تقدیر کتنی کھوٹی ہے اور یہ بھی کہ میری تقدیر کتنی کھوٹی تھی۔ خدا خدا کر کے وہ بالآخر اس موضوع پر آ ہی گئی جس کا مجھے انتظار تھا۔ جب میرے قتل کا ذکر شروع ہوا، تو میں نے پوچھا:

"لیکن آخر یہ قتل کیا کس نے ہے؟ ہکروبل میں بھی ہم نے اس کا بہت چرچا سنا ہے لیکن ابھی تک ہمیں یہ پتہ نہیں چلا کہ قاتل تھا کون؟"

"تم وہاں کی بات کرتی ہو۔ یہی تو وہ سوال ہے جس کا جواب جاننے کے لئے یہاں اس شہر کا

بچہ بچہ بے تاب ہے۔ کئی تو یہاں تک کہتے ہیں کہ شائد باپ نے خود ہی اپنے بیٹے کو قتل کر دیا ہو۔"

"کیا؟ باپ نے؟؟ لوگ ایسا بھی کہتے ہیں؟"

"شروع شروع میں تو تقریباً سبھی کا یہی خیال تھا۔ اس بڈھے کو تو خدا کا شکر کرنا چاہیئے کہ موت کے منہ سے بال بال بچ گیا۔ لوگ تو شائد اسے اسی رات مار ڈالتے، لیکن خیریت ہوئی کہ انہوں نے ارادہ بدل لیا۔ ہوا یہ کہ اسی رات جِم نام کا ایک حبشی بھی غائب ہو گیا اور لوگوں کو شک گذرا کہ شائد قاتل وہی ہو۔"

"لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟ —— وہ تو......"

میں نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ بہتری اسی میں تھی کہ میں خاموش رہوں۔ وہ عورت اپنی باتوں میں اس قدر محو تھی کہ اسے یہ تک پتہ نہ چلا کہ میں نے بھی کچھ کہا ہے۔

"ہاں تو وہ حبشی بھی اسی رات سے غائب ہے جس رات ہَک فن کا قتل ہوا تھا۔ اب اس حبشی کو پکڑنے کے لئے تین سو ڈالر کا انعام رکھا گیا ہے۔ ویسے دو سو ڈالر کا انعام اس بڈھے باپ کو پکڑنے کے لئے بھی رکھا گیا ہے۔ حادثے کی صبح وہ بڈھا شہر آیا اور اس واردات کی اطلاع دی اور پھر لوگوں کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر لاش کو ڈھونڈتا رہا۔ اس کے بعد وہ غائب ہو گیا۔ رات تک لوگوں کو پکا یقین ہو گیا کہ مجرم وہی ہے۔ اور وہ اسے مار ڈالنے پر تل گئے۔ لیکن خوش قسمتی سے وہ ان کے ہتھے نہ چڑھا۔ اور اگلے دن یہ حبشی غائب ہو گیا۔ حبشی اسی رات دس بجے کے بعد سے لاپتہ ہے۔ لہٰذا لوگوں نے وہ قتل اسی حبشی کے سر تھوپ دیا۔ ابھی یہ چرچا گرم ہی تھا کہ اگلے روز وہ بڈھا بھی آن وارد ہوا اور جج تھیچر کے پاس جا کر لگا شور مچانے۔ اس کا مطالبہ تھا کہ وہ چھ ہزار ڈالر اس کے حوالے کئے جائیں تاکہ وہ اس رقم کی مدد سے تمام الی نائس کا چپہ چپہ چھان کر اس حبشی کو کھوج نکالے۔ آخر جج نے اسے کچھ رقم دے کر جان چھڑائی اور اسی شام وہ نشے میں دُھت آدھی رات تک دو مشکوک قسم کے اجنبیوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتا رہا۔ اور پھر انہی کے ساتھ کہیں چلا گیا۔ تب سے اس کا کچھ پتہ نہیں۔ لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ

جب تک معاملہ ٹھنڈا نہیں پڑ جاتا، وہ آنے کا نہیں۔ اب لوگوں کو دوبارہ یقین ہو گیا ہے کہ اصلی قاتل وہی ہے۔ اور یہ سارا ڈھونگ اس نے اس لئے رچایا ہے کہ لوگ یہ سمجھیں کہ قتل ڈاکوؤں نے کیا ہے اور وہ بغیر مقدمہ لڑے چپکے سے بنک کی رقم وصول کرے۔ اب تو سب کو یقین ہو گیا ہے کہ اس جیسا آدمی اپنے بیٹے کو بھی قتل کرنے سے گریز نہیں کر سکتا۔ میرا اپنا بھی یہی خیال ہے کہ وہ نہایت مکار ہے۔ اگر وہ ایک سال تک نہ آئے تو اس کے بعد کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا اس کے خلاف ثبوت تو کوئی ہے نہیں۔ اور تب تک ساری بات لوگوں کو بھول جائے گی بس پھر کیا ہے۔ وہ نہایت مزے سے بنک کی رقم ہضم کرے گا۔"

"بات جچتی تو ہے۔ اگر یہ واقعہ نہ بھی ہو، تو بھی ناقابلِ تردید ضرور ہے۔ اب تو سبھی یہ سمجھتے ہوں گے کہ اس حبشی کا قتل سے کوئی تعلق نہیں؟"

"سبھی تو خیر نہیں۔ اب بھی بہت سے لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ قاتل وہی ہے۔ حبشی نواب جلد ہی پکڑا جائے گا۔ اسے مار پیٹ کر سب کچھ اگلوا لیں گے۔"

"کیوں؟ تو کیا وہ ابھی تک اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں؟"

"تم بھی کتنی بھولی ہو! تین سو ڈالر کا انعام روز روز تھوڑے ہی ملا کرتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ حبشی یہیں کہیں چھپا ہوا ہے خیال تو میرا بھی یہی ہے لیکن ابھی تک میں نے کسی سے اپنے شکوک کا اظہار نہیں کیا۔ ابھی کچھ روز پہلے ان پڑوسیوں سے، جو ساتھ والے لکڑی کے مکان میں رہتے ہیں، اسی موضوع پر بات چیت ہو رہی تھی۔ وہ حیران تھے کہ لوگ اسے جیکسن جزیرے پر جا کر کیوں نہیں کھوجتے۔ جب میں نے پوچھا، 'کیوں؟ وہاں کوئی رہتا نہیں کیا؟' تو انہوں نے بتایا کہ وہ جگہ بالکل غیر آباد ہے، اس وقت تو خیر میں خاموش رہی۔ لیکن تب سے میں نے اس معاملے پر کافی غور کیا ہے۔ مجھے پکا یقین ہے کہ ابھی دو ایک روز پہلے میں نے اس جزیرے کے سرے کے قریب سے دھواں اٹھتا دیکھا تھا۔ میں نے سوچا عین ممکن ہے وہ حبشی وہیں چھپا ہو۔ خیر، میرا خیال ہے کہ جزیرے میں تلاش بھی ہو ہی

جانی چاہیئے۔ ہاں، البتہ اس روز کے بعد دھواں پھر دکھائی نہیں دیا۔ ہوسکتا ہے وہ حبشی یہاں سے بھی رفو چکر ہوگیا ہو۔ تاہم میرے شوہر کا ارادہ ہے کہ ایک اور شخص کو ہمراہ لے کر اس جگہ کی چھان بین کرے وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا اور ابھی دو ہی گھنٹے پہلے لوٹا ہے۔ آتے ہی میں نے اسے یہ بات بتادی تھی۔"

اس عورت کی باتیں سُن کر میں اتنا پریشان ہوگیا کہ میرے لئے نچلا بیٹھنا محال ہوگیا۔ میرے لئے لازمی تھا کہ کسی نہ کسی طرح اپنے ہاتھوں کو مصروف رکھوں۔ میں نے میز پر سے ایک سوئی اٹھائی اور اس میں دھاگہ ڈالنے لگا۔ میرے ہاتھ لرز رہے تھے۔ تاہم میں نہایت ہی بھونڈے پن سے دھاگہ ڈالنے کی کوشش کرتا رہا۔ عورت یکلخت خاموش ہوگئی اور میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ عجیب انداز سے میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرائے جارہی تھی۔ میں نے سوئی اور دھاگہ وہیں میز پر رکھ دیئے اور یوں ظاہر کرنے لگا جیسے اس کی گفتگو ہی میری تمام تر دلچسپی کا مرکز ہو۔ اور یہ حقیقت بھی تھی۔ دلچسپی تو مجھے تھی ہی میں نے کہا: "تین سو ڈالر تو بہت بڑی رقم ہوتی ہے کاش یہ رقم میری ماں کو مل جائے! ——— اچھا، تو آپ کے شوہر آج رات ہی وہاں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"ہاں، ہاں ——— وہ تو اس دوسرے آدمی کے ساتھ جس کا میں نے ذکر کیا ہے، شہر گیا ہی اس لئے ہے کہ اگر ہوسکے تو ایک کشتی کا بندوبست کرے اور کسی سے بندوق بھی مانگ لائے۔ آدھی رات کے بعد وہ اپنی مہم پر روانہ ہوجائیں گے۔"

"لیکن اگر وہ رات کی بجائے دن کو جائیں تو شاید انہیں ڈھونڈنے میں آسانی رہے گی۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن آسانی تو حبشی کو بھی رہے گی۔ آدھی رات کے بعد وہ خوب مزے سے سویا ہوگا اور اسے پتہ بھی نہ چلے گا کہ کوئی شخص جنگل میں آیا بھی ہے یا نہیں۔ یہ دونوں چپکے چپکے اس جگہ کو ڈھونڈ لیں گے۔ جہاں آگ جل رہی ہوگی۔ اگر حبشی آگ جلا کر سویا ہوگا تو یہ آگ اندھیرے میں دور سے نظر آجائے گی۔"

"اوہ! اس بات کا تو مجھے خیال ہی نہیں آیا۔"

عورت ایک بار پھر بڑے غور سے میری طرف دیکھ رہی تھی جس سے مجھے کچھ تشویش سی ہونے لگی —— تھوڑی دیر بعد وہ بولی!

"کیا نام بتایا تھا تم نے بیٹی؟"

"م — میری ولیمز۔" میں نے جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی، پتہ نہیں کیوں، مجھے یوں محسوس ہوا کہ جو نام میں نے پہلے بتایا تھا، وہ میرا نہیں تھا۔

میں نے سر جھکا کر آنکھیں فرش پر گاڑ دیں۔ میرا خیال تھا کہ اس سے پہلے میں اپنا نام سارہ بتا چکا ہوں۔ میں تذبذب میں پڑ گیا لیکن مجھے یہ بھی خوف تھا کہ کہیں یہ عورت میری پریشانی کو نہ بھانپ لے۔ میں چاہتا تھا کہ عورت یوں خاموش نہ بیٹھے بلکہ بولتی چلی جائے، بولتی چلی جائے۔ اس کے یوں خاموش رہنے سے میرے شکوک اور بھی پختہ ہوتے جا رہے تھے —— بالآخر وہ بولی:

"لیکن میرا خیال ہے کہ جب تم آئی تھیں، تو تم نے اپنا نام سارہ بتایا تھا۔"

"جی ہاں — میرا پورا نام ہے۔ سارہ میری ولیمز۔ سارہ پہلا نام ہے بعض لوگ مجھے سارہ کہہ کر پکارتے ہیں اور بعض میری۔"

"اچھا۔ تو یہ بات ہے!"

"جی۔"

میں نے سمجھا بات ٹل گئی ہے۔ اب میری کوشش یہ تھی کہ جتنی جلدی ہو سکے، یہاں سے نکلوں۔ مجھ میں اتنی جرأت نہ تھی کہ اس عورت کے ساتھ آنکھ ملا کر بات کر سکوں۔

پھر، اس کے بعد عورت ناسازگار حالات کا رونا لے بیٹھی۔ "آج کل تو گزارہ ہی بڑی مشکل سے ہوتا ہے" —— "یا یہ کہ یہاں یوں دندناتے پھرتے ہیں جیسے یہ جگہ انہی کی مملکت ہو" وغیرہ وغیرہ۔ یہ باتیں سن کر میری تشویش قدرے کم ہوئی۔ چوہوں کے

بارے میں تو جو کچھ اس نے کہا تھا۔ وہ حرف بحرف صحیح تھا کیونکہ ہر دو منٹ بعد کونے والے بل میں سے کسی نہ کسی چوہے کی تھوتھنی نظر آجاتی تھی۔ عورت نے بتایا کہ جب وہ اکیلی ہوتی ہے تو اپنے پاس کوئی نہ کوئی چیز ایسی ضرور رکھتی ہے جو بوقت ضرورت چوہوں پر نشانہ لگانے کے کام آسکے۔ ورنہ یہ چوہے تو ایک پل چین نہ لینے دیں۔ اس نے سیسے کی ایک لمبی سی ڈلی اٹھائی جو ایک سرے پر مڑی ہوئی تھی، اور بولی: "جب میں اس سے نشانہ لگاتی ہوں، تو نشانہ اکثر ٹھیک بیٹھتا ہے۔ لیکن ابھی دو ایک دن پہلے نشانہ لگاتے لگاتے میرے بازو میں موچ آگئی تھی، لہٰذا میں وثوق سے نہیں کہہ سکتی کہ اب میرا نشانہ صحیح بیٹھے گا یا نہیں" تاہم وہ موقعہ کی تاک میں رہی اور جونہی ایک چوہے نے تھوتھنی نکالی، اس نے بیتابی سے وہ ڈلی اس پر دے ماری۔ مگر نشانہ غلط رہا۔ اور "ہائے" کہہ کر اس نے اپنا بازو تھام لیا۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ اگلے چوہے پر میں نشانہ لگاؤں۔ میں چاہتا تھا کہ اس کے شوہر کے آنے سے پہلے پہلے یہاں سے نکل جاؤں۔ لیکن بغیر موقعہ ملے کیسے بھاگ اٹھتا؟ میں نے ڈلی اٹھالی اور جونہی ایک چوہے نے گردن نکالی میں نے نشانہ باندھ کر ڈلی اس پر دے ماری۔ اگرچہ چوہا ایک سیکنڈ اور گردن بل کے باہر رہنے دیتا تو اس کی خیر نہیں تھی۔ عورت میرے اس نشانے سے بہت متاثر ہوئی اور تعریف کرتے ہوئے بولی: "کوئی بات نہیں۔ اگلا چوہا تمہارے ہاتھوں سے نہیں بچ سکتا۔" وہ ڈلی اٹھا لائی اور پھر سوت کی ایک انٹی مجھے دیتے ہوئے بولی: ذرا اسے پکڑے رکھو۔ میں گولا بنا لوں" اور بغیر اس کے کہ میں کچھ کہوں، اس نے وہ انٹی میرے ہاتھوں کے گرد لپیٹ دی اور پھر اپنے شوہر کی باتیں کرنے لگی۔ باتیں کرتے کرتے اچانک وہ رک گئی اور بولی:

"ذرا چوہوں پر بھی نظر رکھو۔ اور اس ڈلی کو اپنی جھولی میں رکھو تاکہ موقع پر چوک نہ ہو۔ یہ کہتے ہی اس نے وہ ڈلی میری جھولی میں پھینک دی۔ میں نے فوراً اس دونوں ٹانگوں میں پکڑ لیا۔ اور وہ پھر باتیں کرنے میں مصروف ہو گئی۔ لیکن ایک ہی منٹ بعد اس نے وہ

انٹی میرے ہاتھوں پر سے اتار لی، اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے ہوئے بولی:

"ہاں، تو اب بتاؤ تمہارا اصلی نام کیا ہے؟"

"ک۔کیا مطلب؟" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"تمہارا اصلی نام کیا ہے؟ بل؟ ٹام؟ یا باب؟ یا کچھ اور؟"

میں تھر تھر کانپنے لگا۔ میری سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کیا کروں۔ میں نے کہا۔

"آپ مجھ بیچاری لڑکی سے کیوں مذاق کرتی ہیں؟ اگر آپ کو میرا یہاں ٹھہرنا پسند نہیں، تو میں ——"

"نہیں! تم یوں نہیں جا سکتے۔ وہیں بیٹھے رہو! —— سنو، میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی، نہ تمہارا راز کسی پر ظاہر کروں گی۔ صرف تم اصل بات مجھے بتا دو۔ مجھ پر اعتماد رکھو میں تمہارا راز کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ اور اگر ممکن ہوا تو تمہاری مدد کروں گی —— میرا شوہر بھی تمہاری ہر طرح مدد کرے گا۔ یہ تو میں نے بھانپ لیا ہے کہ تم اپنی نوکری سے بھاگ آئے ہو۔ مگر یہ کوئی ایسا سنگین جرم تو ہے نہیں۔ تم نے کسی کو نقصان تھوڑا ہی پہنچایا ہے؟ —— اُن لوگوں نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا ہوگا اور تم بھاگ آئے یہی نا۔ تو پھر کیا ہوا؟ تم ساری بات مجھے بتا دو۔ میں کسی سے نہیں کہوں گی۔"

"اب جب میرا بھید کھل ہی گیا ہے" میں نے کہا "تو کیوں نہ ساری بات سچ سچ کہہ دوں۔ بات یہ ہے جی، کہ جب میرے ماں باپ مر گئے تو قانون کے مطابق مجھے ایک کمینے قسم کے بوڑھے کسان کی شاگردی میں دے دیا گیا، جو یہاں سے تیس میل دور رہتا ہے۔ مگر وہ کسان مجھ سے اتنا برا برتاؤ کرتا تھا کہ میں اسے برداشت نہ کر سکا۔ جونہی وہ دو دن کے لئے کہیں باہر گیا۔ میں نے موقع کا فائدہ اٹھایا اور اس کی بیٹی کے پرانے کپڑے چرا کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ یہ تیس میل کا سفر میں نے تین راتوں میں طے کیا ہے۔ دن کو میں چھپ کر آرام کرتا، اور رات کو سفر کرتا۔ میں ایک تھیلے میں روٹی اور گوشت بھر لایا تھا اور راستے میں انہی

سے کام چلاتا رہا۔ مجھے امید ہے کہ چچا ایبز مور مجھے سہارا دے گا۔ تبھی تو میں سیدھا اس گوشن میں چلا آیا ہوں۔"

"گوشن؟ لیکن اس شہر کا نام گوشن تو نہیں۔ یہ تو سینٹ پیٹرز برگ ہے۔ گوشن تو دریا کے منبع کی طرف دس میل اوپر ہے۔ تمہیں کس نے بتایا تھا کہ اس شہر کا نام گوشن ہے؟"

"ایک آدمی نے۔ آج صبح جب میں جنگل میں سونے کے لئے جا رہا تھا تو میں نے اس آدمی سے گوشن کا راستہ پوچھا اور اس نے بتایا کہ اس چوک پر جہاں سڑک دو حصوں میں بٹ جاتی ہے، میں داہنی طرف کی سڑک پکڑ لوں۔ پانچ میل بعد گوشن آ جائیگا۔"

"اس نے یقیناً پی رکھی ہو گی۔ اس نے تمہیں بالکل الٹ بتایا ہے۔"

"اچھا؟ — اور ہاں، اب آپ نے کہا تو مجھے کچھ یاد آتا ہے کہ اس کی چال ڈھال سے واقعی یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ نشے میں ہے۔ لیکن خیر، کوئی بات نہیں۔ اب چلتا ہوں، صبح ہونے تک گوشن پہنچ جاؤں گا۔"

"ایک منٹ رکو۔ کچھ کھانے کو لیتے جاؤ۔ شاید راستے میں ضرورت پڑ جائے"

اس نے کھانے کی کچھ چیزیں مجھے دے دیں اور بولی۔

"اچھا یہ تو بتاؤ جب لیٹی ہوئی گائے اٹھنے لگتی ہے، تو اس کے جسم کا کون سا حصہ سب سے پہلے زمین سے اٹھتا ہے؟۔ سوچو مت، فوراً جواب دو۔ ہاں، کون سا حصہ پہلے اٹھتا ہے؟"

"پچھلا حصہ"

"اور گھوڑے کا؟"

"اگلا"

"درخت کے کس طرف سب سے زیادہ کائی اگتی ہے؟"

"شمال کی طرف"

"اگر پندرہ گائیں ایک پہاڑی پر چر رہی ہوں، تو ان میں سے کتنی گایوں کے منہ ایک ہی طرف کو ہوں گے؟"

"پندرہ کی پندرہ کے۔"

"تم تو واقعی دیہات میں رہتے رہے ہو۔ مجھے شک تھا کہ شاید اب کی بار تم نے پھر مجھے دھوکہ دینے کی کوشش کی ہو۔ اچھا، اب بتاؤ، تمہارا اصلی نام کیا ہے؟"

"جارج پیٹرز۔"

"اب اسے یاد رکھنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جب میں دوبارہ پوچھوں، تو تم کہہ دو کہ تمہارا نام الیگزینڈر ہے۔ اور پھر جب جھوٹ پکڑا جائے تو کہہ دو کہ نہیں تمہارا پورا نام جارج الیگزینڈر ہے — اور سنو، ان کپڑوں کو پہن کر عورتوں کے پاس مت جانا۔ تم سے لڑکی کا سوانگ نہیں رچایا جاتا۔ مردوں کو تو شاید تم دھوکہ دے دو۔ مگر عورتوں کو نہیں دے سکتے — اور بیٹے، سوئی میں دھاگہ ڈالتے وقت دھاگہ کو پکڑ کر سوئی اس کے پاس نہیں لاتے، بلکہ سوئی پکڑ کر دھاگہ اس میں سے گزارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کم از کم عورتیں اسی طرح دھاگہ ڈالتی ہیں۔ ہاں البتہ مرد وہ تمہارے والا طریقہ ہی استعمال کرتے ہیں اور جب چوہے پر یا کسی اور چیز پر نشانہ مارنے لگو، تو پہلے تو پنجوں کے بل کھڑے ہو جاؤ اور پھر نہایت بھونڈے پن سے اپنا بازو دھیرے دھیرے سر کے اوپر تک لے جاؤ اور یوں پھینکو کہ نشانہ کم از کم چھ سات فٹ دور لگے۔ اور پھینکتے وقت بازو کو اکڑا کر شانے کو یوں جھٹکا دو۔ گویا بازو شانے کے گرد گھوم رہا ہو۔ لڑکیاں ایسے ہی پھینکتی ہیں۔ تمہاری طرح نہیں کہ بازو کو ایک طرف کر کے کلائی اور کہنی کو جھٹکا دیا۔ اس طرح تو لڑکے پھینکتے ہیں۔ ایک بات اور جب کوئی چیز کسی لڑکی کی جھولی میں گرتی ہے تو وہ اپنے گھٹنے چوڑے پھیلا دیتی ہے۔ انہیں جکڑ نہیں لیتی جیسے تم نے ڈلی سنبھالتے وقت کیا تھا۔ جب تم سوئی میں دھاگہ ڈال رہے تھے میں تو اسی وقت سمجھ گئی تھی کہ تم لڑکی نہیں ہو۔ باقی کے سب امتحان تو صرف اس لئے تھے کہ

شک کی گنجائش نہ رہے۔ اچھا، سارہ میری دلبر، جارج الیگزینڈر پیٹرس! اب تم سیدھے اپنے چچا کے پاس چلے جاؤ۔ اگر کبھی تمہیں کوئی دقت پیش آئے۔ تو بے جھجک مسز جوڈتھ لاقٹس کو، یعنی مجھے، اطلاع دینا۔ میں تمہاری ہر ممکن مدد کرنے کی کوشش کروں گی۔ دریا کے ساتھ والی سڑک پر ناک کی سیدھ میں چلتے جاؤ۔ اور ہاں اگلی بار جب تم پیدل سفر کرو تو موزے اور جوتے ساتھ لینا مت بھولنا۔ دریا کنارے والی سڑک بہت پتھریلی ہے۔ گوشن پہنچتے پہنچتے تمہارے پیروں کی بُری حالت ہو جائے گی۔"

میں دریا کے کنارے کنارے چل پڑا۔ کوئی پچاس گز دور جا کر میں پیچھے مڑا اور اس مکان کے پاس سے بھاگتا ہوا اس جگہ پہنچ گیا، جہاں میری کشتی بندھی تھی۔ میں نے کشتی میں چھلانگ لگائی اور ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر تیزی سے روانہ ہو گیا۔ دریا کے منبع کی طرف میں نے اس جگہ کا رخ کیا جہاں سے جزیرے کا اگلا سرا قریب پڑتا تھا۔ میں نے ہیٹ اتار لیا تاکہ دیکھنے میں کوئی رکاوٹ نہ آئے۔ ابھی میں دریا کے وسط میں ہی تھا کہ گھڑیال بجنے لگا۔ میں ہمہ تن گوش ہو کر گننے لگا۔ پانی پر سے گزر کر آتی ہوئی گھنٹے کی آواز مدھم مگر بالکل صاف سنائی دے رہی تھی۔ گھڑیال نے گیارہ بجائے۔ میرا سانس پھول گیا تھا۔ تاہم جزیرے کی طرف مڑنے سے پہلے میں نے دم لینا بھی مناسب نہ سمجھا اور سیدھا اس جنگل کا رُخ کیا جہاں میں نے پہلے پہل ڈیرہ جمایا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی میں نے بہت سا ایندھن اکٹھا کیا اور ایک اونچی، خشک سی جگہ پر بڑا سا الاؤ جلا دیا۔

اس کے بعد میں کشتی لے کر اپنی غار کی طرف چل پڑا جو وہاں سے کوئی ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھی۔ کشتی کو کنارے پر باندھ کر میں نے بھاگتے ہوئے جنگل کو طے کیا اور پہاڑی پر چڑھ گیا۔ غار میں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ جم خوب مزے سے سویا ہوا تھا۔ میں نے اسے جگایا اور کہا۔

"اٹھو۔ فوراً تیار جاؤ۔ ایک منٹ بھی ضائع مت کرو۔ وہ لوگ ہمارا تعاقب کر رہے ہیں۔"

جم نے نہ تو کوئی سوال پوچھا، نہ منہ سے کچھ بولا۔ تاہم جس افراتفری میں اس نے وہ آدھ

گھنٹہ گزارا اس سے ظاہر تھا کہ اس کی جان پر بنی ہوئی ہے۔ آدھے ہی گھنٹے میں ہمارا سب سامان بندھ کر تیار ہو گیا اور ہم بیڑے میں جا بیٹھے جو بید کی جھاڑیوں میں چھپا تھا۔ روانہ ہونے سے پہلے ہم نے اس آگ کو جو غار کے اندر جل رہی تھی، اچھی طرح بجھا دیا اور پھر بغیر کسی مشعل کے چل پڑے۔

دریا میں داخل ہونے سے پہلے میں نے کشتی پر ادھر اُدھر دو ایک چکر کاٹے تاکہ دیکھوں کوئی کشتی تو اس طرف نہیں آ رہی۔ اگر کوئی کشتی ہو گی بھی، تو کم از کم مجھے نظر نہ آئی کیونکہ گہرے سایوں میں ستاروں کی روشنی کچھ زیادہ مدد نہیں کر پاتی۔

ہم نے بیڑا نکالا اور تاریکی میں اسے آہستہ آہستہ کھینے لگے۔ بغیر آواز کئے ہم آگے بڑھتے رہے حتیٰ کہ جزیرے کو پار کر گئے۔ اس دوران میں ہم نے نہ تو اونچا سانس لیا۔ اور نہ ہی ایک لفظ منہ سے نکالا۔

---

۱۲ ۔ سست رفتار بحری سفر۔ "ادھار"۔ غرقاب کشتی کی چھان بین۔ سازشی۔ کشتی کی کھوج۔

بیڑا نہایت سست رفتاری سے چل رہا تھا۔ جزیرہ پار کرتے کرتے ہمیں ایک بج گیا اب ہم ایسی جگہ پہنچ گئے تھے کہ اگر کوئی کشتی ہمارا تعاقب کرتی بھی۔ تو ہم فوراً ناؤ میں بیٹھ کر الی نائیس کے ساحل پر جا اُترتے۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ کسی نے ہمارا تعاقب نہیں کیا ورنہ خاصی مشکل پڑتی ہم ناؤ میں اپنے ساتھ بندوق رکھنا بھول گئے تھے اور بندوق ہی کیا۔ بنسی تک لینے کا ہمیں خیال نہ رہا چلتے وقت ہم اس قدر افراتفری میں تھے کہ سارا سامان بیڑے پر ہی لاد دیا۔ یقیناً

یہ ہماری غلطی تھی۔

پتہ نہیں، وہ لوگ جزیرے پر گئے بھی یا نہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اگر وہ لوگ واقعی وہاں آئے ہوں گے تو انہوں نے سیدھا اس جگہ کا رُخ کیا ہو گا جہاں میں نے الاؤ جلایا تھا۔ اور پھر تمام رات وہ اس الاؤ کے پاس اس امید پر پہرا دیتے رہے ہوں گے کہ جم اب آیا کہ آیا۔ میں نے اپنی طرف سے انہیں مغالطے میں ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ اور اگر کسی وجہ سے وہ دھوکے میں نہ آئے ہوں۔ تو اس میں میرا کیا قصور؟ وہ لوگ دھوکے میں آئے یا نہیں، بہر حال میری سکیم میں کوئی کمی نہ تھی۔

جب تڑکا ہونے لگا تو ہم نے کشتی کو ساحل کے موڑ پر ایک پٹڑی کے ساتھ باندھ دیا اور کلہاڑے سے درختوں کی ٹہنیاں کاٹ کر اسے یوں اچھی طرح ڈھانپ دیا کہ دور سے دیکھنے پر یہی نظر آتا تھا جیسے ساحل نیچے دھنس گیا ہو۔ یہ الی نائس کا ساحل تھا اور اس ریتلی پٹڑی پر درختوں اور جھاڑیوں کے جھنڈ کنگھی کے دانتوں کی طرح اُگے ہوئے تھے۔

سامنے مسوری کا ساحل تھا جہاں پہاڑ ہی پہاڑ تھے۔ ادھر کا، یعنی الی نائس کا ساحل گنجان جنگلوں سے اٹا پڑا تھا۔ یہاں پانی کا دھارا مسوری کے ساحل کی طرف بہہ رہا تھا۔ لہٰذا کسی شخص کے ادھر آ نکلنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ سارا دن ہم درختوں کے پیچھے لیٹے رہے اور بیڑوں اور جہازوں کو مسوری کے ساحل کے قریب سے گزرتا دیکھتے رہے رہا۔ بہاؤ کے رخ چلنے والی کشتیاں تیزی سے نکل جاتیں لیکن مخالف سمت جانے والی کشتیوں کو خاصی جدوجہد کرنی پڑتی۔ یہاں پہنچ کر میں نے جم کو وہ ساری باتیں تفصیلاً کہہ سنائیں جو اس عورت نے مجھ سے کہی تھیں۔ جم بولا: "وہ عورت بہت ہوشیار ہے۔ اگر کہیں وہ خود ہماری تلاش میں آتی ہمنی، تو رات بھر آگ کے پاس پہرا نہ دیتی۔ وہ ان میں سے نہیں جو آگ کے پاس بیٹھے پہرا دیتے رہتے ہیں۔ وہ تو اپنے ساتھ کتا لے کر آتی۔" میں نے کہا: "اگر یہی بات ہے تو اس نے یہ مشورہ اپنے شوہر کو کیوں نہ دیا؟" جم بولا: "دیا تو ضرور ہو گا مگر ذرا دیر سے یعنی

اس وقت جب وہ روانہ ہونے لگے ہوں گے۔ اور چونکہ کتا ان کے پاس ہے نہیں لہٰذا وہ اس کا بندوبست کرنے شہر چلے گئے ہوں گے۔ اس میں وقت تو لگنا ہی تھا۔ بس ہمیں بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا۔ ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم یہاں سولہ سترہ میل دور اس پٹڑی پر یوں بے فکری سے لیٹے ہوتے۔ نہیں صاحب! اگر انہوں نے وقت ضائع نہ کیا ہوتا تو ہم اس وقت اپنے پرانے قصبے میں ہوتے۔" میں نے کہا "وجہ کچھ بھی ہو۔ ہمارے لئے تو یہی بہت ہے کہ ان کے ہتھے نہیں چڑھے۔"

جب شام گہری ہونے لگی، تو ہم نے جھاڑیوں کے اس جھنڈ میں سے گردنیں باہر نکالیں اور چاروں طرف کا معائنہ کرنے لگے۔ سب ٹھیک تھا۔ جم نے بیڑے کے اوپر کے چند تختے اتارے اور ایک جھونپڑی سی بنانے میں مصروف ہو گیا، تاکہ دوپہر کی گرمی دھوپ میں یا بارش میں اس کے سائے میں بیٹھ جایا کریں، سامان بھی بھیگنے سے بچا رہے۔ جم نے اس جھونپڑی کا فرش بھی بنایا جو بیڑے کی سطح سے تقریباً ایک فٹ اونچا تھا۔ اب ہمارے کمبل اور دیگر سامان اتنی اونچائی پر رکھے تھے کہ دخانی کشتیوں کی تیز رفتاری سے پیدا ہونے والی لہریں بھی ان تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ جھونپڑی کے عین وسط میں ہم نے مٹی کی ایک پانچ چھ انچ موٹی تہہ جما دی اور اس کے گرد ایک چوکھٹا لگا دیا تاکہ مٹی اپنی جگہ جمی رہے۔ بارش کے وقت یا سخت سردی کے روز اس پلیٹ فارم پر آگ جلائی جا سکتی تھی۔ اور چونکہ آگ جھونپڑی کے اندر ہوتی، اس لئے لوگوں کو نظر بھی نہ آتی۔ ہم نے ایک چپو بھی بنا لیا۔ اگر کبھی کسی وقت ہمارا چپو کسی چیز سے ٹکرا کر ٹوٹ جائے تو اس سے کام چلایا جا سکتا تھا۔ لالٹین لٹکانے کے لئے ایک کھونٹی بھی بنائی گئی اس کا مقصد یہ تھا کہ اگر کوئی دخانی کشتی پیچھے سے آ رہی ہو تو ہم فوراً لالٹین جلا کر اس پر لٹکا دیں تاکہ ٹکر نہ ہو۔ ہاں، سامنے سے آتی ہوئی کشتیوں کو لالٹین دکھانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی بشرطیکہ ہم ان کے راستے میں نہ ہوں۔ دریا کافی چڑھا ہوا تھا اور اس کے کنارے ابھی تک زیر آب تھے۔ لہٰذا منبع کی طرف جانے والی کشتیاں عموماً ساحل کے قریب رہتیں جہاں پانی کا بہاؤ تیز نہ تھا۔

اگلی رات ہم نے کوئی سات آٹھ گھنٹے سفر کیا۔ دھارے کے بہاؤ کی رفتار کوئی چار میل فی گھنٹہ تھی۔ ساری رات ہم مچھلیاں پکڑتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ کبھی کبھی ہم پانی میں ڈبکی لگا لیتے۔ تاکہ نیند نہ آئے۔ یوں پیٹھ کے بل تختوں پر لیٹ کر ستارے گنتے ہوئے اور اس پرسکون و شاں دریا کے دھارے کے ساتھ ساتھ بہتے ہوئے ہمیں ایک عجیب سی گمبھیرتا کا احساس ہو رہا تھا۔ اگر ہمیں بات بھی کرنی ہوتی تو دبی زبان میں کرتے، بہت کم ہنستے، اور صرف ایک دو بار ہنسی، کھی، پر ہی اکتفا کر لیتے۔ موسم عموماً خوشگوار رہا۔ ہمیں کوئی حادثہ بھی پیش نہ آیا۔ نہ اس رات، نہ اگلی رات اور نہ اس سے اگلی۔

ہر رات کئی قصبے آتے اور گزر جاتے۔ بعض قصبے پہاڑیوں پر واقع تھے۔ رات کی تاریکی میں ہمیں مکان تو نظر نہ آتے، صرف روشنیوں کا ایک جال سا بچھا دکھائی دیتا۔ پانچویں رات سینٹ لوئیس کے پاس سے گزرتے ہوئے ہمیں ایسا محسوس ہوا جیسے سارے عالم میں نور ہی نور بھر گیا ہو۔ سینٹ پیٹرزبرگ کے لوگ کہا کرتے تھے کہ سینٹ لوئیس کی آبادی لگ بھگ بیس تیس ہزار کی ہے۔ ان دنوں مجھے ان کی باتوں پر یقین نہیں آتا تھا، لیکن رات کے دو بجے جب ہر طرف سناٹا طاری تھا، روشنیوں کے اس وسیع پھیلاؤ کو دیکھ کر مجھے ان کی بات پر یقین کرنا ہی پڑا۔ شہر پر مکمل سکوت طاری تھا۔ شاید سبھی لوگ نیند میں مگن تھے۔

میرا یہ معمول تھا کہ ہر رات جب دس بجنے کو ہوتے۔ تو میں کسی چھوٹے سے گاؤں کے قریب ساحل پر اتر جاتا اور دس پندرہ سینٹ کا آٹا، گوشت، اور کھانے پینے کا دوسرا سامان خرید لاتا۔ کبھی کبھار کوئی مرغی ہاتھ لگ جاتی تو اسے بھی چرا لاتا۔ ابا کہا کرتا تھا کہ جب بھی مرغی چرانے کا موقع ملے، اسے ہاتھ سے مت جانے دو۔ اگر خود تمہیں اس کی ضرورت نہ بھی ہو تو کوئی نہ کوئی شخص ایسا ضرور ہو گا۔ جسے مرغی درکار ہو۔ بس وہ مرغی اسے دے دو۔ اور یاد رکھو کہ نیکی کا اجر ضرور ملتا ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ کبھی ایسا موقع آیا ہی نہ تھا جب خود

ابّا کو مرغی کی ضرورت نہ ہو۔ بہر حال یہ قول اسی کا ہے۔

صبح تڑکا ہونے سے پہلے میں چپکے سے کسی کھیت میں گھس جاتا اور کبھی تربوز، کبھی خربوزے، کبھی کدّو، یا چھولیا، یا ایسی ہی کوئی اور شے "ادھار" لے آتا۔ ابّا کہا کرتا تھا کہ اگر نیّت صاف ہو تو "ادھار" لینے میں کوئی حرج نہیں۔ ہاں البتہ بیوہ اس قسم کے "ادھار" کو کبھی چوری ہی کہتی تھی اور کہا کرتی تھی کہ شریف آدمی ایسا کام نہیں کرتے۔ جم کا خیال تھا کہ ان دونوں ہی نظریوں میں کچھ کچھ صداقت ہے۔ لہٰذا بہترین طریق عمل یہ ہونا چاہیئے کہ ہم یہ اصول بنا لیں کہ فلاں فلاں چیز کو کبھی اُدھار نہیں لیں گے۔ اس کے بعد باقی چیزوں کو "ادھار" لینے میں کوئی حرج نہیں۔ ایک رات سفر کے دوران میں ہم نے اس مسئلے پر بہت غور و خوض کیا کہ کونسی شے ممنوع قرار دی جائے۔ تربوز؟ یا گرماک؟ یا خربوزہ؟ بالآخر صبح ہونے تک ہم نے ایک تسلّی بخش حل ڈھونڈ ہی نکالا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ جنگلی سیب اور جنگلی انگوروں کو ممنوع سمجھا جائے۔ اس فیصلے سے پہلے ہمارے ضمیر بالکل مطمئن نہ تھے۔ لیکن اب تمام الجھنیں دور ہو گئیں۔ یہ فیصلہ مجھے واقعی پسند آیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جنگلی سیب تو ویسے بھی اچھے نہیں ہوتے، اور جہاں تک جنگلی انگوروں کا تعلق ہے۔ ان کے پکنے میں ابھی دو مہینے باقی تھے ــــــــ

کبھی کبھی کوئی مرغابی بھی ہمارے ہتھے چڑھ جاتی یعنی اگر کوئی مرغابی شام کے بعد ادھر ادھر گھومتی رہتی، یا صبح صبح جلدی گھر سے نکل آتی، تو ہم اس کا شکار کرنے سے کبھی نہ چوکتے مختصر یہ کہ گزارہ خوب مزے سے چل رہا تھا۔

سینٹ لوئیس کے بعد پانچویں رات کو ہمیں ایک طوفان نے آلیا۔ اس رات بجلی بڑے زور سے کڑک رہی تھی، اور اس کی چمک آنکھوں کو خیرہ کیئے دیتی تھی۔ بارش کا کہنا تھا کہ بس آج ہی برسوں گی۔ ہم جھونپڑی کے اندر جا بیٹھے اور بیڑے کو خدا کے بھروسے پر چھوڑ دیا۔ جب کبھی بجلی چمکتی تو ہمیں صرف دو ہی چیزیں دکھائی دیتیں۔ سامنے حد نظر تک

دریا ہی دریا اور دائیں بائیں اونچی اونچی چٹانیں۔ تھوڑی دیر بعد میں نے کہا: "جم! وہ دیکھو! اُدھر" میرا اشارہ ایک دُخانی کشتی کی طرف تھا جو چٹان سے ٹکرا گئی تھی۔ ہمارا بیڑا بھی سیدھا اسی طرف جا رہا تھا۔ اسی اثناء میں بجلی چمکی اور ایک لمحہ کے لئے کشتی کا منظر ہماری آنکھوں کے سامنے کوند گیا۔ کشتی ایک پہلو جھکی ہوئی تھی اور اوپری ڈیک کا صرف تھوڑا سا حصہ پانی سے باہر تھا۔ جب بجلی چمکتی تو اس کی ایک ایک رسی دکھائی دینے لگتی۔ اوپر ایک بہت بڑے گھنٹے کے پاس ایک کرسی رکھی تھی جس کی پشت پر ایک ہیٹ ٹنگا تھا۔

ایک تو رات کا وقت، دوسرے طوفان، اور پھر ہر چیز پر اسراری اس کشتی کو دیکھ کر میرے دل میں بھی وہی اشتیاق پیدا ہونے لگا جو ایسے موقع پر ہر لڑکے کے دل میں پیدا ہوتا ہے میں چاہتا تھا کہ اس میں چڑھ کر کچھ تفتیش کی جائے۔ میں نے کہا: "جم! آؤ۔ اس میں چڑھیں" لیکن جم کو یہ بات پسند نہ آئی۔ وہ بولا: "میں تباہ شدہ کشتیوں کی سیر نہیں کیا کرتا۔ اور پھر جیسا کہ بائیبل میں لکھا ہے" میں پہلے ہی کافی گناہ گار ہوں۔ مجھے مزید گناہ میں نہ ڈال" — اور، اور ہو سکتا ہے کہ اس میں کوئی چوکیدار بھی ہو"

"چوکیدار! یہاں چوکیدار کا کیا کام؟" میں نے جواب دیا "پائلٹ ہاؤس اور کیبن کے سوا اب اس کشتی میں رکھا ہی کیا ہے جس کی چوکیداری کی ضرورت ہو۔ اور کوئی بھی شخص ان چیزوں کے لئے اپنی جان کبھی خطرے میں نہیں ڈالے گا۔ یہ کشتی تو کسی بھی وقت پاش پاش ہو سکتی ہے"۔

جم کے پاس اس دلیل کا کوئی جواب نہ تھا۔ میں کہتا چلا گیا: "ممکن ہے کپتان کے کمرے میں ہمیں کوئی کام کی شے ہاتھ لگ جائے جسے ہم ادھار لے سکیں مثلاً سگار اور یہ سگار کم از کم پانچ پانچ سینٹ والے تو ضرور ہی ہوں گے۔ دخانی کشتیوں کے کپتان خاصے امیر ہوتے ہیں۔ ان کی تنخواہ ساٹھ ڈالر ماہوار ہوتی ہے۔ لہٰذا انہیں یہ پروا نہیں ہوتی کہ چیز مہنگی مل رہی ہے یا سستی۔ بس جس چیز پر طبیعت آ گئی، اسے خرید لیا۔ چلو۔

اٹھو۔ جیب میں ایک موم بتی رکھ لو اور چلے آؤ۔ جب تک میں اپنی خواہش پوری نہیں کر لیتا مجھے چین نہیں آئے گا۔ اگر ٹام سائر یہاں ہوتا تو کیا وہ ایسا موقع ہاتھ سے جانے دیتا؟ ہرگز نہیں۔ وہ اسے بھی ایک مہم ہی سمجھتا، اور خواہ اسے جان سے بھی ہاتھ کیوں نہ دھونے پڑتے، وہ اس غرقاب کشتی کی تلاشی ضرور لیتا۔ اور پھر تلاشی بھی کس شان سے! ادھر تو اس کا یوں معاینہ کرتا جیسے کرسٹوفر کولمبس جنت کی کھوج میں نکلا ہو۔ کاش ٹام سائر یہاں ہوتا!"

جم کچھ بڑبڑایا تو ضرور، مگر بالآخر مان ہی گیا۔ اس نے مجھے تنبیہہ کی کہ خواہ مخواہ باتیں نہ کیا کروں اور اگر کچھ کہنے کی ضرورت پڑے بھی تو سرگوشی میں کہوں۔ اس اثنا میں ہم اس کشتی کے بالکل قریب آ گئے تھے۔ اگلی بار جب بجلی چمکی تو ہم نے فوراً اس کا جنگلہ پکڑ لیا اور اس کے ساتھ چمٹ گئے۔

اس کشتی کا ڈیک خاصا اونچا تھا۔ اندھیرے میں ہم دبے پاؤں اس جھکے ہوئے تختے پر چلتے ہوئے افسروں کے کیبن کی طرف بڑھنے لگے۔ اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ ہم نے بازو پھیلا لیے تاکہ تنی ہوئی رسیوں سے ٹکرا نہ جائیں۔ ہم نیچے فرش پر ٹٹول کر پاؤں رکھتے تاکہ کسی چیز کی ٹھوکر نہ لگے۔ جلد ہی ہم روشندان کے سرے تک پہنچ گئے اور پھر اسے اٹھا کر اوپر ڈیک پر آ گئے۔ چند فٹ پرے کپتان کا کمرہ تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور جب ہم نے ہال میں نگاہ دوڑائی تو اس کے پرلے سرے پر ہمیں ایک روشنی سی دکھائی دی اور اس کے ساتھ ہی کچھ دھیمی دھیمی آوازیں آنے لگیں۔

جم بولا: "میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ آؤ واپس چلیں" ابھی ہم مڑے ہی تھے کہ کسی کے رونے کی آواز آئی۔ ایک آدمی گڑگڑا رہا تھا: "خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو میں قسم کھاتا ہوں کسی سے کچھ نہ کہوں گا۔"

دوسری آواز جو کافی بلند تھی بولی: "جم ٹرنر، تم جھوٹ بکتے ہو۔ ایک بار پہلے بھی تم

یہی قسم کھا چکے ہو۔ تم ہمیشہ اپنے حصے سے زیادہ مانگتے ہو۔ اور مانگتے ہی کیا، لے لیتے ہو۔ کیونکہ تم ہمیشہ یہ دھمکی دیتے ہو کہ اگر تمہارا مطالبہ پورا نہ ہوا تو تم مخبری کر دو گے۔ لیکن اب برداشت کی حد ہو گئی ہے۔ تمہارے جیسا کمینہ اور غدار کتا دنیا بھر میں نہیں ملے گا۔"

جم تو بیڑے کی طرف چلا ہی گیا تھا۔ میرے دل میں کھد بد ہونے لگی کہ آخر دیکھوں تو ماجرا کیا ہے۔ میں نے سوچا اگر ٹام سائر یہاں ہوتا تو یوں بزدلوں کی طرح نہ بھاگ اٹھتا۔ پھر میں کیوں بھاگوں؟ میں دیکھ کر ہی رہوں گا کہ یہ کیا قصہ ہے۔ اندھیرا بہت گہرا تھا۔ میں ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل اس چھوٹی سی گلی میں رینگنے لگا۔ جدھر سے آوازیں آ رہی تھیں جب میں کپتان کے کمرے کے پاس پہنچا جس کے پرلی طرف یہ ہال تھا۔ تو میں نے دیکھا کہ ایک آدمی جس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں، فرش پر لیٹا ہے۔ دو آدمی اس کے پاس کھڑے تھے ان میں سے ایک کے ہاتھ میں اندھی سی لالٹین تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں پستول جس کی نالی کا منہ لیٹے ہوئے آدمی کے سر کی طرف تھا۔ یہ پستول والا شخص بولا:

"جی چاہتا ہے، تمہیں گولی مار دوں۔ اور قسم خدا کی تم ہو اسی کے مستحق۔ کمینے کتے!"

فرش پر لیٹا ہوا آدمی ڈر کے مارے سکڑ گیا اور گڑگڑا کر بولا: "بل! خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا"

لیکن اسے یوں گڑگڑاتا دیکھ کر وہ لالٹین والا شخص ہنسنے لگتا اور کہتا: "بہت خوب! بہت خوب! آج تم نے پہلی بار سچ بولا ہے۔ بتاؤ گے کیسے؟" —— اور ایک بار تو اس نے یہ بھی کہہ دیا: "ذرا اسے گڑگڑاتے ہوئے تو دیکھو! قسم خدا کی اگر ہم نے اسے یوں بے بس نہ کر دیا ہوتا اور اس کے ہاتھ پاؤں نہ باندھ دیئے ہوتے تو یہ ہم دونوں کو مار ڈالتا۔ اور وہ صرف اس لئے کہ ہم نے اپنا حق مانگا تھا! لیکن جم ٹرنر! خدا گواہ ہے کہ آج کے بعد تم کسی کو دھمکی نہ دے سکو گے —— بل! پستول ہٹا لو۔"

بل بولا: "نہیں۔ جیک پیکارڈ۔ میں اب اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ یہ وہی

تو ہے جس نے ہیٹ فیلڈ کو قتل کیا تھا۔ اس کا بھی یہی حشر ہونا چاہیئے!"
ہیکارڈ بولا۔ "لیکن میں نہیں چاہتا کہ یہ ہمارے ہاتھوں قتل ہو۔ اس کی بھی ایک وجہ ہے۔"
فرش پر پڑا ہوا آدمی پھر گڑگڑانے لگا: "جیک ہیکارڈ، تم واقعی دیوتا ہو۔ میں تمہارا یہ احسان تا زندگی نہیں بھولوں گا۔"

لیکن ہیکارڈ نے اس کی طرف بالکل توجہ نہ دی۔ لالٹین کو کھونٹی پر لٹکا کر وہ اندھیرے میں اس طرف آنے لگا جہاں میں بیٹھا تھا۔ ساتھ ہی اس نے بل کو اشارہ کیا کہ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا آئے۔ میں ہاتھ پاؤں کے بل چلتا ہوا تختے پر چڑھنے لگا۔ لیکن دو ہی گز چلنے کے بعد رک گیا۔ کشتی یوں جھکی ہوئی تھی کہ رینگ کر اوپر چڑھنا خاصا دشوار تھا۔ لہذا میں ڈر رہا تھا کہ کہیں وہ لوگ آنہ پہنچیں۔ میں فوراً ایک کمرے میں گھس گیا۔ وہ شخص بھی اندھیرے میں راستہ ٹٹولتا ٹٹولتا میرے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ اس کمرے کے قریب پہنچ کر وہ بولا۔
"یہیں آجاؤ۔"

وہ اور اس کے پیچھے پیچھے بل دونوں کمرے کے اندر آگئے۔ میں فوراً رینگ کر اوپر کے تختے پر جا چڑھا اور سوچنے لگا کہ اب خیر نہیں۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا کہ ناحق مصیبت مول لی۔ وہ وہیں تختے کا سہارا لیکر کھڑے ہو گئے اور باتیں کرنے لگے۔ اندھیرے میں وہ مجھے نظر تو نہیں آرہے تھے لیکن ان کے منہ سے آنے والی شراب کی بو سے مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ وہ کس جگہ کھڑے ہیں۔ یہ سوچ کر کہ اگر میں نے کبھی شراب پی ہوتی۔ تو اس کے نتائج کتنے بھیانک ہو سکتے تھے، میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس علّت سے بچا ہوا ہوں۔ تاہم سچ تو یہ ہے کہ اگر میں نے پی بھی ہوتی۔ تو بھی انہیں میری موجودگی کا علم نہ ہوتا۔ کیونکہ میں تو وہاں دم سادھے بیٹھا تھا۔ میں اس قدر خوفزدہ تھا کہ سانس لینے کی ہمّت ہی نہیں ہوتی تھی۔ ویسے اگر میں خوفزدہ نہ بھی ہوتا تو بھی سانس نہ لے سکتا۔ وہ اس قدر ہوتے ہوئے بول رہے تھے کہ اگر مجھے ان کی باتیں سننی تھیں، تو دم سادھ کر بیٹھنا لازمی تھا۔

بل کا ارادہ تھا کہ ٹرنر کو قتل کر دیا جائے۔ وہ بولا:

"مخبری کرنے کی دھمکی تو اس نے دی ہے"

"وہ واقعی کرے گا۔ اس جھگڑے اور ہمارے اس برتاؤ کے بعد اگر ہم اُسے اپنا سارا حصہ بھی دے دیں۔ تو بھی وہ باز نہیں آئے گا۔ بلاشبہ وہ سلطانی گواہ بن جائے گا۔ میری بات مانو اور مجھے اس قضیے کو ختم کر ہی لینے دو۔"

"ارادہ تو میرا بھی یہی ہے۔" ہیکارڈو نے نہایت تحمل سے کہا۔

"اوہ! میں سمجھتا تھا کہ شاید تم اس تجویز کے خلاف ہو۔" بل بولا "اچھا تو پھر اب دیر کا ہے کی ہے؟ آؤ اس سے نپٹ ہی لیں۔"

"ایک منٹ رکو۔ ابھی میں نے بات پوری کہاں کی ہے؟ سنو، گولی مارنا تو خیر ٹھیک ہے ہی۔ لیکن اگر اس سے بھی بہتر کوئی سبیل نکل آئے تو حرج کیا ہے؟ میرا مطلب ہے۔ یوں پھانسی کا پھندا مول لینا کوئی دانشمندی نہیں۔ ایسا کوئی طریقہ کیوں نہ اختیار کیا جائے جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ کیوں؟"

"سو فی صدی درست۔ لیکن یہ ہوگا کیسے؟"

"سنو! میری تجویز یہ ہے کہ پہلے تو ہم اس کشتی کی اچھی طرح تلاشی لے لیں۔ ممکن ہے، کچھ چیزیں ابھی تک ہماری نظروں سے چھپی رہی ہوں۔ پھر یہ سارا سامان لے جا کر کسی جگہ چھپا دیں۔ اور آرام سے بیٹھے انتظار کرتے رہیں۔ دو ہی گھنٹے میں یہ کشتی پاش پاش ہو جائے گی اور اس پر یہ تحقیق [illegible] گئیں گے۔ حضرت ٹرنر خود بخود کیفر کردار کو پہنچ جائیں گے۔ [illegible] ٹرنر [illegible] یہ ہوا کیا کہ [illegible] مر ہی سہی گا تو بھی تو کسی پر اس کی موت کا الزام نہیں آسکے گا۔ میرا خیال ہے کہ قتل کی بجائے یہ سکیم بہتر ہے۔ میرا اپنا اصول یہ ہے کہ جب تک کوئی دوسرا طریقہ ممکن ہو کسی کو قتل نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ نہ تو دانشمندی ہے اور نہ اخلاق۔ کیوں؟ منظور ہے؟"

"ہاں۔ میرا خیال ہے، تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ لیکن اگر یہ کشتی پاش پاش نہ ہوئی تو ____؟"

"کم از کم دو گھنٹے انتظار تو کر لیں۔ پھر دیکھا جائے گا"

"چلو ٹھیک ہے۔ آؤ اب کام شروع کریں"

ان کے جانے کے بعد میں بھی نیچے اتر آیا۔ پسینے اور خوف سے میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ میں رینگتا ہوا باہر نکلا۔ باہر گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے آہستہ سے آواز دی "جم!" اور پھر کہیں قریب ہی سے اس نے سرگوشی میں جواب دیا "ہوں" —— میں نے کہا "جم! ایک لمحہ بھی ضائع مت کرو۔ یہ وقت 'ہوں' 'ہوں' کرنے کا نہیں۔ اندر قاتلوں کا گروہ بیٹھا ہے، اگر ہم نے ان کی کشتی کھول کر دریا میں نہ بہائی۔ تو ان میں سے ایک یقیناً جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ اور اگر ہم ان کی کشتی بہا دیں تاکہ یہ لوگ نکلنے نہ پائیں، تو یہ بھی کے سبھی شکنجے میں پھنس جائیں گے اور مجسٹریٹ خود ان سے نبٹ لے گا۔ بس اب جلدی کر دیں ادھر دیکھتا ہوں، تم ادھر ڈھونڈو۔ اور وہ بیڑا ادھر لے آؤ۔ اور ——"

"لیکن۔ لیکن —— بیڑا؟ بیڑا ہے کہاں؟ وہ تو کہیں بہہ گیا ہے" جم نے جواب دیا۔

۱۳۔ غرقاب کشتی میں سے بچ نکلنا۔ پہریدار۔ کشتی کا ڈوبنا

یہ سنتے ہی میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ یوں لگتا تھا کہ ابھی بیہوش ہو کر گر جاؤں گا۔ ذرا سوچئے تو! اس غرقاب کشتی پر ان قاتلوں کے ساتھ یوں پھنس جانا! یہ بھی کیا تقدیر ہوئی؟ لیکن اب یوں افسوس کرنے کا وقت نہ تھا۔ ہمیں تو کسی نہ کسی طرح ان کی کشتی کو حاصل کرنا تھا۔ بہانے کے لئے نہیں، بلکہ اپنے استعمال کے لئے۔ ہم تھر تھر کانپتے دائیں طرف کے تختے

پر رینگنے لگے۔ ہماری رفتار اسی قدر سست تھی کہ جب ہم اگلے سرے پر پہنچے تو یوں لگتا تھا جیسے ہمیں یہ چند گز کا فاصلہ طے کرنے میں ایک ہفتہ لگ گیا ہو۔ کشتی یہاں بھی نہیں تھی۔ جم کی تو یہ حالت ہو گئی کہ اس کے لئے دو قدم چلنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ ڈر کے مارے اس کی ٹانگوں میں سکت ہی نہ رہی تھی۔ میں نے کہا: "جم! رکو مت۔ چلتے چلو۔ اگر ہم یہیں پھنس گئے، تو جان کی خیر نہیں۔" ہم پھر رینگنے لگے۔ اب کی بار ہم نے کیبن کے سرے کا رُخ کیا۔ خوش قسمتی سے ہمیں وہ جگہ مل گئی۔ وہاں سے ہم روشندان پر چڑھ گئے۔ ہم نہایت احتیاط سے کواڑوں پر پاؤں رکھ رکھ کر رینگتے ہوئے چڑھ رہے تھے۔ روشندان کا اگلا سرا پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ جب ہم ہال کے دروازے کے نزدیک پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کی کشتی وہاں بندھی ہے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ آنسوؤں کی وجہ سے مجھے کشتی بھی دھندلی دھندلی سی دکھائی دیتی تھی۔ قریب تھا کہ میں چھلانگ مار کر اس پر چڑھ جاؤں کہ دروازہ کھلا اور ایک آدمی سر باہر نکال کر ادھر اُدھر جھانکنے لگا۔ وہ مجھ سے صرف دو ہی فٹ دور ہو گا۔ میں نے سوچا بس اب پھنسے۔ لیکن اس آدمی نے دروازہ پھر بند کر دیا اور بولا: "بل! خدا کے لئے لالٹین بجھا دو۔"

اس کے بعد اس نے سامان سے بھری ایک بوری کشتی میں پھینک دی اور پھر خود بھی اُس میں سوار ہو گیا۔ یہ پیکارڈ تھا۔ اس کے بعد بل بھی آکر کشتی میں بیٹھ گیا۔ پیکارڈ نے ہولے سے کہا: "سب ٹھیک ہے۔ کشتی چلاؤ۔"

ہماری رہی سہی اُمید بھی جاتی رہی۔ میرے تو ہاتھ پاؤں جواب دینے لگے، کواڑوں سے چمٹے رہنا دشوار ہو رہا تھا۔ لیکن عین اسی وقت بل نے پوچھا: "ایک منٹ ٹھہرو—— تم نے اس کی جیبوں کی تلاشی لے لی تھی نا؟"

"نہیں تو—— میرا خیال تھا تم نے لے لی ہو گی۔"

"میں نے تو نہیں لی۔ تو پھر اس کے حصے کی رقم اسی کے پاس ہو گی۔"

"ہاں - چلو اٹھو - نقدی کو یوں ہاتھ سے کھو کر اس سامان کو لیجانے کا کیا فائدہ!"

"لیکن کہیں وہ ہمارے ارادوں کو نہ بھانپ لے"

ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی - لیکن ہم رقم کو یوں چھوڑ کر نہیں جا سکتے - چلو اٹھو"

دونوں کشتی میں سے نکل کر پھر اندر چلے گئے -

ان کے اندر جاتے ہی دروازہ بھی بند ہو گیا کیونکہ کواڑ بھی اسی طرف کو تھے جدھر کشتی جھکی ہوئی تھی - اگلے ہی لمحے میں نے کشتی میں چھلانگ لگائی اور پھر فوراً بعد جم بھی گرتا پڑتا اس میں آگرا - میں نے چاقو سے رسی کاٹ دی اور کشتی تیزی سے روانہ ہو گئی -

ہم ابھی تک اتنے ڈرے ہوئے تھے کہ چپو چلانے کی ہمت نہ پڑتی تھی - ہم بالکل چپ سادھے بیٹھے رہے یہاں تک کہ سرگوشی میں بھی بات نہ کی، نہ ہی اونچا سانس لیا - رفتہ رفتہ ہم چپو رکھنے والی جگہ، اور پھر اس کے بعد کشتی کے دوسرے سرے پر پہنچ گئے - ایک دو سیکنڈ میں ہم نے کشتی پار کر لی - اور دو گز پرے جا پہنچے - اب ہم بالکل محفوظ تھے -

تین چار سو گز آگے جا کر جب ہم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو کیبن کے دروازے پر لالٹین کی مدھم سی روشنی نظر آئی - ظاہر تھا کہ انہیں اپنی کشتی کی گمشدگی کا علم ہو گیا ہے - اور اب تو انہیں یہ بھی پتہ چل گیا ہو گا کہ ان کا بھی وہی حشر ہونے والا ہے جو انہوں نے جم ٹرنر کے لئے تجویز کیا تھا -

جم نے چپو لے لئے اور ہم اپنے بیڑے کے تعاقب میں نکل پڑے - لیکن اب مجھے ان بدمعاشوں کے حشر کے بارے میں تشویش ہونے لگی تھی - فکر مند تو شائد میں شروع سے ہی تھا لیکن اس وقت اس کے متعلق سوچنے کی فرصت کہاں تھی؟ میں سوچنے لگا کہ وہ لوگ قاتل ہی سہی، بدمعاش ہی سہی - لیکن یوں ایک غرقاب کشتی میں قید ہو جانا کتنی بھیانک موت ہے! اور پھر کون جانے شائد کل میں ہی قاتل بن جاؤں! اور اگر میرا بھی یہی حشر ہو تو! ——

لہٰذا میں نے جم سے کہا :

"دیکھو جم! اب جہاں بھی روشنی نظر آئی میں سو گز ادھر یا ادھر کسی ایسی جگہ اتر پڑوں گا

جو ہمارے اور کشتی کے چھپنے کے لئے موزوں ہو۔ اس کے بعد میں اس مکان میں چلا جاؤں گا جہاں روشنی ہو رہی ہو گی اور کوئی ایسا قصہ گھڑ کر انہیں سناؤں گا کہ وہ لوگ جا کر اس غرقاب کشتی میں پھنسے ہوئے ان بدمعاشوں کی جان بچالیں۔ بعد میں وہ چاہے ان بدمعاشوں کو پھانسی پر لٹکا دیں، ہمیں اس سے کیا؟"

لیکن یہ تجویز سر سے نہ چڑھ سکی کیونکہ جلد ہی ایک طوفان نے ہمیں آگھیرا۔ یہ طوفان پہلے سے بھی زیادہ تند تھا۔ بارش موسلا دھار ہو رہی تھی۔ دور دور تک کوئی روشنی دکھائی نہ دے رہی تھی۔ شاید ساری دنیا محو خواب تھی۔ ہم تیزی سے بہتے چلے جا رہے تھے اور ہماری نظروں کو اگر کسی چیز کی جستجو تھی تو روشنی کی اور ساتھ ہی اپنے بجرے کی۔ بہت دیر بعد کہیں جا کر بارش تھمی۔ لیکن بادل پھر بھی نہ کھلے اور بجلی بھی کبھی کبھی چمکتی رہی۔ ایک بار جب بجلی چمکی تو ہمیں یوں لگا جیسے کوئی سیاہ سی شے ہمارے آگے آگے بہتی چلی جا رہی ہے۔ ہم نے فوراً کشتی کی رفتار تیز کر دی۔

یہ ہمارا ہی بجرا تھا۔ اس پر ایک بار پھر سوار ہو کر ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اب ہمیں اپنی داہنی طرف کے ساحل پر ایک روشنی بھی نظر آنے لگی تھی۔ میں نے جم سے کہا: "میں وہاں اس مکان میں جا کر انہیں اطلاع دے ہی آؤں" ——— وہ کشتی جو ہم ابھی ابھی چرا کر لائے تھے اس سامان سے لدی ہوئی تھی جو ان بدمعاشوں نے دخانی کشتی سے چرایا تھا۔ یہ تمام سامان ہم نے اپنے بجرے پر رکھ دیا اور پھر میں نے جم سے کہا کہ وہ تھوڑی دور اور چلا جائے۔ تقریباً دو میل آگے جا کر لالٹین جلا دے اور اسے تب تک نہ بجھائے جب تک میں واپس نہ پہنچ جاؤں۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے چپو اٹھا لئے اور کشتی کو کھیتا ہوا اس روشنی کی طرف چل پڑا۔ ساحل کے قریب پہنچ کر مجھے ایک پہاڑی پر تین چار اور روشنیاں نظر آئیں۔ یہ کوئی گاؤں تھا۔ ساحل والی روشنی کے پاس پہنچ کر میں نے چپو کشتی میں رکھ دیئے اور اسے دھارے کے ساتھ ساتھ بہنے دیا۔ یہ روشنی ایک دخانی کشتی سے آ رہی تھی جس کے مستول سے لالٹین ٹنگی تھی۔ میں اس

کشتی کے ارد گرد دیکھنے لگا کہ شاید چوکیدار نظر آجائے۔ کچھ دیر بعد وہ مل گیا۔ وہ گھٹنوں میں سر دبائے بیٹھا تھا۔ میں نے دو تین بار اس کو شانے سے پکڑ کر ہلایا اور ساتھ ساتھ بلند آواز میں روتا رہا۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ لیکن جب اس کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ سنبھل گیا۔ اس نے خوب منہ کھول کر جمائی لی اور پھر دو ایک انگڑائیاں لے کر بولا:

"کیوں؟ کیا بات ہے؟ روتے کیوں ہو؟ ہوا کیا ہے؟"

میں نے جواب دیا: "ابّا اور امّی، اور دیدی، اور۔۔۔۔" میں نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا اور زار زار رونے لگا۔

وہ بولا: "ارے اس طرح بلک بلک کر کیوں روتے ہو؟ ہم سب پر مصیبتیں آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔ تمہارا دکھ بھی مٹ جائے گا۔ لیکن یہ تو بتاؤ انہیں ہوا کیا ہے؟"

"انہیں ــــ انہیں ــــ کیا آپ ہی اس کشتی کے چوکیدار ہیں؟"

"ہاں" اس نے فخر سے جواب دیا۔ اس کشتی کا کپتان، نائب کپتان، ڈرائیور، چوکیدار اور نوکر ــــ یہ سب کچھ میں ہی ہوں۔ اور کبھی کبھی جب کوئی سواری نہیں ملتی تو میں خود ہی اس کی سواری بھی بن جاتا ہوں۔ درست ہے کہ میں جم ہارن بیک جتنا امیر نہیں اور اس لئے ہر ایرے غیرے کی خاطر تواضع نہیں کر سکتا نہ ہی اس کی طرح پیسہ بہا سکتا ہوں۔ لیکن کئی بار میں نے اس سے یہ کہا ہے کہ اگر کوئی شخص چاہے کہ وہ میری جگہ لے لے اور میں اس کی جگہ، تو میں ہرگز اس پیش کش کو قبول نہیں کروں گا۔ کروں بھی کیوں؟ میں ملاح ہوں اور یہی زندگی میرے لئے سب کچھ ہے۔ اگر کبھی مجھے پانی سے دو میل بھی دور شہر میں رہنا پڑ جائے تو بس میری تو آفت آجائے۔ وہاں نہ ہنگامہ ہو گا نہ بھیڑ بھاڑ۔ مجھے تو اگر کوئی اپنی تمام دولت بھی دے دے تو بھی میں دریا کا کنارا نہ چھوڑوں۔ میں تو ــــ"

میں نے اسے بیچ میں ہی ٹوک دیا اور کہا: "ان کی جان پر بنی ہوئی ہے۔ اور ــــ"

"کن کی؟"

"وہی - ابّا اور امّی اور دیدی اور مس ہگر - اور اگر آپ اتنی مہربانی کریں کہ اپنی کشتی لے کر وہاں چلے جائیں تو ـــــ"

"کہاں؟ وہ ہیں کہاں؟"

"اس غرقاب کشتی ـــــ"

"کونسی غرقاب کشتی؟"

"ایک ہی تو کشتی غرق ہوئی ہے۔"

"تمہارا مطلب والٹر سکاٹ سے تو نہیں؟"

"ہاں، ہاں - وہی۔"

"ارے بابا! ـــــ وہ وہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"مگر وہ جان بوجھ کر وہاں تھوڑا ہی گئے تھے۔"

"درست ہے - جان بوجھ کر نہیں گئے ہوں گے - لیکن اگر وہ فوراً ہی اس کشتی سے نہ اتارے گئے تو پھر ان کی خیر نہیں۔ آخر وہ وہاں گئے کیسے؟"

"بات یہ تھی کہ مس ہگر ہمیں ملنے ہمارے شہر آئی تھی ـــــ"

"ہاں ہاں، بوتھ لینڈنگ میں تو پھر؟"

"شام کے وقت وہ گھوڑے ڈھونے والے ایک بیڑے میں سوار ہو کر رات بھر کے لئے اپنی ایک سہیلی کے ہاں چلی گئی - اس کی حبشن نوکرانی بھی اس کے ساتھ تھی - اس سہیلی کا نام اب مجھے یاد نہیں آ رہا - تھوڑی دور جا کر ان کا چپّو ہاتھ سے چھوٹ گیا کشتی نے یکلخت رخ بدلا اور پانی کے دھارے کے ساتھ ساتھ بہنے لگی - دو میل وہ اسی طرح بہتی رہی اور پھر اس غرقاب کشتی کے ساتھ جا ٹکرائی کشتی کا ملاح، اور گھوڑے، اور حبشن نوکرانی تو ڈوب گئے لیکن مس ہگر اس غرقاب کشتی کے ساتھ چمٹ گئی - اس کے تھوڑی دیر بعد ہم لوگ

بھی اپنی کشتی میں بیٹھ کر ادھر ہی آنکلے۔ غرقاب کشتی ہمیں نظر نہ آئی اور ہم بھی اس سے جا ٹکرائے ہم تو خیر، سب بال بال بچ گئے ـــــ میرا مطلب ہے بل وہیپل کے سوا۔ بل وہیپل بہت نیک آدمی تھا۔ کاش اس کی بجائے میں مر جاتا ـــــ"

"ارے! ایسا واقعہ تو آج تک میں نے نہیں سُنا۔ اچھا۔ تو پھر تم لوگوں نے کیا کیا؟"

"پہلے تو ہم زور زور سے آوازیں دیتے رہے۔ لیکن دریا کا پاٹ اتنا چوڑا ہے کہ کسی کو ہماری آواز سنائی نہ دی۔ تب ابا نے کہا کہ کوئی تیر کر ساحل تک چلا جائے اور مدد لے آئے۔ ان سب میں صرف مجھے ہی تیرنا آتا تھا، میں دریا میں کود پڑا۔ اور، اور مس ہُکر یہ بھی کہتی تھی کہ اگر کسی بھی جگہ سے مدد کا بندوبست نہ ہو تو میں اس کے چچا کے پاس چلا جاؤں وہ سب انتظام کر دے گا۔ کوئی ایک میل تیرنے کے بعد میں کنارے پر پہنچ گیا۔ تب سے ادھر ادھر بھٹک رہا ہوں اور لوگوں سے مدد کے لئے کہہ رہا ہوں لیکن کوئی میری بات ہی نہیں سُنتا وہ سب یہی کہتے ہیں! "کیا؟ ایسی رات میں؟ اس باڑھ میں جائیں؟ نہ بھئی نہ۔ اس کا کچھ فائدہ نہیں۔ کسی دخانی کشتی والے سے کہو" ـــــ تو جناب اگر آپ چلیں ـــــ"

"ارادہ تو میرا ہے لیکن کہہ نہیں سکتا کہ جا پاؤں گا یا نہیں۔ اچھا۔ یہ تو بتاؤ اس کا خرچ کون دے گا؟ تمہارے ابا کے پاس اتنی رقم ـــــ؟"

"آپ اس کی فکر نہ کریں ـــــ مس ہُکر نے خاص طور پر مجھ سے کہا تھا، اس کا چچا! ہارن بیک ـــــ"

"ارے! تو وہ ہارن بیک کی بھتیجی ہے!۔ اچھا، تم یوں کرو۔ سیدھے اس روشنی کی طرف چلے جاؤ۔ چوتھائی میل دور جا کر ایک شراب کی دکان آئے گی۔ ان سے کہنا کہ تمہیں فوراً ہارن بیک کے پاس پہنچا دیں۔ وہ ان کا آنے جانے کا سب خرچ دے دیگا۔ بس سیدھے ادھر ہی جانا۔ راستے میں کہیں وقت نہ ضائع کرنا۔ یہ خبر جِم ہارن بیک تک جلد از جلد پہنچنی چاہیئے۔ ہاں، اس سے یہ کہہ دینا کہ تسلی رکھے۔ اس کے شہر پہنچنے سے پہلے میں

اس کی بھتیجی کو بخیر و عافیت لے آؤں گا۔ بس اب وقت ضائع مت کرو۔ میں اپنے انجینئر کو جگاتا ہوں۔"

میں فوراً اس روشنی کی سمت چل پڑا جدھر اس نے اشارہ کیا تھا۔ لیکن جونہی اس نے پیٹھ پھیری، میں فوراً الٹے پاؤں بھاگا اور چپکے سے اپنی کشتی میں آ کر بیٹھ گیا۔ رسّی کھول کر میں اسے کنارے کے ساتھ ساتھ تقریباً چھ سو گز دور آگے لے گیا جہاں بہت سی دوسری کشتیاں کھڑی تھیں۔ وہاں رک کر میں دیکھنے لگا۔ بات یہ تھی کہ جب تک وہ دخانی کشتی روانہ نہ ہو جاتی، میری تسلّی نہ ہوتی۔ کچھ بھی ہو ان بدمعاشوں کے لئے اتنا کچھ کر کے میرا ضمیر اب کافی مطمئن تھا۔ کتنے لوگ ان کے لئے اس طرح آفت مول لینے کو تیار ہوتے ہیں؟ کاش بیوہ کو اس کا علم ہو سکتا! یہ سُن کر کہ کس طرح میں نے ان بدمعاشوں کی جان بچائی۔ وہ بہت خوش ہوتی۔ بیوہ جیسے خدا پرست اور نیک لوگوں کو ان بدمعاشوں اور غنڈوں کے ساتھ نیکی کرنے میں بہت مزا آتا ہے۔

ابھی میں انتظار کر ہی رہا تھا کہ وہ غرقاب کشتی لڑھکتی ہوئی آتی دکھائی دی۔ رات کے اندھیرے میں وہ یوں لگ رہی تھی جیسے کوئی بہت بڑا سیاہ دھبّہ پھسلتا چلا جا رہا ہو۔ اسے دیکھ کر میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ میں فوراً کشتی لے کر اس کی طرف بڑھا۔ وہ تقریباً ساری کی ساری پانی میں ڈوبی ہوئی تھی اور اسے دیکھ کر مجھے یوں لگا کہ ان لوگوں کا زندہ ہونا ناممکن ہے میں نے اس کے اردگرد دو ایک چکر کاٹے اور کچھ آوازیں بھی دیں مگر کوئی جواب نہ ملا۔ کشتی پر موت کا سا سناٹا طاری تھا۔ ان بدمعاشوں کے اس حشر پر مجھے دکھ تو ہوا۔ مگر کوئی خاص زیادہ نہیں۔ کم از کم مجھے اتنی تسلّی ضرور ہوئی کہ اگر یہ لوگ اپنے اس حشر کو برداشت کر گئے ہیں، تو وقت آنے پر میں بھی اس قسم کا حشر برداشت کر ہی لوں گا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دخانی کشتی بھی آ پہنچی۔ اسے آتا دیکھ کر میں نے فوراً کشتی کو دریا کے وسط کی طرف موڑا اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب میں اسے نظر نہیں آ رہا تو میں نے

چپو روک لئے اور تماشہ دیکھنے لگا۔ وہ کشتی اس ڈھانچے کے ارد گرد یوں چکر کاٹ رہی تھی جیسے مس جمکر کی لاش کو سونگھ رہی ہو۔ شائد کپتان یہ سوچتا ہوگا کہ لاش کو ڈھونڈ کر اس کے چچا ہارن بیک کے حوالے کر دے۔ کچھ دیر بعد کپتان مایوس ہو گیا اور کشتی واپس ساحل کی طرف چل دی۔ ہم نے بھی چپو اٹھائے اور دریا کے دھارے کے ساتھ ساتھ بہنے لگا۔

خدا خدا کر کے مجھے دور جم کی لالٹین دکھائی دی۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ ٹمٹماتی ہوئی روشنی شاید ہزاروں میل دور سے آ رہی ہے۔ جب میں بیڑے کے پاس پہنچا تو مشرق میں سپیدی کی ایک ہلکی سی لکیر افق پر نمودار ہو رہی تھی۔ ہم نے فوراً ایک جزیرے کا رخ کیا اور وہاں پہنچ کر پہلے تو بیڑے کو چھپانے کا بندوبست کیا۔ اور پھر وہ بدمعاشوں والی کشتی ڈبو دی اور خشکی پر آ کر مُردوں کی طرح بے سدھ لیٹ گئے۔

۱۴۔ گپ شپ۔ حرم۔ فرانسیسی

جب ہم سو کر اٹھے تو سب سے پہلے ہم نے اس سامان کا جائزہ لیا جو ان بدمعاشوں نے کشتی سے چرایا تھا۔ بوٹ، کمبل، کپڑے، متفرق اشیا، بہت سی کتابیں، ایک دوربین: اور سگار کے تین ڈبے۔ ہم دونوں نے زندگی بھر میں اتنا سامان نہیں دیکھا تھا۔ سگار تو واقعی قیمتی تھے۔ ساری دوپہر ہم جنگل میں لیٹے باتیں کرتے رہے۔ ہم بہت خوش تھے میں نے جم کو وہ سارا واقعہ سنایا جو میں نے اس غرقاب کشتی کے اندر دیکھا تھا۔ اور پھر اس کے بعد اس دخانی کشتی کے مالک کے ساتھ اپنی ملاقات کی تفصیلات بھی اس کے گوش گزار کر دیں۔ میں سمجھتا تھا کہ ایسے ہی واقعات کا نام "مہم" ہوتا ہے۔ لیکن جم بولا: میرے لئے تو بس اتنی ہی مہم کافی ہے۔ تم تو ہال میں گئے اور میں باہر بیڑے کی طرف آنے لگا۔ لیکن باہر

آکر جب مجھے پتہ چلا کہ بڑا غائب ہے، تو میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ میں نے سمجھا کہ بس اب اپنا کام تو تمام ہوا ہی سمجھو۔ بات یہ تھی کہ مجھے تو ہر طرف سے عذاب دکھائی دیتا تھا۔ اگر کوئی مجھے نہ بچاتا، تو میں ڈوب کر مر جاتا۔ اور اگر کوئی بچا لیتا تو یقیناً اُسے میری اصلیت کا پتہ چل جاتا اور انعام کے لالچ میں وہ مجھے مس واٹسن کے حوالے کر دیتا اور پھر وہ بڑھیا مجھے جنوبی ریاستوں میں لے جا کر بیچ ڈالتی۔"

بات واقعی درست تھی۔ جم کی تقریباً ہر بات ٹھیک ہی ہوا کرتی تھی۔ اس کی سوجھ بوجھ عام حبشیوں سے کہیں زیادہ تھی۔

میں نے ان کتابوں میں سے بادشاہوں، نوابوں، اور امراء کے قصے پڑھ کر جم کو سنائے جب میں نے اسے بتایا کہ وہ لوگ نہایت بھڑکیلے لباس پہنا کرتے تھے۔ بہت سج دھج کر رہا کرتے تھے، اور ایک دوسرے کو "مسٹر" کی بجائے "جہاں پناہ" "آقا" "سرکار" وغیرہ کے القاب سے پکارا کرتے تھے۔ تو مارے حیرت کے جم کی آنکھیں یوں پھیل گئیں جیسے ابھی نکل کر باہر آ گریں گی۔ وہ بولا: "یہ بات تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ ان لوگوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوگی۔ میں نے تو سلیمان بادشاہ کے سوا کسی بادشاہ کا نام ہی نہیں سنا۔ ہاں البتہ تاش کے بادشاہ ضرور دیکھے ہیں ـــــ اچھا یہ تو بتاؤ کہ بادشاہ کو تنخواہ کیا ملتی ہے؟"

"تنخواہ!" میں نے کہا "ارے! وہ چاہے تو ہزار ڈالر ماہوار لے لے۔ اسے مانگنا تو ہے نہیں، صرف اپنی خواہش کا اظہار کرنا ہے کہ مجھے اتنی رقم چاہئے۔ وہ رقم فوراً اسے مل جائے گی۔ ہر چیز پر اسی کا تو حق ہوتا ہے۔"

"پھر تو ان کے مزے ہوتے ہوں گے۔ اچھا، ہک! یہ تو بتاؤ، وہ کرتے کیا ہیں؟"

"انہیں کچھ کرنا دھرنا نہیں ہوتا۔ تمہیں اتنا بھی پتہ نہیں؟ وہ تو صرف بیٹھے رہتے ہیں۔"

"بیٹھے رہتے ہیں! سچ؟"

"بالکل سچ۔ وہ صرف بیٹھے رہتے ہیں۔ کوئی کام نہیں کرتے۔ ہاں لڑائی کے دنوں میں

انہیں میدان جنگ میں ضرور جانا پڑتا ہے۔ ورنہ سارا سارا دن نکمے بیٹھے رہتے ہیں۔ یا پھر باز اُڑاتے رہتے ہیں۔ ہاں، باز ——" میں دفعتاً رک گیا۔ "شی! یہ آواز کیا ہے؟" میں نے کہا۔
ہم دبے پاؤں جنگل میں سے باہر آگئے اور ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ وہاں کوئی نہیں تھا ایک دخانی کشتی موڑ پر سے آرہی تھی اور یہ آواز اسی کے پہیوں کی تھی۔ ہم واپس جنگل میں آگئے۔

"میں نے کہا تھا، باز لڑانے اور اسی قسم کے دوسرے مشغلوں کے علاوہ ان کے پاس کوئی کام نہیں ہوتا" میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اور ہاں، جب ان کے پاس بالکل کوئی کام نہیں ہوتا، تو وہ پارلیمنٹ وغیرہ کے ساتھ جھگڑا کرنے لگتے ہیں۔ یا پھر اگر کوئی شخص ان کی مرضی کے مطابق کام نہیں کرتا تو اس کا سر کاٹ دیتے ہیں۔ ویسے زیادہ تر وقت وہ حرم میں ہی گزارتے ہیں"

"کس میں؟"

"حرم میں"

"یہ حرم کیا بلا ہوتی ہے"؟

"یہ وہ جگہ ہے جہاں ان کی بیویاں رہتی ہیں۔ تمہیں حرم کا بھی پتہ نہیں۔ سلیمان کا بھی تو ایک حرم تھا اور اس میں دس لاکھ بیویاں رہتی تھیں۔"

"ہاں، یاد آیا۔ یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔ یہ حرم کیا ہوا، اچھا خاصہ بورڈنگ ہاؤس ہوا۔ اور پھر ان کا زیادہ تر وقت بچوں کو چپ کرانے میں ہی گزرتا ہوگا۔ اور ان کی بیویوں میں جھگڑے بھی خوب ہوتے ہوں گے۔ اور ان ہنگاموں سے خوب شور مچتا ہوگا۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ اس کے باوجود کہا یہ جاتا ہے کہ سلیمان دنیا کا سب سے عقلمند انسان تھا۔ مجھے تو یہ بات کچھ جچتی نہیں۔ کیا کوئی عقلمند آدمی یہ چاہے گا کہ اس کا چاروں طرف ہمیشہ چیخ دپکار ہوتی رہے۔ نہیں صاحب! جس شخص میں ذرا بھی عقل ہے، وہ اس قسم کی زندگی ہرگز پسند نہیں کرے گا۔ عقلمند آدمی تو یہ چاہے گا کہ اس کا ایک کارخانہ ہو۔ کارخانے کا یہ فائدہ تو ہوتا ہے

کہ جب آرام کرنے کو جی چاہا، کھٹ سے مشین بند کر دی۔"

"کچھ بھی ہو۔ تھا وہ دنیا کا سب سے عقلمند آدمی۔ یہ بات خود بیوہ نے مجھ سے کہی تھی۔"

"بیوہ کچھ بھی کہتی رہے۔ کم از کم مجھے تو اس میں عقل کی کوئی بات نظر نہیں آئی۔ اس کے کئی کام تو نہایت احمقانہ تھے۔ تمہیں وہ قصہ تو یاد ہی ہوگا جب وہ ایک بچے کے دو ٹکڑے کرنے لگا تھا؟"

"ہاں۔ یہ قصہ بھی بیوہ نے مجھے سنایا تھا"

"تو کیا وہ حماقت نہیں تھی؟ فرض کرو کہ یہ درخت پہلی عورت ہے، تم دوسری عورت ہو، اور میں، میں ہوں سلیمان۔ اچھا اب یہ جو تمہارا نوٹ ہے، اسے وہ بچہ سمجھ لو۔ تم دونوں کا دعویٰ ہے کہ یہ بچہ تمہارا ہے۔ اب ذرا میرے، یعنی سلیمان کے فیصلے پر غور فرمائیے۔ چاہیئے تو یہ کہ میں پڑوسیوں کے پاس جا کر پتہ لگاؤں کہ اس بچے کی حقیقی ماں کون ہے اور اس بچے کو بخیر و عافیت اس کے حوالے کر دوں۔ ہر وہ شخص جس میں رتی بھر بھی عقل ہوگی، یہی طریقہ اختیار کریگا۔ لیکن ذرا میرا کارنامہ دیکھیئے کہ میں کیا کرتا ہوں۔ میں اس نوٹ کو پھاڑ کر اس کے دو ٹکڑے کر کے ایک ٹکڑا تو اس عورت کے حوالے کر دیتا ہوں، اور دوسرا تمہارے حوالے۔ کیوں؟ یہی تھا نا، سلیمان کا فیصلہ؟ اب تم ہی بتاؤ کہ آدھا نوٹ کس کام کا؟ بالکل اسی طرح آدھا بچہ کس کام کا؟ ایسے بچوں کی تو اگر فوج بھی مفت میں ملے، تو میں نہ لوں۔"

"لیکن اصل نقطہ تو تمہاری سمجھ میں آیا ہی نہیں۔"

"کیا نہیں آیا میری سمجھ میں؟ سمجھ میں نہیں آیا! بھلا اس میں بھی کوئی سمجھنے کی بات ہے؟ جہاں عقل کی بات ہو، میں فوراً سمجھ جاتا ہوں۔ لیکن سلیمان کے اس فیصلے میں عقل کی کوئی بات بھی ہو۔ جھگڑا آدھے بچے کے لیئے تو تھا نہیں، جھگڑا تو تھا سالم، جیتے جاگتے بچے کے لیئے۔ اور اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ بچے کے دو ٹکڑے کر کے اس جھگڑے کو نبٹا سکتا ہے، تو وہ واقعی احمق ہے۔ اسے تو اتنا بھی پتہ نہیں ہوگا کہ بارش میں باہر نکلنا چاہیئے یا نہیں۔ چھوڑو،

جانے دو۔ کوئی دوسری بات کرو۔ یہ سلیمان دلیمان کا قصّہ چھوڑو۔ اُس کی تو میں نس نس سے واقف ہوں۔"

"لیکن جم! یہ حقیقت ہے کہ نکتہ تمہاری سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔ نکتہ! کیسا نکتہ؟ اور یہ بھی سمجھ لو کہ نکتہ وہ نہیں جو تم سمجھتے ہو۔" بلکہ بات ذرا گہری ہے۔ شاید اس معاملے میں سلیمان کا کوئی دوش نہ تھا۔ دوش تھا تو اس ماحول کا جس میں اس کی پرورش ہوئی تھی۔ اگر کسی شخص کے صرف ایک دو بچے ہوں، تو وہ کبھی بچّوں کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرے گا۔ لیکن جس شخص کے پچاس لاکھ بچے ہوں اس کے لئے کسی بچے کے ٹکڑے کرنا ایسا ہی سہل ہوگا، جیسا بلّی کے بچے کو مار ڈالنا۔ اب تم پوچھو گے، وہ کیوں؟ وجہ ظاہر ہے۔ ایک بلّی یا ایک بچّے کے مر جانے سے کچھ فرق پڑتا ہے کیا؟ یہ تو لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ اسی طرح سلیمان کے نزدیک بھی دو ایک بچوں کی موت کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔"

اس کی باتیں سُن کر مجھے کوفت سی ہونے لگی کہ یہ کس قسم کا حبشی ہے جس کے ذہن میں اگر کوئی بات ایک دفعہ بیٹھ جائے، تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں نکال سکتی۔ حبشیوں میں شاید اسے ہی حضرت سلیمان سے سب سے زیادہ بغض تھا۔ لہٰذا میں نے سلیمان کا ذکر چھوڑ دیا۔ اور دوسرے بادشاہوں کی باتیں کرنے لگا۔ میں نے اسے فرانس کے لوئی سولھواں کا قصّہ سنایا جس کا سر قلم کر دیا گیا تھا۔ اور اس کے بیٹے کا بھی، جسے اس کے بعد تخت پر بیٹھنا تھا مگر وہ بھی قید کر لیا گیا اور کہا جاتا ہے کہ جیل میں ہی اس کی موت ہو گئی تھی۔"

"بیچارا لڑکا!" جم بولا۔

"لیکن کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ جیل سے بھاگ نکلا تھا اور یہاں امریکہ میں آ گیا تھا۔"

"یہ تو اچھا ہی ہوا ــــ لیکن یہاں تو وہ ہر وقت اداس رہتا ہوگا کیونکہ یہاں بادشاہ، نواب وغیرہ تو ہیں نہیں کیوں؟ یہاں کوئی بادشاہ ہے؟"

"نہیں تو!"

"تو پھر تو وہ بیکار ہی ہوگا۔ اچھا، تو اس کا گزارہ کیسے چلتا ہوگا؟"

"پتہ نہیں۔ ایسے لوگ یا تو پولیس میں بھرتی ہو جاتے ہیں، یا پھر فرانسیسی زبان سکھا کر روزی کماتے ہیں۔"

"اچھا ہک! تو کیا فرانس کے لوگ اس زبان میں باتیں نہیں کرتے، جس میں ہم کرتے ہیں؟"

"نہیں بھئی۔ اگر تم انہیں باتیں کرتا سنو، تو ایک لفظ بھی تمہاری سمجھ میں نہ آئے۔"

"اچھا؟ یہ کیوں؟"

"وجہ تو مجھے معلوم نہیں۔ لیکن ہے یہ درست۔ ایک کتاب میں میں نے بھی اس زبان کے چند ایک لفظ پڑھے تھے۔ فرض کرو کہ کوئی شخص تمہارے پاس آکر کہتا ہے 'پالی وو فرانزی' تو تمہاری سمجھ میں کچھ آئے گا کیا؟"

"خاک سمجھ میں آئے گا۔ اگر وہ مجھ سے ایسی بات کرے تو میں اس کا سر ہی نہ پھوڑ دوں۔ میرا مطلب ہے اگر وہ سفید فام نہ ہو تو —— کس حبشی کی مجال ہے جو مجھے یوں گالی دے جائے"

"یہ گالی تھوڑا ہی ہے۔ اس کا مطلب تو صرف یہ ہے۔ کیا آپ کو فرانسیسی زبان آتی ہے اگر اس نے یہی کچھ پوچھنا ہے تو سیدھی طرح کیوں نہیں پوچھتا! پوچھتا تو وہ یہی ہے لیکن فرانسیسی زبان میں۔"

"لیکن اس طرح پوچھنے کی بھی کیا تک ہے؟ کم از کم میں تو یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی شخص میرے ساتھ یوں کلام کرے —— یہ تو نری بیہودگی ہے۔"

"لیکن جم! یہ تو بتاؤ، کیا بلیاں بھی ہماری ہی طرح باتیں کرتی ہیں؟"

"نہیں تو۔"

"اور گائے؟"

"نہیں۔"

"کیا کبھی گائے بلی کی طرح بولتی ہے۔ یا بلی گائے کی طرح؟"

"نہیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ بلی اور گائے کی زبانوں کا ایک دوسرے سے مختلف ہونا

بالکل قدرتی امر ہے"۔

"یقیناً"

"تو پھر، اگر بلّی کی زبان اور گائے کی زبان ہماری زبان سے مختلف ہو تو یہ بھی قدرتی امر ہو گا۔

"تو پھر اگر ایک فرانسیسی کی زبان ہماری زبان سے مختلف ہے تو اس میں اچنبھے کی کیا بات ہے؟

"بالکل"۔

"لیکن بلّی کوئی انسان ہے؟"

"نہیں تو"

"تو پھر بلّی کیوں انسان کی طرح بولے؟ ــــ اور گائے انسان ہے کیا؟ یا گائے بلّی ہے؟"

"ہرگز نہیں"۔

"تو پھر وہ دونوں ایک دوسرے کی زبان کیوں بولیں؟ ــــ لیکن یہ تو تم مانتے ہو نا۔ کہ فرانسیسی انسان ہوتا ہے"۔

"بالکل"

"تو پھر وہ انسانوں کی زبان میں بات کیوں نہ کرے"؟

اب یہ تو بات روزِ روشن کی طرح عیاں تھی کہ اس شخص سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ایک حبشی کے ساتھ بحث کر کے اس کے بھیجے میں کوئی نئی بات بٹھانا بالکل غیر ممکن ہوتا ہے۔ لہٰذا میں خاموش ہو گیا۔

۱۵- ہَک کا بیڑے سے بچھڑ جانا۔ دھند میں پھنسنا۔ بیڑے کا ملنا۔ کوڑا کرکٹ

میرا خیال تھا کہ تین راتوں کے سفر کے بعد ہم کائرو جا پہنچیں گے۔ یہ شہر

ریاست الی نائس کے بالکل جنوب میں اس جگہ واقع ہے جہاں اوہیو دریا آکر دریا سے آملتا ہے۔ ہمیں اس جگہ کی تلاش تھی۔ ہماری سکیم یہ تھی کہ وہاں پہنچ کر بیڑا بیچ دیں گے اور جہاز پر چڑھ کر شمالی ریاستوں کی طرف نکل جائیں گے جہاں غلامی کا رواج نہیں تھا۔ بس وہاں پہنچ کر ہمارے سب دکھ دور ہو جائیں گے۔

اگلی رات خاصی دھند پڑی۔ ایسے موسم میں سفر کرنا دانشمندی نہیں تھی۔ لہذا ہم نے فیصلہ کیا کہ کشتی اور بیڑے کو کہیں باندھ دیا جائے۔ میں بیڑے کی رسی پکڑ کر ڈونگی میں جا بیٹھا اور اسے کھینچتا ہوا بیڑے کے آگے آگے چلنے لگا تاکہ کوئی اچھی سی جگہ دیکھ کر اسے باندھ دوں۔ لیکن وہاں چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کے سوا اور کوئی ایسی شے نظر نہ آئی جس کے ساتھ بیڑا بحفاظت بندھا رہ سکے۔ بالآخر میں نے رسی کو دو تین لپیٹ دیکر اسے ایک جھاڑی کے ساتھ باندھ دیا۔ جو بالکل کنارے پر ہی اگی ہوئی تھی۔ لیکن یہاں پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا اور بیڑا کچھ ایسی تیزی سے ادھر آیا کہ اس کے زور سے وہ جھاڑی جڑ سے اکھڑ گئی۔ اور یہ جا، وہ جا، بیڑا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ عین اسی وقت دھند اور بھی گہری ہو گئی۔ اتنی گہری کہ نظر بیس گز سے آگے کام ہی نہیں کرتی تھی۔ بیڑے کو یوں غائب ہوتا دیکھ کر میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ میں فوراً ناؤ میں کود گیا اور چپو اٹھا کر دیوانہ وار ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگا۔ مگر ناؤ تھی کہ ٹس سے مس نہ ہوتی تھی۔ ہوا یہ کہ گھبراہٹ میں، میں رسی کھولنا ہی بھول گیا تھا۔ خیر، میں اٹھ کر رسی کھولنے لگا۔ گھبراہٹ کا یہ عالم تھا کہ میرے ہاتھوں پر لرزہ طاری تھا اور مجھ سے کچھ بن نہ پڑتا تھا۔

خدا خدا کر کے کشتی روانہ ہوئی، اور میں فوراً بیڑے کے تعاقب میں نکل پڑا۔ میرے پسینے چھوٹ رہے تھے اور دل تھا کہ بیٹھا جاتا تھا۔ جب تک میں ٹاپو کے ساتھ ساتھ رہا مجھے کوئی دقت پیش نہ آئی۔ لیکن ٹاپو کی لمبائی محض ساٹھ گز ہی تو تھی۔ جونہی میں اس کے سرے پر پہنچا، پانی کا ایک ریلا مجھے بہا کر دریا میں لے گیا۔ ہر طرف دھند ہی دھند تھی۔ سفید اور گہری۔ مجھے یہ تک پتہ نہ چلا کہ کس سمت جا رہا ہوں۔ میری حالت تو اس مردے کی سی تھی جسے لوگ کندھوں

پر اٹھا کر جدھر چاہیں چل دیں۔

میں نے سوچا چپو چلانا بے سُود ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ریت کے کسی تودے یا ساحل کے ساتھ ٹکرا جاؤں۔ میں پاتو پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ لیکن کب تک؟ "او ۔۔۔ د ۔۔۔ د!" میں نے زور سے پکارا اور پھر ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگا۔ جواب میں کہیں سے "او ۔۔۔ د ۔۔۔ د" کی آواز آئی۔ لیکن یہ آواز بالکل مدھم تھی۔ میری جان میں جان آئی اور میں فوراً کشتی لے کر اس آمد کی سمت چل پڑا۔ گاہے گاہے میں رک کر کان کھڑے کر کے سننے لگتا۔ لیکن اگلی بار جب وہ آواز آئی تو مجھے یہ احساس ہوا کہ میں اس آواز کی سمت نہیں جا رہا، بلکہ میرا رخ اس سے ہٹ کر دائیں طرف کو ہے اور اس سے اگلی بار تو مجھے یوں لگا جیسے میں آواز سے ہٹ کر بائیں طرف کو جا رہا ہوں بس یوں لگتا تھا کہ آواز تک پہنچنے کی بجائے میں تودائروں میں سفر کر رہا ہوں۔ مگر حیرت یہ تھی کہ آواز ہر بار سامنے سے ہی آتی سنائی دیتی تھی۔

کاش وہ شخص کنستر پیٹ رہا ہوتا، اور وہ بھی لگاتار۔ لیکن وہ تو "او ۔۔۔ ہو۔" کئے جا رہا تھا اور وہ بھی وقفوں کے بعد۔ دراصل یہ وقفے ہی میری پریشانی کا باعث تھے خیر، موجوں سے لڑتا بھڑتا میں آگے بڑھتا رہا۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب مجھے یہ محسوس ہوا کہ دفعتاً یہ آواز میری پشت سے آنے لگی ہے۔ میں نے سوچا یا تو یہ آواز کسی دوسرے شخص کی ہے، یا پھر پورا چکر کاٹ کر میں اب عین مخالف سمت میں چل رہا ہوں۔

میں نے چپو پھینک دیا اور غور سے سننے لگا۔ آواز ایک بار پھر آئی اور اس بار بھی آئی تو یہ پیچھے سے، لیکن اس کا محلِ وقوع کچھ مختلف تھا۔ اس کے بعد یہ آواز برابر آتی رہی اور میں برابر اس کا جواب دیتا رہا اور اس تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن ہر بار یہ مختلف جگہ سے آتی سنائی پڑتی۔ رفتہ رفتہ یہ پھر سامنے سے آنے لگی۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ دھارے نے کشتی کا رخ پھیر دیا ہے، اور اب یہ پھر بہاؤ کی سمت بہہ رہی ہے۔ میری جان میں جان آئی۔ اگر یہ آواز واقعی جم ہی کی تھی، تو پھر مجھے کوئی خطرہ نہ تھا۔ لیکن اگر یہ جم کی بجائے کوئی اور ہی ہوا تو ۔۔۔ دھند میں

آواز پہچاننا خاصا مشکل ہوتا ہے کیونکہ دھند میں ہر شے کی ہئیت بدل جاتی ہے۔

اُ د --- و --- د کی آواز برابر آتی رہی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد میری ناؤ ساحل سے ٹکرا گئی۔ اس ساحل پر گنجان درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ یوں اگے ہوئے تھے جیسے بھوتوں کی قطاریں کھڑی ہوں۔ پانی کا ریلا مجھے بائیں طرف کو اچھال کر خود درختوں سے ٹکراتا، سر ٹپکتا دہاڑتا ہوا آگے نکل گیا۔

اگلے ہی لمحے دھند کی ایک موٹی سی چادر نے مجھے اپنے اندر لپیٹ لیا۔ ایک بار پھر چاروں طرف مکمل سکوت طاری ہوگیا۔ میں خاموش بیٹھا۔ اپنے دل کی دھک دھک سنتا رہا۔ خوف کے مارے اوپر کی سانس اوپر، اور نیچے کی نیچے رہ گئی تھی۔

بالآخر میں نے اس آواز تک پہنچنے کی کوشش ترک کردی۔ بات یہ تھی کہ خشکی کا یہ ٹکڑا دراصل ایک جزیرہ تھا۔ اور ہم اس کے دوسری طرف جا پہنچا تھا۔ یہ کوئی ریت کی پٹڑی تو تھی نہیں کہ تیز تیز چپو چلا کر دس منٹ میں پار کر لیا جائے۔ یہ تو خاصا بڑا جزیرہ تھا جو تقریباً پانچ چھ میل لمبا اور شائد آدھ میل چوڑا ہوگا۔ اور اس پر درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ اُگے ہوئے تھے۔

پندرہ منٹ تک میں یونہی خاموش بیٹھا رہا۔ میرے کان برابر اس آواز پر لگے ہوئے تھے ویسے تو کشتی چار پانچ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بہہ رہی ہو گی مگر لگتا ایسا تھا جیسے یہ ساکن کھڑی ہو۔ اگر کبھی کوئی درخت تیزی سے گزر جاتا تو بجائے یہ سوچنے کے کشتی کتنی تیز چل رہی ہے، میں اس بات پر حیران ہونے لگتا کہ درخت کس تیزی سے بہہ رہا ہے۔ اوہ خدا کس قدر سونے پن کا عالم تھا۔ ذرا تصور تو کیجیے۔ گہری دھند ہو۔ رات کا وقت ہو، اور آپ تن تنہا ایک کشتی میں بیٹھے ہوں!

تقریباً آدھ گھنٹے تک میں یونہی بہتا رہا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے بعد میں "اد۔ و۔ د" پکار لیتا اور پھر ہمہ تن گوش ہو کر جواب کا انتظار کرنے لگتا۔ بالآخر وہ آواز پھر سنائی دینے لگی لیکن یوں جیسے بہت دور سے آرہی ہو۔ میں نے فوراً کشتی کا رُخ اس کی طرف موڑ لیا۔ اور اس کے تعاقب میں چل پڑا۔ لیکن دفعتاً مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں ریت کے بہت سے تودوں میں پھنس گیا ہوں۔

یہ تودے ویسے تو مجھے دکھائی نہیں دیتے تھے لیکن جب کبھی ان کے درمیان بہنے والا دھارا چھوٹا ہو جاتا، تو مجھے ان کی ایک جھلک نظر آ جاتی۔ اور کبھی کبھی تو ان کے ٹکرانے والی لہروں کی ساں ساں کو سُن کر مجھے ان کی موجودگی کا احساس ہو جاتا۔ خیر تھوڑی دیر بعد وہ آواز پھر آئی، لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ اس کا پیچھا کرنا اتنا ہی بے سود ہے جیسے چھلاوے کے پیچھے بھاگنا۔ میں نے کبھی کسی آواز کو یوں آنکھ مچولی کرتے نہیں سنا تھا۔ اِدھر آئی، اُدھر غائب۔

چار پانچ بار تو میں کنارے سے ٹکراتا ٹکراتا بچا۔ وہ تو میری خوش قسمتی تھی کہ عین وقت پر میں کشتی کا رُخ موڑ لینے میں کامیاب ہو جاتا۔ مجھے یقین تھا کہ جم کا بیڑا بھی میری کشتی کی طرح ان کناروں سے ٹکراتا پھرتا ہو گا۔ ورنہ اگر وہ دریا میں ہوتا تو کہیں دور نکل گیا ہوتا اور مجھے یوں اس کی آواز سنائی نہ دیتی۔ ویسے بھی اس کے بیڑے کی رفتار میری کشتی سے زیادہ ہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد مجھے ایسا لگا جیسے میری کشتی ان تودوں میں سے نکل دریا میں آ گئی ہے۔ اب وہ آواز آنی بھی بند ہو گئی تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں جم کا بیڑا کسی درخت سے نہ ٹکرا گیا ہو۔ میں خود تھکن سے اس قدر چور تھا کہ اب چپو چلانے کی ہمت بھی باقی نہیں تھی۔ یہ سوچ کر کہ "جو ہونا ہوگا، ہو جائے گا" میں نے چپو رکھ دیے اور کشتی میں لیٹ گیا۔ سونا تو خیر نہیں چاہتا تھا مگر لیٹتے ہی نیند نے غلبہ پا لیا۔ بالآخر میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اگر چند منٹ سو لیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔

ایک بار جو آنکھ لگی تو پھر اسے کھولنا میرے بس کا نہ تھا۔ نہ جانے میں کتنی دیر سوتا رہا۔ جب میں جاگا تو دھند چھٹ چکی تھی اور اوپر آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے۔ میری کشتی تیزی سے ایک موڑ پار کر رہی تھی۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ شاید یہ خواب ہے۔ مجھے اتنا بھی تو پتہ نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں اور یہ جگہ کونسی ہے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد مجھے کچھ یاد آنے لگا لیکن یہ یادیں بھی کچھ ایسی دھندلی سی تھیں جیسے یہ واقعہ ایک ہفتہ پہلے ہوا ہو۔

اس جگہ دریا کا پاٹ نہایت چوڑا تھا۔ اس کے دونوں کناروں پر دیو قامت اور گنجان جنگل

آگے ہوئے تھے۔ ستاروں کی روشنی میں یہ جنگل یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے ایک ٹھوس سیاہ دیوار بہت دور تک کھینچتی چلی گئی ہو۔ ادھر سے نظریں ہٹا کر میں سامنے دیکھنے لگا۔ جہاں دور پانی پر ایک دھبہ سا کھسکتا جا رہا تھا۔ میں نے رفتار تیز کر دی۔ لیکن جب میں قریب پہنچا تو مجھے یہ دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی کہ وہ شے جو دور سے بیڑے کی طرح نظر آ رہی تھی، دو تین شہتیروں کا ایک چھوٹا سا گٹھا تھا جو خراماں خراماں بہتا چلا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور دھبہ دکھائی دیا اور میں اس کی طرف لپکا۔ مگر اس بار پھر مجھے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ ہاں! البتہ تیسری بار میرا اندازہ درست نکلا۔ یہ تیسرا دھبہ ہمارا بیڑا ہی تھا۔

بیڑے کے قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ جم گھٹنوں میں سر دیئے سو رہا ہے۔ اس کا دایاں ہاتھ چپو کے اوپر لٹکا ہوا تھا۔ دوسرا چپو ٹوٹ چکا تھا اور بیڑے پر پتوں، ٹہنیوں، اور کیچڑ کے انبار لگے تھے۔ ظاہر تھا کہ اس کا سفر خاصا کٹھن رہا ہے۔

میں نے ناؤ کو بیڑے کے ساتھ باندھ دیا اور جم کے پاس جا کر لیٹ گیا۔ اور یوں جسم کو کھینچ کھینچ کر جمائیاں اور انگڑائیاں لینے لگا کہ میری مٹھیاں بار بار جم سے ٹکرا گئیں۔ پھر میں نے کہا۔

"ہلو جم! ——— ارے! میں اتنی دیر سو بار رہا تم نے مجھے جگایا کیوں نہ؟"

"خدایا تیرا شکر ہے! ——— ارے ہک! تم کہاں سے آ گئے؟ تم زندہ ہو؟ کیا تم ڈوبے نہیں تھے؟ شکر ہے خدا کا تم واپس آ گئے! کیا یہ حقیقت ہے؟ مجھے یقین نہیں آ رہا۔ آؤ بیٹے آ گے آؤ۔ تا کہ تمہیں جی بھر کر دیکھ لوں۔ میرے قریب آؤ۔ تمہیں چھو کر تو دیکھوں کہ تم واقعی زندہ ہو۔ ارے تم تو سچ مچ ہک ہی ہو۔ میرا اپنا ہک! خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔"

"جم! ہوش میں آؤ۔ تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ تم کیسی باتیں کر رہے ہو! تم نشے میں تو نہیں ہو؟"

"نشے میں؟ کون ——— میں؟ ——— نشہ!!"

"تو پھر یہ بے تکی باتیں کیوں کر رہے ہو؟"

"بے تکی؟"

"بے تکی نہیں، تو اور کیا؟ ۔ ابھی ابھی تم میرے واپس آنے کا یوں ذکر کر رہے تھے جیسے میں کہیں کھو گیا تھا"

"اوہ ہک ـــ ہک! ذرا میرے ساتھ نظر ملا کر بات کرو۔

ہاں! اب بتاؤ تم گئے نہیں تھے کیا؟"

"میں چلا گیا تھا! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں تو کہیں نہیں گیا تھا۔ اور جاتا بھی کہاں؟

"تو پھر کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ پہلے یہ بتاؤ میں جم ہوں یا کوئی اور؟ اور اگر جم ہوں تو یہیں ہوں یا کہیں اور؟ پہلے اس کا فیصلہ ہو جائے۔ پھر آگے بات ہو گی۔"

"مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ تم جم ہو، اور یہیں ہو۔ لیکن یوں لگتا ہے کہ تمہارا سر پھر گیا ہے۔"

"میرا سر پھر گیا ہے!! ـــ اچھا، یہ تو بتاؤ تم وہاں کنارے پر ناؤ باندھنے نہیں اترے تھے کیا؟"

"نہیں تو ـــ کون سا کنارا؟ مجھے تو کوئی کنارا ونارا نظر نہیں آیا"

"کنارا نظر نہیں آیا! سنو ہک! جب تم ناؤ باندھنے اترے تھے، تو رسی کھل نہیں گئی تھی کیا؟ اور پھر میں اور بیڑا دریا میں بہنے لگے تھے، اور تم اور ناؤ وہیں دھند میں پیچھے رہ گئے تھے ـــ کیوں؟ یہ واقعہ ہے یا نہیں؟

"دھند! کیسی دھند؟"

"وہی دھند جو ہوا کرتی ہے۔ اور کیسی؟ وہی دھند جو رات بھر چھائی رہی ہے ـــ اور۔ اور پھر تم "او۔ و۔ و" نہیں کرتے رہے تھے کیا؟ اور میں نے اس کا جواب نہیں دیا تھا؟ ـــ اور پھر ہم ان ریت کے تودوں میں پھنس گئے تھے، اور ہم میں سے ایک پیچھے رہ گیا تھا اور ڈوب گیا تھا اور دوسرا بھی ڈوبنے ہی والا تھا۔ یہ دوسرا یقیناً ڈوب ہی جاتا کیونکہ اسے یہ تک تو پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے، کس جگہ ہے؟؟ ـــ اور پھر کیا یہ غلط ہے میں ان تودوں سے ٹکراتا رہا ہوں؟ اور یہ بھی کہ کئی بار میں ڈوبتا ڈوبتا بچا ہوں؟؟ کیا یہ سب جھوٹ ہے؟ سپنا۔

بولو، جواب دو۔"

"سنو، جم! میری سمجھ میں بالکل کچھ نہیں آرہا کہ تم کہہ کیا رہے ہو —— نہ تو مجھے کوئی دھند نظر آئی ہے، نہ تودے۔ اور نہ ہی یہ آفتیں جن کا تم ذکر کر رہے ہو۔ میں تو ساری رات یہیں بیٹھا تم سے باتیں کرتا رہا ہوں۔ ابھی دس منٹ پہلے تم سو گئے تھے۔ شاید میں بھی سو گیا ہوں گا۔ اور ظاہر ہے کہ ان دس منٹوں میں تم نے شراب تو پی نہیں۔ یقیناً خواب دیکھا ہے۔"

"واہ بھئی واہ! بھلا یہ سب کچھ دس منٹ کے خواب میں ہی مجھ پر بیت گیا ہے؟"

"اور کیا؟ یہ سب کچھ جو تم بتا رہے ہو، محض واہمہ ہے۔"

"لیکن ہک! یہ سب کچھ تو مجھے روزِ روشن کی طرح ......"

"روزِ روشن کی طرح ہو یا کسی اور طرح۔ لیکن حقیقت اس میں رتی بھر بھی نہیں۔ میں بھی تو یہیں تھا۔ مجھے یہ سب کچھ کیوں نظر نہیں آیا؟"

جم خاموش ہو گیا اور یوں ہی ساکت بیٹھا کوئی پانچ منٹ تک اس واقعہ پر غور کرتا رہا۔ پھر بولا: "اچھا یونہی سہی۔ میں نے خواب ہی دیکھا ہوگا۔ لیکن یقین جانو۔ ایسا عجیب غریب خواب میں نے زندگی بھر کبھی نہیں دیکھا جو خواب کم ہو اور حقیقت زیادہ۔ اور جسے دیکھنے کے بعد میں یوں تھک کر چور ہو گیا ہوں۔"

"کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ خواب میں آدمی کوئی ایسا کام کرتا ہے جس سے وہ تھک جاتا ہے۔ لیکن تمہارا یہ خواب واقعی عجیب و غریب ہے۔ ذرا بتاؤ تو، تم نے کیا دیکھا تھا؟"

بس پھر کیا تھا، جم نے وہ سارے واقعات تفصیلاً کہہ سنائے۔ البتہ کہیں کہیں اس نے خوب رنگ آمیزی بھی کی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ خواب کسی خطرے کی نشاندہی کرتا ہے۔ لہٰذا وہ کہنے لگا: "میں اس کی تعبیر بتانے کی کوشش کرتا ہوں —— پہلی پٹڑی سے مراد ایک ایسا شخص ہے، جو ہمارے ساتھ نیکی کرے گا۔ لیکن پانی کے تند دھارے کا مطلب ہے کہ کوئی دوسرا شخص ہمیں اس نیک بندے سے جدا کر دے گا۔ آوازیں ان خطروں کی علامتیں ہیں

جن کی ہمیں وقتاً فوقتاً پیشگی اطلاع ملتی رہا کرے گی۔ اگر ہم نے ان علامتوں کی پروا نہ کی تو یقیناً کسی نہ کسی آفت میں مبتلا ہو جائیں گے۔ بہت سارے ترُدوں سے مراد ہے بہت ساری آفتیں جن میں جھگڑالو یا کمینے لوگ ہمیں پھنسانے کی کوشش کریں گے۔ لیکن اگر ہم نے ان کی باتوں پر توجہ نہ دی اور اپنے کام سے کام رکھا تو ہم دھند میں سے یعنی آفات کے پھندوں سے خیر و عافیت نکل آئیں گے۔ اور پھر دریا میں بہنے لگیں گے یعنی ہمارا راستہ ہموار ہو جائے گا۔ دریا سے مراد وہ ریاستیں ہیں، جہاں غلامی کا رواج نہیں۔ بس وہاں پہنچ کر ہم ہر آفت سے محفوظ ہو جائیں گے۔"

جب میں واپس بیڑے میں سوار ہوا تھا، تو آسمان پر گہرے بادل گھر آئے تھے اور تاریکی اور بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ لیکن اب بادل چھٹنے شروع ہو گئے تھے۔

"تعبیر تو واقعی اچھی ہے۔ لیکن ذرا یہ تو بتاؤ کہ ان پتوں، ٹہنیوں، کیچڑ اور اس ٹوٹے ہوئے چپو کا کیا مطلب ہے؟" میں نے ان چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا جو بیڑے پر جا بجا بکھری ہوئی تھیں۔

جم حیرت سے کبھی اس خس و خاشاک کو دیکھتا اور کبھی مجھے۔ لیکن خواب والی بات اس کے ذہن پر یوں حاوی ہو چکی تھی کہ حقائق کو اصل روپ میں دیکھنا اب اس کے لئے ممکن ہی نہ تھا۔ بالآخر جب ان چیزوں کی نوعیت اس کی سمجھ میں آ گئی، تو اس نے اپنی آنکھیں میرے چہرے پر جما دیں اور نہایت سنجیدگی سے بولا!

"کیا پوچھا تھا تم نے؟ یہی نا، کہ ان چیزوں کا مطلب کیا ہے؟ تو سنو۔ جب میں چپو چلاتا چلاتا اور تمہیں پکارتا پکارتا تھک گیا۔ تو مجھے نیند آ گئی۔ میرا خیال تھا کہ اب تم مجھ سے بچھڑ گئے ہو۔ لہٰذا میرا دل اس قدر ٹوٹ گیا کہ مجھے اس بات کی بالکل پروا نہ رہی کہ میرا یا اس بیڑے کا کیا حشر ہو گا۔ لیکن جب میں جاگا، اور تمہیں صحیح سلامت اپنے سامنے موجود پایا، تو میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ مجھے تمہارے لوٹ آنے کی اتنی خوشی تھی کہ میرا جی

چاہ رہا تھا کہ دو زانو ہو کر تمہارے پاؤں چوم لوں۔ لیکن ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو! تمہاری کوشش یہی تھی کہ جھوٹ بول کر مجھے بیوقوف بناؤ ـــــ ہاں تو تم نے یہی پوچھا تھا نا کہ یہ سب کیا ہے؟ تو سنو! ان اشیاء کو کوڑا کرکٹ کہتے ہیں۔ اور ان لوگوں کی اصلیت بھی کوڑا کرکٹ سے کم نہیں ہوتی، جو اپنے دوستوں پر کیچڑ اچھال کر انہیں شرمندہ کرتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ ہوتے ہوئے اٹھا اور جھونپڑی کے اندر چلا گیا۔ جو کچھ اس نے کہا تھا، وہ میرے ڈوب مرنے کے لئے کافی تھا۔ میں اپنے کئے پر اس قدر نادم تھا کہ اگر مجھے یقین ہوتا کہ میرے اس فعل سے جم اپنے الفاظ واپس لے لے گا، تو میں اُس کے پاؤں بھی چومنے کو تیار تھا۔

اس کے بعد میری اتنی ہمت نہ ہوئی کہ جم کے ساتھ آنکھ ملا سکوں۔ تقریباً پندرہ منٹ تک میں یونہی بیٹھا رہا۔ بالآخر میں اٹھا اور جم کے پاس جا کر اس سے معافی مانگی۔ یہ درست ہے کہ وہ حلبشی تھا لیکن مجھے اس بات کا کوئی رنج نہیں کہ مجھے ایک حلبشی سے نیچا دیکھنا پڑا۔ اس دن کے بعد میں نے اس سے کبھی مذاق نہ کیا۔ اگر مجھے یہ علم ہوتا کہ میرا مذاق اسے اس قدر ناگوار گزرے گا، تو شاید میں یہ مذاق کبھی نہ کرتا۔

۱۶۔ توقعات۔ سفید جھوٹ۔ بہتے ہوئے سکے۔ کائرو کو پیچھے چھوڑ جانا۔ تیر کر ساحل پر پہنچنا۔

ہم سارا دن سوتے رہے اور جب رات آئی، تو پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ ہم ایک

بہت بڑے بیڑے کے پیچھے پیچھے ہو لئے جو یوں آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا جیسے یہ کسی جلوس کی جھانکی ہو۔ اس کے دونوں سروں پر چار لمبے لمبے حفاظتی چھجے لگے تھے جس سے ہم نے اندازہ لگایا کہ اس میں کم از کم تیس سواریاں ہوں گی۔ اس پر پانچ جھونپڑیاں بنی تھیں جو ایک دوسری سے کافی دور تھیں۔ ان جھونپڑیوں کے درمیان الاؤ جل رہا تھا۔ دونوں سروں پر لمبے لمبے ستون گڑے تھے جو جھنڈا لہرانے کے کام آتے تھے۔ یہ بیڑا واقعی پُرشکوہ تھا۔ ایسے بیڑے پر ملاح ہونا بھی باعثِ فخر تھا۔

بہتے بہتے ہم ایک ایسی جگہ جا پہنچے جہاں دریا ایک طرف کو مڑ جاتا تھا۔ اب بادل چھا گئے تھے اور رات خاصی گرم ہو گئی تھی۔ یہاں دریا کا پاٹ بہت چوڑا تھا اور اس کے دونوں طرف گھنے جنگل تھے۔ یہ جنگل اتنے گنجان تھے کہ درختوں کی قطاریں ٹھوس دیوار کی طرح نظر آرہی تھیں۔ ان میں اتنی بھی دراڑ نہ تھی کہ اس طرف کی ایک جھلک بھی نظر آسکے۔ ہم قاہرہ کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ ہمیں شک تھا کہ اگر اس قصبے تک پہنچ بھی گئے تو اسے پہچان بھی پائیں گے یا نہیں۔ مجھے یقین نہ تھا کہ ہم اسے پہچان سکیں گے۔ میں نے سن رکھا تھا یہ قصبہ صرف دس بارہ گھروں پر مشتمل ہے۔ اگر ان مکانوں کی بتیاں بجھی ہوں تو ہمیں پتہ بھی نہیں چلے گا کہ قصبہ کب آیا اور کب نکل گیا لیکن جم کہنے لگا کہ جہاں دو دریاؤں کا سنگم ہوگا وہی جگہ قاہرہ ہوگی۔ میں نے کہا: "لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم اس سنگم کو پہچان ہی نہ پائیں اور اس مغالطے میں رہیں کہ ہم کسی جزیرے کے اس پار سے ہو کر پھر دریا میں داخل ہو رہے ہیں۔ ہم دونوں کافی پریشان تھے۔ سوال یہ تھا کہ آخر کیا کیا جائے؟ میری رائے تھی کہ جونہی روشنی نظر آئے میں ساحل پر جا اتروں اور کہوں کہ میرا ابا پیچھے کشتی پر سامان لا رہا ہے اور چونکہ وہ اس علاقے سے ناواقف ہے اس نے مجھے یہ معلوم کرنے بھیجا ہے کہ قاہرہ یہاں سے کتنی دور ہے۔ یہ تجویز جم کو بھی پسند آئی ہم نے پائپ سلگا لئے اور انتظار کرنے لگے۔

اب ہمیں صرف ایک ہی فکر تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ قصبہ آئے اور نکل جائے اور ہمیں

پنہ ہی نہ چلے۔ جم کو یقین تھا کہ وہ اسے فوراً پہچان لے گا۔" میں اسے کیسے بھول سکتا ہوں؟ وہاں پہنچتے ہی میری غلامی ختم ہو جائے گی اور میں آزاد ہو جاؤں گا۔ لیکن اگر ہم اس کے پار چلے گئے تو ہم پھر ایسے علاقے میں پہنچ جائیں گے جہاں غلامی کا رواج ہے اور میں پھر غلام کا غلام رہوں گا"۔۔۔۔۔ لہٰذا تھوڑے تھوڑے وقفے بعد وہ اچھل پڑتا اور کہتا "وہ دیکھو! وہ رہی روشنی!"

لیکن جلد ہی ہمیں مایوس ہونا پڑتا۔ کیونکہ جسے وہ روشنی سمجھتا تھا، وہ یا تو کوئی جگنو ہوتا یا پھر چھلاوا۔ وہ پھر بیٹھ جاتا اور اس کی آنکھیں ایک بار پھر کسی روشنی کا انتظار کرنے لگتیں۔ آزادی اب اس کے اس قدر قریب تھی کہ اس کے تصور ہی سے اس کے دل میں ہیجان سا پیدا ہونے لگا تھا۔ اس کی اس بے تابی کو دیکھ کر میں خود بے چین ہو رہا تھا۔ اور میرے جسم پر لرزہ سا طاری تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اب جب کہ اس کی آزادی کا خواب حقیقت بننے والا تھا، مجھے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا تھا۔ جم کی غلامی کو ختم کرانے میں کس کا ہاتھ تھا؟ میرا ۔۔۔ اور کس کا؟ میرے ضمیر پر ایک بوجھ سا آپڑا تھا۔ مجھے ایک پل بھی چین نہ پڑ رہا تھا۔ اس وقت تک مجھے یہ احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ میرا یہ عمل قابل گرفت ہے۔ لیکن اب جب مجھے اس کا احساس ہوا تو میرا ضمیر بے چین ہو اٹھا۔ میں نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دینے کی کوشش کی کہ قصور میرا نہیں۔ میں نے کہاں جم کو بھگایا ہے؟ لیکن ہر بار میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا اور کہتا: "مگر تمہیں یہ علم تو تھا کہ وہ اپنی آقا کو چھوڑ کر بھاگ آیا ہے۔ تمہارا فرض تھا کہ تم کشتی کو سیدھے ساحل پر لے جاتے اور اس کی مخبری کر دیتے۔"

اس دلیل کے سامنے میں لاجواب ہو گیا اور میری پریشانی اور بھی بڑھ گئی۔ ضمیر پھر کہتا: "بچاری مس واٹسن نے تمہارا کیا بگاڑا تھا کہ تم اس کے غلام کو بھاگتا دیکھتے رہے اور تم نے ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالا؟ اس بچاری نے تمہارا کیا بگاڑا تھا کہ تم نے اس کے ساتھ یہ سلوک کیا؟ اس نے تمہیں انسان بنانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی، تمہارے ساتھ نیکی کرتی رہی، تمہیں انجیل پڑھاتی رہی۔ اور تم نے اس کی نیکیوں کا یہ صلہ دیا!"

ضمیر کی لعن طعن سے میں اس قدر پریشان ہو گیا کہ میں سوچنے لگا کہ اس سے تو موت ہی بھلی۔ انتہائی اضطراب کے عالم میں میں خود کو کوستا، بیڑے پر ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔ اُدھر جم کی حالت بھی غیر تھی۔ وہ نہایت بیتابی کے عالم میں ادھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ ہم دونوں ایک عجیب سی کشمکش میں مبتلا تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے بعد جب وہ ٹہلتا ٹہلتا ایکدم مڑ کر کہتا: "وہ دیکھو! وہ رہا کائرو!" تو میرے سینے میں خنجر سا چبھ جاتا۔ میں سوچنے لگتا کہ اگر یہ واقعی کائرو ہی ہوا تو میں شرم سے ڈوب مروں گا۔

ادھر میں اس ادھیڑ بن میں غرق تھا، اُدھر جم مجھے اپنی سکیمیں سنا رہا تھا۔ وہ کہتا: "جب میں کسی ایسی ریاست میں پہنچ جاؤں گا، جہاں غلامی کا رواج نہیں، تو سب سے پہلا کام یہ کروں گا کہ جو کچھ کماؤں گا، اس میں سے ایک پیسہ بھی خرچ نہ کروں گا۔ اور جب میرے پاس کافی رقم جمع ہو جائے گی، تو اپنی بیوی کی قیمت ادا کر کے اسے چھڑا لوں گا۔ میری بیوی بھی وہیں مس واٹسن کے پڑوس میں ایک زمیندار کی غلامی میں ہے۔ پھر ہم دونوں محنت مزدوری کریں گے اور اپنے دونوں بچوں کو آزاد کرا لیں گے —— اور بالفرض اگر ان کے آقا نے انہیں بیچنے سے انکار کر دیا تو میں کسی ایسے سوشل ورکر کی مدد سے، جو غلامی کا مخالف ہو گا، انہیں اغوا کر لوں گا۔"

اس کی باتیں سن سن کر میرا جسم شل ہوا جاتا تھا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی ایسی باتیں نہ کی تھیں۔ ذرا غور تو کیجیے، آزادی کے تصور ہی سے اس میں کتنا فرق آ گیا تھا۔ یہ تو بالکل اس کہاوت والی بات ہوئی کہ "حبشی کو ایک انچ دے دو، پھر وہ سارا گز ہتھیا لے گا۔" میں نے اپنے آپ کو بہت کوسا کہ یہ سب میری ہی بے وقوفی کا نتیجہ ہے۔ یہ بات مجھے پہلے کیوں نہ سوجھی۔ یہ وہی حبشی ہے جو میری وجہ سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اور اب اس کی یہ مجال کہ وہ بچوں کو اغوا کرنے کی سوچ رہا ہے۔ آخر ان بچوں کے آقا نے میرا کیا بگاڑا ہے؟ میں تو اس بچارے کو جانتا تک نہیں!

جم کی باتیں سن کر مجھے بڑا دکھ ہوا۔ اس کے بارے میں میری رائے یکسر بدل گئی۔ میرا ضمیر نہایت شدت سے مجھے لعن طعن کرنے لگا۔ بالآخر مجھ سے اور برداشت نہ ہو سکا اور میں نے اپنے ضمیر سے کہا: "ذرا صبر سے کام لو۔ ابھی تیر کمان سے نہیں نکلا۔ ذرا روشنی نظر آنے دو۔ میں فوراً ساحل پر جا کر اس کی مخبری کر دوں گا۔" اس سے مجھے کچھ سکون ملا۔ میرے سینے سے بوجھ ہٹ گیا اور میری پریشانی دور ہو گئی۔ میں گنگناتا ہوا نہایت بے تابی سے کسی روشنی کا انتظار کرنے لگا ——— تھوڑی دیر بعد ایک روشنی دکھائی دی۔ اور اس کے ساتھ ہی جم کی آواز آئی: "ہک! اٹھو اور سیلیوٹ کرو۔ اب میں محفوظ ہوں۔ بالآخر کائرو آ ہی گیا۔ میرا دل کہتا ہے یہ کائرو ہی ہے۔"

میں نے جواب دیا: "ذرا ٹھہرو۔ میں ناؤ لے کر پتہ کرتا ہوں۔ ممکن ہے یہ شہر کائرو نہ ہو ———"

اس نے فوراً کشتی تیار کی اور میرے بیٹھنے کے لئے اپنا پرانا کوٹ اس کے پیندے میں بچھا دیا۔ پھر اس نے مجھے چپو پکڑا دیا اور جب میں چلنے لگا تو بولا: "آہا! اب وہ وقت آنے ہی والا ہے۔ جب میں خوشی کے نعرے بلند کروں گا اور کہوں گا 'ہک! زندہ باد!' — میں آزاد ہوں اور اس کا سہرا ہک کے سر ہے۔ بغیر ہک کی مدد کے مجھے یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ ہک! میں یہ احسان تا عمر نہیں بھولوں گا۔ ایسا دوست جم کو آج تک نصیب نہیں ہوا۔ تم جم کے بہترین دوست ہو۔"

کشتی روانہ ہو گئی۔ اس وقت تک میرا مصمم ارادہ یہی تھا کہ اس کی مخبری کر دوں گا۔ لیکن یہ آخری جملہ سن کر میری ہمت جواب دے گئی۔ میں نے رفتار دھیمی کر دی اور سوچنے لگا کہ جس مقصد کے لئے میں جا رہا ہوں، اُسے پورا کر کے کیا واقعی مجھے راحت ملے گی؟ ابھی میں پچاس ہی گز گیا ہوں گا کہ جم بول اٹھا: "شاباش ہک! تم واحد گورے ہو جس نے جم سے وعدہ کر کے اسے نبھایا ہے۔"

میری حالت قابلِ رحم تھی۔ تاہم میں نے اپنے آپ سے کہا "فرض تو پورا کرنا ہی ہوگا۔ میں بے گناہ اپنے فرض سے کوتاہی نہیں کروں گا" ـــــ اسی وقت ایک کشتی لپکتی ہوئی میری طرف آئی۔ اس میں دو آدمی بیٹھے تھے اور ان کے پاس بندوقیں تھیں۔ وہ میرے قریب آکر رک گئے۔ میں نے بھی چپو روک لئے۔ ان میں سے ایک بولا "وہ ادھر کیا شے ہے؟"

"بیڑا" میں نے جواب دیا۔

"تمہارا ہے"؟

"جی"

"کوئی دوسرا آدمی بھی ہے؟"

"ہاں، ایک"

"اچھا!۔ آج پانچ حبشی یہاں سے فرار ہوگئے ہیں۔ وہ ادھر اس موڑ پر سے بھاگ نکلے تھے ـــــ اچھا، وہ تمہارا آدمی حبشی ہے یا گورا؟"

مجھ سے فوراً کچھ جواب بن نہ پڑا میں نے بہت کوشش کی لیکن میرے لب نہ ہلے میں چاہتا تھا کہ جی کڑا کرکے جم کا راز فاش کردوں، لیکن انتہائی کوشش کے باوجود میرا حوصلہ نہ ہوا۔ میں تو خرگوش سے بھی بزدل نکلا۔ مخبری کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ بالآخر میں نے جواب دیا "گورا"۔

"چلو ہم خود ہی چل کر دیکھ لیتے ہیں"

"شکریہ" میں نے کہا "میرا ابا اس بیڑے پر ہے۔ اگر آپ میرے ساتھ چل کر اس بیڑے کو یہاں روشنی میں کھینچ لانے میں ہماری مدد کریں، تو آپ کی نہایت مہربانی ہوگی ابا، اور اماں، اور میری آپا ہیں۔ ان سب کی طبیعت خراب ہے"۔

"اس وقت ہمیں جلدی تو بہت ہے لیکن اب تمہارے ساتھ تو چلنا ہی پڑے گا۔ چلو وقت ضائع مت کرو۔ چپو اٹھاؤ"۔

میں نے چپو اٹھا لیا۔ وہ بھی اپنی کشتی کھینے لگے۔ جب ہم دو چار گز آگے آگئے تو میں بولا:

"ابا یقیناً آپ کے نہایت مشکور رہیں گے۔ بات یہ ہے کہ اب تک میں نے جتنے بھی لوگوں سے مدد مانگی ہے، ان سب نے بیڑے کو ساحل تک لانے میں ہماری مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ اور دیکھئے نا، اسے ساحل پر لانا مجھ اکیلے کے بس کی بات نہیں"

"بہت کمینے لوگ تھے وہ! لیکن بات کچھ عجیب سی لگتی ہے۔ اچھا بیٹے! یہ تو بتاؤ تمہارے ابا کو تکلیف کیا ہے؟"

"جی۔ اُنہیں ــــ وہ ــــ کوئی خاص تکلیف تو نہیں"

انہوں نے فوراً چپو روک لئے۔ اب ہم بیڑے سے تھوڑی ہی دور رہ گئے تھے۔

ان میں سے ایک بولا:

"لڑکے! تم جھوٹ بول رہے ہو۔ سچ سچ بتاؤ تمہارے باپ کو کیا تکلیف ہے؟ اگر اب بھی جھوٹ بولا تو تمہاری خیر نہیں"

"جی۔ میں۔ میں۔ بالکل سچ۔ میرے ابا کو وہ۔ وہ ــــ لیکن جناب ہمیں یوں بے سہارا چھوڑ کر تو مت جائیے۔ دیکھئے نا، آپ تھوڑی دور اور چلے آیئے۔ میں آپ کو رسی پکڑا دوں گا۔ آپ بے شک بیڑے پر نہ چڑھئیں"

"او جان! واپس چلو۔ جلدی واپس مڑو" ان میں سے ایک بولا "لڑکے ہٹ جاؤ یہاں سے۔ ہوا کے رخ سے پرے ہو جاؤ۔ تمہارا ستیاناس! مجھے ڈر ہے کہیں ہوا نے یہ نامراد مرض ہم تک پہنچا ہی نہ دیا ہو۔ اب بات سمجھ میں آئی۔ تمہارے ابا کو چیچک ہے۔ اور یہ تو تم جانتے ہو یہ کتنا نامراد مرض ہے۔ تم نے پہلے کیوں نہ بتا دیا؟ یہاں بیماری پھیلانا چاہتے ہو کیا؟" ــــ

"ج۔ جناب" میں نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا "میں کیا کرتا؟ جس کسی سے بھی میں نے مرض کا ذکر کیا وہی ہماری مدد کرنے کی بجائے دم دبا کر بھاگ گیا"

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ ہمیں واقعی افسوس ہے۔ لیکن ـــــ پھر بھی۔ دیکھو نا، ہمیں بھی تو یہ مرض نہیں خریدنا ہے۔ اچھا اب تم یہاں سے چل دو۔ ساحل پر آنے کی کوشش مت کرنا۔ تم سے اکیلے تو بیڑا کھنچے گا نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دو۔ یہاں سے بیس میل آگے دریا کے بائیں کنارے پر ایک قصبہ آئے گا۔ اور تمہارے وہاں پہنچنے تک دن بھی کافی نکل آیا ہو گا۔ تم وہاں یہ کہہ کر مدد مانگنا کہ تمہارے ابا کو اور دوسرے لوگوں کو سردی لگ گئی ہے۔ بس اور کچھ نہ کہنا۔ نہیں تو وہاں بھی یہی حشر ہو گا۔ دیکھو نا، ہم تمہارے ساتھ کتنی اچھی طرح پیش آرہے ہیں۔ بس اب تم یہاں سے چل دو اور بیس میل پرے جا کر ہی دم لینا۔ شاباش! تم تو بہت اچھے لڑکے ہو۔ وہ جو سامنے روشنی ہے، وہاں رُکنے کی کوشش نہ کرنا۔ وہ تو صرف لکڑیاں لادنے کا گھاٹ ہے۔ اور ہاں، سنو۔ تمہارے ابا کو شاید پیسوں کی ضرورت ہو۔ اور بیچارے کی حالت بھی تو خراب ہے۔ یہ لو یہ بیس ڈالر کا سونے کا سکہ۔ میں اسے اس لکڑی پر رکھ کر تمہاری طرف بہا دیتا ہوں۔ جب یہ لکڑی تمہارے قریب پہنچے، تو یہ سکہ اٹھا لینا۔ تم لوگوں کو یوں اس حالت میں بے یار و مددگار چھوڑ دینا ہے تو کمینگی، لیکن چیچک کا مرض کون مول لے؟"

"پارکر! ایک منٹ رکو۔" دوسرا بولا۔ "میں بھی بیس ڈالر کا سکہ اس لکڑی پر رکھے دیتا ہوں۔ اچھا بیٹے۔ خدا حافظ۔ اب تم ویسے ہی کرنا جیسا مسٹر پارکر نے بتایا ہے۔"

"ہاں بیٹے۔ بالکل ویسے ہی کرنا۔ اور سنو۔ اگر کوئی بھگوڑا حبشی تمہیں مل جائے تو فوراً شور مچا کر اسے پکڑوا دینا۔ شاید تمہیں کچھ اور رقم مل جائے۔"

"خدا حافظ جناب۔" میں نے جواب دیا۔ "اگر مجھ سے بن پڑا تو کسی سالے حبشی کو بچ کر نہ نکلنے دوں گا۔"

جب وہ چلے گئے تو میں واپس بیڑے پر آگیا۔ میں اپنے کیے پر بہت نادم تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جو کچھ میں نے کیا ہے، وہ درست نہیں۔ تاہم پچھتانے سے حاصل؟ ایسا لگتا تھا کہ مجھ

جیسے شخص کے لئے، جس کی زندگی کا آغاز ہی غلط ڈھنگ سے ہوا ہو، سدھرنے کی کوشش بے سود ہے۔ ایسے شخص کو جب بھی نیک بننے کا کوئی موقع نصیب ہوتا ہے، تو مناسب تربیت کے فقدان کی وجہ سے اس کے ارادے متزلزل ہو جاتے ہیں، اور وہ اپنی خواہش کو عملی جامہ پہنا ہی نہیں سکتا۔۔۔۔ اس کے بعد میرے خیالات کا دھارا ایک اور سمت بہہ نکلا۔ میں نے سوچا: چلو فرض کیا کہ میں نیک بن جاتا اور جم کو پکڑوا دیتا۔ تو کیا تب مجھے اپنے کئے پر ندامت نہ ہوتی۔ کیا اس صورت میں میری حالت موجودہ حالت سے بہتر ہوتی؟ ہرگز نہیں اس وقت بھی ذہنی طور پر اسی طرح مضطرب رہتا تو پھر نیک بننے سے فائدہ؟ جب نیکی کرنے میں دشواریاں اٹھانی پڑتی ہوں، لیکن برا بنے رہنے میں کوئی خاص دقت نہ ہو؛ اور نتیجہ دونوں صورتوں میں وہی رہے؛ تو پھر خواہ مخواہ اپنی ڈگر کیوں چھوڑی جائے؟۔۔۔ اپنے ان سوالوں کا مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کر لیا کہ آیندہ نیکی اور بدی کے ان بکھیڑوں میں نہیں پڑوں گا۔ بلکہ وہی کچھ کروں گا جو مجھے جچتا ہو۔

بیڑے پر پہنچ کر میں نے جم کو بہت تلاش کیا۔ لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا۔ میں نے جھونپڑی کے اندر بھی جھانک کر دیکھا۔ مگر وہ وہاں بھی نہیں تھا۔

"جم"، میں نے پکارا۔

"ہک! میں یہاں ہوں۔ اِدھر۔ وہ لوگ اب نظر تو نہیں آتے نا؟ آہستہ بولو"

وہ دریا میں کشتی کے ایک طرف چپو کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ صرف اس کی ناک پانی سے باہر تھی۔ جب میں نے اسے یقین دلایا کہ وہ لوگ کافی دور چلے گئے ہیں، تب کہیں جا کر وہ بیڑے پر چڑھا ۔۔۔ اور بولا:

"میں نے تمام گفتگو سن لی تھی۔ اسی لئے تو میں پانی میں اتر گیا تھا کہ اگر کہیں وہ لوگ بیڑے پر آ چڑھتے، تو میں تیر کر کنارے پر چلا جاتا۔ اور پھر جب وہ دفع ہو جاتے، تو میں واپس بیڑے پر آ جاتا۔ لیکن ہک بھئی۔ شاباش ہے۔ تمہیں۔ تم نے انہیں خوب اُلّو بنایا ہے۔ تم نے

تو میری جان بچا لی۔ یہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھولوں گا"

اس کے بعد ہم اس رقم کے متعلق غور کرنے لگے جو یوں اچانک ہمارے ہاتھ آگئی تھی، رقم بھی خاصی تھی۔ یعنی بیس بیس ڈالر۔ جم کہنے لگا کہ اب اگر ضرورت پڑی تو اب ہم جہاز میں بھی سفر کر سکیں گے۔ اور یہی نہیں آزاد ریاستوں میں پہنچ کر جہاں غلامی کا رواج نہیں، ہم اسی رقم سے اپنا گزارہ چلاتے رہیں گے جب تک کہ کوئی اور بندوبست نہیں ہو جاتا۔ اخراجات کا مسئلہ اب ہمارے ارادوں کے راستے میں حائل نہیں ہو سکے گا ــــ اور پھر اب فاصلہ رہ ہی کتنا گیا تھا؟ صرف بیس میل۔ یہ بیڑا بیس میل تک تو ساتھ دیگا ہی ـــــ جم کی کتنی تمنا تھی کہ کاش اب تک ہم وہاں پہنچ لئے ہوتے۔!

پو پھٹتے ہی ہم نے بیڑے کو کنارے پر باندھ دیا۔ جم اس معاملے میں خاصا محتاط تھا کہ بیڑے کو خوب اچھی طرح چھپا دیا جائے تا کہ کسی کو نظر نہ آئے۔ اس کے بعد وہ سارا دن سامان کو گٹھڑیوں میں باندھتا رہا۔ اب وقت آگیا تھا جب ہم بیڑے کو چھوڑ سکتے تھے۔

اس رات کوئی دس بجے کے قریب ہمیں بائیں طرف کو ایک موڑ پر کچھ روشنیاں نظر آئیں۔ یقیناً یہ کوئی قصبہ تھا۔ میں فوراً ناؤ لے کر نکل پڑا تا کہ پتہ لگاؤں یہ کون سا قصبہ ہے۔ تھوڑی دور جا کر مجھے ایک آدمی ملا جو اپنی کشتی میں بیٹھا مچھلیاں پکڑنے کے لئے ڈوریاں لگا رہا تھا۔ میں نے اس کے قریب جا کر پوچھا۔

"مسٹر۔ یہ قصبہ کائرو ہی ہے نا؟"

"کائرو؟ تمہارا دماغ تو صحیح ہے؟"

"تو پھر کون سا قصبہ ہے؟"

"میرا سر مت کھاؤ۔ ادھر جا کر پوچھ لو۔ اگر تم آدھ منٹ کے اندر اندر یہاں سے دفعان نہ ہوئے، تو تمہاری خیر نہیں۔"

میں واپس بیڑے پر چلا آیا۔ یہ خبر سن کر جم کو خاصی مایوسی ہوئی لیکن میں نے

اسے دلاسا دیا کہ چلو، کوئی بات نہیں۔ یہ قصبہ کائرو نہیں، تو نہ سہی۔ اگلا قصبہ تو ضرور ہی کائرو ہو گا۔

سورج نکلنے سے تھوڑی دیر پہلے ہمیں ایک اور قصبہ نظر آیا۔ میں پھر کشتی لے کر تیار ہو گیا لیکن جم نے روک دیا اور کہنے لگا کہ یہ قصبہ ہرگز کائرو نہیں ہو سکتا کیونکہ کائرو کی زمین اونچی نہیں۔ یہ بات میرے ذہن سے اتر ہی گئی تھی۔ خیر، ہم نے بیڑے کو پھر بائیں ساحل پر باندھ دیا اور خود جنگل میں جا کر چھپ گئے۔ اب مجھے بھی کچھ کچھ شک ہونے لگا۔ میں نے کہا:

"جم! کہیں ہم کائرو پیچھے تو نہیں چھوڑ آئے؟ ہو سکتا ہے دھند میں ہمیں پتہ ہی نہ چلا ہو۔"

جم کا دل تو اس قدر ٹوٹ چکا تھا کہ اسے اب اس کے ذکر سے ہی نفرت ہونے لگی تھی۔ وہ بولا: "بابا! خدا کے لئے اس کا نام مت لو۔ ہم بیچارے حبشیوں کی بدقسمتی کا کیا ٹھکانہ! مجھے یہی خدشہ ہے کہ شاید ابھی تک اس کینچلی کا اثر زائل نہ ہوا ہو۔"

"خدا غارت کرے اس کینچلی کو! کاش میں نے اسے دیکھا ہی نہ ہوتا!"

"لیکن اس میں تمہارا کیا قصور؟ تمہیں کیا پتہ تھا؟ تم کیوں اپنے آپ کو کوستے ہو؟"

جب دن نکل آیا تو دریا کا جو منظر ہماری آنکھوں نے دیکھا وہ یہ تھا کہ ساحل کے قریب تو اوہیو دریا کا شفاف پانی بہہ رہا ہے، لیکن دریا کے بیچوں بیچ والا دھارا خاصا گدلا ہے۔ اب اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ کائرو واقعی پیچھے رہ گیا ہے۔

ہم نے اس نئی صورت حال پر غور کیا۔ اب ساحل پر جانا خطرے سے خالی نہ تھا اور بیڑے کو واپس، دریا کے بہاؤ کے خلاف لے جانا ہمارے بس کا نہیں تھا۔ لہذا اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ ہم رات کا انتظار کریں اور پھر بیڑے کو یہیں چھوڑ، خدا کا نام لے کر کشتی میں ہی دریا کے منبع کی طرف روانہ ہو جائیں۔ سارا دن ہم جنگل میں چھپے رہے تاکہ اچھی طرح آرام کر کے رات کی جدوجہد کے لئے تازہ دم ہو جائیں۔ خدا خدا کر کے رات آئی اور ہم بیڑے پر آ گئے ——— وہاں پہنچ کر ہمیں پتہ چلا کہ کشتی غائب تھی۔

بہت دیر تک ہم سکتے کے عالم میں کھڑے رہے۔ ہماری زبان گنگ ہو گئی تھی۔ ویسے اب ہمارے پاس کہنے کو تھا ہی کیا؟ بلاشبہ یہ کینچلی ہی کی کارستانی تھی۔ لہٰذا کسی کو دوش دینے سے فائدہ؟ اور پھر خواہ مخواہ دوسروں کو دوش دے کر اپنی مصیبتوں میں اضافہ کیوں کیا جائے؟ خاموشی ہی میں مصلحت تھی۔

لیکن ہم کب تک خاموش رہتے؟ بالآخر بات چیت شروع ہوئی۔ مسئلہ یہ تھا کہ اب کیا کیا جائے؟ ہمیں اس کے سوا اور کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ بیڑے پر ہی سفر جاری رکھا جائے۔ اور کہیں راستے میں کوئی ناؤ مل جائے، تو اسے خرید کر واپس منبع کی طرف مڑ جائیں۔ ویسے آپ جانتے ہیں میرے ابا کا اصول تو یہ تھا کہ جب بھی کوئی شے آپ کو درکار ہو۔ اور اس کا مالک موجود نہ ہو، تو آپ بے کھٹکے اسے ادھار لے لیجئے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہم اس حربے کا استعمال نہ کر سکتے تھے۔ اس سے خواہ مخواہ لوگ ہمارے پیچھے پڑ جاتے۔

جب تاریکی گہری ہو گئی، تو ہم بیڑے پر چڑھ گئے اور اسے دریا کے بہاؤ کے رخ چھوڑ دیا۔

اگر ان تمام مصیبتوں کے باوجود، جو ہم پر پڑیں، آپ کو اب بھی یقین نہیں آیا کہ سانپ کی کینچلی کو چھونا کتنا خطرناک ہوتا ہے، تو صاحب ذرا صبر کیجئے اور ان حادثات کا ذکر بھی سن لیجئے جو ابھی پیش آنا باقی تھے۔ تب آپ کو واقعی یقین آ جائے گا۔

یہ تو آپ کو علم ہی ہے کہ کشتی اگر خریدی جا سکتی ہے، تو صرف اس جگہ جہاں بہت سے بیڑے ساحل پر کھڑے ہوں۔ اور جہاں ہم تھے وہاں دور دور تک کوئی بیڑا نظر نہ آتا تھا۔ ہم متواتر تین گھنٹے سفر کرتے رہے حتیٰ کہ رات کی تاریکی سفیدی مائل ہو گئی اور گاڑھی بھی۔ دوسرے لفظوں میں دھند کی ایک موٹی سی تہہ ہر طرف چھا گئی۔ ایسے عالم میں نہ تو دریا کے خدوخال نظر آتے ہیں، نہ ہی فاصلوں کا اندازہ رہتا ہے۔ بس ہر طرف سناٹا ہی سناٹا تھا۔ نہ جانے کب تک ہم اس سناٹے میں لپٹے رہے۔ بالآخر بہت دیر بعد ایک دخانی کشتی ہمیں اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ ہم نے لالٹین جلا دی تاکہ انہیں ہمارا موجودگی کا علم ہو جائے۔ منبع کی طرف جانے والی دخانی کشتیاں عموماً ہم سے دور ہی رہا کرتی تھیں لیکن یہ

وہ ریت کے ان تودوں کے قریب قریب رہتی تھیں جہاں پانی قدرے ساکن ہوتا ہے۔ لیکن ایسی راتوں کو جب دھند گہری ہوتی ہے، تو یہ کشتیاں دریا کے عین وسط میں آ جاتی تھیں اور مخالف دھارے کا مقابلہ کرتی کرتی منبع کی طرف سرکتی رہتی تھیں۔

ایک کشتی کے انجنوں کی آواز تو ہمیں کافی دیر سے سنائی دے رہی تھی، لیکن یہ کشتی ہمیں نظر نہ آئی۔ اور آئی تو اس وقت جب وہ عین سر کے اوپر آن پہنچی۔ وہ سیدھی ہماری طرف چلی آ رہی تھی۔ ملاح لوگ اکثر یہ شرارت کیا کرتے ہیں کہ اپنی کشتی کو بالکل قریب لا کر یکلخت پہلو بچا کر نکل جاتے ہیں۔ ایسا کر کے وہ اپنی مشاقی کا ثبوت دینا چاہتے ہیں کہ دیکھو ہم اتنے قریب آ کر بھی ٹکّر نہیں مارتے۔ کئی بار جب بیڑے کا ایک آدھ تختہ کھینچ کر ان کی دخانی کشتی کے ساتھ ٹکرا جاتا ہے، تو ڈرائیور اپنا سر کھڑکی سے باہر نکال کر قہقہہ لگاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس نے خاصا پر لطف مذاق کیا ہے ——— خیر، یہ کشتی ہماری طرف بڑھتی رہی، بڑھتی رہی۔ ہمارا ابھی تک یہی خیال تھا کہ یہ ڈرائیور بھی ہمارے ساتھ شرارت کرے گا۔ اور ہمیں چھو کر نکل جائے گا۔ لیکن یہ دیکھ کر ہمیں تعجب ہونے لگا کہ کشتی برابر ہماری ہی طرف بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ اور اس نے پہلو بچانے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔ کشتی خاصی بڑی تھی اور اس کی رفتار بھی کافی تیز تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے بادل کے ایک بہت بڑے ٹکڑے کے گرد جگنو منڈلا رہے ہوں۔ آنکھ جھپکنے میں یہ کشتی ہمارے قریب آ پہنچی۔ اس کی بھٹیوں کے سب دروازے کھلے تھے اور ان میں دہکتی ہوئی آگ یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے سرخ سرخ دانتوں کی ایک قطار سی لگی ہو۔ جہاز کا اگلا سرا اب عین ہمارے اوپر منڈلا رہا تھا۔ "ہٹ جاؤ" کوئی چلّایا اور پھر الارم بجنے لگا تاکہ ڈرائیور انجن بند کر دے۔ اس کے ساتھ ہی گالیوں کی بوچھاڑ اور بھاپ کی سوں سوں کے درمیان، جم تو بیڑے کے ایک طرف، اور میں دوسری طرف دریا میں کود گئے۔ اور وہ کشتی بیڑے کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔

میں نے ڈبکی لگائی۔ میری کوشش یہ تھی کہ جلد از جلد دریا کی تہہ پر پہنچ جاؤں۔ ایک

ہی سیکنڈ کے اندر اندر تئیس فٹ کے محیط والے اس پہیئے نے میرے اوپر سے گزرنا تھا اور میں چاہتا تھا کہ کسی طرح اس کی زد سے بچ جاؤں۔ ویسے تو میں ایک منٹ تک پانی کے اندر رہ سکتا ہوں، لیکن اب کی بار مجھے کوئی ڈیڑھ منٹ تک غوطہ لگانا پڑا۔ میرے پھیپھڑے پھٹنے لگے اور میں تیزی سے ہاتھ پاؤں مارتا ہوا اوپر سطح پر پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ اوپر آکر میں نے زور سے ناک سٹرک کر پانی نکالا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ پانی کا بہاؤ خاصا تیز تھا۔ تقریباً دس سیکنڈ بعد کشتی کے انجن میں پھر حرکت ہوئی اور وہ چل پڑی۔ یہ ملاح لوگ بیڑے والوں کی مطلق پروا نہیں کرتے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ کشتی چھک چھک کرتی ہوئی دھند میں گم ہو گئی لیکن اس کی آواز بدستور سنائی دے رہی تھی۔

میں نے جم کو دس بارہ آوازیں دیں لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ پانی میں ہاتھ پاؤں مارتے مارتے ایک تختہ میرے ہاتھ سے ٹکرا گیا۔ میں نے فوراً اسے پکڑ لیا اور اس کے سہارے تیرتا ہوا ساحل تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ پانی کا دھارا مجھے بائیں طرف کے ساحل کی طرف لے جا رہا تھا جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہاں قریب ہی کوئی گھاٹ ہوگا۔ میں نے اپنا رخ بدل لیا اور گھاٹ کی سمت بہنے لگا۔

یہ لمبا چوڑا ترچھا گھاٹ تقریباً دو میل میں پھیلا ہوا تھا۔ لہٰذا مجھے وہاں تک پہنچنے میں خاصی دیر لگ گئی۔ بہر حال میں بخیر و عافیت کنارے پر آن لگا اور اچک کر خشکی پر آگیا۔ دھند کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اونچی نیچی زمین پر اندھوں کی طرح راستہ ٹٹولتا میں تقریباً پون میل گیا ہوں گا کہ دفعتاً لکڑی کی ایک پرانی طرز کی جھونپڑی سے ٹکرا گیا۔ اندھیرے میں یہ جھونپڑی مجھے نظر ہی نہیں آئی تھی۔ میں بھاگنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ کتوں کا ایک جم غفیر میری طرف لپکا اور چیخ چیخ کر بھونکنے لگا۔ میں وہیں رک گیا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو میری خیر نہیں۔

۱۷۔ شرفِ ملاقات ۔ ارکانؔ سا کا فارم ۔ کمرے کی سجاوٹ ۔ سٹیفن ڈاؤلنگ باٹس ۔ شاعرانہ صلاحیتیں ۔

تقریباً ایک منٹ بعد کھڑکی میں سے ایک آواز آئی: "ارے خاموش ہو جاؤ بچو۔ کیا شور مچا رکھا ہے!" اور پھر بولنے والے نے کھڑکی سے سر باہر نکالے بغیر ہی پوچھا: "کون ہے؟"

میں نے کہا: "میں ہوں۔"

"میں کون؟"

"جارج جیکسن، جناب"

"کیا چاہیے؟"

"جی کچھ نہیں۔ میں ادھر سے گزر رہا تھا لیکن کتوں نے راستہ روک لیا"

"تم اتنی رات گئے یہاں آوارہ گردی کیوں کر رہے ہو؟"

"جی، میں آوارہ گردی تو نہیں کر رہا۔ میں تو دخانی کشتی سے گر پڑا تھا۔"

"کیا کہا؟ سٹیم بوٹ سے گر گئے تھے؟" اس نے پوچھا۔ اور پھر اندر کسی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا:

"ارے کوئی روشنی تو لاؤ"۔۔۔۔ اور پھر مجھ سے کہنے لگا: "کیا نام بتایا تھا تم نے؟

"جارج جیکسن۔ میں ابھی لڑکا ہی ہوں۔"

"دیکھو۔ جو کچھ تم کہہ رہے ہو، اگر وہ سچ ہے تو کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ ڈرو مت۔ لیکن ہاں، وہیں اسی جگہ کھڑے رہو۔ بھاگنے کی کوشش مت کرنا"۔۔۔۔۔ اور پھر اندر کسی سے بولا: "ارے کوئی جا کر باب اور ٹام کو جگا دو۔ اور ہاں، بندوقیں بھی لیتے آنا"۔۔۔ اس کے

بعد وہ پھر مجھ سے مخاطب ہوا، "ہاں تو جارج جیکسن، تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے ؟"

"جی نہیں۔ میں اکیلا ہی ہوں۔"

اب مکان کے اندر سے لوگوں کے چلنے پھرنے کی آوازیں آنے لگیں اور کسی نے بتی بھی جلادی وہ آدمی فوراً غرایا: "بٹیسی کی بچی! روشنی ہٹاؤ۔ تمہیں بالکل عقل نہیں۔ اسے اُدھر رکھو۔ وہاں گیٹ کے پیچھے ــــ اور باب! اگر تم اور ٹام تیار رہو، تو فوراً اپنا اپنا مورچہ سنبھال لو۔"

"سب لوگ تیار ہیں۔"

اس کے بعد وہ شخص مجھ سے مخاطب ہوا: "جارج جیکسن! تم شیفرڈسن گھرانے کو جانتے ہو؟"

"جی نہیں۔ میں نے توان کا نام تک نہیں سُنا۔"

"ہونہہ۔ کیا پتہ یہ سچ ہے یا جھوٹ! خیر، تم سب لوگ تیار رہو۔ ہاں تو جارج جیکسن چلو آگے بڑھو۔ اور دیکھو بھاگنا مت۔ آہستہ آہستہ آنا۔ اگر کوئی دوسرا شخص تمہارے ساتھ ہے، تو اسے کہو وہ وہیں رہے۔ اگر وہ آگے آیا تو اسے گولی ماردی جائے گی۔ چلو بڑھو آگے۔ آہستہ آہستہ آنا۔ اور دروازے کے پاس پہنچو، تو اسے تھوڑا سا کھول کر اندر آجانا۔ دروازہ پورا مت کھولنا۔ سنا؟"

میں ہولے ہولے آگے بڑھا۔ اگر میں چاہتا بھی تو تیز نہ چل پاتا۔ سناٹا اتنا گہرا تھا کہ مجھے اپنے دل کی دھک دھک صاف سنائی دے رہی تھی۔ انسان تو انسان، کتے بھی سانس روکے کھڑے تھے۔ ہاں البتہ وہ سائے کی طرح میرے ساتھ لگے رہے۔ اور میرے ساتھ ساتھ دروازے کی طرف بڑھتے رہے۔ دروازہ زمین سے اونچا تھا اور اس کے باہر تین ڈنڈوں والی ایک سیڑھی رکھی تھی۔ جونہی میں نے سیڑھی پر قدم رکھا، تو پہلے تو تالا کھلنے کی اور پھر کنڈی کھلنے کی آواز آئی۔ میں نے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا اور اس کے بعد ایک دھکا اور۔ اس کے ساتھ ہی اندر سے آواز آئی: "بس کافی ہے۔ اب اپنا سر اندر کرلو۔" میں نے

ڈرتے ڈرتے سر اندر کیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ یہ سر اب سلامت نہیں رہے گا۔

موم بتّی فرش پر رکھی تھی۔ کوئی پون منٹ تک وہ مجھے، اور میں انہیں دیکھتا رہا۔ تین قوی ہیکل انسان جن کی بندوقیں میری طرف تنی تھیں۔ میری تو جان ہی نکل گئی۔ ان میں سب سے بڑے کی عمر کوئی ساٹھ برس کی ہوگی اور باقی دونوں ہی تیس پینتیس کے قریب ہوں گے وہ تینوں ہی وجیہہ اور خوبرو تھے۔ ان کے علاوہ تین عورتیں بھی موجود تھیں۔ جو عورت سب سے آگے کھڑی تھی، اُس کے سر کے بال سفید تھے۔ وہ نہایت جاذب نظر اور شائستہ تھی۔ اس کے پیچھے کھڑی دونوں عورتیں نوجوان تھیں لیکن وہ مجھے ٹھیک طرح نظر نہیں آرہی تھیں۔

بوڑھا بولا: "اندر چلے آؤ۔"

جونہی میں اندر داخل ہوا، اس بوڑھے نے فوراً دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھادی اور ان نوجوانوں سے بولا: "چلو اندر چلیں۔ بندوقیں بھی ساتھ لیتے آؤ۔" ـــــ یہ دوسرا کمرہ ایک خاصا بڑا دیوانخانہ تھا جس کے فرش پر موٹے سوت کی بُنی ایک نئی دری بچھی تھی۔ ہم ایک کونے میں جا بیٹھے۔ یہ کونہ سامنے والی کھڑکیوں سے ہٹ کر ایک طرف کو تھا لہٰذا یہ جگہ باہر سے آنے والی گولیوں کی زد سے باہر تھی۔ اور ان سامنے والی کھڑکیوں کے سوا کوئی دوسری کھڑکی اس مکان میں نہیں تھی۔ انہوں نے موم بتّی اٹھا کر اس کی روشنی میں مجھے اچھی طرح جانچا پرکھا، اور کہنے لگے: "یہ لڑکا شیفرڈسن خاندان میں سے نہیں ہے۔ اس کا ناک نقشہ ان سے بالکل مختلف ہے۔" اس کے بعد وہ بڈھا بولا: "اگر تمہیں اعتراض نہ ہو، تو میں تمہاری تلاشی لے لوں۔ گھبراؤ نہیں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ صرف یہ دیکھنا ہے کہ تمہارے پاس ہتھیار تو نہیں۔" اس نے اوپر اوپر ہی سے جیبوں کو ٹٹول کر دیکھا اور اندر کی تلاشی نہ لی۔ جب اس کی تسلّی ہوگئی، تو وہ بولا: "ادھر آکر آرام سے بیٹھ جاؤ۔ گھبراؤ نہیں ـــــ اور ہاں یہ تو بتاؤ تم کون ہو، اور ادھر کیسے چلے آئے؟"

لیکن اس بوڑھی عورت نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا: "نہیں ساؤل ڈیر، دیکھو نا، یہ بچارا کتنا بھیگ گیا ہے۔ اور اسے بھوک بھی تو لگی ہو گی۔"

"ہاں راقیل۔ یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔"

تب وہ عورت بیٹسی (جو ایک حبشی عورت تھی) سے بولی: "بیٹسی! بھاگ کر کچھ کھانے کو لے آؤ ——— فوراً آنا" ——— اور اس کے بعد ان دوسری عورتوں سے کہنے لگی:

"ارے تم میں سے کوئی جا کر بک کو تو جگا دو۔ اسے کہنا ——— ارے! بک تو خود ہی آ گیا۔ ہاں بک اس لڑکے کو لے جاؤ اور اس کے یہ گیلے کپڑے اتروا کر اپنے سوکھے کپڑے پہنا دو۔"

بک میری ہی عمر کا تھا۔ یہی کوئی تیرہ چودہ برس کا۔ البتہ وہ مجھ سے کہیں زیادہ توانا تھا۔ اس نے صرف ایک قمیص پہن رکھی تھی۔ اور اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ جمائیاں لیتا اور ایک ہاتھ سے آنکھیں ملتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں بندوق پکڑی ہوئی تھی جو زمین پر گھسٹتی چلی آ رہی تھی۔ آتے ہی وہ بولا: "کیوں؟ شیفرڈسن نہیں آئے کیا ———؟"

"نہیں" انہوں نے جواب دیا: "کسی نے غلطی سے خطرے کا اعلان کر دیا تھا۔"

"وہ آ جاتے تو اچھا ہی تھا۔ کم از کم مجھے ایک شیفرڈسن کا شکار کرنے کا موقع تو ملتا۔"

وہ سب ہنسنے لگے۔ باب بولا:

"بک! تم تو بہت دیر میں آئے۔ اس اثنا میں تو وہ ہم سب کا قلع قمع کر دیتے۔"

"کسی نے مجھے جگایا ہی نہیں۔ یہ کیا بات ہے، جب بھی موقع آتا ہے۔ مجھے کوئی اطلاع تک نہیں دیتا۔"

"کوئی بات نہیں بیٹے" بوڑھا بولا: "وقت آنے دو۔ تمہیں بہت سے مواقع ملیں گے۔ فکر مت کرو۔ اچھا اب اس وقت تو ماں کا کہنا مانو اور جو کچھ اس نے کہا ہے وہی کرو۔"

اس کا کمرہ اوپر کی منزل پر تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے گاڑھے کی ایک قمیص اور ایک پتلون

مجھے پہننے کو دے دی۔ جب میں کپڑے پہن رہا تھا، تو وہ بولا: "تمہارا نام کیا ہے؟"—— لیکن میرے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی وہ فوراً ایک چڑیا اور ایک خرگوش کا ذکر لے بیٹھا جو پہلے روز اس نے جنگل میں پکڑے تھے۔ اس کے بعد وہ بولا: "اچھا یہ بتاؤ، جب بتی بجھ گئی تو موسیٰ کہاں تھا؟"

"پتہ نہیں" میں نے کہا "یہ بات تو میں نے پہلے کبھی نہیں سُنی۔"

"سوچو"

"سوچوں کیا؟ جب مجھے کچھ علم ہی نہیں تو سوچنے سے فائدہ؟"

"لیکن سوچو تو۔ اس کا جواب تو بہت آسان ہے۔"

"کون سی بتی بجھی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی سی بھی بتی" وہ بولا۔

"بھئی۔ مجھے کچھ پتہ نہیں۔ تم ہی بتا دو وہ کہاں تھا۔"

"اندھیرے میں۔ اور کہاں؟ جب بتی بجھی تو وہ اندھیرے میں تھا۔"

"اگر تمہیں پتہ تھا، تو تم نے مجھ سے کیوں پوچھا؟"

"ارے! تمہیں اتنی بھی سمجھ نہیں۔ یہ تو پہیلی تھی۔ خیر، چھوڑو اسے۔ یہ بتاؤ تم یہاں کتنے دن رہو گے؟ یہیں کیوں نہیں رہ جاتے؟ خوب مزا رہے گا۔ ہمیشہ کے لئے یہیں رہ جاؤ۔ یہاں سکول تو ہے نہیں۔ اچھا تمہارے پاس کتا ہے؟ میرے پاس ہے اور وہ اتنا ہوشیار ہے کہ اگر دریا میں کنکر پھینکو تو اسے جھٹ سے نکال لاتا ہے۔ اور ہاں، تم بھی اتوار کے روز کنگھی وغیرہ کرتے ہو گے؟ یعنی سر دھونا، نہانا اور اسی قسم کی حماقتیں۔ میرا تو بالکل جی نہیں چاہتا، پر کیا کروں، اماں زبردستی یہ سب کام کرواتی ہیں۔ یہ کمبخت برجس بھی کتنا تنگ کرتی ہے۔ اس کو پہن ہی کیوں نہ لوں؟ لیکن نہیں۔ پہن کر کیا کروں گا؟ پہلے

ہی بہت گرمی ہے - اچھا، ہو گئے تیار؟ چلو، اب چلیں"

سرد روٹی، سرد گوشت، مکھن اور چھاچھ ——— جب ہم واپس آئے تو یہ نعمتیں میری منتظر تھیں - اس سے بہتر دعوت میں نے آج تک نہیں کھائی - بک، اور اس کی ماں، اور گھر کے دیگر افراد پائپ پیتے رہے - اگر نہیں پیا تو عیشن خادمہ نے، جو اٹھ کر چلی گئی تھی - یا پھر ان نوجوان عورتوں نے - وہ پائپ پیتے رہے اور میں کھانا کھاتا رہا - اور ساتھ ہی ساتھ بات چیت بھی ہوتی رہی - ان نوجوان عورتوں نے رضائیاں اوڑھ لی تھیں - ان کے کھلے بال پیٹھ تک لٹکے ہوئے تھے - وہ سوال پوچھتے رہے اور میں جواب دیتا رہا - جو کہانی میں نے انہیں بتائی وہ یہ تھی کہ میرا ابا، اور میں، اور گھر کے دوسرے لوگ آرکنسا کے جنوب میں ایک فارم پر رہا کرتے تھے - میری بہن میری این کسی کے ساتھ بھاگ گئی - اور شادی کر لی - اس کے بعد اس کا کچھ اتا پتا نہ ملا - میرا بھائی بل ان کی کھوج میں نکلا لیکن اس کے بعد اس کی بھی کوئی خبر نہ ملی - ٹام اور ہارڈ مر گئے - اب صرف میں اور ابا ہی رہ گئے لیکن ان پریشانیوں نے، ابا کا دل توڑ دیا - اس کی موت کے بعد میں نے گھر کا بچا کھچا سامان سمیٹا اور وہاں سے چل پڑا - اب وہاں رہ کر کرتا بھی کیا؟ فارم ہمارا اپنا تو تھا نہیں - خیر میں ایک سٹیم بوٹ پر سوار ہو گیا جو نشیب کی طرف آ رہا تھا مگر بد قسمتی ہے اس سے لڑھک کر گر پڑا اور تیرتا ہوا کنارے پر آ لگا - اس کے بعد میں سیدھا اس گھر میں آ گیا ——— میرے اس درد بھرے قصے کو سن کر وہ لوگ بولے! "کوئی فکر نہ کرو - اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھو، اور جب تک چاہو، یہیں رہو" ——— اس اثنا میں صبح ہو گئی اور سب لوگ سو گئے - میں اور بک ایک ہی چارپائی پر سوئے - کافی دن چڑھے جب میں سو کر اٹھا تو اپنا نام ہی بھول چکا تھا - تقریباً ایک گھنٹہ میں سوچتا رہا کہ رات میں نے کیا نام بتایا تھا - لیکن بے سود - بالآخر جب بک نے آنکھ کھولی تو میں نے چھوٹتے ہی پوچھا "بک تمہیں ہجے کرنے آتے ہیں؟"

"ہاں تو" اس نے جواب دیا -

"اچھا! شرط رہی۔ میرے نام کے ہجے کر کے دکھاؤ"

"جو چاہے شرط رکھ لو۔"

"اچھا کرو ہجے"

"جی۔ او۔ آر۔ جی۔ ای۔ جے۔ اے۔ ایکس۔ او۔ این ــــ کیوں ٹھیک ہے نا؟

وہ بولا۔

"ہاں" میں نے کہا۔ "تم نے کر ہی لئے۔ مجھے امید نہیں تھی۔ تمہیں ہجے آتے ہوں گے میرے نام کے ہجے کافی مشکل ہیں اور بنا مشق کے نہیں آتے۔"

میں نے چپکے سے یہ ہجے لکھ لئے۔ ممکن تھا کوئی مجھ سے کہہ دے کہ اپنے نام کے ہجے کرو۔ ایسے موقع پر لازمی تھا کہ میں انھیں فر فر بول دوں کہ وہ یہی سمجھیں کہ میں اس نام کا عادی ہوں"

اس خاندان کے لوگ بہت ہی نیک تھے۔ ان کا مکان نہایت عمدہ تھا۔ ایسا نفیس مکان میں نے اس سے پہلے دیہات میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی واقعی ایک شان تھی صدر دروازے پر لوہے کی کنڈی یا رسی سے بندھے لکڑی کے ڈنڈے نہیں تھے بلکہ پیتل کا ہینڈل تھا جیسا شہر کے مکانوں میں ہوتا ہے۔ دیوانخانے میں پلنگ وغیرہ کچھ نہیں تھا حالانکہ شہروں کے کئی دیوانخانوں میں ابھی تک پلنگ نظر آتے ہیں۔ اس کمرے میں ایک بہت بڑا آتشدان بھی تھا جس کا فرش اینٹوں کا تھا۔ ان اینٹوں کو پانی سے دھویا جاتا تھا اور پھر ایک دوسری اینٹ سے رگڑا جاتا تھا تاکہ صاف ستھری دکھائی دیں اور ان کا رنگ ہمیشہ سرخ رہے۔ کبھی کبھی ان پر سرخ روغن ملا پانی چھیڑ دیا جاتا تھا۔ جیسے یہ لوگ بھورا ہسپانوی روغن کہتے تھے تاکہ ان کا رنگ بادامی ہو جائے بالکل ویسا ہی جیسا کہ شہر میں رواج تھا۔ اس گھر میں پیتل کے بڑے بڑے حلقے بھی تھے۔ لکڑی چیرتے وقت یہ شہتیری کو مضبوطی سے جکڑے رکھتے تھے۔ مینٹل پیس پر عین وسط میں ایک کلاک رکھا تھا جس کے شیشے کے نچلے حصے پر کسی قصبے کی تصویر بنی تھی اور درمیان میں ایک گول دائرہ تھا جو سورج کا علامیہ تھا۔ اس شیشے کے

پیچھے پینڈولم جھولتا رہتا تھا۔ اس کلاک کی ٹِک ٹِک کی آواز بہت سہانی تھی کبھی کبھی جب کوئی پھیری والا آکر اس کی اچھی طرح صفائی کر دیتا تو یہ کلاک بجنا شروع ہو جاتا اور کم از کم ڈیڑھ سو بار ٹن ٹن کرکے ہی دم لیتا۔ پھیری والے اسے ٹھیک کرنے کی کوئی اجرت نہیں لیتے تھے۔

کلاک کے دونوں طرف کھریا مٹی سے بنے ہوئے بڑے بڑے طوطے رکھے تھے۔ ان طوطوں کے رنگ بہت شوخ تھے۔ ایک طوطے کے پہلو میں چینی مٹی کی بنی ایک بلی تھی اور دوسرے پہلو میں ایک کتا۔ اگر آپ اسے تھوڑا سا دبا دیں تو وہ چوں چوں کرنے لگتے تھے مگر چوں چوں کرتے وقت نہ تو ان کے منہ کھلتے اور ان کے چہروں کے انداز ہی بدلتے۔ یہ آواز ان کے نیچے سے آتی تھی۔ ان کے پیچھے جنگلی مرغابی کے پروں سے بنے دو بڑے بڑے پنکھے تھے کمرے کے وسط میں ایک میز تھی اور اس میز پر سیب، سنگترے، آڑو، انگور وغیرہ پھلوں سے بھری ہوئی ایک ٹوکری رکھی تھی۔ ان پھلوں کے رنگ غیر معمولی طور پر شوخ تھے۔ لیکن یہ پھل مصنوعی تھے کیونکہ کہیں کہیں سے جہاں کوئی حصہ ٹوٹ گیا تھا، سفید چاک سی دکھائی دے رہی تھی

اس میز پر ایک میز پوش بچھا تھا۔ یہ میز پوش خوبصورت موم جامے کا بنا ہوا تھا۔ اس کے چاروں طرف حاشیہ تھا اور وسط میں لال اور نیلے رنگ میں اُڑتے ہوئے عقاب کی تصویر بنی تھی۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ یہ میز پوش فلاڈلفیا سے منگوایا گیا تھا۔ میز کے ہر کونے پر کتابیں رکھی تھیں۔ ان کتابوں میں ایک تو باتصویر انجیل تھی جسے رات کے وقت پورے خاندان کے سامنے پڑھا جاتا تھا۔ دوسری کتاب کا نام "پلگرمز پراگریس" تھا جس میں ایک ایسے آدمی کی کہانی تھی جس نے اپنا گھر بار چھوڑ دیا تھا کبھی کبھی میں اس کتاب کے چند ایک صفحے پڑھ لیا کرتا تھا لیکن یہ بات میری سمجھ میں بالکل نہ آئی کہ آخر اس نے اپنا گھر بار کیوں چھوڑ دیا تھا۔ یہ کتاب خاصی دلچسپ تھی اور مشکل بھی۔ ایک اور کتاب "دوستی کا تحفہ" نامی تھی جس میں خوبصورت شاعری درج تھی۔ میں نے بہت کوشش کی مگر یہ کتاب میرے پلے نہ پڑی ان کتابوں میں ہنری کلے کی تقریروں کا ایک مجموعہ بھی تھا اور ڈاکٹر گن کی تصنیف "گھر کا ڈاکٹر" بھی۔ ان کے

علاوہ اور بھی بہت سی کتابیں تھیں۔ میز کے گرد خوبصورت کرسیاں رکھی تھیں جن کے گدیلے کسی پرانی بوسیدہ ٹوکری کی طرح درمیان میں پچکے ہوئے نہیں تھے۔

دیواروں پر تصویریں ٹنگی تھیں۔ زیادہ تر تصویریں واشنگٹن اور لیفائٹ کی تھیں یا پھر لڑائی کے منظروں یا پہاڑی دوشیزاؤں کی۔ ایک تصویر میں وہ منظر دکھایا گیا تھا جب اعلان آزادی پر دستخط ہوئے تھے۔ چند تصویریں ایسی تھیں جنہیں وہ لوگ پنسل سکیچ کہتے تھے۔ یہ تصویریں اس خاندان کی ایک لڑکی نے خود ہی بنائی تھیں۔ جس وقت اس نے یہ تصویریں بنائی تھیں اس کی عمر صرف پندرہ برس کی تھی۔ یہ لڑکی اب زندہ نہیں تھی۔ جتنی تصویریں میں نے دیکھی ہیں، یہ تصویریں ان سب سے مختلف تھیں۔ ان میں استعمال شدہ رنگ کچھ زیادہ ہی سیاہ تھا۔ ایک تصویر میں ایک عورت دکھائی گئی تھی جس نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ اس لباس کی آستینیں کچھ اس قسم کی تھی کہ بغلوں کے نیچے تو فیتہ باندھ کر گھیرا بہت تنگ بنایا گیا تھا مگر درمیان میں یہ لباس بند گوبھی کی طرح پھولا ہوا تھا۔ اس عورت کے سر پر بیلچے ایسا ہیٹ تھا جس کے ساتھ ایک سیاہ نقاب لگا تھا۔ عورت کے ٹخنے ننھے ننھے سے تھے اور ان کے گرد فیتہ لپٹا تھا۔ اس کے پاؤں میں سیاہ رنگ کے لمبوترے سے سلیپر تھے۔ عورت اپنی داہنی کہنی سے سنگِ مزار کا سہارا لئے بیٹھی تھی۔ قبر کے اوپر بید کا ایک درخت آنسو بہا رہا تھا۔ عورت کا دوسرا ہاتھ جس میں سفید رومال اور جالی کا ایک تھیلا پکڑا ہوا تھا، ایک لٹک رہا تھا۔ اس تصویر کے نیچے لکھا تھا: "ہائے کیا اب تم سے کبھی ملاقات نہیں ہو سکے گی؟" ——— دوسری تصویر کسی جوان عورت کی تھی جس نے سر کے اوپر بالوں کا جوڑا بنا رکھا تھا۔ جوڑے میں ایک کنگھی ٹنگی تھی جو یوں نظر آ رہی تھی جیسے کسی کرسی کی پشت ہو۔ وہ عورت اپنے چہرے کو رومال میں چھپائے رو رہی تھی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک پرندے کی لاش تھی جس کی ٹانگیں اوپر کو اٹھی تھیں۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا: "ہائے! تیرے سہانے گیت ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے ہیں!" ——— تیسری تصویر بھی ایک جوان عورت ہی کی تھی جو کھڑکی میں بیٹھی

چاند کو تک رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں ایک خط تھا جسے اس نے ابھی ابھی کھولا تھا
خط کے ایک کونے میں مُہر کی کالی لاکھ نظر آرہی تھی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک لاکٹ
تھا جس پر اس کے ہونٹ پیوست تھے۔ لاکٹ کے ساتھ ایک زنجیر تھی۔ اس تصویر کا عنوان
تھا: تم چلے گئے؟ ہاں یہ سچ ہے" ــــــ یہ تصویریں تھیں تو بہت عمدہ مگر مجھے ان میں
کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ بات یہ تھی کہ جب کبھی مجھ پر اداسی کا دورہ پڑتا یہ تصویریں
مجھے اور بھی دیوانہ بنا دیتیں ــــــ گھر کے سب لوگوں کو اس لڑکی کی موت کا بے حد
افسوس تھا کیونکہ اگر وہ زندہ رہتی تو بہت سی اور بھی ایسی تصویریں بناتی جن کے منصوبے
اس نے پہلے سے بنا رکھے تھے۔ ان تصویروں کو دیکھ کر واقعی ماننا پڑتا تھا کہ اس کی بے
وقت موت سے اس کے خاندان کو کس قدر نقصان پہنچا ہے۔ البتہ اس کے موڈ کو دیکھتے
ہوئے میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ قبرستان اسے بہت راس آیا ہوگا۔ بعد میں مجھے
پتہ لگا کہ بیمار پڑنے سے پہلے وہ ایک ایسی تصویر بنانے میں مصروف تھی جو شاید اس کا
شاہکار ہوتی۔ دن رات بیچاری یہی دعا مانگتی رہتی کہ کسی طرح یہ تصویر مکمل ہو جائے۔ لیکن ظالم
موت نے اسے اتنی بھی مہلت نہیں دی۔ یہ تصویر بھی ایک جوان عورت ہی کی تھی جس نے
لمبا سفید گاؤن پہن رکھا تھا۔ یہ عورت ایک پل کے جنگلے پر یوں کھڑی تھی۔ جیسے اب
کودی کہ کودی۔ اس کے کھلے بال کمر سے نیچے تک لٹک رہے تھے۔ اس کی نظریں چاند پر
جمی تھیں اور اس کے گال آنسوؤں سے تر تھے۔ اس کے دو بازو چھاتی پر رکھے تھے
دو سامنے پھیلے ہوئے تھے اور دو اوپر چاند کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ مصورہ کا ارادہ تھا
کہ ان تینوں میں سے جو انداز بہترین ہو۔ اسے رکھ لیا جائے اور باقی مٹا دیئے جائیں۔ لیکن
جیسا کہ میں نے کہا، اس بیچاری کو مہلت ہی کب ملی؟ یہ ادھوری تصویر مرحومہ کے کمرے
میں اس کے پلنگ کے سرہانے دھری رہتی تھی۔ صرف اس کے جنم دن پر اس تصویر پر
پھول چڑھائے جاتے تھے۔ ورنہ سارا سال اس پر ایک چھوٹا سا پردہ پڑا رہتا۔ تصویر کی عورت

کا چہرہ نہایت خوبصورت تھا لیکن اتنے سارے بازوؤں کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ یہی احساس ہونے لگتا ہے جیسے اس کی شکل مکڑی ایسی ہو۔

مرحومہ ایک نوٹ بک بھی رکھا کرتی تھی۔ اس نوٹ بک میں وہ رسالہ "پریسبیٹیرین آبزرور" کے وہ حصے کاٹ کر چپکا دیا کرتی تھی جن میں حادثات کا' یا مریضوں کا' یا موت کی اطلاعات کا ذکر ہوتا۔ ان کے نیچے وہ چند شعر لکھ دیتی جو اس نے خود ہی موزوں کیے ہوتے۔ اس کی شاعری واقعی اچھی تھی۔ مثال کے طور پر وہ نظم دیکھیے جو اس نے سٹیفن ڈاؤلنگ باٹس نام کے ایک لڑکے کی موت پر لکھی تھی۔ یہ لڑکا کنوئیں میں گر کر ڈوب گیا تھا۔

"سٹیفن ڈاؤلنگ باٹس کی موت پر"

کیا ہوا تھا جان سٹیفن کو؟
کیا سچ مچ وہ مرحوم ہوا؟
کیا لوگوں کی آنکھیں نم تھیں؟
کیا کوئی لبِ بستر رویا چیخا؟
اُف کمسن سٹیفن ڈاؤلنگ کو
کچھ بھی تو میسّر آ نہ سکا۔
نہ کسی مرض نے گھیرا اسے
عیادت کا بھی لطف اٹھا نہ سکا۔
نہ کالی کھانسی ہی آئی
خسرا نکلا' نہ داغ پڑے
کوئی بھی تو نہ کہنے پایا۔
سٹیفن ڈاؤلنگ کو دورے پڑے۔

نہ تو تیرِ نظر نے چھلنی کیا۔
نہ دل میں ہوک نہ سر میں سودا۔
وا، حضرت سٹیفن ڈاولنگ باٹس
یہ بھی نہ کہا دو دردِ گردہ!"
تو پھر ہوا کیا جان سٹیفن کو؟
اس قصۂ غم کی بھی ایک کہی۔
وہ پھسلا، گرا اک کنوئیں میں۔
اور روح یہ پیکر چھوڑ گئی۔
لوگوں نے اسے باہر کھینچا
اور پیٹ کا پانی نکال دیا۔
لیکن جب ہونی ہو ہی گئی
پھر کون اسے واپس لاتا؟

چودہ سال کی عمر میں اگر ایملین گرینجر فورڈ اس قسم کی شاعرانہ صلاحیتوں کی مالک تھی تو خدا ہی جانتا ہے کہ بڑی ہو کر وہ کہاں پہنچتی۔ بک کا کہنا تھا کہ وہ پلک جھپکتے شعر موزوں کر لیا کرتی تھی۔ اسے تو سوچنے کی بھی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ پہلے وہ ایک مصرعہ لکھ لیتی اور دوسرے مصرعے کے متعلق سوچنے لگتی۔ لیکن اگر ہم قافیہ موضوع نہ ملتا۔ تو پہلے مصرع ہی کو کاٹ دیتی اور اس کی جگہ کوئی اور موضوع لکھ لیتی۔ یوں یہ عمل جاری رہتا۔ اس کا کوئی خاص موضوع نہ تھا وہ تو ہر موضوع پر لکھنے کو تیار رہتی بشرطیکہ یہ موضوع غم اور اداسی سے متعلق ہو جب بھی کوئی موت ہو جاتی تو خواہ یہ موت مرد کی ہو، یا عورت کی، یا بچے کی — لاش کے سرد ہونے سے پہلے ہی وہ اپنا خراجِ عقیدت اسے پیش کر دیتی۔ ان نظموں کو وہ خراجِ عقیدت کہا کرتی تھی۔ پڑوسیوں میں مشہور تھا کہ جب بھی کوئی موت ہو تو سب سے پہلے

ڈاکٹر پہنچتا ہے، پھر ایملین، اور سب کے بعد کفن دفن کا بندوبست کرنے والا صرف ایک موقع ایسا تھا جب کفن دفن کرنے والا شخص ایملین سے پہلے پہنچ گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بچاری ایملین کو بہت دیر تک مرحوم کے نام کا یعنی وہسلر کا ہم قافیہ لفظ ہی نہ سوجھا۔ اس سانحے کے بعد وہ بچاری بہت افسردہ رہنے لگی۔ لیکن اس نے کسی سے نہ شکایت کی، نہ گلہ، نہ شکوہ۔ بس اندر ہی اندر گھلتی گئی اور پھر جلد ہی مر گئی۔ شروع شروع میں جب میں ان تصویروں سے کچھ خاص متاثر نہیں ہوا تھا، اور نہ ہی مجھے مرحومہ سے کوئی خاص عقیدت ہوئی تھی، کئی بار میں نے ارادہ کیا کہ اس کے کمرے میں جا کر اس کی نوٹ بک پڑھوں۔ مجھے اس گھر کے لوگوں سے چاہے وہ زندہ تھے یا مردہ ایک اُنس سا ہو گیا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی بھی کمی ہمارے درمیان حائل ہو۔ بچاری ایملین نے تو ہر موت کو اپنا خراجِ عقیدت منظوم شکل میں پیش کیا تھا۔ لیکن قدرت کی نا انصافی دیکھیے کہ اس کی اپنی موت پر کسی نے کوئی مرثیہ نہ کہا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ دو ایک شعر موزوں ہو جائیں لیکن بات بنی نہیں۔ ایملین کے کمرے کی دیکھ بھال میں بہت احتیاط برتی جاتی تھی۔ اس کے اندر ہر شے بالکل اسی طرح رکھی رہتی تھی جس طرح وہ خود اپنی زندگی میں انہیں رکھا کرتی تھی۔ وہاں کسی کو سونے کی اجازت نہیں تھی۔ گھر میں اتنے سارے حبشی خادموں کے ہوتے ہوئے بھی اس کی بوڑھی ماں خود ہی اس کمرے کی دیکھ بھال کیا کرتی تھی۔ وہ وہاں بیٹھ کر یا تو سلائی کڑھائی کرتی رہتی یا پھر انجیل پڑھتی رہتی۔

ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ دیوان خانے کی کھڑکیوں پر خوبصورت سفید پردے لگے تھے جن پر قلعوں کی تصویریں بنی تھیں۔ ان قلعوں کی فصیلیں انگور کی بیلوں سے ڈھکی تھیں اور جانور کھائی میں سے پانی پینے کے لئے آتے دکھائے گئے تھے۔ دیوان خانے کے ایک کونے میں چھوٹا سا پیانو رکھا تھا پہلے تو میں یہی سمجھتا رہا کہ اس کے اندر ٹین کی طشتریاں رکھی ہیں۔ جب وہ جوان عورتیں اس پیانو کی دھن پر ٹوٹ گیا وہ آخری بندھن، یا جنگِ پراگ، کا نغمہ بجاتیں تو میرے دل میں خوشی کی لہریں مچلنے لگتیں۔ ——— اس مکان کی تمام دیواروں پر بہتر

ہورہا تھا۔ کئی کمروں کے فرش پر قالین بھی بچھے تھے۔ باہر کی تمام دیواروں پر سفیدی کی ہوئی تھی۔

اس مکان کے دو حصّے تھے اور نہ صرف ان حصّوں کے درمیان کا صحن ہی چھتا ہوا تھا بلکہ صحن پر پکّا فرش بھی تھا۔ بسا اوقات دوپہر کو کھانے کی میز اسی صحن میں لگائی جاتی کیونکہ یہ جگہ ٹھنڈی اور آرام دہ تھی۔ قصّہ کوتاہ اس مکان کی چیز اپنی جگہ بہترین تھی۔ اور دسترخوان کا تو کہنا ہی کیا! ایسے ایسے لذیذ کھانے اور پھر پیٹ بھر!!

۱۸۔ کرنل گرینجر فورڈ۔ رئیسانہ شان گنبوں کے جھگڑے۔ انجیل۔ بیڑے کا واپس مل جانا۔ لکڑیوں کا ڈھیر۔ گوشت اور گوبھی

آپ کو یہ تو اندازہ ہو ہی گیا ہوگا کہ کرنل گرینجر فورڈ ایک شریف آدمی تھا۔ یہی نہیں، اس کا خاندان بھی شریف تھا۔ وہ اعلیٰ اوصاف کا حامل تھا۔ کرنل گرینجر فورڈ اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور بقول بیوہ ڈگلس (عمدہ) خاندان انسان کے لیے بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا گھوڑے کے لیے۔ اور یہ تو ہر کسی کو علم تھا کہ خود بیوہ ڈگلس کا خاندان ہمارے قصبے کے چوٹی کے خاندانوں میں سے تھا۔ اور تو اور خاندان کی اہمیت کے بارے میں ابا کا بھی یہی خیال تھا، حالانکہ اس کا اپنا حسب نسب بالکل معمولی تھا۔ کرنل گرینجر فورڈ کا قد لمبا، جسم اکہرا، اور رنگت سانولی تھی۔ اس کے چہرے پر سرخی کا نام تک نہ تھا۔ اپنے اس سوکھے ہوئے چہرے کی وہ بلاناغہ حجامت بنایا کرتا تھا۔ اس کے ہونٹ۔ پتلے، ناک اونچی بھنویں گھنی اور آنکھیں سیاہ تھیں۔ یہ آنکھیں یوں اندر دھنسی ہوئی تھیں کہ جب وہ کسی کی طرف دیکھتا تو یوں لگتا جیسے اس کی پتلیاں کسی غار کے اندر سے جھانک رہی ہوں۔ اس کا ماتھا اونچا تھا، اور بال سیدھے اور شانوں تک لمبے تھے۔ اس کے ہاتھ لمبے اور پتلے تھے۔ وہ روز قمیض بدلتا اور پھر سر سے پیر تک پورا لباس پہنتا۔ اس کا سوٹ اس قدر سفید تھا کہ اس پر نظر نہیں ٹکتی تھی۔

اتوار کے روز وہ لمبی پشت والا اپنلا کوٹ پہنتا، جس پر پیتل کے بٹن لگے تھے۔ جب وہ باہر نکلتا تو اس کے ہاتھ میں آبنوس کی ایک چھڑی ہوتی جس کی مٹھی چاندی کی تھی۔ وہ کبھی غیر سنجیدہ بات نہیں کرتا تھا، کبھی اونچا بھی نہیں بولتا تھا۔ وہ اس قدر حلیم الطبع تھا کہ اس کی رحمدلی سے متاثر ہو کر لوگ بے جھجک اس پر اعتماد کرنے لگتے۔ وہ شاذ و نادر ہی مسکراتا لیکن جب مسکراتا تو اس کی مسکراہٹ نہایت دلفریب ہوتی۔ ہاں البتہ جب کبھی وہ کھمبے کی طرح تن کر کھڑا ہو جاتا اور اس کی بھنوؤں کے نیچے سے چنگاریاں سی نکلنے لگتیں۔ تو سامنے کھڑے شخص کی خیریت اسی میں تھی کہ فوراً بھاگ کر کسی قریب کے درخت پر جا چڑھے اور یہ بعد میں پوچھے کہ ماجرا کیا ہے۔ اس نے کبھی کسی سے یہ نہیں کہا تھا کہ میاں سلیقے سے بات کرو، کیونکہ اس کے سامنے کسی کی جرأت ہی نہیں ہوتی تھی کہ ایسی ویسی بات کر جائے۔ اس کی صحبت ہر شخص کے لئے باعثِ خوشی ہوتی۔ اس کا ساتھ توجاڑے کی دھوپ کی طرح خوشگوار ہوتا۔ اس کے پاس بیٹھ کر ہمیشہ یہی احساس ہوتا کہ موسم بڑا سہانا ہے۔ جب کبھی اس کے چہرے پر بادل چھا جاتے، تو آدھ منٹ کے لئے جیسے مطلع بھی تاریک ہو جاتا۔ اور یہی آدھ منٹ اپنا کام کر جاتا۔ اس کے بعد کم از کم ایک ہفتہ تک کسی کی ہمت نہ ہوتی کہ کسی قسم کی غلطی کا مرتکب ہو۔

صبح کے وقت جب وہ اور اس کی بیوی نیچے آتے تو گھر کے سب لوگ کرسیوں سے اٹھ کر انہیں "صبح بخیر" کہتے اور تب تک کھڑے رہتے جب تک کہ یہ میاں بیوی اپنی اپنی نشستوں پر نہ بیٹھ جائیں اس کے بعد ٹام اور یاب الماری میں سے گلاس نکال کر رم کا ایک جام بنا کر اسے پیش کرتے وہ گلاس لے لیتا اور انتظار کرتا کہ ٹام اور یاب کے جام بھی تیار ہو جائیں۔ پھر وہ دونوں جھک کر کہتے: "آیا حضور، اماں جان، ہم آپ کے تئیں اپنا فرض بجالاتے ہیں۔" اس پر وہ میاں بیوی بھی ذرا سا جھکتے اور کہتے "شکریہ۔" اور پھر وہ تینوں مرد گلاس منہ سے لگا لیتے۔ اس کے بعد یاب اور ٹام اپنے گلاسوں میں تھوڑی سی چینی ڈال کر اس میں چمچ بھر پانی اور تھوڑی سی شراب یا سیب کی برانڈی ملا دیتے۔ میں اور ریک ان گلاسوں کو لے لیتے اور ان بزرگوں کی صحت

کا جام نوش کرتے۔

ٹوب سب سے بڑا تھا، اور ٹام اس سے چھوٹا۔ دونوں نہایت خوبرو تھے۔ ان کے شانے چوڑے، چہرے گندمی۔ بال سیاہ اور لمبے، اور آنکھیں کالی تھیں۔ وہ بھی باپ کی طرح سر سے پاؤں تک سفید لباس پہنتے۔ باپ کی طرح ان کے ہیٹ بھی چوڑے تھے۔

ان کے علاوہ مس شارلاٹ تھی جس کی عمر پچیس برس، اور قد لمبا تھا۔ وہ بہت خوددار تھی اور اس کی شخصیت بھی خاصی بارعب تھی۔ ویسے اگر وہ غصے میں نہ ہو، تو بہت ہی بھلی لگتی تھی۔ لیکن جب اس کا پارہ چڑھا ہوتا تو اس کی آنکھوں سے بھی باپ ہی کی طرح شعلے نکلنے لگتے جن کا سامنا کرنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ بہت حسین تھی۔

تھی تو اس کی بہن صوفیہ بھی خوبصورت، لیکن اس کا حُسن کچھ دوسرے ہی قسم کا تھا۔ وہ فاختہ کی طرح حلیم تھی، اور اس کی عمر بیس برس کی تھی۔

گھر کے ہر فرد کو ایک ایک حبشی غلام ملا ہوا تھا۔ بک کے پاس بھی ایک خادم تھا، میرے خادم کے تو بس مزے ہی مزے تھے کیونکہ مجھے خادم سے کام کروانے کی عادت نہ تھی۔ لیکن بک کا خادم بیچارہ سارا سارا دن پنجوں کے بل کھڑا رہتا۔

تو یہ ہے اس خاندان کی تفصیل۔ ان کے علاوہ چند اور افراد بھی ماضی میں اس خاندان کا حصہ رہ چکے تھے۔ یعنی تین لڑکے جو قتل ہو گئے تھے، اور ایمی لین جو مر چکی تھی۔

کرنل گرینجر فورڈ کے بہت سے فارم تھے، اور ان پر تقریباً ایک سو غلام کام کرتے تھے کبھی کبھی گھڑسواروں کی کوئی ٹولی بھی ادھر آ نکلتی۔ یہ گھڑسوار جو دس دس پندرہ پندرہ میل دور سے آتے، پانچ چھ دن تک ڈیرا ڈالے رہتے۔ وہ دریا کے نزدیک اِدھر اُدھر تفریح کرتے رہتے۔ دن کے وقت جنگل میں پکنک ہوتی اور رات کو گھر میں ناچ ہوتا۔ یہ لوگ اس خاندان کے نزدیکی رشتہ دار تھے۔ مرد اپنی بندوقیں ہمراہ لے کر آتے تھے۔ وہ لوگ بھی نہایت خوبرو تھے اور اونچے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

اسی علاقے میں ایک اور معزز قبیلہ بھی تھا۔ یہ قبیلہ پانچ چھ گھرانوں پر مشتمل تھا ان میں سے اکثر شیفرڈسن گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ خاندان بھی گرینجر فورڈ خاندان کی طرح اعلیٰ نسب تھا اور خوددار اور امیر بھی۔ دونوں خاندانوں کے لوگ ایک ہی گھاٹ سے سٹیم بوٹ پر چڑھا اترا کرتے تھے۔ یہ گھاٹ ہمارے گھر سے تقریباً دو میل دور تھا اور جب کبھی میں اپنے عزیزوں کے ساتھ اس گھاٹ پر جاتا تو مجھے بہت سے شیفرڈسن لوگ گھوڑوں پر سوار وہاں نظر آتے۔

ایک دن بک اور میں اور بک دور جنگل میں شکار کھیل رہے تھے کہ گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی۔ اس وقت ہم سڑک پار کر رہے تھے۔ بک بولا: "چھلانگ لگاؤ اور جنگل میں جا گھسو۔ فوراً جلدی —" ہم جنگل میں جا گھسے اور پتوں کے پیچھے سے جھانکنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک خوبصورت نوجوان گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا سڑک پر سے گزرا۔ وہ ماہر گھڑ سوار تھا اور گھوڑے پر بیٹھا بالکل فوجی نظر آتا تھا۔ اس کے سامنے بندوق رکھی تھی۔ میں نے فوراً اسے پہچان لیا یہ ہارنے شیفرڈسن تھا۔ اسی لمحہ میرے پہلو میں بیٹھے بک نے بندوق داغی اور اس کے ساتھ ہی ہارنے کا ہیٹ اس کے سر سے لڑھک کر سڑک پر آرہا۔ ہارنے نے فوراً بندوق پکڑلی اور گھوڑے کو اس طرف موڑ دیا جدھر ہم چھپے بیٹھے تھے۔ لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی ہم بھاگ نکلے۔ جنگل کوئی خاص گھنا نہ تھا۔ میں نے دو ایک بار مڑ کر دیکھا تاکہ جب گولی چلے تو ادھر ادھر ہو جاؤں اور اس کی زد میں نہ آؤں دونوں بار مجھے یہی نظر آیا کہ ہارنے بک کو نشانہ بنانے کی کوشش میں ہے۔ اس کے بعد وہ سڑک پر جدھر سے آیا تھا اسی طرف لوٹ گیا۔ میں نے سمجھا وہ ہیٹ اٹھانے گیا ہے لیکن میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ وہ میری نظروں سے اوجھل تھا ہم فوراً بھاگ اٹھے اور گھر پہنچ کر ہی دم لیا۔ ہماری یہ حالت دیکھ کر کرنل گرینجر فورڈ کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے بجلی سی کوند گئی۔ میں نے سمجھا شاید بک کی جرأت مندانہ حرکت پر خوش ہے۔ لیکن جلد ہی اس کے چہرے پر پھر متانت چھا گئی اور وہ نرمی سے بولا: "بیٹے! یہ چھپ کر گولی چلانا مجھے پسند نہیں۔ تم سڑک پر آمنے سامنے ہو کر کیوں نہ لڑے؟"

"لیکن ابا ـ شیفرڈسن بھی تو سامنے آکر گولی نہیں چلاتے ـ وہ بھی تو تاک میں رہتے ہیں اور موقع دیکھ کر وار کرتے ہیں۔"

جب بک یہ قصہ سنا رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ مس شارلاٹ کا سر فخر سے اونچا ہو گیا ہے۔ اس کے نتھنے پھول گئے اور اس کی آنکھیں چمکنے لگیں ـ اس وقت وہ بالکل ایک ملکہ جیسی لگ رہی تھی ــــ لیکن ان دونوں نوجوانوں کے چہروں پر بےلطف بادل سا چھا گیا تھا ـ ایک بھی لفظ منہ سے نکالے بغیر وہ چپ چاپ بک کی باتیں سنتے رہے ـ صوفیہ کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا لیکن جب اس نے سنا کہ وہ نوجوان بخیر و عافیت ہے، تو اس کے چہرے کی سرخی لوٹ آئی ـ

اس کے بعد موقع پا کر میں بک کو کھیتوں میں لے گیا، اور درخت کے سائے میں بیٹھ کر جہاں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہ تھا، میں نے پوچھا:

"بک! کیا واقعی تمہارا ارادہ اسے قتل کرنے کا تھا؟"

"یقیناً۔"

"اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟"

"میرا؟ میرا تو کچھ نہیں بگاڑا۔"

"تو پھر تم کیوں اس کی جان کے درپے ہو؟"

"خاندانی عناد"

"یہ خاندانی عناد کیا ہوتا ہے؟"

"نہیں اتنا بھی پتہ نہیں؟ کہاں رہتے رہے ہو؟"

"میں نے تو آج تک اس کا نام نہیں سنا ـ اچھا بتاؤ تو یہ کیا ہوتا ہے"

"یعنی"، بک بولا "فرض کرو کہ ایک آدمی کا دوسرے آدمی سے کوئی جھگڑا ہے اور وہ اسے قتل کر دیتا ہے ـ اس کے بعد مقتول کا بھائی اس قاتل کی جان لے لے گا ـ اور پھر یہ سلسلہ

اس طور رہتا ہے کہ ایک مقتول کے بھائی۔ دوسرے مقتول کے بھائیوں کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں۔ سگے بھائیوں کو ختم کرنے کے بعد چچیرے بھائیوں کی باری آتی ہے، اور یوں باری باری سارا خاندان ختم ہو جاتا ہے۔ اور خاندان کے خاتمے کے ساتھ یہ عناد بھی ختم ہو جاتا ہے لیکن یہ عمل دیرپا ہوتا ہے اور انجام تک پہنچنے میں خاصہ عرصہ لگ جاتا ہے۔"

"اچھا، تو تمہارا یہ عناد بھی کافی پرانا ہے کیا؟"

"ہاں تو، اس کا آغاز کوئی تیس برس پہلے ہوا تھا۔ پہلے دونوں فریقوں میں کسی بات پہ جھگڑا ہوا اور نوبت مقدمہ بازی تک پہنچی۔ اس کے بعد وہی ہوا جو ہونا تھا۔ یعنی ہارنے والے نے جیتنے والے کو قتل کر دیا۔"

"لیکن جھگڑا ہوا کس بات پر تھا؟ زمین پر؟"

"شائد۔ مجھے علم نہیں۔"

"اچھا! پہلا قتل کس نے کیا تھا؟ گرینجر فورڈ خاندان نے یا شیفرڈسن والوں نے؟"

"مجھے کیا علم؟ اس بات کو تو اب برسوں گزر گئے ہیں۔"

"کسی کو تو پتہ ہوگا؟"

"ہاں، ابا کو ہے۔ اور شائد دوسرے بڑے بوڑھے بھی جانتے ہوں گے۔ لیکن میرا خیال ہے اب تو وہ لوگ بھی بھول چکے ہوں گے کہ جھگڑے کا آغاز کس بات سے ہوا تھا۔"

"اچھا بک! پھر تو بہت سے قتل ہوئے ہوں گے؟"

"ہاں، جنازوں کو کندھا دینے کے کافی مواقع ہاتھ آتے ہیں۔ لیکن یہ بھی تو ہے کہ ہر گولی جان لیوا ثابت نہیں ہوتی۔ ابا کے بدن میں اب بھی دو چار گولیاں دفن ہوں گی۔ لیکن ابا اس بارے میں کوئی خاص فکرمند نہیں شائد اس لئے کہ ان کا وزن ویسے بھی کم ہے۔ باب بھی ایک بار چاقو کھا چکا ہے۔ ٹام کو بھی دو ایک زخم لگ چکے ہیں۔"

"کیا اس برس بھی کوئی جانی نقصان ہوا ہے؟"

"ہاں، ایک ہماری طرف سے ہلاک ہوا اور ایک ان کی طرف سے تین ماہ پہلے کی بات ہے۔ میرا چچیرا بھائی بڈ دریا کے اس پار جنگل میں سے گزر رہا تھا۔ اس کی عمر چودہ برس کی تھی۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا اور ذرا اس کی حماقت تو دیکھو، ہتھیار لیے بغیر ہی گھر سے نکل پڑا تھا۔ ایک سنسان سی جگہ پر اسے اپنے پیچھے گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی۔ جب اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اسے پتہ چلا کہ بڈھا بالڈی شیفرڈسن اس کے پیچھے بندوق تانے چلا آ رہا ہے۔ اس بڈھے کے سفید بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ بڈ کو چاہیے تھا کہ فوراً گھوڑے سے اتر کر جنگل میں چھپ جاتا لیکن اس نے سمجھا کہ شاید وہ گھوڑے کو تیز بھگا کر بہت آگے نکل جائے گا۔ پانچ میل وہ اسی طرح دوڑتے رہے۔ بڈ آگے آگے اور وہ بڈھا اس کے پیچھے پیچھے۔ اب وہ بڈھا بالکل اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔ جب بڈ نے دیکھا کہ کھیل ختم ہوا چاہتا ہے تو اس نے گھوڑا روک کر اس بڈھے کے سامنے سینہ تان دیا تاکہ گولی سینے میں لگے۔ بڈھے نے اسے قتل تو کر دیا لیکن یہ قتل اسے بہت مہنگا پڑا۔ ایک ہی ہفتہ کے اندر ہمارے خاندان والوں نے اسے ختم کر دیا۔"

"بک! میرا خیال ہے کہ وہ بڈھا بالکل بزدل تھا۔"

"نہیں تو۔ اس میں بزدلی کی کیا بات ہے؟ اس شیفرڈسن کنبے کا کوئی بھی شخص بزدل نہیں، نہ ہی گرینجر فورڈ میں کوئی بزدل ہے۔ ایک دن ہمارے کنبے کے تین آدمیوں نے اس بڈھے کو گھیر لیا تھا۔ اور وہ بڈھا کوئی آدھ گھنٹے تک اکیلا ہی ان تینوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ آخر جیت اسی کی ہوئی۔ وہ چاروں گھوڑوں پر سوار تھے لیکن جونہی آمنا سامنا ہوا، وہ بڈھا فوراً گھوڑے پر سے اتر پڑا اور لکڑیوں کے ایک ڈھیر کے پیچھے چھپ گیا۔ گھوڑے کو اس نے اپنے آگے کر لیا تاکہ اس کی آڑ رہے گرینجر فورڈ گھرانے کے لوگ گھوڑوں پر سوار اس کے اردگرد چکر کاٹتے رہے دونوں طرف سے خوب گولیاں چلیں انجام یہ ہوا کہ جب وہ بڈھا اور اس کا گھوڑا گھر پہنچے، تو زخموں سے چور تھے، لیکن ہمارے کنبے کے لوگوں کا حال یہ ہوا کہ انھیں اٹھا کر گھر لانا پڑا۔ ان میں سے ایک تو مر ہی چکا تھا۔ اور دوسرا اگلے دن مر گیا۔ تو جناب! اگر آپ کو بزدلوں کی تلاش

ہو تو اس جنس کو شیفر ڈسن گھرانے میں مت ڈھونڈیے۔ وہاں آپ کو کوئی بزدل نہیں ملے گا۔ ان کے ہاں تو اس قسم کی شے ہے ہی نہیں"

اگلے اتوار کو ہم سب ڈگ گرجا گھر گئے جو وہاں سے تقریباً تین میل دور تھا۔ ہر شخص اپنے گھوڑے پر سوار تھا۔ مردوں کے پاس بندوقیں تھیں جو انہوں نے اپنے گھٹنوں میں دبا رکھی تھیں۔ ہک نے بھی اپنی بندوق ساتھ لے لی تھی۔ گرجا گھر کے اندر پہنچ کر انہوں نے یہ بندوقیں دیوار کے سہارے کھڑی کر دیں تاکہ بوقتِ ضرورت فوراً کام میں لائی جا سکیں شیفر ڈسن گھرانے کے لوگ بھی مسلح ہو کر آئے تھے اور ان کی بندوقیں بھی دیوار کے ساتھ کھڑی تھیں۔ مجھے تو پادری کے وعظ میں کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ وہی برادرانہ اخوت اور اسی قسم کی اکتا دینے والی باتیں۔ البتہ لوگوں نے اس وعظ کی بہت تعریف کی۔ واپسی پر وہ لوگ انہی باتوں کا چرچا کرتے رہے اور اعتقاد، نیکی، رحمت، اور تقدیر اور خدا جانے اسی قسم کی اور کن کن باتوں کا ذکر ہوتا رہا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے۔ میرے لئے یہ اتوار خاصا اکتا دینے والا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے تقریباً ایک گھنٹہ بعد ہر شخص اونگھنے لگا تھا۔ کچھ وہیں کرسیوں پر اور کچھ اپنے کمروں میں۔ میرا جی اکتانے لگا۔ بک اور اس کا کتا باہر گھاس پر بیٹھے بیٹھے ہی سو گئے تھے۔ میں نے بھی سوچا کہ اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤں، لیکن جب میں کمرے کے نزدیک پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ صوفیہ اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑی میرا انتظار کر رہی ہے۔ اس کا کمرہ ہمارے کمرے کے ساتھ ہی تھا۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گئی اور آہستہ سے دروازہ بند کر کے کہنے لگی "میں تمہیں اچھی لگتی ہوں نا؟" اور جب میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ بولی: "اچھا تو ایک کام کرو، لیکن کسی کو بتانا نہیں" جب میں نے وعدہ کیا کہ نہیں بتاؤں گا تو کہنے لگی: "میں گرجا گھر میں اپنی انجیل بھول آئی ہوں۔ اس کے ساتھ دو کتابیں اور بھی ہیں تم چپکے سے چلے جاؤ اور اسے اٹھا لاؤ۔ دیکھو کسی سے اس کا ذکر مت کرنا۔

میں گھر سے نکل پڑا اور چپکے سے سڑک پر ہو لیا۔ گرجا گھر بالکل سنسان پڑا تھا صرف فرش پر دو ایک سور لیٹے ہوئے تھے۔ دروازے پر تالا تو تھا نہیں اور سوروں کو کیا فرش نہایت مرغوب ہے کیونکہ گرمیوں میں یہ فرش بہت ٹھنڈا ہوتا ہے۔ انسان اور سور میں یہی تو فرق ہے کہ انسان تو تب گرجا گھر جاتا ہے جب جائے بنا چارہ نہ ہو۔ لیکن سور جب چاہے وہاں پہنچ جاتا ہے۔

میں سوچنے لگا دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ ورنہ کوئی لڑکی انجیل کے متعلق اس قدر فکرمند نہیں ہوتی۔ لہٰذا جب میں کتاب کو اچھی طرح سے جھاڑا تو اس میں سے کاغذ کا ایک پرزہ باہر آگرا۔ اس پر پنسل سے لکھا تھا: "ڈھائی بجے" میں نے کتاب کو اچھی طرح سے الٹ پلٹ کر دیکھا لیکن اس میں سے اور کچھ نہ نکلا۔ میں نے وہ پرزہ واپس کتاب میں رکھ دیا۔ اور گھر آگیا مجھے دیکھتے ہی صوفیہ، جو دروازے میں کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی، میری طرف لپکی اور مجھے دروازے کے اندر گھسیٹ کر اس نے فوراً چٹخنی لگا دی۔ پھر اس نے کتاب کو اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھا اور کاغذ کے اس پرزے کو پڑھ کر اس کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ اس کے بعد اس نے مجھے بھینچ لیا اور لگی میری تعریفوں کے پل باندھنے پھر بولی: "کسی سے اس کا ذکر مت کرنا۔" اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لہرا گئی جس نے اسے اور بھی حسین بنا دیا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا اور جب میں آپے میں آیا تو میں نے اس سے اس کاغذ کے بارے میں پوچھا۔ وہ بولی: "تم نے اسے پڑھا تو نہیں؟"

"نہیں،" میں نے جواب دیا۔

"اچھا، یہ تو بتاؤ، تم کسی کا لکھا پڑھ لیتے ہو؟"

"کوئی خاص نہیں — ہاں اگر موٹا موٹا لکھا ہو تو شاید پڑھ لوں۔"

یہ سن کر وہ بولی: "اس کاغذ پر کچھ بھی تو نہیں لکھا تھا۔ یہ پرزہ تو صرف نشاندہی کے

لئے تھا۔ اچھا، اب تم باہر جاکر کھیلو۔"

گھر سے نکل کر میں دریا کی طرف ہولیا۔ میرا ذہن ابھی تک اس کاغذ کے پرزے میں ہی الجھا ہوا تھا۔ تھوڑی دور جاکر میں نے دیکھا کہ میرا حبشی خادم میرے پیچھے پیچھے چلا آرہا ہے جب ہم کافی آگے نکل آئے تو اس نے مڑ کر ایک لمحے کے لئے گھر کی طرف دیکھا اور پھر دوڑتا ہوا میری طرف آگیا اور پاس آکر بولا: "ماسٹر جاگ! اگر تم میرے ساتھ اس دلدل کی طرف چلو تو میں تمہیں پانی کے سانپ دکھاؤں گا"

میں سوچنے لگا کتنی عجیب بات ہے۔ کل بھی اس نے یہی کچھ کہا تھا۔ اسے علم ہونا چاہئے کہ پانی کا سانپ کچھ ایسا خوبصورت تو ہوتا نہیں کہ آدمی ان کی کھوج میں مارا مارا پھرے آخر یہ راز کیا ہے؟ ــــــ خیر، میں نے کہا: "اچھا، چلو۔"

تقریباً آدھ میل تک میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ پھر وہ ٹخنوں ٹخنوں تک گہری دلدل میں گھس گیا۔ مزید آدھ میل اس دلدل میں چلنے کے بعد ہم خشکی کے ایک ٹکڑے پر جا پہنچے جہاں گھنے درخت، بیلیں، اور جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ وہاں پہنچ کر وہ بولا:

"ماسٹر جاگ! ادھر چند قدم اور آگے چلے جاؤ۔ وہاں بہت سے سانپ ہیں۔ میں تو خیر پہلے بھی کئی بار انہیں دیکھ چکا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ واپس دلدل میں لوٹ گیا اور تھوڑی ہی دیر میں درختوں کے اس پار نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ میں جھاڑیوں میں ادھر ادھر جھانکتا رہا۔ تھوڑی دور جاکر مجھے ایک کھلی جگہ نظر آئی جس کی لمبائی چوڑائی ایک کمرے جتنی ہوگی۔ یہ جگہ بیلوں سے خوب اچھی طرح ڈھکی ہوئی تھی اور اس کے اندر ایک آدمی سویا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ جم تھا۔

میں نے اسے جگایا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے دیکھ کر اسے اچنبھا ہوا ہوگا لیکن میرا اندازہ غلط نکلا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس رات جب ہم بیڑے سے گر پڑے تھے۔ وہ بھی میرے پیچھے پیچھے تیرتا چلا آیا تھا۔ جب میں نے آوازیں دیں تو انہیں سُن کر بھی وہ خاموش رہا کیونکہ اسے

خدشہ تھا کہ کوئی اُسے آکر پکڑ نہ لے اور وہ ایک بار پھر غلامی کی زنجیروں میں جکڑا جائے" مجھے چوٹ بھی آئی تھی اس لئے تیرنے میں مجھے کچھ دقت پیش آرہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میں بہت پیچھے رہ گیا اور تم آگے نکل گئے۔ میرا خیال تھا کہ کنارے پر پہنچ کر تم سے جا ملوں گا، لہٰذا میں نے آواز دینا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن جب میں نے اس مکان کو دیکھا تو مجھے خوف محسوس ہوا اور میں نے اپنی رفتار مدھم کر دی۔ جب وہ لوگ تم سے باتیں کر رہے تھے۔ تو میں کافی دور تھا لہٰذا مجھے کچھ سنائی نہ دیا۔ ویسے بھی میں کتوں سے ہراساں تھا۔ خیر، جب پھر خاموشی چھا گئی، تو میں نے اندازہ لگایا کہ تم گھر کے اندر چلے گئے ہو گے۔ بس میں جنگل میں چلا آیا اور انتظار کرنے لگا۔ اگلی صبح چند حبشی کھیتوں کو جاتے ہوئے ادھر سے گزرے۔ انہوں نے مجھے اس جگہ پہنچا دیا کیونکہ یہ جگہ کتوں سے محفوظ ہے۔ درمیان میں پانی ہے نا۔ ہر رات جب وہ میرے لئے کچھ کھانے کو لاتے تو تمہاری خیر خیریت بھی معلوم ہو جاتی۔"

"تو جم! تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بلا لیا؟"

"دیکھو نا ہک! جب تک تیاری مکمل نہ ہو جاتی، نہیں خواہ مخواہ پریشان کرنے سے فائدہ؟ اب سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ جب بھی مجھے موقع ملا ہے، میں چھوٹا موٹا سامان اور کھانے پینے کی چیزیں خریدتا رہا ہوں۔ اور راتوں کو میں بیڑے کی مرمت کرتا رہا ہوں"

"بیڑا! کونسا بیڑا؟"

"ہمارا اپنا بیڑا۔ اور کونسا؟"

"تو تمہارا مطلب ہے کہ ہمارا بیڑا صحیح سلامت تھا؟"

"نہ ــــ صحیح سلامت تو خیر نہیں تھا۔ اسے کافی نقصان پہنچا تھا۔ اس کا ایک سرا تو بالکل ناکارہ ہو چکا تھا۔ لیکن مجموعی طور پر نقصان کوئی خاص زیادہ نہیں تھا۔ ہاں، البتہ ہمارا تمام سامان تباہ و برباد ہو گیا تھا۔ اگر پانی کی تہہ تک نہ پہنچتے اور رات اتنی تاریک ہوتی، اور ہم اتنے خوفزدہ نہ ہوتے اور اپنے ہوش و حواس نہ کھو بیٹھتے، تو ہمیں علم ہو جاتا کہ بیڑا ٹوٹا نہیں، بلکہ صحیح د

سلامت ہے۔ خیر خدا جو کرتا ہے، اچھا ہی کرتا ہے۔ اب میں نے بیڑے کی مرمت کر دی ہے اور یہ بالکل نیا ہی بن گیا ہے۔ اور سامان بھی ہمارے پاس نیا ہی آگیا ہے۔"

"لیکن جم! یہ بیڑا تمہارے ہاتھ آیا کیسے؟"

"یعنی تمہارا مطلب ہے کہ میں تو جنگل میں چھپا بیٹھا تھا، پھر یہ بیڑا میرے ہاتھ کیسے آگیا؟ بات یہ ہے کہ بیڑا میں نے نہیں پکڑا۔ چند حبشیوں نے اسے موڑ پر کنارے کے ساتھ لگا پایا۔ بس وہ اسے یہاں نالے میں لے آئے اور ان جھاڑیوں میں چھپا دیا۔ اس کے بعد ان میں تو تو میں میں ہونے لگی کہ اس کا مالک کون ہو۔ مجھے اس کی خبر مل گئی۔ بس پھر کیا تھا، میں نے یہ کہہ کر ان کا جھگڑا نبٹا دیا کہ یہ بیڑا ان میں سے کسی کی بھی ملکیت نہیں، بلکہ میرا اور تمہارا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ ایک گورے صاحب کی جائداد ہے۔ لہذا اگر انہوں نے اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تو خوب پٹائی ہوگی۔ پھر میں نے ان کو دس دس سینٹ دے دیئے۔ بس وہ خوش ہو گئے اور لگے دعا مانگنے کہ اگر اسی طرح کے اور بھی کچھ بیڑے ادھر آتے رہیں، اور انہیں یونہی رقم ملتی رہے تو ان کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ اس کے بعد سے یہ حبشی میرا بہت خیال رکھتے ہیں، جو کچھ مانگتا ہوں، مہیا کر دیتے ہیں۔ مجھے دوبارہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ تمہارا خادم جیک تو بہت ہی نیک ہے۔ ہوشیار بھی کافی ہے۔"

"ہوشیار تو واقعی ہے۔ دیکھو نا، اس نے مجھے یہ تک نہیں بتایا کہ تم یہاں چھپے بیٹھے ہو۔ وہ تو یہی کہتا رہا کہ اگر میں اس کے ساتھ آؤں تو مجھے پانی کے سانپ دکھائے گا۔ ظاہر ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر کوئی گڑبڑ ہوگئی تو کم از کم اس پر کوئی الزام نہیں آسکے گا۔ وہ تو یہی کہے گا کہ اس نے کبھی ہم دونوں کو اکٹھا نہیں دیکھا۔ اور یہ ہے بھی حقیقت۔"

اگلے دن جو کچھ ہوا، اسے بیان کرنے کا حوصلہ مجھ میں نہیں۔ مختصر یہ کہ علی الصبح جب میری آنکھ کھلی تو پہلے تو میں نے ارادہ کیا کہ کروٹ بدل کر سو جاؤں۔ لیکن دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ ہر طرف غیر معمولی سناٹا چھایا ہوا ہے اور کہیں کوئی حرکت نظر نہیں آتی۔ میں حیران ہو گیا۔ اور پھر

جب مجھے یہ پتہ چلا کہ بک بھی وہاں موجود نہیں ہے تو میں اچنبھے میں پڑ گیا اور سوچنے لگا کہ یہ ماجرا کیا ہے؟ میں نیچے آ گیا۔ وہاں بھی کوئی نہیں۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ میں گھر کے باہر آ گیا۔ وہاں بھی یہی عالم۔ میں سوچنے لگا کہ آخر بات کیا ہے؟ تبھی مجھے جیک دکھائی دیا جو لکڑیوں کے ڈھیر کے پاس بیٹھا تھا۔ میں نے پوچھا: "جیک! بات کیا ہے؟"

وہ بولا: ماسٹر جاگ! تمہیں واقعی پتہ نہیں؟

"نہیں تو۔"

"مس صوفیہ بھاگ گئی ہے۔ وہ رات سے لاپتہ ہے، کسی کو علم نہیں کہ وہ کتنے بجے گھر سے نکلی تھی۔ وہ ہارنے شیفرڈسن کے ساتھ بھاگی ہے اور اسی سے شادی کرے گی۔ کم از کم ان لوگوں کو تو یہی یقین ہے۔ ابھی صرف آدھ گھنٹہ پہلے ہی گھر والوں کو اس بات کا علم ہوا ہے۔ انہوں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ فوراً بندوقیں اکٹھی کی گئیں اور گھوڑے کسے گئے۔ اور پھر عورتیں تو دوسرے رشتہ داروں کو اطلاع دینے چلی گئیں اور بوڑھا ماسٹر سال اور اس کے بیٹے بندوقیں لے کر گھوڑے دوڑاتے ہوئے اس سڑک پر ہو لئے جو دریا کے کنارے کنارے جاتی ہے۔ ان کا ارادہ ہے کہ اس شخص کو جو صوفیہ کو اغوا کر کے لے گیا ہے، دریا پار کرنے سے پہلے ہی ختم کر دیا جائے ایسا لگتا ہے کہ کافی خون خرابہ ہو گا۔"

"اور بک نے مجھے نہیں جگایا، اور مجھے بتائے بغیر چلا گیا؟" میں نے کہا۔ ضرور گیا ہو گا۔ وہ نہیں چاہتے کہ تم خواہ مخواہ اس میں پھنسو۔ ماسٹر بک نے تو بندوق بھرتے وقت یہ اعلان کیا تھا کہ یا تو وہ کسی شیفرڈسن کی لاش لے کر لوٹے گا، یا خود اس کی اپنی لاش گھر واپس آئے گی۔ شیفرڈسن کنبے میں تو ڈھیر سارے لوگ ہیں۔ اگر کوئی اس کے ہتھے چڑھ گیا، تو وہ یقیناً اس کی لاش لے کر ہی لوٹے گا۔"

میں تیز تیز دوڑتا ہوا دریا کنارے والی سڑک پر ہو لیا۔ ابھی میں تھوڑی ہی دور گیا ہوں گا کہ گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ذرا اور آگے جا کر، جہاں سے لکڑی کے تختوں کی

بنی دکان اس کے قریب پڑا لکڑیوں کا ڈھیر، اور سٹیم بوٹوں کے ٹھہرنے کا گھاٹ نظر آتے ہیں، میں نے سڑک چھوڑ دی اور جھاڑیوں اور درختوں کی اوٹ میں چھپ چھپ کر چلنے لگا۔ موزوں سی جگہ دیکھ کر میں ایک درخت پر چڑھ گیا اور اس کی ٹہنیوں میں چھپ کر نظارہ دیکھنے لگا۔ اس درخت کے سامنے ذرا فاصلے پر لکڑیوں کا چار فٹ اونچا ڈھیر پڑا تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ اسی ڈھیر کے پیچھے چھپ جاؤں۔ لیکن یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں نے اپنے اس ارادے کو عملی جامہ نہ پہنایا اور اس کی بجائے درخت پر جا چڑھا۔

چار پانچ گھڑ سوار چیختے چلاتے، گالیاں دیتے، اس دکان کے سامنے والے میدان میں ادھر اُدھر چکر کاٹ رہے تھے۔ وہ ان لڑکوں کی تاک میں تھے جو گھاٹ کے قریب بڑے لکڑیوں کے ڈھیر کے پیچھے بیٹھے تھے۔ لیکن وہ لڑکے نہایت چوکس تھے اور انہیں اپنے نزدیک پھٹکنے نہیں دے رہے تھے۔ جونہی کوئی گھڑ سوار دریا کی طرف مڑتا، ڈھیر کے پیچھے سے ایک گولی سنسناتی ہوئی اس کے استقبال کو نکلتی۔ وہ دونوں لڑکے پیٹھ سے پیٹھ جوڑ کر بیٹھے تھے اور اس طرح انہوں نے دونوں طرفوں سے ناکہ بندی کر رکھی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ گھوڑ سوار دکان کی طرف چلے گئے اور چیخنے چلانے اور چکر کاٹنے کی آوازیں بند ہو گئیں، تو ایک لڑکا اٹھا اور ڈھیر کے پیچھے سے اس نے شست لگا کر گولی جو چلائی تو ان سواروں میں سے ایک لڑھک کر نیچے آ رہا ہے۔ فوراً، گھڑ سوار گھوڑوں سے کود پڑے اور اپنے زخمی ساتھی کو اٹھا کر دکان میں لے جانے لگے۔ موقع غنیمت جان کر وہ دونوں لڑکے بھاگ کھڑے ہوئے۔ لیکن ابھی وہ اس دکان اور اس درخت کے، جہاں میں بیٹھا تھا، آدھے راستے میں ہی ہوں گے کہ ان لوگوں کو پتہ چل گیا۔ وہ فوراً اچھل کر گھوڑوں پر چڑھے اور ان لڑکوں کا پیچھا کرنے لگے۔ لحظہ بہ لحظہ وہ لڑکوں کے قریب تر آتے جا رہے تھے۔ لیکن لڑکے چونکہ کافی فاصلہ طے کر چکے تھے۔ لہذا ان کے آتے آتے وہ اس ڈھیر کے پاس پہنچ گئے۔ جو اس درخت کے سامنے تھا جہاں میں چھپا بیٹھا تھا۔ اب ایک بار پھر وہی کہانی دہرائی جانے لگی۔ یعنی لڑکوں

نے پھر دونوں طرفوں کی ناکہ بندی کر لی۔ ان لڑکوں میں ایک تو بک تھا اور دوسرا ایک دُبلا پتلا نوجوان جس کی عمر تقریباً انیس[19] برس ہوگی۔

وہ گھڑ سوار تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر گھوڑے دوڑاتے رہے، اور پھر واپس مڑ گئے۔ جونہی وہ نظروں سے اوجھل ہوئے، میں نے فوراً بک کو پکار کر اُسے یہ اطلاع دے دی۔ میری آواز سن کر وہ بھونچکا رہ گیا کہ میں یہاں کیسے اور پھر درخت پر ٹنگا ہوا! پھر وہ بولا: "ان پر اچھی طرح نگاہ رکھو اور جونہی وہ نظر آئیں، مجھے بتا دینا۔ ان کے ارادے خطرناک ہیں۔ اور یقیناً وہ جلد ہی لوٹ آئیں گے" —— چاہتا تو میں تھا کہ درخت پر سے اُتر آؤں۔ مگر ہمت نہیں پڑتی تھی۔ بک نے مجھے بتایا کہ اس کا باپ اور دونوں بھائی مارے گئے ہیں، لیکن دشمن کے بھی دو تین آدمی ڈھیر ہو چکے ہیں۔ پھر وہ رونے لگا۔ اس المیے کے باوجود سے یقین تھا کہ وہ اور اس کا چچیرا بھائی جو (یہ اس کے ساتھ والے دوسرے نوجوان کا نام تھا) اس کا بدلہ لے کر رہیں گے۔ ہوا یہ کہ شیفرڈسن کے کنبے کے لوگ جھاڑیوں کی آڑ میں چھپے بیٹھے تھے، اور جونہی اس کا باپ اور بھائی ادھر سے گذرے۔ انھوں نے حملہ کر دیا۔ بک کو اگر کوئی افسوس تھا تو یہ کہ اس کے ابّا نے اپنے باقی رشتہ داروں کا انتظار کئے بغیر ہی یہ جنگ شروع کر دی تھی۔ حالانکہ اسے بخوبی علم تھا کہ شیفرڈسن کنبے کے لوگوں کی تعداد ان سے کہیں زیادہ ہے۔ میں نے بک سے پوچھا: "صوفیہ اور ہارنے کا کیا ہوا؟" —— "وہ تو دریا پار کر چکے ہیں" اس نے اطلاع دی" اور بخیر و عافیت ہیں" —— یہ سنکر مجھے بہت خوشی ہوئی تاہم حیرت اس بات پر تھی کہ بک کو اگر کوئی رنج تھا تو یہ کہ اس روز اس نے ہارنے کو کیوں اپنے ہاتھ سے نکل جانے دیا۔

دفعتاً دھائیں دھائیں کی آوازیں آنے لگیں۔ تین چار بندوقیں اکٹھی چل رہی تھیں۔ اب ہمیں پتہ چلا کہ وہ گھڑ سوار گئے نہیں تھے۔ وہ گھوڑوں سے اتر پڑے تھے اور جنگل کا چکر کاٹ کر پیچھے سے حملہ آور ہوئے تھے۔ اس اچانک حملے سے وہ دونوں لڑکے زخمی ہو گئے اور انہوں نے

جان بچانے کے لئے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ لیکن جب وہ دھارے کے ساتھ بہتے ہوئے ادھر سے گزرے تو وہ لوگ بھی ساتھ ساتھ ساحل پر دوڑتے رہے اور "مارو، مارو" چلاتے ہوئے ان پر گولیاں برساتے رہے۔ یہ نظارہ دیکھ کر میرا جی ڈوبنے لگا اور میں اس قدر نڈھال ہو گیا کہ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ اب گرا کہ گرا۔

اس واقع کی یاد ہی سے میرا جی گھبرانے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اس المیے کی تفصیلات بیان کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ کاش میں اس رات اس ساحل پر نہ آتا! مجھے یہ جگر دوز نظارہ تو دیکھنا نہ پڑتا۔ یہ المناک واقعات مجھے تا زندگی نہیں بھولیں گے۔ اور تو اور یہ منظر اکثر میرے خوابوں میں آتے رہتے ہیں۔

اندھیرا ہونے تک میں وہیں درخت پر ٹنگا رہا۔ میری ہمت نہ تھی کہ نیچے اتر آؤں کبھی کبھی دور جنگل میں سے بندوقوں کی آوازیں آنے لگتیں، دو بار تو میں نے گھڑ سواروں کی ٹولیوں کو بندوقیں تانے مکان کے پاس سے گزرتے دیکھا۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ خون خرابہ ابھی جاری ہے۔ میرا جی بیٹھنے لگا اور میں نے تہیہ کر لیا کہ اب دوبارہ اس گھر کے پاس تک نہ پھٹکوں گا۔ نجانے کیوں، مجھے رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ اس المیے کا باعث میں ہوں۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ کاغذ کے اس پرزے کا اصل مطلب کیا تھا۔ یعنی پارنے نے صوفیہ کو رات کے ڈھائی بجے کہیں بلایا تھا۔۔ ان کی نیت بھاگ نکلنے کی تھی۔ میرا فرض تھا کہ اس کے باپ کو یہ سارا واقعہ سنا دیتا اور یہ بھی بتاتا کہ اس کاغذ کو دیکھ کر صوفیہ کتنی خوش ہوئی تھی۔ شائد اس کا باپ اسے کمرے میں بند کر دیتا اور یہ نوبت نہ آتی۔

درخت سے اتر کر میں تھوڑی دور تک ساحل کے ساتھ ساتھ چلتا گیا۔ وہ دونوں لاشیں کنارے سے کچھ ہی دور پانی میں پڑی تھیں۔ میں انہیں گھسیٹ کر ساحل پر لے آیا اور ان کے چہروں پر کپڑا ڈال دیا۔ اس کے بعد میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا وہاں سے روانہ ہو گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں ان کے چہرے ڈھانپ رہا تھا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

کتنا پیارا دوست تھا وہ!!

اب اندھیرا ہونے لگا تھا۔ گھر جانے کا تو خیر سوال ہی نہیں تھا۔ میں جنگل میں سے ہوتا ہوا دلدل کی طرف چل دیا۔ جم اس جزیرے پر نہیں تھا۔ میں نے سیدھا نالے کا رخ کیا۔ میری کوشش تھی کہ کسی طرح جھاڑیوں میں چھپتا چھپاتا بیڑے تک پہنچ جاؤں تاکہ اس منحوس علاقے کو جتنی جلدی ہو سکے خیرباد کہہ دیا جائے۔ لیکن نالے پر پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں کہ بیڑا غائب ہے!——

میں خوف سے لرز اٹھا۔ ایک لمحے کے لئے تو میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ جونہی میں آپے میں آیا، میں نے فوراً زور زور سے پکارنا شروع کر دیا۔ اور پھر ایک آواز جو زیادہ سے زیادہ پچیس قدم دور رہی ہو گی، آئی: "شکر ہے خدا کا! ارے یہ تم ہو — لیکن شور کیوں مچا رہے ہو!!"

یہ آواز جم کی تھی۔ لیکن مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ آواز میرے نجات دہندے کی ہو۔ میں کنارے کنارے بھاگنے لگا۔ تھوڑی دور آگے بیڑا کھڑا تھا۔ میں جلد اس پر چڑھ گیا جم نے مجھے سینے سے لگا لیا اور مجھے صحیح وسلامت دیکھ کر اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ بولا:

"شکر ہے خدا کا۔ میرا تو خیال تھا کہ اب کی بار شاید تم زندہ نہ لوٹو۔ جیک یہاں آیا تھا۔ کیونکہ تم واپس گھر نہیں لوٹے تھے، لہٰذا اس کا اندازہ تھا کہ تم بھی مارے گئے ہو گے۔ میں کیا کرتا؟ میں نے بیڑا لیا اور اب میں نالے کے سرے کی سمت روانہ ہونے ہی والا تھا کہ تم آ گئے۔ اب تو میں صرف جیک کا انتظار کر رہا تھا تاکہ جانے سے پہلے یہ صحیح خبر مل جائے کہ آیا تم زندہ ہو یا نہیں۔ شکر ہے خدا کا کہ تم آ گئے۔"

میں بولا: "چلو یہ بھی اچھا ہی ہے۔ میرے گھر نہ لوٹنے سے وہ لوگ یہی سمجھیں گے کہ میں بھی مارا گیا ہوں اور کہ میری لاش دریا میں بہہ گئی ہو گی۔ ویسے دریا میں انہیں ایسی لاش بھی مل ہی جائے گی جس سے ان کے اس خیال کی تائید ہو جائے۔ تو جم! اب ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرو اور جتنی جلدی ہو سکے دریا کی طرف چل پڑو۔"

جب تک بیڑا دو میل آگے مسسپی کے وسط میں نہ پہنچ گیا، مجھے چین نہ آیا۔ دریا میں پہنچ کر ہم نے لالٹین جلا کر لٹکا دی۔ اب ہم پھر نہ صرف آزاد تھے، بلکہ بخیر و عافیت بھی پورے بارہ گھنٹے سے میرے منہ میں اناج کا دانہ تک نہیں گیا تھا۔ جم نے کچھ بھٹے اور گوشت، اور گوبھی، اور دو ایک دوسری چیزیں دیں۔ انہیں کھا کر میں نے لسّی پی۔ ان کے سامنے دنیا کے بہترین سے بہترین پکوان بھی ہیچ تھے۔ میں کھانا کھاتا رہا اور باتیں کرتا رہا۔ میں خوش تھا کہ ان جھگڑوں سے جان بچی۔ جم خوش تھا کہ دلدل سے چھٹکارا نصیب ہوا۔ اب ہماری متفقہ رائے یہی تھی کہ بیڑا ہی ہمارا گھر ہے اور اس سے بہتر گھر ہمیں کہیں نہیں مل سکتا۔ مکانوں میں دم گھٹنے لگتا ہے، لیکن بیڑے پر آدمی آزادی سے سانس لیتا ہے۔ بیڑے پر کتنا سکھ ہے، کتنی آزادی، کتنا چین!!

۱۹۔ دن کو آرام، رات کو سفر۔ علم سیارگان۔ نشہ بندی کی مہم۔ ڈیوک آف برج واٹر۔ بادشاہوں کے دکھڑے

دو تین دن اور دو تین راتیں اسی طرح گزر گئیں۔ گزر کیا گئیں۔ یوں سمجھئے بہہ گئیں چپکے سے خاموشی سے، آرام سے بہہ گئیں۔ اگر آپ یہ جاننا ہی چاہتے ہیں کہ یہ دن ہم نے کیسے گزارے، تو سنئے:

اس جگہ دریا کا پاٹ بہت ہی چوڑا تھا۔ یہی کوئی ڈیڑھ میل کے قریب ہوگا۔ رات کو تو ہم سفر کرتے، اور دن کو چھپ جاتے۔ جونہی رات ختم ہونے کو آتی ہم بیڑے کو ساحل پر باندھ دیتے۔ بیڑا باندھنے کے لئے ہم ہمیشہ ٹاپو کے قریب کسی موزوں سی جگہ کا انتخاب کرتے جہاں پانی ساکن ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہم جھاڑیاں کاٹ کر بیڑے کو اچھی طرح ڈھانپ دیتے تاکہ نظر نہ آئے۔ ادھر سے فارغ ہو کر مچھلیاں پکڑنے کے لئے بنسیاں لگا دی جاتیں۔ پھر ہم تھوڑی دیر دریا میں

تیرنے رہتے تاکہ تازہ دم ہو جائیں۔ نہا دھو کر ہم کنارے کے قریب ہی ریت کے تودے پر بیٹھ جاتے جہاں پانی گھٹنے گھٹنے ہوتا، اور طلوعِ آفتاب کا نظارہ کرتے رہتے۔ ہر طرف سناٹا ہوتا، گہرا سناٹا جیسے ساری کائنات محوِ خواب ہو۔ ہاں کبھی کبھی مینڈکوں کی آواز اس سناٹے کو چیرتی ہوئی نکل جاتی۔ اس جھٹپٹے کے عالم میں جب ہم دریا کے اس پار نظر دوڑاتے تو ہمیں ایک سرمئی سی لکیر کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا۔ یہ لکیر ان درختوں کی نشاندہی کرتی تھی جو اُدھر اس کنارے پر اگے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد آکاش پر زرد رنگ کا ایک دھبہ سا نمودار ہوتا اور نمودار ہوتے ہی پھیلنا شروع کر دیتا اب دریا بھی دھیرے دھیرے اپنے چہرے سے تاریکی کا نقاب ہٹانا شروع کر دیتا اور دور اس کے پانی کا رنگ جو ابھی تک سیاہ ہوتا، سیاہی مائل ہونا شروع ہو جاتا۔ کہیں اس پر سیاہ دھبے سے پھسلتے نظر آتے۔ یہ دھبے دراصل وہ کشتیاں تھیں، جو سامان ڈھو کر منڈی تک لے جا رہی ہوتیں کبھی کبھی سیاہ رنگ کی لمبی سی لکیریں دور پانی پر پھسلتی دکھائی دیتیں (یہ دراصل بڑے بجرے تھے) گاہے گاہے کسی چپو کی چپ چپ سنائی دینے لگتی، یا ملی جلی انسانی آوازیں دریا کی لہروں پر تھرکتی ہوئی ہمارے کانوں تک پہنچ جاتیں۔ سناٹا اس قدر گہرا ہوتا کہ دور سے آنے والی آواز بھی صاف سنائی دیتی تھی۔ چلتے چلتے کبھی پانی کی سطح پر ایک لکیر سی بننے لگتی جو اس بات کی علامت تھی کہ پانی کے اندر ایک درخت لگا ہوا ہے اور جب پانی کا دھارا اس سے ٹکراتا ہے تو یہ لکیر سی بن جاتی ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد پانی کے اوپر دھند اٹھنے لگتی اور اس کے ساتھ ہی پہلے تو مشرقی افق پر اور پھر فوراً ہی سطحِ آب پر سرخی سی بکھر جاتی۔ پھر دریا کے اس پار جنگل کے سرے پر بنی ہوئی لکڑی کی کوئی جھونپڑی بھی نظر آنے لگتی۔ غالباً یہ لکڑیوں کا ذخیرہ ہوتا۔ یہ لکڑیاں نہایت سلیقے سے چُنی ہوتی تھیں۔

پھر نسیمِ سحری ہمیں پنکھا کرنے لگتی اس میں جنگلی پھولوں کی خوشبو بسی ہوتی، اور دریا کے پانیوں کی خنکی اور تازگی بھی۔ ہاں البتہ جب مچھیرے مردہ مچھلیاں ادھر اُدھر کنارے پر بکھیر دیتے تو کبھی کبھی ہوا میں خوشبو کی جگہ سڑاند بھری ہوتی ــــ اس کے بعد دن نکل آتا اور ہر شے دھوپ

مسکرانے لگتی، اور پرندے گیت گانے لگتے۔

ایسے میں اگر آگ جلالی جائے تو دھواں نظر نہیں آتا ہم بنسیوں پر سے مچھلیاں اتار بیٹنے اور گرم گرم ناشتہ کرکے دریا کے سُونے پن کو دیکھنے رہتے، دیکھتے رہتے حتیٰ کہ ہمیں اونگھ آنے لگتی اور ہم نیند کی آغوش میں چلے جاتے۔ تھوڑی دیر بعد ہم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے اور دیکھنے لگتے کہ یہ شور کیا ہے جس نے ہماری نیند اُچاٹ کردی ہے۔ کبھی کبھی دور اس کنارے کے قریب کوئی سٹیم بوٹ منبع کی طرف جارہی ہوتی۔ لیکن فاصلہ اس قدر زیادہ ہوتا کہ اس کے چلنے کے بارے میں ہمیں ٹھیک طرح سے اندازہ نہ ہوسکتا، سوائے اس کے کہ اس کا سٹیرنگ سامنے ہے یا پہلو کی طرف۔ اس کے گزر جانے کے بعد ماحول پر ایک بار پھر خاموشی چھا جاتی، اور سُونا پن مسلط ہوجاتا تقریباً ایک گھنٹے تک یہی عالم رہتا اور پھر دور اس کنارے پر ایک بیڑا سرکتا ہوا نظر آتا۔ کبھی کبھی کوئی شخص اس پر لکڑیاں پھاڑ رہا ہوتا، کیونکہ بیڑوں پر یہ عمل اکثر ہوتا رہتا ہے۔ ہمیں لکڑیاں پھاڑنے والا آدمی تو نظر نہ آتا، لیکن جب وہ کلہاڑے کو گھما کر سر کے اوپر لے آتا تو ایک لمحے کے لیے لوہے کا پھل دھوپ میں چمک اُٹھتا اور پھر غائب ہوجاتا۔ اور اگلے لمحے وہ پھل پھر دھوپ میں چمک اٹھتا اور اس کے ساتھ ہی ٹھک کی آواز سنائی دیتی۔ اس آواز کو ہم تک پہنچنے میں کچھ دیر لگ جاتی تھی۔

بس یونہی سوتے جاگتے، سناٹے کی متکلم صداؤں کو سنتے، دن گزر جاتا۔ ایک روز کا ذکر ہے دریا کی سطح پر گہری دھند چھائی ہوئی تھی۔ اور ادھر سے گزرنے والے بیڑوں اور کشتیوں پر لوگ خالی برتن بجا بجا کر شور مچا رہے تھے۔ تاکہ سٹیم بوٹوں کو ان کی موجودگی کا علم ہوجائے اور ٹکر نہ ہو۔ ایک بیڑا، وہ کشتی تھی یا بیڑا۔ یہ ٹھیک طرح سے نظر نہیں آرہا تھا، ساحل کے اس قدر نزدیک سے گزرا کہ ہمیں سواریوں کی باتیں کرنے اور گالیاں دینے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں، حالانکہ دھند کی وجہ سے بیڑا ہمیں بالکل نظر نہیں آرہا تھا۔ ہمارے رونگٹے کھڑے ہوگئے کیونکہ جب آواز تو سنائی دیتی ہو پر بولنے والے کی شکل نظر نہ آتی ہو تو بھوتوں کا گمان ہونے لگتا ہے۔ جم کو تو یکا یقین تھا کہ یہ بھوت ہی ہیں۔ لیکن میں بولا: "نہیں، یہ بھوت نہیں ہوسکتے بھلا

کبھی بھوتوں نے یہ بھی کہا ہے: "ستیاناس ہو اس دھند کا!"

جلد ہی رات آگئی اور ہم پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ جب ہمارا بیڑا دریا کے وسط میں پہنچا، تو ہم نے اسے دھارے کے رحم پر چھوڑ دیا کہ جدھر چاہے بہالے جائے۔ پھر ہم نے پائپ سلگائے اور ٹانگیں پانی میں لٹکا کر باتیں کرنے لگے۔ اس روز ہم نے دنیا جہان کی باتیں کر ڈالیں۔ عام طور پر ہم دن رات ننگے بدن ہی رہا کرتے تھے اور کپڑے صرف اس وقت پہنتے جب مچھر بہت زیادہ تنگ کرنے لگتے۔ جو کپڑے بک کے گھر والوں نے مجھے دیئے تھے، وہ اتنے عمدہ تھے کہ انہیں پہن کر میرا دم گھٹنے لگتا تھا۔ ویسے بھی کپڑوں کے بارے میں خاصا بے نیاز ہو چکا تھا۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ دریا میں صرف ہمارا ہی بیڑا بہہ رہا ہوتا اور کافی عرصے تک کوئی دوسرا بیڑا یا کشتی نظر نہ آتی۔ پانی کے دھارے کے پرلی طرف چھوٹے چھوٹے جزیرے تھے اور ان جزیروں کے پرے ساحل۔ کبھی کبھار جب کسی جھونپڑی کی کھڑکی میں دیا جل رہا ہوتا تو ساحل پر ایک ننھی سی روشنی ٹمٹماتی ہوئی دکھائی دیجاتی۔ اور اگر کوئی بیڑا یا کشتی گزر رہے ہوتے تو سطح دریا پر بھی اکا دکا روشنی پھسلتی ہوئی نظر آجاتی۔ کبھی کبھی کسی بیڑے سے بربط کی آواز یا گیت کے بول سنائی دے جاتے۔ بیڑے پر زندگی کتنی پر لطف ہوتی ہے! ہمارے سروں کے اوپر ستاروں سے دمکتا آکاش ہوتا، اور ہم پیٹھ کے بل لیٹے ان ستاروں کو تکتے رہتے اور اس بات پر بحث کرتے کہ آیا ستارے تخلیق کیے گئے تھے یا اپنے آپ ہی عالم ظہور میں آ گئے تھے۔ جم کا خیال تھا کہ ان کی تخلیق ہوئی تھی۔ اس کے برعکس میری رائے تھی کہ یہ اپنے آپ ہی وجود میں آئے تھے۔ میری دلیل یہ تھی کہ اگر کوئی شخص ان کی تخلیق کرنے بیٹھتا تو اتنے سارے ستاروں کی تخلیق میں یُگ بیت جاتے۔ جم نے قیاس لگایا کہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ چاند نے انڈے دیئے ہوں۔ اس بات میں مجھے بھی کچھ کچھ صداقت نظر آئی لہٰذا میں نے اس کی مخالفت نہ کی۔ میں نے خود مینڈکوں کو سینکڑوں ہزاروں انڈے دیتے دیکھا ہے۔ لہٰذا اگر چاند نے اتنے سارے انڈے دے بھی دیئے ہوں تو کوئی تعجب نہیں جب کبھی کوئی ستارہ ٹوٹتا تو ہماری نظریں اس کا تب تک

تعاقب کرتی رہتیں جب تک کہ اس کی لکیر مدھم ہوتے ہوتے نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتی۔ ان ٹوٹتے تاروں کے متعلق حجم کا قیاس یہ تھا کہ شاید کچھ انڈے خراب ہو گئے ہوں گے۔ لہٰذا انہیں گھونسلے سے باہر پھینک دیا گیا ہے۔

رات کو دو ایک بار کوئی سٹیم بوٹ بھی اندھیرے میں پھسلتی ہوئی نظر آجاتی کبھی کبھی جب اس کی چمنیاں چنگاریاں اگلنے لگتیں اور یہ چنگاریاں دریا میں ادھر ادھر بکھر جاتیں تو یوں لگتا جیسے انار چھوٹ رہے ہوں۔ یہ منظر واقعی بڑا حسین ہوتا۔ اور پھر یہ کشتی مڑ جاتی اور اس کی بتیاں نظروں سے غائب ہو جاتیں اور چھک چھک کی آواز خاموش ہو جاتی۔ اس کے ساتھ ہی ایک بار پھر ہر طرف سناٹا چھا جاتا سٹیم بوٹ تو چلی جاتی لیکن اس سے پیدا ہونے والی لہریں بہت دیر تک بیڑے سے ٹکراتی رہتیں اسے ٹھوکے دے دے کر تھوڑا سا لہو آنکے ڈھکیل جاتیں۔ اس کے بعد دیر تک ہمیں اکا دکا مینڈکوں کی ٹراہٹ کے سوا کوئی دوسری آواز سنائی نہ دیتی۔

آدھی رات کے بعد جب ساحل پر رہنے والے لوگ سو جاتے، اور جھونپڑیوں کے اندر ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں گل ہو جاتیں۔ تو دو تین گھنٹوں کے لئے ساحل پر گھپ اندھیرا چھا جاتا ان روشنیوں سے ہم نے گھڑی کا کام لینا شروع کر دیا تھا۔ جب بھی کوئی روشنی نظر آتی ہم سمجھ لیتے کہ سحر ہونے کو ہے۔ بس ہم فوراً کوئی اچھی سی جگہ تلاش کر کے بیڑے کو باندھ دیتے، اور خود جنگل میں جا چھپتے۔

ایک روز سحر کے وقت مجھے ایک ناؤ ہاتھ لگی اور میں دھارے کو پار کر کے سامنے ساحل کے قریب چلا گیا۔ فاصلہ دو سو گز سے زیادہ نہ تھا۔ میں وہاں سے کشتی کو کھیتا ہوا کوئی ایک میل اندر نالے میں چلا گیا۔ اس نالے کے دونوں طرف سرو کے درخت اگے ہوئے تھے۔ دراصل یہاں میں گوندنیوں کی تلاش میں ادھر آیا تھا۔ جب میں اس جگہ پہنچا جہاں ایک پگڈنڈی اس نالے کے آر پار جاتی تھی، تو کیا دیکھتا ہوں کہ دو آدمی دبے پاؤں چلتے ہوئے آرہے ہیں جیسے کسی کا تعاقب کر رہے ہوں۔ میری تو جان ہی نکل گئی۔ کیونکہ اس جگہ اگر کسی شخص کو کسی

کی تلاش ہو سکتی تھی، تو میری ـــــ یا شائد جم کی۔ میں نے ارادہ کیا کہ بھاگ اٹھوں مگر وہ اتنے قریب آ چکے تھے کہ بھاگنا ممکن نہ تھا۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے آواز دی اور گڑگڑانے لگے کہ کسی طرح ان کی جان بچاؤں۔ وہ اپنی بے گناہی کی قسمیں کھا کھا کر کہتے رہے کہ لوگ ناحق ان کا پیچھا کر رہے ہیں۔ وہ تو فوراً کشتی میں ہی کود پڑتے لیکن میں نے کہا:

"نہ نہ! ایسا مت کرو۔ ابھی کتے اور گھوڑے کافی دور ہیں۔ تم لوگ جھاڑیوں کے بیچ میں سے ہوتے ہوئے تھوڑی دور نالے کے ساتھ ساتھ چلے جاؤ۔ پھر پانی میں اتر آنا اور تیر کر میرے پاس آ جانا۔ اس سے کتے تمہاری بو نہ پا سکیں گے۔"

انہوں نے ایسا ہی کیا اور جونہی وہ کشتی میں سوار ہوئے۔ میں فوراً اپنے ٹیلے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے پانچ دس منٹ بعد ہی دور کتوں اور آدمیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ ہمیں دکھائی تو نہیں دے رہے تھے لیکن ان آوازوں سے ہم نے اندازہ لگایا کہ وہ لوگ نالے ہی کی طرف آ رہے ہیں۔ پھر شائد وہ رک کر ادھر ادھر ڈھونڈنے لگ گئے ہوں گے تھوڑی دیر میں جب ہم اور آگے نکل آئے، تو یہ آوازیں آنی بند ہو گئیں۔ اور جب ہم جنگل کے اندر سے گزرتے ہوئے تقریباً ایک میل دور دریا میں داخل ہو گئے، تو ایک بار پھر ہر طرف خاموشی چھا گئی ہم نے کشتی کو بیڑی پر باندھ دیا اور جنگل میں چھپ گئے۔ اب ہم محفوظ تھے۔

ان میں سے ایک کی عمر ستر برس یا شائد اس سے بھی کچھ زیادہ ہی تھی۔ اس کا سر گنجا اور داڑھی سفید تھی اس نے ایک بوسیدہ سا ہیٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے جسم پر ایک میلی چکٹ اونی قمیص تھی۔ اور ایک پھٹی پرانی نیلی سی برجس جسے اس نے اپنے لمبے بوٹوں کے اندر ٹھونس رکھا تھا۔ اس برجس کے ساتھ لگے گیلس بھی گھر کے بنے ہوئے ہی تھے۔ اور ہاں یاد آیا گیلس بھی دو نہیں تھے، صرف ایک ہی تھا۔ اس کے بازو پر لمبی پشت والا ایک پرانا سا کوٹ رکھا تھا۔ کوٹ کا رنگ نیلا تھا اور اس پر پیتل کے چمکدار بٹن لگے تھے ان دونوں آدمیوں کے پاس نمدے سے بنے ہوئے بڑے بڑے تھیلے تھے جو کچھ اس طرح ٹھنسے ہوئے تھے، کہ

ان پر موٹے تازے اور پلے بلے چوہوں کا گمان ہوتا تھا۔

دوسرے آدمی کی عمر تیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کا لباس بھی معمولی سا تھا۔ ناشتہ کرنے کے بعد ہم تینوں وہیں لیٹ گئے اور بات چیت کرنے لگے۔ اس بات چیت سے اولین انکشاف یہ ہوا کہ یہ دونوں حضرات بھی ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں۔

"تم نے کیا کیا تھا؟" گنجے آدمی نے دوسرے سے پوچھا۔

"میں دوائی بیچتا ہوں۔ میرا دعویٰ ہے کہ اس سے دانتوں کی کالکھ اتر جاتی ہے۔ لیکن ایک بات ضرور ہے۔ کالکھ تو واقعی اتر جاتی ہے، لیکن پالش بھی جاتی رہتی ہے۔ خیر، میرا قصور یہ تھا کہ اپنی میعاد سے ایک رات اوپر یہاں ٹھہر گیا۔ آج میں کھسک ہی رہا تھا کہ راستے میں تم سے ملاقات ہو گئی۔ تمہیں یاد ہوگا کہ جب تم نے کہا کہ لوگ، تمہارے تعاقب میں ہیں اور مجھ سے مدد مانگی، تو میں نے یہی کہا تھا ناں، کہ میں خود خطرے میں ہوں۔ لہٰذا بہتری اسی میں ہے کہ دونوں بھاگ نکلیں —— تو یہ ہے میرا قصہ تم اپنی کہو۔"

"میں اس گاؤں میں ایک ہفتے سے نشہ بندی کا پرچار کر رہا تھا۔ تمام عورتیں۔ کیا چھوٹی، کیا بڑی —— سب مجھ سے خاصی متاثر تھیں۔ بات یہ تھی کہ میں نے لفنگوں کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ مجھے ہر رات پانچ چھ ڈالر کی کمائی ہو جاتی تھی اور وہ یوں کہ میرے لیکچر کی ٹکٹ دس سینٹ فی آدمی تھی۔ بچے اور حبشی مفت۔ میرا کاروبار خاصا چمک اٹھا تھا کہ نہ جانے کل رات کس نے یہ افواہ اڑا دی کہ میں خود چوری چوری شراب پیتا ہوں، اور اس مقصد کے لئے میں نے ایک جگ چھپا رکھا ہے۔ ایک حبشی نے آج صبح صبح مجھے جگا کر یہ اطلاع دی کہ لوگ چپکے چپکے گھوڑے اور کتے اکٹھے کر رہے ہیں۔ اس نے کہا: "وہ تمہیں آدھ گھنٹے کی مہلت دیں گے۔ اگر اس اثنا میں تم نو دو گیارہ نہ ہوئے تو تمہارا منہ کالا کر کے اور پروں کا تاج پہنا کر جلوس نکالا جائے گا" —— بس پھر کیا تھا۔ میں نے ناشتہ کا انتظار کرنا بھی مناسب نہ سمجھا، اور چلا آیا۔ ویسے بھی مجھے کوئی خاص بھوک نہیں تھی۔"

"اچھا، بزرگوارم" وہ جوان آدمی بولا "کیوں نہ ہم دونوں مل کر کام کریں۔ کیا خیال ہے؟"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اچھا یہ تو بتائیے آپ کا کاروبار کیا ہے؟ ـــــ میرا مطلب ہے عام طور پر تم کیا کیا کرتے ہو"

"پیشے کے اعتبار سے تو میں اخبار نویس ہوں۔ البتہ کبھی کبھی پیٹنٹ دواؤں کا کاروبار کر لیتا ہوں۔ اس کے علاوہ میں اداکار بھی ہوں۔ المیہ اداکاری میری خصوصیت ہے۔ اور کبھی کبھی اگر موقع ملے تو مسمریزم بھی کر لیتا ہوں، اور ماتھے کی بناوٹ دیکھ کر قسمت بتا دیتا ہوں منظوم جغرافیہ پڑھا سکتا ہوں، اور لیکچر دے سکتا ہوں ـــــ دراصل میں بہت سے فنون کا ماہر ہوں بس جو کام ملا وہی کر لیا۔ مطلب یہ کہ میرا کوئی ایک کاروبار نہیں۔ ہاں تو آپ کیا کرتے ہیں؟"

"اپنے زمانے میں میں نے کافی عرصے تک ڈاکٹری کی ہے۔ یعنی کینسر، ادھرنگ، اور ایسی ہی دوسری بیماریوں کے لئے میرا شرطیہ علاج یہ تھا کہ مریض کو ہاتھوں کے بل لٹا دیا جائے ـــــ اور ہاں، اگر میرے ساتھ کوئی ایسا شخص ہو جو اطلاعات فراہم کر سکے، تو میں جوتش بھی لگا لیتا ہوں تبلیغ میں اور مذہبی جلسے منعقد کرنے میں مجھے خاصی مہارت ہے۔"

چند منٹ تک دونوں خاموش رہے اس کے بعد اس جوان نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بولا: "واہ ری قسمت!"

"قسمت کو کیوں کوس رہے ہو؟" گنجے نے پوچھا۔ "ذرا غور کرو۔ یہ بھی کیا تقدیر ہے کہ مجھے ایسی زندگی بسر کرنی پڑ رہی ہے اور وہ بھی ایسے لوگوں کی صحبت میں اور اتنی بات کہہ کر وہ ایک میلے کچیلے رومال سے آنکھیں پونچھنے لگا۔

"کیا کہنے آپ کے! یعنی ہماری صحبت آپ کے شایان شان نہیں!" گنجا تنک کر بولا وہ اپنے آپ کو اس جوان سے برتر سمجھتا تھا۔

"نہیں، یہ بات نہیں۔ آپ کی صحبت تو ـــــ میرا مطلب ہے اب میں رہ رہ کر اسی قابل گیا ہوں۔ اور اس میں قصور سراسر میرا اپنا ہی ہے۔ میں کیا تھا، اور کیا بن گیا ہوں۔

آپ کو کیا الزام دوں - دے بھی کیسے سکتا ہوں؟ اور آپ کو ہی کیا، کسی کو بھی کیا الزام دے سکتا ہوں؟ میں تھا ہی اسی کا مستحق - زمانہ جس قدر بھی ستم ڈھائے، کم ہے - البتہ مجھے اتنا اطمینان ضرور ہے کہ کہیں نہ کہیں دو گز کی قبر تو مل ہی جائے گی - بے شک زمانہ اپنی روش نہ بدلے اور جو کچھ میرے پاس ہے، وہ بھی چھین لے - میرے عزیز، میری جائداد، میرا سب کچھ مجھ سے لے لے، پھر بھی وہ دو گز زمین تو مجھے ہر حالت میں میسّر ہو ہی جائے گی - اور ایک نہ ایک دن مجھے اس میں سونا نصیب ہوگا ہی - اس وقت مجھے کوئی غم نہ رہے گا، اور میرے ٹوٹے ہوئے دل کو راحت ملے گی" اتنا کہہ کر اس نے پھر آنکھیں پونچھ لیں -

"لعنت ہے تمہارے ٹوٹے ہوئے دل پر!" گنجے نے کہا - اپنے دل کے یہ ٹکڑے ہمیں کیوں دکھا رہے ہو - ہم نے تو اسے نہیں توڑا!"

"نہیں - میں نے کب کہا ہے کہ آپ نے توڑا ہے؟ میں آپ لوگوں کو تو کوئی الزام نہیں دے رہا ہوں - میں تو صرف اپنے آپ کو کوس رہا ہوں - میں خود ہی تو اپنی اس حالت کا ذمہ دار ہوں - اور مجھے اس کی سزا ملنی چاہیئے تھی - میرا جو حشر ہوا ہے، میں اسی کا مستحق تھا، مجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں"،

"حشر! کیا مطلب ہے تمہارا؟ آخر تم تھے کیا؟"

"کیا بتاؤں؟ آپ کو شاید یقین ہی نہ آئے - اور آپ ہی پر کیا موقوف ہے، کسی کو بھی تو یقین نہیں آتا! چلئے، چھوڑیئے اسے! کوئی خاص بات تو ہے نہیں - میری پیدائش کا راز ——

"پیدائش کا راز! تمہارا مطلب ہے کہ ——"

"جناب" وہ جوان آدمی نہایت سنجیدگی سے بولا، "جناب، میں یہ راز آپ کو اس لئے بتا رہا ہوں کیونکہ مجھے آپ پر اعتماد ہے - حسب و نسب کے اعتبار سے میں ایک ڈیوک ہوں"۔

یہ سن کر جم کی آنکھیں یوں پھیل گئیں - جیسے ابھی چہرے میں سے نکل کر باہر آ گریں گی

شائد میری آنکھیں بھی یوں پھٹی کی پھٹی رہ گئی ہوں گی۔

لیکن گنجا بولا:

"نہیں نہیں۔ تم مذاق کر رہے ہو"

"مذاق نہیں، حقیقت ہے۔ میرا دادا جو ڈیوک آف برج واٹر کا سب سے بڑا لڑکا تھا پچھلی صدی کے آخر میں امریکہ بھاگ آیا تھا تاکہ یہاں کی آزاد فضا میں سانس لے سکے۔ اس نے یہیں شادی کی اور اسی ملک میں اس کا انتقال ہوا۔ اس شادی سے اس کا ایک بیٹا ہوا۔ انہی دنوں اس کے باپ کا انتقال ہو گیا اور دوسرے بیٹے یعنی میرے پردادا کے چھوٹے بھائی نے منصب اور جائیداد ہتھیالی اور اس طرح اس بچے کا جو اصل ڈیوک تھا۔ حق غصب کر لیا گیا جناب میں اسی بچے کی اولاد ہوں اور مجھے ہی ڈیوک آف برج واٹر کہلانے کا حق حاصل ہے لیکن واہ ری تقدیر! تو نے میری کیا حالت کر دی۔ میری جائداد مجھ سے چھن گئی۔ عزیز واقربا ساتھ چھوڑ گئے؛ اور اس پر طرّہ یہ کہ لوگ اب میری جان کے در پے ہیں۔ زمانہ مجھ سے نفرت کرتا ہے؛ میرے جسم پر ڈھنگ کا کپڑا نہیں، دل ٹوٹ چکا ہے؛ اور اب میں اس بیڑے پر مجرموں کی صحبت میں بیٹھا ہوں۔"

یہ سُن کر جم کا دل اور بھی پسیج گیا۔ مجھے بھی اس پر ترس آنے لگا۔ ہم نے لاکھ کوشش کی کہ اس کی ڈھارس بندھائیں لیکن وہ بولا: "ان طفل تسلیوں سے فائدہ؟ اگر تم لوگ واقعی میرے خیرخواہ ہو، تو مجھے بحیثیت ایک ڈیوک کے قبول کر لو۔"

ہم نے کہا: "ہمیں منظور ہے، مگر یہ تو بتاؤ کہ ہمیں کرنا کیا ہو گا؟"

وہ بولا: "اس کا طریقہ یہ ہے کہ جب بھی تم لوگ مجھ سے بات کرو، تو پہلے کورنش بجا لاؤ، اور مجھے مخاطب کرتے وقت 'سرکار'، 'آقا'، 'حضور' کے القاب استعمال کرو۔ ویسے اگر تم مجھے صرف برج واٹر کہہ کر پکارو تب بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ کیونکہ برج واٹر بجائے خود ایک لقب ہے، نام نہیں۔ اور پھر جب میں دسترخوان پر بیٹھوں، تو تم میں سے ایک شخص میری اردلی

میں رہے، اور میں جو خدمت کہوں بجا لائے۔"

یہ کوئی مشکل کام نہ تھا، لہٰذا ہم نے فوراً اس پر عمل شروع کر دیا۔ اس روز کے بعد کھانے پر جم برابر اس کی اردلی میں کھڑا رہتا، اور اس کو مخاطب کرتے وقت کہتا: "سرکار ذرا اسے چکھئے گا؟ ——— اور اسے؟" ——— وغیرہ وغیرہ۔ یہ سن کر وہ شخص خوشی سے پھولا نہ سماتا۔

لیکن اب وہ بوڑھا خاموش رہنے لگا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس کی حالت یہ ہو گئی جیسے اس کی زبان کو تالا لگ گیا ہو۔ ایسا لگتا تھا کہ ڈیوک کی قدر و منزلت اسے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی، اور اسے اندر ہی اندر کچھ پریشانی سی ہو رہی تھی۔ خیر، دوپہر کے بعد وہ بولا:

"سنو، بلج واٹر! مجھے تم سے ہمدردی تو واقعی بہت ہے، مگر جو کچھ تم پر بیتی ہے، وہ کوئی انوکھی بات نہیں۔"

"انوکھی نہیں؟ وہ کیسے؟"

"بالکل انوکھی نہیں۔ تم واحد شخص تو ہو نہیں جس سے اس کا مرتبہ چھن گیا ہو۔"

"اچھا!!"

"اور نہ ہی تم واحد شخص ہو، جس کا جنم ایک راز ہو۔" بوڑھا بولا، اور یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے اور وہ رونے لگا۔

"رو ؤ مت۔ یہ تو بتاؤ تمہارا مطلب کیا ہے؟" دوسرے شخص نے پوچھا۔

"بلج واٹر، تمہیں ایک بات بتاؤں۔ لیکن وعدہ کرو تم یہ راز کسی پر ظاہر نہیں کرو گے۔" بوڑھے نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

"مرتے دم تک نہیں۔" اس نے جواب دیا اور بوڑھے کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔ "آخر آپ کہئے تو، آپ کی زندگی کا راز کیا ہے؟"

"بلج واٹر سنو۔ میں فرانس کا مرحوم شہزادہ ہوں۔"

یقین مانو، یہ سن کر جم کی اور میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ڈیوک بولا:

"کیا کہا؟ تم کیا ہو؟"

"ہاں دوست! یہ حقیقت ہے۔ جو شخص اس وقت تمہارے سامنے بیٹھا ہے۔ وہ وہی لاپتہ ڈافن ہے۔ یعنی لوئی سترھواں ——— جو لوئی سولھواں اور میری اینٹونیٹ کا بیٹا ہے"۔

"تم! اس عمر میں!! نہیں۔ یہ بالکل ممکن نہیں۔ یعنی تم کہنا یہ چاہتے ہو کہ تم ہی مرحوم چارل مین ہو۔ اس حساب سے تو تمہاری عمر کم از کم چھ سات سو سال کی ہو گی"۔

"بریلج واٹر۔ یہ آفاتِ زمانہ کا نتیجہ ہے کہ میرے بال وقت سے پہلے پک گئے ہیں، اور جھڑنے شروع ہو گئے ہیں۔ ہاں تو جناب، یقین مانئے کہ وہ شخص جو اس وقت آپ کے پاس بیٹھا ہے یعنی یہ پھٹے حال، تیلی پر جس میں لیٹا ہے۔ آوارہ؟ جلاوطن، زمانے کا مارا شخص ——— یہی فرانس کے تخت کا اصل وارث ہے۔

اس کے بعد وہ زار زار رونے لگا۔ اور اتنا رویا اتنا رویا کہ جم کو اور مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں۔ ویسے ہمیں اس بات پر فخر تھا اور مسرت بھی کہ ایسا عالی نسب شخص ہمارا ہم سفر ہے۔ خیر، جیسے ہم نے ڈیوک کو ڈھارس دی تھی۔ ویسے ہی ہم نے اسے بھی ڈھارس دینے کی کوشش کی۔ لیکن وہ بولا: "اس سے کیا حاصل؟ اب تو صرف موت ہی مجھے ان غموں سے چھٹکارا دلا سکتی ہے۔ ہاں، البتہ جب کوئی شخص میرے منصب کو ملحوظ خاطر رکھتا ہے، اور مجھے وہ مرتبہ دیتا ہے جس کا میں مستحق ہوں، تو میرا جی بہل جاتا ہے۔ یعنی میرے ساتھ بات کرتے وقت ایک زانو پر جھک جائے؛ مجھے شہنشاہِ عالم کہہ کر مخاطب کرے؛ دستر خوان پر میری اردلی میں رہے؛ اور جب تک میں نہ کہوں، میری موجودگی میں بیٹھنے کی جرأت نہ کرے ——— اس کے بعد جم اور میں اسے شہنشاہ عالم کے لقب سے پکارنے لگے۔ ہم ہر وقت اس کی خدمت میں جٹے رہتے اور جب تک وہ ہمیں بیٹھنے کے لئے نہ کہتا، ہم ہاتھ باندھے کھڑے رہتے۔ اس سے بہت حد تک اس کا جی بہل گیا اور وہ خوش خوش رہنے لگا۔ لیکن ڈیوک رنجیدہ خاطر ہو گیا۔ حالات کی اس گردش سے وہ خاصا نالاں تھا۔ تاہم شہنشاہ ہمیشہ اس کے ساتھ دوستوں ایسا سلوک کرتا، اور اکثر

کہتا کہ اس کے باپ کے، ڈیوک کے پردادا اور اس کے خاندان کے دوسرے لوگوں کے ساتھ اچھے
مراسم تھے۔ اور ان لوگوں کو اجازت تھی کہ جب چاہیں محل میں تشریف لے آئیں ــــ اس کے
باوجود ڈیوک کچھ اکھڑا اکھڑا سا رہنے لگا۔ حتیٰ کہ ایک روز شہنشاہ بولا: "خدا جانتا ہے ہمیں اس
بیڑے پر اور کتنا عرصہ اکٹھے رہنا ہے۔ تو کبھی بلج واٹر، تم کب تک یوں روٹھے رہو گے؟ چھوڑو
ان باتوں کو، خواہ مخواہ دکھی ہونے سے فائدہ؟ ذرا سوچو تو، اگر میں ڈیوک کے گھر پیدا نہ ہوا
تو اس میں میرا کیا قصور؟ ــــ اور اگر تم شہنشاہ کے گھر پیدا نہ ہو سکے، تو تمہارا کیا قصور؟ ــــ
پھر مغموم رہنے سے فائدہ؟ اپنا تو اصول ہے کہ حالات
کیسے بھی ہوں، ان سے حتی الامکان سمجھوتہ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔
ہمارے یہاں پہنچ جانے میں بھی کوئی نہ کوئی بہتری ہو گی۔ دیکھو نا، کھانے پینے کی کوئی کمی نہیں۔
اور زندگی بہت مزے سے گزر رہی ہے۔ چلو چھوڑو، اب اٹھو۔ آؤ ہاتھ ملاؤ۔ آج سے ہم ایک
دوسرے کے دوست بن جائیں۔"

یوں ڈیوک اور شہنشاہ میں صلح ہو گئی۔ ان کی دوستی سے جم اور میں بہت خوش ہوئے
کشیدگی جاتی رہی اور دوستی کا دور [illegible] گیا۔ ایک ہی بیڑے پر سفر کرنے والوں میں اگر آپس میں
ذرا بھی کشیدگی ہو، تو فضا بہت ناخوشگوار رہتی ہے۔ بیڑے کی زندگی میں تو لطف ہی تب آتا ہے
جب ہر شخص مطمئن ہو، مسرور ہو اور دوسروں کے خلاف اسے کوئی شکایت نہ ہو۔

مجھے یہ جاننے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ یہ دونوں حضرات پرلے درجے کے جھوٹے ہیں۔
ان میں نہ تو کوئی ڈیوک تھا، نہ شہنشاہ، ــــ یہ دونوں نہایت کمینے تھے اور صرف کمینے ہی
نہیں دھوکے باز بھی۔ تاہم میں نے اس کا اظہار نہ کیا کہ میں ان کی اصلیت سے واقف
ہوں، اور اس سارے واقع کو پی گیا۔ بات یہ تھی کہ اگر میں اس کا اظہار کر بھی دیتا تو بیکار
جھگڑا کھڑا کرنے کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہوتا۔ اگر یہ لوگ خود کو بادشاہ اور ڈیوک کہلاتے
ہیں اور اس سے ہمارے اس چھوٹے سے کنبے میں صلح اور آشتی بنی رہتی ہے، تو مجھے کیا اعتراض

ہو سکتا تھا؟ ـــــ اور جہاں تک جم کا تعلق ہے، اس کے سامنے ان کا بھانڈا پھوڑنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ لہٰذا میں خاموش رہا۔ آپ اسے میں نے چاہے اور کچھ سیکھا ہو یا نہ ایک بات ضرور سیکھ لی تھی۔ اور وہ یہ کہ ایسے لوگوں کے ساتھ نباہ کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے یعنی انہیں ان کی من مرضی کرنے دی جائے۔

۲۰۔ہک کا بیان۔ مہم کی تیاری۔ جلسہ گاہ میں اداکاری۔ سمندری ڈاکو اور جلسہ۔ ڈیوک کا چھاپہ خانہ

ان لوگوں نے ہم سے بہت سے سوالات پوچھے۔ مثلاً یہ کہ ہم بیڑے کو چھپا کر کیوں رکھتے ہیں؟ ہم دن کو آرام کیوں کرتے ہیں، اور سفر کیوں نہیں کرتے؟ کیا جم بھگوڑا ہے؟

میں نے جواب دیا: "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ بھگوڑا غلام بھلا جنوب کا رُخ کرے گا؟" بات معقول ہی تھی۔ بھاگا ہوا غلام کبھی جنوب کا رخ نہیں کر سکتا۔ خیر، مجھے کوئی نہ کوئی قصہ تو گھڑنا ہی تھا۔ لہٰذا میں نے انہیں بتایا کہ میرا خاندان مسوری کے پوٹنگ علاقے میں بسا ہوا تھا۔ میرا جنم بھی وہیں ہوا۔ بدقسمتی سے گھر کے سب افراد ایک ایک کر کے موت کے پنجے میں چلے گئے۔ صرف ابا، میں، اور میرا بھائی آئیک زندہ بچے۔ ابا تو گھر بار چھوڑ کر چچا بین کے پاس چلے گئے جو اورلینز سے تقریباً چالیس میل دور جنوب میں کہیں رہتے ہیں۔ وہاں ان کا ایک چھوٹا سا فارم ہے جو دریا کے کنارے واقع ہے ـــ ابا کی حالت کافی خستہ تھی اور اسے کئی لوگوں کا قرض بھی دینا تھا۔ بالآخر جب تمام قرض چکا دیا گیا تو اس کے پاس صرف سولہ

ڈالر بچے یا پھر یہ غلام جم۔ لیکن اتنے سے اثاثے سے ہم چودہ سو میل کا سفر تو طے نہیں کر سکتے تھے یہ رقم جہاز کے تھرڈ کلاس کرائے یا کسی اور ذریعہ آمد و رفت کے اخراجات کے لئے ناکافی تھی۔ خیر، ایک روز جب باڑھ آئی تو ابا کی قسمت نے یاوری کی ' اسے یہ بیڑا ہاتھ لگ گیا۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ بیڑا ہمیں نیو اورلینز تک تو پہنچا ہی دے گا۔ مگر ابا کی قسمت کا ستارہ جلد ہی ڈوب گیا۔ ایک رات ایک سٹیم بوٹ ہمارے بیڑے کے اگلے حصے سے ٹکرا گئی اور ہم سب دریا میں گر پڑے ہم نے فوراً غوطہ لگایا تاکہ کہیں سٹیم بوٹ کے پہیئے تلے نہ کچلے جائیں۔ جم اور میں تو صحیح سلامت سطح پر واپس آ گئے، لیکن ابا نشے میں تھا۔ آئک تو خیر تھا ہی چار برس کا بچہ۔ ان دونوں کو پانی نے دبوچ لیا۔ اس کے بعد کے دو ایک دن ہم نے نہایت پریشانی میں بسر کئے۔ لوگ کشتیاں لئے ہمارے پیچھے پیچھے آتے تاکہ جم کو مجھ سے چھین کرلے جائیں۔ ان کا خیال تھا کہ جم بھگوڑا ہے۔ اس دن کے بعد ہم نے دن کا سفر بند کر دیا اور راتوں کو سفر کرنے لگے۔ اب رات کو کوئی تنگ نہیں کرتا۔

یہ سن کر ڈیوک بولا:

"فکر مت کرو۔ مجھے ذرا مہلت دو، میں کوئی نہ کوئی ایسی ترکیب ڈھونڈ ہی نکالوں گا جس سے ہم پھر جب چاہیں دن میں سفر کر لیں۔ میں اس مسئلہ پر اچھی طرح غور کروں گا' اور کوئی نہ کوئی تدبیر نکال ہی لونگا۔ آج کا دن تو خیر یونہی چلنے دو۔ کیونکہ وہ سامنے جو قصبہ ہے' دن میں وہاں جانا شاید خطرے سے خالی نہ ہو۔"

جوں جوں رات بھیگتی گئی، مطلع تاریک ہوتا گیا۔ یوں لگتا تھا کہ بارش ہو گی۔ آسمان پر چاروں طرف بجلیاں کوند رہی تھیں۔ بادل کافی نیچے تھے اور اب تو پتے بھی کانپنے لگے تھے ظاہر تھا کہ یہ موسم ہمارے لئے باعثِ تشویش رہے گا۔ ڈیوک اور بادشاہ دونوں، بیڑے پر بنی جھونپڑی کے اندر جا کر سامان کو الٹ پلٹ کرنے لگے۔ انہیں اس بات کی فکر تھی کہ دیکھیں ہمارے بستر کس قسم کے ہیں۔ میرا گدا تو بھوسے سے بھرا ہوا تھا۔ اور جم کا تنکوں سے۔ ظاہر ہے میرا بستر جم کے بستر سے بہتر تھا۔ کیونکہ تنکوں میں ایک آدھی کھچی ضرور رہ جاتی ہے سوتے وقت سوئی

کی طرح بدن میں گھس جاتی ہے اور تنگ کرتی ہے۔ اس کے علاوہ کروٹ لیتے وقت یہ تنکے یوں چرمرانے لگتے ہیں جیسے آپ سوکھے پتوں کے ڈھیر پر لیٹے ہوں۔ ایسی سرسراہٹ سے نیند اچاٹ ہو جانا لازمی ہے۔ خیر، ڈبوک نے میرا بستر لپیٹ کیا مگر بادشاہ نے اسے ٹوک دیا اور بولا "میرا خیال تھا کہ ہمارے مراتب میں جو فاصلہ ہے، اسے دھیان میں رکھتے ہوئے آپ کو یہ علم ہو گا کہ تنکوں کا بستر میرے شایانِ شان نہیں۔ یہ بستر آپ لیجئے۔"

ایک منٹ کے لئے جم اور میں بھونچکے رہ گئے۔ ہمیں خدشہ تھا کہ وہ پھر نہ جھگڑ پڑیں لیکن ڈیوک کا جواب سُن کر ہماری جان میں جان آئی۔ وہ بولا "جب تقدیر نے میرا سر پر غرور نیچا کر دیا ہے، تو بھلا اب میرے لئے اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ میں آپ کے سامنے بھی سر تسلیم خم کر دوں۔ میری تو تقدیر ہی ایسی ہے۔ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں، جتنا جی چاہے، ستا لو۔ میں سب سہہ لونگا۔"

جب رات کی تاریکی گہری ہو گئی، تو ہمارا بیڑا پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ بادشاہ کی ہدایت تھی کہ ہم دریا کے ٹھیک وسط میں رہیں۔ اور جب تک قصبے سے کافی آگے نہ نکل جائیں، روشنی نہ کریں۔ تھوڑی دیر بہتے رہنے کے بعد ہمیں روشنیوں کا ایک چھوٹا سا جھنڈ دکھائی دیا جو آہستہ آہستہ پھسلتا ہوا نظروں سے غائب ہو گیا۔ یہ قصبہ تقریباً آدھ میل میں پھیلا ہوا تھا۔ جب یہ قصبہ تین چوتھائی میل پیچھے رہ گیا، تو ہم نے لالٹین جلا کر لٹکا دی۔ دس بجے کے قریب بارش اور طوفان نے ہمیں آ لیا۔ بجلی زور زور سے کڑک رہی تھی۔ جب بجلی چمکتی تو دور دور تک ہر شے منوّر ہو جاتی۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ میں اور جم تب تک بیڑے پر پہرہ دیتے رہیں جب تک موسم صاف نہیں ہو جاتا۔ پھر وہ اور ڈیوک دونوں جھونپڑی کے اندر جا کر سو گئے۔ میری ڈیوٹی بارہ بجے تک تھی۔ ویسے تو میرے پاس بستر اب رہا ہی نہیں تھا، لیکن اگر بستر ہوتا بھی تو بھی میں نہ سوتا۔ ایسے طوفان روز روز تو دیکھنے کو ملتے نہیں! ــــ اوہ خدا! کتنی بھیانک تھیں ہوا کی چیخیں! ہر دس سیکنڈ کے بعد جب بجلی چمک اٹھتی تو آدھ آدھ میل تک ہر طرف سفید سی ٹوپیاں اُفق پر لہرا جاتیں۔ اور پھر جب بارش آتی تو جزیرے مٹیالے مٹیالے سے نظر آنے

لگتے اور پھر دیوانہ وار سر پٹکتے دکھائی دیتے۔ اس کے بعد گڑ۔ گڑاڑ۔ گڑڑڑ۔۔۔ کا شور گونج اٹھتا۔ اور بجلی بڑبڑاتی گرجتی آتی، اور گرجتی بڑبڑاتی چلی جاتی۔ اس کے فوراً ہی بعد شوں، کی آواز آتی اور خیرہ کن روشنی کی ایک لکیر سی فضا میں لہرا جاتی۔ پھر ایک توپ سی گرج اٹھتی۔ لہریں اتنی تند تھیں کہ کبھی کبھی تو وہ مجھے بیڑے سے اٹھا کر دریا میں پھینک دیتیں۔ میں نے کپڑے تو پہنے ہوئے نہیں تھے لہٰذا ان ڈبکیوں کی مجھے کوئی پرواہ تھی۔ دریا کے اندر اُگے ہوئے درختوں سے بھی اب ہمیں کوئی خطرہ نہ رہا کیونکہ بجلی اب یوں متواتر چمک رہی تھی کہ یہ درخت ہمیں عین وقت پر نظر آ جاتے اور ہم بیڑے کا رُخ موڑ کر کنی کترا کر نکل جاتے۔

یہ تو آپ کو علم ہی ہے کہ درمیان میں ایک بار پھر میری ڈیوٹی آنی تھی۔ لیکن مجھے ابھی سے نیند آنے لگی تھی۔ لہٰذا جم نے پیش کش کی کہ آدھ پہر وہ اور میری جگہ ڈیوٹی دے دیگا۔ کتنا نیک تھا وہ! میں بھی جھونپڑی کے اندر سرک گیا، لیکن ڈیوک اور بادشاہ یوں پاؤں پھیلا کر سوئے ہوئے تھے کہ میرے لئے کوئی جگہ ہی نہیں تھی۔ میں باہر آ کر لیٹ گیا۔ بارش کی تو مجھے پرواہ تھی نہیں کیونکہ گرمیوں کا موسم تھا۔ اور اب لہروں میں بھی کوئی خاص تندی نہ تھی۔

دو بجے کے قریب جب لہریں پھر زور پکڑ گئیں تو جم کے جی میں آئی کہ مجھے جگا دے مگر پھر اس نے ارادہ بدل دیا کیونکہ اس کے خیال میں ابھی لہروں میں اتنی تندی نہیں آئی تھی کہ باعث تشویش بن سکیں۔ لیکن جم کا اندازہ غلط نکلا۔ تھوڑی ہی دیر میں پانی کا ایک ایسا زبردست ریلا آیا کہ اس نے مجھے بیڑے سے اچھال کر دریا میں گرا دیا۔ میری یہ حالت دیکھ کر جم ہنستے ہنستے دُھرا ہوا جا رہا تھا۔ جبشیوں میں شاید وہ واحد شخص تھا جسے بات بات پر ہنسی آ جاتی تھی۔

میں نے اپنی ڈیوٹی سنبھال لی اور جم سونے کی کوشش کرنے لگا۔ جلد ہی اس کے خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ طوفان بھی اب کچھ مدہم ہو گیا تھا۔ لہٰذا جونہی مجھے ساحل پر روشنی دکھائی دی، میں نے اسے جگا دیا۔ اس کے بعد ہم نے حسب معمول بیڑے کو دن بھر کے لئے چھپا دیا۔

ناشتے کے بعد بادشاہ کہیں سے تاش کی پرانی بوسیدہ سی گڈی نکال لایا اور وہ اور ڈیوک کچھ دیر اس سے شغل فرماتے رہے۔ داؤ پایہ سینٹ فی بازی کا تھا۔ جلد ہی وہ اس سے اکتا گئے۔ بقول ان کے کسی اگلی مہم کا پلان تیار کرنے لگے۔ ڈیوک نے اپنے جھولے میں ہاتھ ڈال کر کچھ چھپے ہوئے

اشتہار نکالے اور انہیں بآوازِ بلند پڑھنے لگا۔ ایک اشتہار کی عبارت تھی۔

"پیرس کے مشہور و معروف ڈاکٹر مونٹا لبان، کھوپڑی کی بناوٹ دیکھ کر مقدر بتانے کے علم پر لیکچر دیں گے۔ ٹکٹ دس سینٹ۔ اگر کوئی اپنی شخصیت کا باتفصیل نقشہ تیار کروانا چاہے، تو اس کی فیس پچیس سینٹ ہو گی۔"

ان اشتہاروں میں جگہ، تاریخ، اور وقت کے خانے خالی چھوڑ دیئے گئے تھے ـــــ ڈیوک نے ہمیں بتایا کہ ڈاکٹر مونٹا لبان وہ خود ہی ہیں ایک دوسرے اشتہار میں اس نے خود کو "دنیا کا مشہور و معروف المیہ اداکار گیرک دی ینگر جو ڈرری لین لنڈن میں نام کما چکا ہے" کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ باقی اشتہاروں میں بھی اس نے مختلف ناموں کے ساتھ مختلف کارہائے نمایاں منسوب کر رکھے تھے مثلاً جادو کی چھڑی سے یہ بتانا کہ "زمین میں پانی کس جگہ ہے، اور سونا کس جگہ" یا پھر "بھوت چڑیل بھگانا" وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کچھ ہمیں دکھانے کے بعد وہ بولا:

"خیر، کچھ بھی ہو، اداکاری سے مجھے خاص لگاؤ ہے۔ اور ہاں، بادشاہ سلامت، آپ نے کبھی اداکاری کی ہے؟"

"نہیں تو۔" بادشاہ نے جواب دیا۔

"تو جناب بدقسمت بادشاہ سلامت، سنیئے۔ تین دن کے اندر اندر آپ اداکار بن جائیں گے" ڈیوک بولا "جونہی ایک اچھا سا قصبہ آیا، سب سے پہلا کام یہ کیا جائے گا کہ ایک ہال کرائے پر لیکر ہم "رچرڈ سوم" میں سے تلوار کی لڑائی کا، اور "رومیو اور جولیٹ" میں سے بالکنی کا سین پیش کریں گے کیوں، کیا ارادہ ہے؟"

"ارادہ کیا ہوگا؟ میں تو ہر وہ کام کرنے کو تیار ہوں، جس میں رقم ملنے کی امید ہو۔ مگر بیج واٹر مجھے تو اداکاری کی الف، بے بھی نہیں آتی۔ نہ میں نے کبھی ڈرامے دیکھے ہیں۔ جب ابا مرحوم محل میں ڈرامے کروایا کرتے تھے۔ ان دنوں میں بہت چھوٹا سا تھا۔ خیر یہ تو بتاؤ کیا واقعی میں اسے سیکھ جاؤں گا؟"

"بالکل۔ یہ تو بہت آسان ہے"

"اس کے بعد ڈیوک نے اسے بتایا کہ رومیو کون تھا اور جولیٹ کون تھی؛ اور بولا رومیو کا پارٹ

تو میں کہتا ہی رہا ہوں، تم جولیٹ بن جاؤ۔

"لیکن ڈیوک، اگر جولیٹ واقعی اتنی جوان تھی، جتنی تم بیان کرتے ہو، تو شاید میرا یہ گنجا سر اور سفید داڑھی اس کے لیے موزوں نہ ہوں گے"

"ندامت کرو۔ ان گنوار لوگوں کی توجہ اس طرف جائے گی ہی نہیں۔ تم پوشاک پہنے ہو گے اور پوشاک پہن کر آدمی کچھ کا کچھ بن جاتا ہے۔ اچھا، اب ذرا غور کرو۔ رات کا وقت ہے، چاندنی چھٹکی ہوئی ہے، سونے سے پہلے جولیٹ بالکنی میں کھڑی چاندنی کا نظارہ کر رہی ہے۔ اس نے نائٹ گاؤن پہنا ہوا ہے اور اس کے سر کے بال نائٹ کیپ کے اندر ڈھکے ہوئے ہیں۔ اس کے لئے ہمیں اس قسم کی پوشاک چاہیئے"

اتنا کہہ کر اس نے اپنے تھیلے میں سے شوخ پردوں ایسے سوتی کپڑے کی بنی دو تین پوشاکیں نکالیں اور بولا: "یہ قرونِ وسطیٰ کا لباس رچرڈ سوم اور اس کے مخالف کے لئے ہے۔" اس کے بعد اس نے ایک لمبی سفید، سوتی نائٹ شرٹ، اور اسی کپڑے کی بنی ایک نائٹ کیپ نکالی۔ انہیں دیکھ کر بادشاہ کو اطمینان ہو گیا۔ تب ڈیوک نے ایک کتاب نکالی اور بڑی شان کے ساتھ اچھلتا، کودتا، اور اداکاری کرتا ہوا اس میں سے اپنا پارٹ ادا کرنے لگا، تاکہ بادشاہ اس فن سے متعارف ہو جائے پھر اس نے کتاب بادشاہ کو دے دی تاکہ وہ اپنا پارٹ زبانی یاد کر لے۔

موڑ سے تقریباً تین میل آگے جا کر ایک چھوٹا سا قصبہ آتا تھا۔ کھانے کے بعد ڈیوک بولا: "مجھے ایک تدبیر سوجھی ہے جس سے ہم دن کو بھی سفر کر سکیں گے اور یہ پلان ایسا ہے جس میں جم کے لئے بالکل کوئی خطرہ نہ ہو گا۔ بس اب میں قصبے میں جا کر اس کا بندوبست کرتا ہوں۔" بادشاہ بولا: "چلو، میں بھی چلتا ہوں، شاید قسمت یاوری کرے۔" اور چونکہ کافی ختم ہو چکی تھی، جم نے مجھ سے کہا کہ میں بھی ان کے ساتھ ناؤ میں چلا جاؤں، اور کافی خرید لاؤں۔

جب ہم قصبے میں پہنچے تو گلیاں یوں سونی اور اجاڑ تھیں، اور وہاں اس قدر سناٹا تھا جیسے اتوار کا دن ہو۔ کہیں کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف ایک بیمار حبشی ایک مکان کے پچھواڑے بیٹھا دھوپ کھا رہا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ چھوٹے بچوں، بوڑھوں اور بیماروں کو چھوڑ کر شہر کا ہر شخص دو میل دور جنگل میں وعظ سننے گیا ہوا ہے۔ بادشاہ نے اس حبشی سے اس جگہ کے بارے میں

مکمل تفصیلات حاصل کرلیں، اور مجھ سے بولا: "میں اس جلسے میں جاتا ہوں، شاید کچھ ہاتھ لگ جائے۔ چلو، تم بھی چلو۔"

ڈیوک دراصل کسی چھاپہ خانہ کی تلاش میں تھا۔ بالآخر ہمیں ایک چھاپہ خانہ مل ہی گیا۔ یہ چھوٹی سی دکان تھی اور بڑھئی کی دوکان کی بالائی منزل پر واقع تھی۔ بڑھئی بھی اور چھاپہ خانے کا مالک بھی وعظ سننے گئے ہوئے تھے۔ لیکن ان کی دکانوں کے دروازے کھلے تھے۔ یہ جگہ بہت گندی تھی۔ ہر طرف کوڑا کرکٹ بکھرا پڑا تھا۔ دیواریں سیاہی کے دھبوں یا گھوڑوں اور بھاگے ہوئے غلاموں کی تصویروں سے اٹی پڑی تھیں۔ ڈیوک نے اپنا کوٹ اتار لیا اور بولا: بس ٹھیک ہے، میرا کام تو ہو گیا ——— لہذا اسے وہیں چھوڑ کر میں اور بادشاہ جلسے کی طرف روانہ ہو گئے۔

تقریباً آدھ گھنٹے میں ہم وہاں پہنچ گئے۔ گرمی میں ہم پسینہ پسینہ ہو رہے تھے۔ جلسے میں کوئی بیس ہزار آدمی جمع تھے، یہ لوگ بیس بیس میل دور سے آئے تھے جنگل میں ہر طرف گاڑیاں اور بگھیاں نظر آ رہی تھیں اور ان میں جتے ہوئے گھوڑے گاڑیوں کے اندر بنی ہوئی چرنیوں میں سے دانہ کھا رہے تھے، اور پیر پٹک پٹک کر مکھیاں اڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک طرف بلیاں کھڑی کر کے ان کے اوپر ٹہنیاں ڈال کر چند شیڈ بنا لیے گئے تھے جن میں لیمن، روٹی، تربوزوں کے ڈھیر، سبز بھٹے اور اسی قسم کی دوسری چیزیں بک رہی تھیں۔

ایسے ہی چند چھپر اور بھی تھے جن کے نیچے وعظ ہو رہا تھا۔ یہ چھپر قدرے زیادہ کشادہ تھے تاکہ ان کے سائے میں زیادہ سے زیادہ لوگ بیٹھ سکیں۔ بنچوں کی جگہ شہتیریوں کے چرے ہوئے تختوں کو استعمال کیا گیا تھا۔ ان تختوں میں سوراخ کر کے ڈنڈے ٹھونک دیئے گئے تھے جو ان بنچوں کے پایوں کا کام دیتے تھے۔ یہ بنچ بغیر پشت کے تھے ان چھپروں کے بیچ ایک کونے میں اونچے اونچے سٹیج بنے تھے جن پر کھڑے ہو کر واعظ وعظ کرتے تھے۔ عورتوں نے دھوپ سے بچاؤ کے لیے ہیٹ پہن رکھے تھے، اکثر عورتوں کے فراک اس کپڑے کے بنے تھے جو سوت اور اونوں کو کات کر بنا گیا تھا؛ چند ایک نے دھاری دار کپڑے کا لباس پہن رکھا تھا۔ جوان لڑکیں نے پھولدار کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ نوجوانوں میں سے کچھ ننگے پاؤں تھے اور چند بچے ایسے بھی تھے،

جن کے تن پر ایک قمیص کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ کچھ بوڑھی عورتیں سلائیاں بن رہی تھیں۔ اور چند نوجوان جوڑے چوری چوری آنکھیں لڑا رہے تھے۔

اس چھپر میں جہاں ہم سب سے پہلے داخل ہوئے، ایک واعظ حمد گا رہا تھا۔ پہلے وہ خود دو مصرعے گاتا، پھر سب لوگ ان مصرعوں کو گا گا کر دہراتے۔ اتنے سارے لوگ یوں مسرور ہو کر گا رہے تھے کہ میرے دل میں بھی جوش امڈ آیا۔ واعظ نے دو سطریں اور گائیں اور ان لوگوں نے پھر انہیں گا کر دہرایا۔ اور یوں یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ہر بول کے ساتھ ان کا جوش بھی بڑھتا جا رہا تھا، اور ان کی آوازیں بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھیں، حتیٰ کہ گیت ختم ہوتے ہوتے یہ عالم ہو گیا تھا کہ کئی آدمی تو آہیں بھر رہے تھے، اور کئی زور زور سے شور مچا رہے تھے۔ اس کے بعد وعظ شروع ہوا، اور نہایت جوش و خروش سے شروع ہوا۔ واعظ کبھی تو سٹیج کے اُس کونے میں چلا جاتا، اور کبھی اس کونے میں کبھی سٹیج کے بالکل آگے آ کر تھوڑا سا جھک کر کھڑا ہو جاتا۔ وہ اپنے جسم کو اور بازوؤں کو ہلا ہلا کر پوری قوت سے چلاتا ہوا لیکچر دے رہا تھا۔ گاہے گاہے وہ انجیل کھول لیتا اور اسے ادھر اُدھر سامعین کو دکھاتا شور مچا مچا کر کہتا: "یہ بیابان والا تانبے کا سانپ ہے۔ اس کو دیکھو، تمہیں زندگی ملے گی۔" یہ سن کر سامعین پکارتے: "حمد ہو خدا کی۔ آمین۔" بس، وہ یونہی وعظ کرتا رہا اور لوگ روتے چلاتے آمین کہتے رہے۔

"آؤ، یہاں آؤ۔ آؤ ماتم کریں۔ وہ سب جو گناہوں سے لتھڑے ہوئے ہیں (آمین)، وہ جو مریض ہیں، وہ جو غمگین ہیں (آمین) جو اپاہج ہیں اور نابینا ہیں (آمین)، وہ جو غریب ہیں، محتاج ہیں، وہ جو بدکار ہیں، (آمین)، آؤ وہ سب جو بوڑھے ہیں، ناپاک ہیں، مصیبت زدہ ہیں۔ آؤ وہ جو اپنے گناہوں پر پشیمان ہیں۔ آؤ سب آؤ اپنے گناہوں اور دکھوں اور غلاظتوں سمیت آؤ۔ وہ پانی جو پاک صاف کرتا ہے، تم سب کے لئے موجود ہے۔ جنت کے دروازے کھلے ہیں۔ آؤ ان دروازوں کے اندر داخل ہو جاؤ۔ تمہیں سکون ملے گا" (آ۔ آمین۔ حمد ہو خدا کی)۔

نجانے یہ سلسلہ کب تک چلتا رہا۔ واعظ کے الفاظ لوگوں کے شور اور آہ و بکا میں

گم ہو کر رہ گئے۔ تب پنڈال کے ہر حصے سے اٹھ اٹھ کر لوگ ماتم کنندوں کے بینچوں کی طرف آنے شروع ہو گئے۔ بھیڑ بہت تھی اور ان بینچوں تک پہنچنے کے لئے انہیں کافی زور لگانا پڑ رہا تھا۔ ان کے چہرے آنسوؤں سے تر تھے۔ بینچوں کے قریب پہنچ کر (یہ بینچ سب سے اگلی قطار میں رکھے تھے) یہ ماتم کنندے زور زور سے گاتے اور شور مچانے لگے۔ وہ فرش پر بکھرے ہوئے بھوسے پر یوں لوٹ رہے تھے جیسے ان پر وحشت کا دورہ پڑ رہا ہو۔

دفعتاً مجھے بتائے بغیر بادشاہ بھی اس مجمع کی طرف روانہ ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد اس شور و غل میں اس کی آواز تمام سب آوازوں پر غالب آگئی۔ اگلے ہی لمحے بھیڑ کو چیرتا ہوا وہ اس سٹیج پر جا پہنچا جہاں واعظ کھڑا تھا اور اس سے درخواست کی کہ وہ لوگوں کو چپ کرائے۔ جب سب لوگ خاموش ہو گئے تو بادشاہ یوں گویا ہوا: "میں ایک سمندری ڈاکو ہوں۔ میں تیس برس سے بحیرِ ہند میں ڈاکے ڈال رہا ہوں۔ پچھلے موسم بہار میں ایک مٹھ بھیڑ میں میرے گروہ کے بہت سے آدمی کام آگئے تھے۔ میں دراصل یہاں اس ملک میں آیا ہی اس لئے تھا کہ مزید نفری بھرتی کر کے اپنے ساتھ لے جاؤں۔ لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ کسی نے میری جیب کاٹ لی اور سٹیم بوٹ والا مجھے یہاں اس قصبے کے ساحل پر اتار کر چلتا بنا۔ میری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ لیکن اب مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں کیونکہ یہ حادثہ میرے لئے باعثِ رحمت ثابت ہوا ہے۔ اس نے میری زندگی کا رخ ہی بدل دیا ہے۔ اور آج پہلی مرتبہ مجھے حقیقی مسرت کا احساس ہو رہا ہے۔ اب میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ کسی نہ کسی طرح اپنے ساتھیوں کے پاس واپس پہنچ جاؤں اور زندگی کا باقی حصہ انہیں راہِ راست پر لانے میں صرف کروں۔ یہ درست ہے کہ اس وقت میرے پاس سفر خرچ کے لئے ایک کوڑی بھی نہیں۔ لیکن اس سے کیا؟ مجھے یقین ہے کہ اس کارِ خیر میں مجھے دوسروں کی نسبت زیادہ کامیابی حاصل ہو گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود بھی تو میں ڈاکو رہ چکا ہوں اور بہت سے ڈاکوؤں کے ساتھ میرے ذاتی مراسم ہیں۔ یہ درست ہے کہ مجھے وہاں پہنچنے میں بہت عرصہ لگے گا کیونکہ میرے پاس سفر خرچ کے لئے ایک کوڑی بھی نہیں۔ لیکن کچھ بھی ہو میں کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچ ہی جاؤں گا۔ اور جب بھی میں کسی ڈاکو کو راہ راست پر لانے میں کامیاب ہوا کروں گا۔ تو سب سے

پہلے اس سے یہ کہوں گا: "نہیں میرے بھائی، میرا شکریہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس نیک کام کا سہرا میرے سر نہیں بلکہ پوک ریل کے جلسے میں حصہ لینے والوں کے سر ہے۔ ان لوگوں کے سر جو پیدا ہی بنی نوع انسان کی بھلائی کے لئے ہوئے ہیں اور ہر انسان کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں اس کا سہرا انہی لوگوں کے سر ہے اور اس واعظ کے سر جس سے بہتر دوست کسی ڈاکو کو شاید ہی نصیب ہو۔"

یہ کہہ کر بادشاہ زار زار رونے لگا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر حاضرین کی آنکھوں سے بھی بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ تب ایک آواز آئی: "اس کے لئے چندہ کرو۔ جلدی کرو۔ چندہ اکٹھا کرو۔" اور اس کے ساتھ ہی چھ سات آدمی چندہ اکٹھا کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ لیکن کسی نے کہا: "اسی سے کیوں نہیں کہتے کہ خود ہی جھولی پھیلا کر چندہ لے لے۔" واعظ سمیت ہر شخص نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔

بادشاہ نے جھولی پھیلائی اور بھیڑ کے اندر داخل ہو گیا۔ وہ آنکھیں پونچھتا جاتا اور لوگوں کو دعائیں دیتا جاتا اور ان کے گن گاتا کہ وہ کتنے اچھے لوگ ہیں جنہوں نے سمندر پار کے ڈاکوؤں کی زندگی سدھارنے میں اس کا ہاتھ بٹایا ہے۔ کبھی کبھی خوبصورت لڑکیاں جن کے گالوں پر آنسو بہہ رہے ہوتے، اس سے التجا کرتیں کہ وہ انہیں اپنا بوسہ لینے کی اجازت دے تاکہ یہ بوسہ اس کی یاد کو ہمیشہ ان کے ذہن میں تازہ رکھے۔ اس نے انہیں بالکل مایوس نہیں کیا۔ کئی لڑکیوں کو تو وہ پانچ پانچ چھ چھ بار سینے سے لگاتا اور ان کے بوسے لیتا۔ کئی لوگوں نے اس سے یہ درخواست بھی کی کہ وہ وہیں ان کے پاس کم از کم ایک ہفتہ ضرور ٹھہرے۔ اور ہر شخص کی خواہش یہ تھی کہ وہ اسی کے غریب خانہ کو اپنے قیام کا شرف بخشے۔ لیکن اس نے کسی کی درخواست قبول نہ کی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ جلسے کا آخری دن تھا، اور مزید قیام سے کسی کو کوئی خاص فائدہ نہ پہنچ سکتا تھا۔ دوسری یہ کہ اسے جلد از جلد بحر ہند پہنچنا تھا تاکہ دوسرے ڈاکوؤں کو راہ راست پر لانے کے کام میں تاخیر نہ ہو۔

واپس بیڑے پر پہنچ کر جب ہم نے وہ سب سکے گنے، تو کل رقم ستاسی ڈالر اور چھتر سینٹ

نکلی۔ اس کے علاوہ بادشاہ تین گیلن شراب کا جگ بھی اٹھا لایا تھا، جو ہمیں راستے میں ایک گاڑی کے نیچے پڑا ملا تھا۔ بادشاہ کا دعویٰ تھا کہ اس نے اپنی زندگی میں کئی بار واعظ کا پیشہ اختیار کیا ہے، لیکن آج جتنا مال متاع اسے کبھی بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وعظ کر کر کے گلا تھکانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ایسے جلسوں کو متاثر کرنے کے لیے جو کام ڈاکوؤں کے ذکر سے لیا جا سکتا ہے۔ وہ کافروں کے ذکر سے ہرگز نہیں لیا جا سکتا۔

بادشاہ کی غیر حاضری میں ڈیوک مارے فخر کے پھولا نہ سما رہا تھا۔ بزعم خود جو مورچہ اس نے مارا تھا، اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ مگر بادشاہ کی کارگزاری دیکھنے کے بعد اس کا سر نیچا ہو گیا۔ چھاپے خانے میں اس نے دو کسانوں کے اشتہار چھاپے تھے جن کے اس نے چار ڈالر وصول کر لئے تھے۔ یہ اشتہار گھوڑوں سے متعلق تھے۔ اس کے علاوہ اس نے اخبار کے لئے دو اشتہار بھی قبول کئے تھے۔ ان اشتہاروں کی اُجرت ویسے تو دس ڈالر تھی لیکن اس نے یہ کہہ کر اگر پیشگی مل جائے تو وہ رعایت کر دے گا، ان سے مزید چار ڈالر اینٹھ لیئے تھے۔ ان کے علاوہ اسے اخبار کے تین چندے بھی وصول ہوئے تھے۔ چندہ یوں تو دو ڈالر تھا، لیکن یہ کہہ کر پیشگی ملنے کی صورت میں رعایت ہو سکتی ہے۔ اس نے آدھ آدھ ڈالر ہی منظور کر لیا تھا۔ ارادہ تو ان کسانوں کا یہ تھا کہ حسب دستور رقم کی ادائیگی جنس میں کریں یعنی وہ اس رقم کے بدلے میں ان سے پیاز یا لکڑیاں لے لے۔ لیکن ڈیوک نے جواب دیا کہ یہ کاروبار اس نے نیا نیا خریدا ہے اور اتنی کم اُجرت وہ لے ہی اس لئے رہا ہے کہ نقد رقم مل جائے۔ اس کے بعد اس نے ایک نظم کا فرما بنایا اور اسے اخبار میں چھپنے کے لئے وہیں رکھ آیا ہاں۔ البتہ یہ فرما تیار کرنے کی اس نے کوئی اجرت نہ لی کیونکہ یہ نظم اس کی اپنی ہی تخلیق تھی۔ اس نظم کے تین شعر تھے۔ ان شعروں میں سوز بھی تھا اور جذبہ بھی۔ نظم کا عنوان تھا: "توڑ دیا، دل توڑ دیا، اور بے درد زمانے"۔ ادھر سے فارغ ہو کر اس نے وہ ساڑھے نو ڈالر جیب میں ڈالے اور چلا آیا۔ وہ اپنی اس کارگزاری سے خاصا مطمئن تھا۔

اس کے بعد اس نے ہمیں ایک اور اشتہار دکھایا جو اس نے خود ہی چھاپا تھا اور جس کی اس نے کوئی اجرت نہیں لی تھی۔ یہ اشتہار ہماری خاطر چھاپا گیا تھا۔ اس میں ایک بھگوڑے

غلام کی تصویر بنی تھی۔ غلام کے کندھے پر ایک لاٹھی رکھی تھی، اور لاٹھی کے ایک گٹھری بندھی تھی۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا: "دو سو ڈالر نقد انعام"۔۔۔۔ تصویر کی ہر ایک چیز، سر کے بالوں سے لیکر پاؤں کے ناخنوں تک، ہو بہو جم سے ملتی تھی۔ اشتہار میں کہا گیا تھا کہ "یہ غلام موسم سرما میں سینٹ جیکس کے ایک فارم سے (جو نیو اورلینز سے چالیس میل جنوب میں واقع ہے) بھاگ نکلا تھا۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ غلام شمال کی طرف چلا گیا ہے۔ جو کوئی اسے پکڑ کر اس کے مالک کو لوٹا دے گا۔ اسے یہ انعام مع اس کے اخراجات کے دیا جائے گا۔"

اشتہار دکھا کر ڈیوک بولا: "بس آج رات کے بعد ہم جب چاہیں دن میں سفر کر سکتے ہیں۔ جب کبھی کوئی شخص آتا دکھائی دے گا، تو ہم رسی سے جم کے ہاتھ پیر باندھ کر اسے کوٹھڑی میں پھینک دیا کریں گے۔ اور یوں ظاہر کریں گے جیسے یہ اشتہار والا بھگوڑا غلام ہو جسے ہم نے شمال میں پکڑا ہے۔ اور چونکہ ہمارے پاس سٹیم بوٹ کا کرایہ نہیں تھا اس لئے ہم اپنے دوستوں سے بیڑا مانگ کر اسے اس کے مالک کے پاس لئے جا رہے ہیں تاکہ انعام وصول کر سکیں۔ ویسے اگر ہم جم کو بیڑیاں اور ہتھکڑیاں پہنا دیں تو یہ قصہ بالکل سچ لگنے لگے گا لیکن اس سے ہماری ناداری کی کہانی قدرے بعید از حقیقت دکھائی دینے لگے گی۔ بات یہ ہے کہ ہتھکڑیوں اور بیڑیوں وغیرہ کی نوعیت تو زیور کی سی ہے۔ لہٰذا ہم جم کو رسی سے ہی باندھا کریں گے۔ بس یوں سمجھو کہ تھیٹر کی اصطلاح میں ہمیں "اکائیوں کے اصول" پر کاربند رہنا چاہیئے۔"

یہ پلان سن کر ہم سب نے ڈیوک کی ذہانت کی داد دی۔ ہمیں یقین تھا کہ اب ہم دن میں بھی بے کھٹکے سفر کر سکتے ہیں۔ ہم صرف یہ چاہتے تھے کہ اس رات ہم اتنا فاصلہ ضرور طے کر لیں۔ جس سے کہ ہم اس قصبے کے لوگوں کی زد سے باہر پہنچ جائیں۔ تاکہ اگر ڈیوک کی کارستانیوں کا پول کھل جانے سے کوئی گڑبڑ ہو بھی، تو ہم پر آنچ نہ آئے۔ بس ایک دفعہ ہم اس خطرے سے نکل جائیں پھر ہم جس طرح چاہیں گے، سفر کیا کریں گے۔

سارا دن ہم دبکے بیٹھے رہے اور جب تک رات کے دس نہ بج گئے، ہمیں وہاں سے روانہ ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔ دس بجے کے قریب ہم چوری چوری نکل پڑے ہماری کوشش

یہی تھی کہ بڑا شہر سے دور دریا کے دوسرے کنارے کی طرف ہی رہے۔ اور جب ہم کافی دور نکل گئے تب کہیں جا کر لالٹین جلائی گئی۔

صبح چار بجے جم نے مجھے جگایا۔ اب پہرا دینے کی باری میری تھی۔ جم بولا: "ہک! اس سفر میں اور بھی بادشاہوں سے ملاقات ہوگی کیا؟"

"نہیں تو" میں نے جواب دیا۔

"پھر تو ٹھیک ہے۔" وہ بولا "ایک یا دو بادشاہ تو خیر ٹھیک ہیں، لیکن ان سے زیادہ کو برداشت کرنے کی ہمت مجھ میں نہیں۔ بادشاہ صاحب تو اس وقت نشے میں مدہوش ہیں، اور ڈیوک کی حالت بھی کچھ ایسی ویسی ہی ہے۔"

مجھے بعد میں پتہ چلا کہ جم بچارا بہت دیر تک یہ کوشش کرتا رہا کہ بادشاہ صاحب کسی طرح فرانسیسی میں گفتگو کریں، تاکہ وہ اس زبان سے لطف اندوز ہو سکے۔ لیکن بادشاہ یہی کہہ کر ٹالتا رہا کہ اسے اپنے ملک سے نکلے اتنا عرصہ ہو چکا ہے، اور اس دوران میں اُسے اتنی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے کہ اب تو اسے اپنی زبان یاد ہی نہیں رہی۔

۲۱۔ مشقِ شمشیر زنی۔ ہیملٹ کی خود کلامی۔ قصبے کی سیر، شہر کا ہلان۔ باگز۔ موت۔

سورج نکل آیا تھا، لیکن ہم نے سفر جاری رکھا۔ اس روز ہم نے بیڑے کو چھپانے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی۔ تھوڑی دیر بعد بادشاہ اور ڈیوک بھی جھونپڑی سے باہر آ گئے۔ ان کی حالت ناگفتہ بہ تھی، لیکن ایک دو بار دریا میں ڈبکیاں لگانے کے بعد ان کی طبیعت بہت حد تک سنبھل گئی۔ ناشتے کے بعد بادشاہ بیڑے پر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اس نے بوٹ اتار دیئے اور برجس کے پائنچے اوپر لپیٹ کر ٹانگیں پانی میں لٹکا دیں اور مزے سے پائپ سلگا کر "رومیو اور جولیٹ" میں سے اپنا پارٹ یاد کرنے لگا۔ جب یہ پارٹ اسے زبانی یاد ہو گیا تو وہ اور ڈیوک مل کر ریہرسل کرنے لگے۔ ڈیوک کو بار بار اسے یہ سمجھانا پڑ رہا تھا کہ کس ڈائلاگ کو کیسے ادا کیا جاتا ہے، آہ کیسے بھری جاتی ہے، دل پر کس طرح ہاتھ رکھا جاتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ چند بار کی پریکٹس کے بعد ڈیوک

مطمئن ہو گیا اور بولا: "اب ٹھیک ہے، لیکن 'روڈیو' کا لفظ ادا کرتے وقت تم سانڈ کی طرح ڈکارا نہ کرو،
بلکہ اس لفظ کو بڑے پیار سے رُک رُک کر درد بھرے انداز میں کہا کرو، یُوں۔ ر۔ د۔ م۔ یو۔ ہاں،
بالکل اس طرح۔ دیکھو نا، جولیٹ بہت پیاری لڑکی ہے۔ اسے گدھے کی طرح ہنہنانا نہیں چاہیئے۔"

اگلے روز ڈیوک نے بڑی ٹہنیوں کو چھیل کر دو تلواریں بنائیں اور پھر وہ اور بادشاہ شمشیر
زنی کی مشق کرنے لگے ڈیوک اپنے آپ کو رچرڈ سوم کہتا تھا۔ کس شان سے وہ بیڑے پر ادھر ادھر وار
کرتے وار بچاتے پھر رہے تھے! وہ منظر واقعی نہایت شاندار تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں بادشاہ کا پاؤں
الجھ گیا اور وہ دریا میں گر پڑا۔ اس کے بعد وہ بیٹھ کر آرام کرنے لگے۔ اور ایک دوسرے کو اپنے وہ کارنامے
سنانے لگے جو پرانے وقتوں میں انہوں نے اسی دریا کے کنارے سرانجام دیئے تھے۔

کھانے سے فارغ ہو کر ڈیوک بولا: "کیپٹ صاحب! یہ شو فرسٹ کلاس ہونا چاہیئے
میرا ارادہ ہے کہ اس میں کچھ اضافہ کر دیا جائے۔ اور پھر پبلک کے اصرار پر بھی تو ہمیں کچھ نہ کچھ پیش کرنا ہی
پڑے گا۔ اس کا انتظام بھی ہونا چاہیئے۔"

"ویل واٹ! لیکن یہ اصرار کیا ہوتے ہیں؟" بادشاہ نے پوچھا۔

ڈیوک نے اسے اصرار کا مطلب سمجھایا اور بولا: "جب وہ میرے لئے اصرار کریں گے، تو میں
ہائی لینڈر کا، یا ملاحوں کا ناچ دکھاؤں گا۔ لیکن تم ــــ تم کیا دکھاؤ گے؟ ہاں، تم وہ ہملٹ کی
خود کلامی کا سین دکھا دینا۔"

"ہملٹ کی کیا دکھاؤں؟"

"ہملٹ کی خود کلامی۔ تمام شیکسپیئر میں یہی تو سب سے مشہور و معروف حصہ ہے۔ یہ تو واقعی
لاجواب ہے۔ کیا بات ہے اس کی۔ ایک بار اس کا نام لے دو۔ بس تماشائی امڈے چلے آتے ہیں۔
بدقسمتی سے میرے پاس اس کتاب کا صرف پہلا حصہ ہی ہے۔ لیکن ذرا صبر کرو، میں حافظے پر زور دیتا ہوں،
شاید یاد آ جائے۔ مجھے ذرا ایک منٹ ٹہلنے دو، شاید ذہن کے دریچے کھل جائیں۔"

وہ بیڑے پر ٹہلنے لگا۔ کھویا کھویا، کسی گہری سوچ میں غرق کبھی اس کی پیشانی پر بڑی بڑی تیوریاں پڑ جاتیں، کبھی ابرو تن جاتے
کبھی ہاتھ سے پیشانی کو پونچھتا ہوا ادھر ادھر لڑکھڑانے لگتا اور آہیں بھرتا اور روتے ہوئے سسکیاں بھر کر ایک دو آنسو

گرا دیا۔ یہ نظارہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھا اور بولا! "ہاں، تو سنو" اس کے ساتھ ہی وہ نہایت شاندار پوز بنا کر کھڑا ہو گیا۔ ایک ٹانگ آگے کو نکلی ہوئی، بازو اوپر کو اُٹھے ہوئے، سر پیچھے کو ڈھلکا ہوا نظریں آکاش پر گڑی ہوئیں۔ اس کے بعد وہ دانت پیستا ہوا غصے میں کچھ بولنے لگا۔ یہ تقریر خاصی بلند آواز میں کی گئی اور تقریر کے دوران میں وہ چھاتی پھیلائے دیوانہ وار ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر دوڑتا رہا۔ کیا شاندار اداکاری تھی ایسی اداکاری میں نے زندگی بھر کبھی نہیں دیکھی۔ اس نے سب کو مات کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کی تقریر یوں تھی (جب یہ تقریر وہ بادشاہ کو سنا رہا تھا، تو میں نے اسے حفظ کر لیا تھا)

"زندہ رہوں۔ یا نہ رہوں؟
یہی تو مسئلہ ہے جس نے
زندگی کر دی ہے میری تیرہ و تار۔
کون اٹھائے اب یہ بوجھ؟ کب تلک؟
اور وہ بیرنم کے جنگل
جن کی ڈلسی نین میں آمد کے ساتھ
کٹ ہی جاتا یہ عذاب
کب آئیں گے؟
موت کے ب۔ ع۔ د......!!؟
بس اسی ایک خوف سے
لرزہ براندام ہے معصوم نیند
نیند جو فطرت کا ہے جزوِ اہم۔
اور تب ہم انساں
ہائے کے ہاتھوں میں مقدر کی کمان
تیر برساتے ہیں ہم چاروں طرف

تاکہ وہ ان جانی منزل، تاکہ وہ ان جانے تیر۔
دور رہیں اور آنہ پائیں ہم تلک۔
ذرا ٹھہرو!
تقاضائے عز و جاہ سنو۔!
کھٹ کھٹاؤ گے کواڑ ڈنکن کے تم ؟!
اور اس کی نیند میں ہو گے مخل ! ؟
کاش، تم یہ کر سکو !
کون ہے جو سہ سکے دشنامِ دور ؟
کون ہے جو کھا سکے چابک کی چوٹ ؟
کون ہے جو چپ رہے سہ کر ستم ؟
مغرور کے پاؤں کی ٹھوکر، کون کھا کر چپ رہے گا ؟
سست رو انصاف کی چیونٹی کی چال، سہ سکو گے ؟
اس کے نالے، اس کے نوحے، اور فغاں
سن سکو گے ؟

نصف شب، سناٹا؛
موت کی سی خاموشی۔
کھل گئے تاریک قبروں کے دہن۔
کیا کہا ؟ ملکِ عدم ؟
وہ دیس۔
جس میں جو بھی پہنچا، لوٹ کر آیا نہیں۔
اور جب منحوس سایہ
پُر فشاں ہوتا ہے انساں کی طرف

سلب ہو جاتی ہیں اس کی قوتیں۔
ہر طرف اشکوں کا نم
ہر طرف آہ و فغاں۔
آہ وزاری اور دھواں
جھومتا آتا تھا اک ابرِ سفید
اور اس ایوانِ غم کا اک لمس۔
بن گیا ابرِ سفید ابرِ سیاہ۔
بس یہی معراج انساں کی بنی۔
مگر تم۔
اوفیلیا!!
کھول نہ اپنا دہن۔
مرمریں عارض تیرے
سویار ہنے دیں انہیں۔
جاؤ اور کسی آشرم میں دفع ہو جاؤ"

یہ تقریر بڈھے کو بہت پسند آئی اور جلد ہی اس نے اسے یوں ازبر کر لیا کہ اب وہ نہایت آسانی سے دھرا سکتا تھا۔ جب وہ یہ تقریر ادا کرتا۔ تو یوں لگتا گویا وہ پیدا ہی اسی کردار کیلئے ہوا تھا۔ وہ نظارہ تو خصوصاً قابلِ دید تھا جب جذبے کی شدت میں اس نے اپنے ہاتھ جس کی جیبوں میں ڈال لئے تھے اور انہیں نکالتے وقت وہ دہرا ہو کر کبھی آگے اور کبھی پیچھے زور لگا رہا تھا۔
جونہی اگلا قصبہ آیا، ڈیوک جا کر کچھ اشتہار چھپوا لایا۔ اس کے بعد دو تین دن تو ہمارا بیڑا چلتا پھرتا تھیٹر بنا رہا۔ سارا سارا دن یا تو شمشیر زنی کی مشق ہوتی رہتی۔ یا پھر ریہرسل (یہ لفظ ڈیوک ہی نے استعمال کیا تھا)، ایک صبح جب ہم ارکان ساکے علاقے میں پہنچے تو موڑ سے ذرا پرے ہمیں ایک چھوٹا سا قصبہ دکھائی دیا۔ اس قصبے سے تین چوتھائی میل ادھر ایک نالہ تھا جس کے دہانے

پر صنوبر کے درخت کی ایک محراب سی یوں بنی ہوئی تھی کہ اس نالے میں داخل ہوتے وقت یہ احساس ہوتا تھا جیسے کسی سرنگ میں گھس رہے ہوں۔ بیڑے کو اس نالے میں چھپا کر اور جم کر وہیں چھوڑ کر ہم تینوں ناؤ لے کر شہر کی طرف چل دیئے تاکہ اس قصبے میں اپنے کھیل کے امکانات کا جائزہ لے سکیں۔

آثار بہت امید افزا تھے۔ اس سہ پہر وہاں سرکس کا شو ہونے والا تھا اور دیہاتی لوگ ابھی سے گھوڑوں پر، یا چھتی ہوئی پرانی گھوڑا گاڑیوں میں سوار ہو کر وہاں آنے شروع ہو گئے تھے۔ سرکس نے تو رات ہونے سے پہلے ہی چلے جانا تھا لہذا ہمارے شو کے لئے حالات بے حد سازگار تھے۔ ڈیوک نے کچہری کی عمارت کرائے پر لے لی۔ اس کے بعد ہم نے شہر کی دیواروں پر اشتہار چسپاں کرنے شروع کر دیئے۔ ان اشتہاروں کا مضمون کچھ اس قسم کا تھا۔

"شیکسپیر کی یاد تازہ ہو گئی!!!

آئیے اور دیکھیے!

صرف ایک رات کے لئے!

دنیا کے مشہور و معروف المیہ اداکار

ڈیوڈ گیرک دی ینگر، ڈریوری تھیٹر لندن کا شہرت یافتہ اداکار

اور

ایڈمنڈ کین دی ایلڈر جو رائل ہے مارکیٹ تھیٹر وائٹ چیپل۔ پڈنگ لین، پکاڈلی لندن میں اور رائل کانٹی نینٹل تھیٹر لندن میں نام کما چکا ہے۔

ان دونوں اداکاروں کو شیکسپیر کے مشہور و معروف ڈرامے

"رومیو اور جولیٹ کے بالکنی سین" میں دیکھیے۔

رومیو ـــــ مسٹر گیرک

جولیٹ ـــــ مسٹر کین۔

ان کے علاوہ کمپنی کے دیگر اداکاروں کو بھی دیکھیے۔

نئی پوشاکیں، نئے منظر، نئی اداکاری۔

اس کے علاوہ

خون کو منجمد کردینے والا، فن کی معراج پر پہنچا ہوا، شمشیر زنی کا سنسنی خیز منظر دیکھئے۔

جسے "رچرڈ سوم" سے لیا گیا ہے۔

رچرڈ سوم ——— مسٹر گیرک۔

رچمنڈ ——— مسٹر کین۔

اور پبلک کے خاص اصرار پر دیکھئے۔

ہملٹ کی خود کلامی۔

اداکار ——— ماہر فن کین۔

جو اس منظر کو لگاتار تین سو راتوں تک پیرس میں کرتا رہا ہے۔

صرف ایک شب کے لئے۔

کیونکہ کمپنی کو جلد ہی یورپ میں اپنے پروگرام کے لئے روانہ ہونا ہے"۔ داخلہ فی کس پچیس سینٹ۔ بچوں اور غلاموں کے لئے دس سینٹ۔

اس کے بعد ہم شہر کی سیر کرتے رہے۔ تقریباً سب دکانوں اور مکانوں کی چھتیں کھپریل کی تھیں، اور دیواریں لکڑی کی۔ ان دیواروں پر شاید کبھی روغن نہیں ہوا تھا۔ یہ ڈھانچے لکڑی کے پایوں پر کھڑے تھے اور زمین سے کوئی تین چار فٹ اونچے تھے۔ تاکہ اگر کبھی دریا کا پانی چڑھ آئے، تو انہیں نقصان نہ پہنچے۔ مکانوں کے اردگرد چھوٹے چھوٹے باغیچے تھے۔ لیکن ان باغیچوں میں امر کنڈوں، سورج مکھی کے پودوں، راکھ کے انباروں، پرانے گلے سڑے بوٹوں، ٹوٹی بوتلوں، اور پھٹے پرانے کپڑوں اور ٹوٹے برتنوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ تمام جنگلے لکڑی کے تختوں کے تھے اور چونکہ ہر تختہ دوسرے سے مختلف تھا لہٰذا صاف ظاہر تھا کہ یہ تختے ایک ساتھ نہیں، بلکہ مختلف موقعوں پر جڑے گئے تھے۔ ان جنگلوں کے مختلف حصے مختلف سمتوں میں

جھکے ہوئے تھے۔ ان کے دروازوں کا عموماً ایک ہی قبضہ تھا اور وہ بھی چمڑے کا چپتا۔ ایک جنگلوں پر بلاشبہ ایک آدھ بار سفیدی ہوئی ہو گی۔ لیکن ڈیوک کا اندازہ تھا کہ یہ عمل کہیں کولمبس کے زمانے میں ہوا ہو گا۔ باغ میں عام طور پر سوٗروں کا بسیرا تھا جنہیں گاہے گاہے لوگ باہر ہانکتے رہتے تھے۔

سب دکانیں ایک ہی گلی میں واقع تھیں۔ ان کے سامنے سفید گھر ملو قسم کا ایک چھپّر تھا جس کے شہتیر کے ساتھ دیہاتی لوگ گھوڑے باندھا کرتے تھے۔ ان چھپروں کے نیچے خالی بکس دھرے تھے جن میں کبھی سامان آیا ہو گا۔ اب تو ان بکسوں پر بیکار آوارہ لوگ بیٹھے رہتے تھے اور سارا سارا دن چاقوؤں سے ان کے کنارے چھیلا کرتے تھے، یا تمبا کو چباتے رہتے، یا منہ کھول کر جمائیاں اور انگڑائیاں لیتے رہتے۔ یہ بہت گھٹیا قسم کے لوگ تھے۔ عموماً وہ پیلے رنگ کے بڑے بڑے ہیٹ جو چھتری کی طرح چوڑے تھے، پہنے ہوتے۔ ان کے بدن پر نہ تو کوٹ ہوتا، نہ واسکٹ۔ وہ ایک دوسرے کو نہایت بے تکلفی سے بل یا بک یا ہینک، باجو، یا اینڈی وغیرہ کہہ کر بلاتے۔ ان کی گفتگو نہایت سست رو ہوتی، اور لفظوں کو کھینچ کھینچ کر بولتے اور ہر بات میں گالی کا استعمال کرتے۔ ہر ستون کے ساتھ کوئی نہ کوئی بے کار آوارہ ٹیک لگائے کھڑا ہوتا جس کے ہاتھ عموماً اس کی برجس کی جیب میں ہوتے۔ وہ جیب میں سے ہاتھ صرف اس وقت نکالتا، جب اس سے کوئی تمبا کو کا ٹکڑا مانگ لیتا، یا جب اسے کھجلانے کی حاجت محسوس ہوتی۔ ان کی گفتگو ہمیشہ یہ ہوتی!

"ہینک، ذرا تمبا کو کا ایک لچھا تو دینا۔"

"اوں ہوں ہہ ـــــ میرے پاس صرف ایک ہی رہ گیا ہے۔ بل سے مانگو؟"

اب بل کی باری آتی۔ وہ یا تو ٹرخا دیتا یا جھوٹ بول دیتا کہ اس کے پاس ختم ہو گیا ہے۔ اس قسم کے آوارہ لوگوں کے پاس عام طور پر کھوٹی کوڑی بھی نہیں ہوتی، تمبا کو کا ٹکڑا کہاں سے آتا۔ یہ لوگ ایک دوسرے سے تمبا کو مانگ کر ہی اپنا گزارہ چلاتے ہیں۔ مثلاً وہ جیک سے کہیں گے: "جیک، تمبا کو کا ٹکڑا دو گے؟ ابھی ابھی بین تھامپس مجھ سے ٹکڑا مانگ کر لے گیا ہے۔ اور

میرے پاس صرف وہی ایک ٹکڑا رہ گیا تھا"۔ ظاہر ہے کہ یہ صریحاً جھوٹ ہے۔ اور ایسی گفتگو ہمیشہ جھوٹ ہی ہوتی ہے۔ اجنبیوں کے سوا باقی سب لوگ اس کی نوعیت سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ لہٰذا جیک جو اجنبی نہیں جواب دیتا ہے۔

"اچھا؟ ــ تو تم نے اسے تمباکو دیا تھا! خوب، یعنی تم نے! تمہیں غلطی لگی ہوگی۔ یہ تمباکو تمہاری بہن للی کے دادا نے دیا ہوگا۔ لیف بکنر! سیدھی طرح میرے وہ ٹکڑے واپس کر دو، جو تم نے ادھار لئے تھے اس کے بعد چاہے تم ایک درجن تمباکو ادھار مانگ لو، میں دیدونگا۔ اور ہاں، میں تم سے سود وغیرہ بھی نہیں لوں گا۔"

"اور وہ ٹکڑے جو میں نے واپس کر دیئے تھے۔ ان کا کیا ہوا؟" ہاں ہاں کئے تھے کوئی چھ سات ٹکڑے واپس کئے تھے۔ یہ بھی اچھی رہی۔ ادھار تو لو بڑھیا تمباکو، اور واپس کرو گھٹیا والا"ــ

بڑھیا تمباکو جو دکان پر بکتا ہے، وہ لمبا اور چوڑا ہوتا ہے۔ لیکن جو تمباکو یہ لوگ چبانے تھے وہ عام طور پر بل دیا ہوا قدرتی پتہ ہی ہوتا تھا۔ جب کوئی شخص تمباکو مانگتا تو وہ اسے چاقو سے کاٹنے کی بجائے، ویسے کا ویسا ہی دانتوں کے درمیان رکھ لیتا۔ اور اسے دانتوں سے کاٹتا رہتا۔ اور بالآخر ہاتھوں سے توڑ کر اس کے دو ٹکڑے کر دیتا اور ایک ٹکڑا خود رکھ کے دوسرا ٹکڑا اس شخص کو لوٹا دیتا۔ تب وہ شخص جو تمباکو دیتا اترے ہوئے چہرے سے اس ٹکڑے کو تکتا رہتا اور کہتا۔ "لو، یہ ڈنٹھل تم لے لو، اور تمباکو والا ٹکڑا مجھے دے دو"۔

قصبے کی تمام گلیاں اور بازار کیچڑ سے بھرے پڑے تھے۔ کیچڑ کے سوا وہاں اور کچھ نہ تھا۔ اور یہ کیچڑ جو تارکول کی طرح سیاہ تھا۔ بعض جگہ تو ایک ایک فٹ گہرا تھا۔ کیچڑ کی دو تین انچ گہری تہہ تو سارے قصبہ پر ہی چڑھی ہوئی تھی۔ ہر طرف سؤر ہی سؤر لوٹ رہے تھے۔ ابھی ابھی ایک سؤرنی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آئے گی۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کے بچوں کا غول ہوگا۔ اور پھر دفعتاً یہ سؤرنی گلی کے بیچوں بیچ پھسکڑا مار کر بیٹھ جائے گی اور رہگیروں کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہیگا

کہ وہ ادھر ادھر سے بچتے ہوئے نکلنے کی کوشش کریں۔ پھر وہ وہیں لیٹ جائے گی اور آنکھیں بند کرے گی اور بچوں کو دودھ پلاتی رہے گی اور ساتھ ہی ساتھ کانوں کو جھلاتی رہے گی۔ یعنی وہ یوں مزے سے لیٹی ہو گی جیسے یہ اسی کی جاگیر ہو۔ اس کے فوراً بعد ایک غنڈے کی آواز آئے گی: "ہے بیٹے، شاباش، پکڑو اسے، شاباش ٹانگ"۔ اس کے ساتھ ہی وہ سورنی اٹھ کر چیختی چلّاتی وہاں سے بھاگ کھڑی ہو گی۔ اس کے دونوں کانوں کے ساتھ ایک ایک کتا چپکا ہوا ہو گا اور وہ بھی بھونکتا ہوا اس کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا ہو گا۔ پھر ان کے پیچھے پیچھے تین چار درجن کتوں کا ایک اور جلوس بھونکتا چلا جائے گا۔ وہ سب غنڈے اٹھ کر تماشہ دیکھنے لگیں گے اور اس شور و غل سے بہت محظوظ ہوں گے۔ جب تک یہ جلوس نظروں سے غائب نہیں ہو جاتا، وہ اس نظارے کو تکتے ہی رہیں گے اس کے بعد وہ پھر اپنی اپنی جگہ بیٹھ کر کتوں کی لڑائی کا انتظار کرنے لگیں گے۔ اس چیخ پکار کے بعد صرف کتوں کی لڑائی ہی ان کی توجہ کا مرکز بن سکتی تھی، یہ انہیں محظوظ کر سکتی تھی۔ البتہ اگر کسی آوارہ کتے پر تارپین ڈال کر اسے آگ لگا دی جاتی۔ یا اس کی دم کے ساتھ ٹین باندھ کر اسے دوڑا دیا جاتا اور اسے تب تک پتھر مارے جاتے جب تک کہ وہ مر نہ جائے، تو یہ نظارہ ان کی توجہ اپنی طرف کھینچنے میں زیادہ کامیاب رہتا۔

دریا کے گھاٹ پر کچھ مکان کنارے پر آگے کی طرف جھکے ہوئے تھے۔ وہ یوں ٹیڑھے میڑھے ہو چکے تھے کہ ایسا لگتا تھا کہ بس اب گرے کہ گرے۔ ان مکانوں میں اب کوئی نہیں رہتا تھا۔ بعض مکانوں کے نیچے سے کہیں کہیں زمین اندر کو دھنس گئی تھی۔ اور اس طرف کا حصہ نیچے جھک گیا تھا۔ لوگ ابھی ان میں رہ تو رہے تھے، لیکن ان میں رہائش خطرے سے خالی نہیں تھی۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ زمیں کے چوڑے چوڑے ٹکڑے دفعتاً نیچے دھنس جاتے تھے۔ کئی بار تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ زمین کا تقریباً چوتھائی میل ٹکرا بیٹھتا چلا جاتا ہے، بیٹھتا چلا جاتا ہے، حتےٰ کہ گرمیوں کے موسم میں یہ سارے کا سارا ٹکڑا دریا میں گر جاتا ہے۔ اس قسم کے قصبے میں مکانوں کو ہمیشہ پیچھے پیچھے لے جانا پڑتا ہے کیونکہ ہر سال دریا آگے ہی آگے بڑھتا چلا آتا ہے۔

اس روز جوں جوں دوپہر نزدیک آتی گئی، جگہوں میں نہ صرف گاڑیوں اور گھوڑوں کی بھیڑ

بڑھتی گئی، بلکہ اور گاڑیاں اور گھوڑے بھی منوا اترآتے رہے۔ دیہات سے آنے والے خاندان کھانا ساتھ لیتے آئے تھے۔ اور گاڑیوں میں بیٹھے کھا رہے تھے۔ اس روز شراب کی بھی کافی کھپت ہوئی۔ تین لڑائیاں تو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔

تھوڑی دیر بعد ایک آواز آئی:

"آگیا، آگیا، باگز آگیا۔ وہ حسب دستور شراب پینے کا ماہواری معمول پورا کرنے گاؤں سے آیا ہے۔ وہ دیکھو، وہ رہا۔"

اس خبر سے سب غنڈوں کے دل میں مسرّت کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے سمجھ لیا کہ وہ لوگ باگز کو بدھو بنا کر تماشہ دیکھا کرتے تھے۔ ایک بولا:

"نہ جانے، اب کی بار وہ کس کا قیمہ بنانے کے ارادے سے آیا ہے۔ اگر واقعی وہ ان سب لوگوں کا قیمہ بنا ڈالنے کی توفیق رکھتا ہو، جن کو چبا ڈالنے کی وہ پچھلے بیس برسوں سے قسم کھا رہا ہے تو اب تک وہ یقیناً ایک عجوبہ بن گیا ہوتا۔"

دوسرا بولا: "کاش باگز مجھے بھی ایسی ہی دھمکی دے۔ اس سے کم از کم مجھے یہ یقین تو ہو جائے گا کہ میں ایک ہزار سال تک نہیں مروں گا۔"

اس اثنا میں باگز گھوڑا دوڑاتا ہوا ادھر آنکلا۔ وہ قبائلیوں کی طرح شور مچاتا، سیٹیاں بجاتا چلا آرہا تھا۔ "ہٹو راستے سے" وہ چلا رہا تھا۔ "آج میں مرنے مارنے کی نیت سے آیا ہوں۔ آج خریدنے پر بھی کسی کو کفن نہیں ملے گا۔"

وہ نشے میں دُھت تھا۔ اور زین پر ادھر ادھر جھوم رہا تھا اس کی عمر پچاس برس سے کچھ اوپر ہی ہوگی۔ اس کے چہرے کا رنگ سرخ تھا۔ ہر شخص اس پر زور زور سے آوازے کس رہا تھا۔ اور ہنس رہا تھا۔ وہ اسے پیار سے گالیاں دے رہے تھے اور جواب میں وہ انہیں گالیاں دے رہا تھا "ٹھہرو بچّو! ابھی تمہاری بھی خبر لیتا ہوں"۔ وہ کہتا "لیکن باری باری۔ فی الحال تو میں شہر آیا ہی اس نیت سے ہوں کہ کرنل شربرن کی بوٹی بوٹی کر دوں۔ میرا تو اصول ہی یہی ہے" پہلے گوشت؛ باقی لوازمات بعد میں۔"

مجھے دیکھ کر وہ گھوڑے کو میرے قریب لے آیا، اور بولا: "لڑکے تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ مرنا چاہتے ہو کیا؟" اور یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

میری تو جان ہی نکل گئی، لیکن ایک آدمی، بولا: "گھبراؤ نہیں۔ وہ تو مذاق کر رہا تھا۔ جب وہ نشے میں ہوتا ہے، تو یہی کچھ کیا کرتا ہے۔ ارکان سارا ریاست میں اس سے بہتر مسخرہ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔ نشے میں ہو، یا ہوش میں، اس نے آج تک کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔"

باگز گھوڑے پر سوار، اس قصبے کی سب سے بڑی دکان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ پھر اس نے سر کو ذرا سا جھکا لیا تھا کہ چھپر کے نیچے سے دکان کے اندر تک دیکھ سکے۔ اس کے بعد وہ چلایا: "او شربرن کے بچے۔ نکل باہر آ، اور اپنے باپ سے مل جسے تو نے دھوکا دیا ہے۔ کتے میں آیا ہی تیری خاطر ہوں اور تمہیں سبق سکھا کر ہی لوٹوں گا۔"

اس کے بعد اس نے شربرن کو ہر قسم کی گالی، یعنی جو بھی گالی اس کی زبان پر آتی رہی دے ڈالی۔ گلی میں لوگوں کی بھیڑ اکٹھی ہو گئی تھی۔ وہ اس کی باتیں سنتے اور ہنس کر چل دیتے۔ تھوڑی دیر بعد ایک باوقار شخص جس کی عمر تقریباً پچپن برس کی ہو گی، اور جس کا لباس شاید اس قصبے میں سب سے اچھا تھا۔ دکان سے باہر نکلا۔ لوگوں نے اس کے لئے راستہ چھوڑ دیا اور ادھر ادھر ہو گئے۔ وہ باگز کے قریب آ کر نہایت سنجیدگی سے بولا: "دیکھو تم نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ خیر، ایک بجے تک تو میں اسے برداشت کرتا رہوں گا۔ لیکن یاد رکھو، ایک بجے کے بعد اگر تم نے ایک لفظ بھی میرے خلاف کہا تو تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ چاہے تمہیں ڈھونڈنے کے لئے مجھے ساری دنیا کی خاک ہی کیوں نہ چھاننی پڑے۔"

یہ کہہ کر وہ واپس دکان کے اندر چلا گیا۔ اب مجمع پر بھی سنجیدگی طاری تھی۔ کسی کو ہنسنے کی تو در کنار ہاتھ پیر تک ہلانے کی جرأت نہ ہوئی۔ باگز نے گھوڑا موڑ لیا اور شربرن کو گالیاں دیتا ہوا واپس چل لیا سارے بازار میں گالیاں بکتا رہا۔ اور پھر واپس اس دکان کے سامنے آ کھڑا ہوا اور گالیاں دینے لگا۔ چند لوگ جو اس کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے اسے خاموش کرانے کی کوشش کرنے لگے، لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ لوگوں نے اسے یہاں تک سمجھ لیا کہ ایک بجنے میں صرف پندرہ منٹ باقی ہیں، لہٰذا خیریت اسی میں ہے کہ وہ گھر لوٹ جائے۔ اور فوراً ہی یہاں سے چلا جائے۔ لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اور وہ پھر گالیاں بکنے لگا۔ اس نے ہیٹ سر سے

اتار کر نیچے کیچڑ میں پھینک دیا اور اس کے اوپر سے گھوڑا دوڑاتا ہوا بازار کے دوسرے سرے تک چلا گیا۔ اس کے سفید بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ ہر شخص نے حتی الامکان کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح اسے بہلا پھسلا کر گھوڑے پر سے اتار لیا جائے اور کسی کمرے میں اس وقت تک بند رکھا جائے، جب تک کہ اس کا نشہ نہ اتر جائے۔ لیکن سب بے سود۔ وہ پھر گھوڑا دوڑاتا ہوا واپس لوٹ آتا اور شربرن پر گالیوں کی بوچھار کرتا۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے کہا:

"کوئی جاکر اس کی بیٹی کو تو بلا لاؤ فوراً اس کی بیٹی کو لے آؤ۔ کبھی کبھی یہ اس کی بات مان لیتا ہے اور اس وقت اگر یہ کسی کی بات مانے گا تو صرف اپنی لڑکی کی۔"

فوراً ایک آدمی بھاگتا ہوا اس کی لڑکی کو بلانے چلا گیا۔ میں بھی وہاں سے چل پڑا، لیکن تھوڑی دور جاکر رک گیا پانچ دس منٹ بعد باگز واپس آیا۔ اب وہ گھوڑے پر سوار نہ تھا۔ وہ گلی پار کرکے لڑکھڑاتا ہوا میری طرف آرہا تھا۔ اس کا سر ننگا تھا۔ دو دوستوں نے اس کے دونوں بازو پکڑے ہوئے تھے اور اسے وہاں سے ہٹانے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اب وہ قدرے خاموش تو تھا لیکن پریشان نظر آرہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اب وہ مزید یہاں نہیں ٹھہرنا چاہتا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ ایک آواز آئی: "باگز!"۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ یہ وہی کرنل شربرن تھا وہ بازار میں کھڑا تھا۔ بالکل ساکت، دایاں ہاتھ اوپر اٹھا ہوا اور اس میں پستول پکڑا ہوا۔ پستول کی نالی کا رخ اوپر آسمان کی طرف تھا۔ اسی لمحے میری نظر ایک نوجوان لڑکی پر پڑی جو دوڑتی ہوئی آرہی تھی۔ اس کے ہمراہ دو آدمی تھے۔ باگز اور اس کے دوست ایک سیکنڈ کے لئے ٹھٹک کر دیکھنے لگے کہ اسے کس نے پکارا ہے۔ جب ان کی نظر پستول پر پڑی تو وہ دونوں آدمی اچھل کر ایک طرف جا کھڑے ہوئے۔ پستول کی نالی آہستہ آہستہ سیدھی ہوئی اور پھر شست لی گئی۔ باگز نے ہاتھ اوپر اٹھا دیئے اور گڑگڑایا: "خدا کے لئے گولی مت چلاؤ۔" دھائیں۔ ایک گولی چلی اور وہ لڑکھڑا کر ہوا کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہوئے، پیچھے ہٹا ـــ دھائیں۔ ایک اور گولی چلی اور وہ بازو پھیلائے دھڑام سے پیٹھ کے بل گر پڑا۔ لڑکی نے چیخ ماری اور بولی: "مار دیا۔ مار دیا۔" مجمع نزدیک آگیا اور ان کے گرد ایک بھیڑ سی جمع ہو گئی۔ لوگ کندھے سے کندھا بھڑا کر اور گردنیں اونچی

کر کر کے دیکھنے لگے۔ لیکن وہ لوگ جو دائرے کے اندر تھے، انھیں دھکیل دھکیل کر پیچھے ہٹا دیتے اور چلا چلا کر کہتے: "پیچھے ہٹو، پیچھے ہٹو۔ ہوا آنے دو۔"

کرنل شریرن نے پستول زمین پر پھینک دی اور پیٹھ موڑ کر اندر چلا گیا۔

لوگ باگز کو اٹھا کر ڈاکٹر کی دوکان پر لے گئے۔ مجمع بھی ساتھ ہو لیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے سارے کا سارا قصبہ وہیں آ پہنچا ہو۔ میں بھاگ کر کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا تاکہ قریب سے اندر کا منظر دیکھ سکوں باگز کو فرش پر لٹا دیا گیا۔ ایک انجیل اس کے سر کے نیچے رکھ دی گئی اور دوسری کھول کر اس کی چھاتی پر۔ چھاتی پر انجیل رکھنے سے پہلے اس کی قمیض پھاڑ دی گئی۔ اب مجھے اس کا زخم صاف نظر آ رہا تھا۔ باگز نے دس بارہ لمبے لمبے سانس لئے۔ جب وہ سانس لیتا تو چھاتی پر رکھی ہوئی انجیل اوپر ابھر آتی، اور جب وہ سانس نکالتا، تو پھر نیچے چلی جاتی۔ تھوڑی دیر بعد وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔ وہ مر چکا تھا۔ اس کی لڑکی لاش سے لپٹ لپٹ کر رو رہی تھی۔ اس کی عمر تقریباً سولہ برس کی تھی۔ لوگوں نے اسے لاش سے علیحدہ کیا اور گھر لے گئے۔ وہ بہت پیاری لڑکی تھی۔ خوف کے مارے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں سارے کا سارا قصبہ وہیں امڈ آیا۔ وہ بھیڑ کو چیرتے، کندھے سے کندھا بھڑاتے اس کھڑکی تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن وہ لوگ جو پہلے ہی کھڑکی کے قریب کھڑے تھے، وہاں سے ہٹنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ نئے آنے والے لوگ شور مچا مچا کر کہتے "اب تم نے کافی تماشا دیکھ لیا ہے، اور کتنی دیر وہاں کھڑے رہو گے۔ اب دوسروں کو بھی دیکھنے کا موقع دو۔ ان کا بھی اتنا ہی حق ہے، جتنا تمہارا۔"

اب چونکہ تو تو میں میں ہونے لگی تھی اور بات بڑھ جانے کا خطرہ تھا، لہٰذا میں وہاں سے کھسک آیا گلیوں میں ہر طرف ہجوم ہی ہجوم تھے اور ان کے جذبات کافی مشتعل تھے۔ ہر وہ شخص جس نے گولی چلتی دیکھی تھی، دوسروں کو اس واقع کی تفصیلات سنا رہا تھا۔ ان کے گرد بھیڑ جمع تھی اور ہر شخص گردن لمبی کیے تفصیلات سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک پتلا دبلا دراز قد آدمی ایک جگہ کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہا تھا: "باگز یہاں کھڑا تھا۔" پھر وہ دوسری جگہ چلا گیا اور بولا: "شریرن یہاں تھا۔" اس شخص کے بال لمبے تھے۔

اور اس نے سفید فر کا ہیٹ پہنا ہوا تھا جو پیچھے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بید کی چھڑی تھی جس پر مٹھی لگی تھی۔ وہ جہاں جاتا لوگ اس کے پیچھے پیچھے ہو لیتے اور اس کی ہر حرکت کو بڑے غور سے دیکھتے اور یوں سر ہلاتے جیسے ساری بات ان کی سمجھ میں آ رہی ہو۔ پھر وہ جھک کر اور رانوں پر ہاتھ رکھ کر غور سے اس جگہ کو دیکھنے لگے جہاں اس نے چھڑی سے ایک نشان سا لگایا تھا۔ اس کے بعد اس شخص نے ہیٹ کو آگے سرکا لیا، جس سے اس کی آنکھیں اس ہیٹ کے نیچے چھپ گئیں، اور وہ تن کر سیدھا کھڑا ہو گیا اور زور سے چلایا: "باگز!" ——— پھر اس نے اپنی چھڑی سے آہستہ آہستہ شست لی اور بولا: "دھائیں!" اور اس کے ساتھ ہی لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا اور پھر بولا: "دھائیں" اور پیٹھ کے بل زمین پر گر پڑا۔ ان لوگوں کی جنہوں نے یہ سارا واقعہ دیکھا تھا، رائے تھی، کہ واقعی اس شخص نے اس تمام واقعہ کو نہایت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ اس سے خوش ہو کر ایک درجن آدمیوں نے اپنی اپنی بوتلیں نکالیں اور اسے شراب پیش کی۔

تھوڑی دیر بعد کوئی بولا: "شربرن کو سزا ملنی چاہیئے۔" بس پھر کیا تھا ہر شخص کی زبان سے یہی ایک بات نکلنے لگی۔ اور وہ ہجوم شور مچاتا روانہ ہو گیا۔ راستے میں کپڑے لٹکانے کی جو بھی رسی انہیں نظر آئی، انہوں نے اسے اتار لیا، تاکہ اس سے شربرن کو پھانسی دی جا سکے۔

۲۲۔ شربرن سرکس کا تماشہ۔ اکھاڑے میں مدہوش۔ رونگٹے کھڑے کر دینے والا المیہ

ہجوم سیدھا شربرن کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ فیا ملیوں کی طرح شور مچاتے، چیختے چلاتے چلے جا رہے تھے۔ جو چیز بھی راستے میں آئی، ہجوم نے اسے پیروں تلے کچل ڈالا۔ کیا ہولناک منظر تھا! آگے آگے بچے دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ تاکہ ہجوم کی زد سے باہر رہیں۔ مکانوں کی کھڑکیوں میں عورتوں کے سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ حبشی لڑکے درختوں پر چڑھ گئے تھے ہر جنگلے کے پیچھے مردوں اور عورتوں کی بھیڑ جمع تھی لیکن جونہی یہ ہجوم قریب آتا، وہ فوراً بھاگ کھڑے ہوتے اور راستے سے ہٹ جاتے۔ کئی عورتیں اور لڑکیاں تو مارے خوف کے رونے لگی تھیں۔

ہجوم شر برن کے مکان کے سامنے جا کر رک گیا۔ ہر طرف اس قدر شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ مکان کا صحن تقریباً بیس فٹ لمبا اور بیس فٹ چوڑا تھا۔ ایک آواز آئی:
"جنگلہ توڑ دو" بس پھر کیا تھا، فوراً تڑاخ تڑاخ کی آوازیں آنے لگیں اور پھر جنگلے کی ایک ایک لکڑی اکھاڑ دی گئی۔ ہجوم کا پہلا ریلا صحن میں داخل ہو گیا۔
جنگلے کے ٹوٹتے ہی شر برن اپنی چھت پر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں دو نالی بندوق تھی۔ وہ خاموش تھا اور اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ ہجوم یکلخت رک گیا اور وہ پہلا ریلا واپس مڑنے لگا۔

شر برن چھت پر کھڑا رہا —— خاموش؛ نیچے ہجوم کو ٹکٹکی لگا کر دیکھتا ہوا سناٹا اس قدر گہرا تھا کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں خوفزدہ ہو گیا۔ شر برن نے دھیرے دھیرے اس ہجوم پر نظر دوڑائی۔ جہاں جہاں اس کی نظر رکتی، لوگ ٹکٹکی لگا کر اسے دیکھنے کی کوشش کرتے لیکن اس کی نظر کی تاب نہ لا سکتے اور کھسیاتے ہو کر آنکھیں نیچی کر لیتے۔ تھوڑی دیر بعد شر برن ہنسنے لگا۔ یہ ہنسی خوشی کی ہنسی نہیں تھی بلکہ یہ تو ویسی ہنسی تھی جو آپ اس وقت ہنستے ہیں جب روٹی کھاتے کوئی کنکر آپ کے دانتوں میں آ جائے۔

اس کے بعد اس نے دھیرے دھیرے، لیکن حقارت سے کہنا شروع کیا: "تم لوگ سزا دو گے! کیا بات ہے! یعنی تم ایک مرد کو سزا دینے کی جرأت کرو گے!! اوہ! سمجھا، چونکہ تم لاچار، بے بس عورتوں کی بے عزتی کر لیتے ہو، تو اس سے تم نے یہ سمجھ لیا کہ تمہارے ہاتھ ایک مرد پر بھی اٹھ سکتے ہیں۔ ارے تم جیسے دس ہزار آدمی بھی ایک مرد کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے بشرطیکہ منہ بھر رات کے وقت نہ ہو۔ اور تم اسے پیچھے سے نہ جا لو۔

"میں تم سب سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میں تمہاری رگ رگ کو پہچانتا ہوں میں جنوب میں پیدا ہوا اور وہیں پلا بڑھا۔ پھر میں شمالی حصے میں چلا گیا۔ لہٰذا میں ہر علاقے کے آدمیوں کی خاصیت سے واقف ہوں۔ آدمی فطرتاً بزدل ہے۔ شمال میں ہر وہ شخص جو عوام کو کچلنا چاہے، بخوشی ایسا کر سکتا ہے۔ عوام اسے کچھ نہیں کہتے الٹا گھر جا کے دعا مانگتے ہیں کہ

خدا انہیں یہ ظلم برداشت کرنے کی سکت دے۔ جنوب میں اکیلے آدمی نے دن دہاڑے سواریوں سے بھری گاڑی روک کر اُسے لوٹ لیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ تمہارے اخبار آئے دن تمہیں "بہادر، بہادر" کہہ کر پکارتے رہتے ہیں۔ جس سے تمہیں یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ تم باقی لوگوں سے زیادہ بہادر ہو۔ لیکن اصلیت یہ ہے کہ تم بھی باقی لوگوں ہی کی طرح کے بہادر ہو۔ نہ کم نہ زیادہ۔ بھلا تمہارے ہاں جیوریاں قاتلوں کو پھانسی کی سزا کیوں نہیں دیتیں؟ اسی لئے ناں، کہ وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں ان کے دوست رات کے اندھیرے میں ان منصفوں کی پیٹھ میں ہی گولی نہ داغ دیں اور یہ بات کوئی ایسی بعید از قیاس بھی نہیں۔

"ہاں تو، یہی وجہ ہے کہ وہ جیوریاں ہمیشہ ملزموں کو بری کر دیتی ہیں۔ ایک مرد اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے وہ سو نقاب پوش بُزدلوں کو ساتھ لے کر جاتا ہے اور اس بدمعاش کو کیفر کردار کو پہنچا آتا ہے بس یہی ایک غلطی تم سے سرزد ہوئی ہے۔ یعنی تم خود تو چلے آئے، لیکن کسی مرد کو ساتھ نہیں لائے۔ دوسری غلطی جو تم نے کی، وہ یہ ہے کہ تم لوگ رات کے اندھیرے کی بجائے دن کے اجالے میں چلے آئے اور وہ بھی بغیر نقاب پہنے۔ ہاں البتہ تم ایک ایسے شخص کو ضرور ساتھ لیتے آئے ہو، جو کسی حد تک مرد کہلانے کے قابل ہے۔ میرا مطلب بک ہارکنیس سے ہے۔ وہ، جو یہاں کھڑا ہے۔ اگر وہ تمہیں ہانک کر نہ لاتا تو تم لوگ وہیں کھڑے شور مچاتے رہتے، اور یہاں تک آنے کی جرأت نہ کرتے۔

"ویسے شاید تم آتے بھی نہیں۔ عام آدمی جھگڑے وگڑے میں نہیں الجھنا چاہتا تم بھی جھگڑا اور خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھے۔ لیکن جب اس نیم مرد یعنی بک ہارکنیس نے نعرہ لگایا: "اسے کیفر کردار تک پہنچا دو۔ اسے سزا دو" تو تم میں اتنی جرأت بھی نہ ہوئی کہ انکار کر سکو۔ تم انکار کیسے کرتے؟ تم یہ بھی تو نہیں چاہتے تھے کہ تمہاری اصلیت ظاہر ہو جائے۔ یعنی تمہاری بزدلی کا بھانڈا پھوٹ جائے بس، تم شور مچاتے اس نیم مرد کے پیچھے پیچھے ہو لئے، اور قسمیں کھانے لگے کہ تم یہ کر دو گے اور وہ کر دو گے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر کوئی شے قابلِ رحم ہے تو وہ ہے وہ ہجوم جس میں ایک بھی مرد نہ ہو ویسے تو فوج بھی ایک ہجوم ہی ہے۔ اگر وہ شجاعت دکھاتے ہیں، تو یہ شجاعت ان کی اپنی نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ شجاعت تو وہ ایک دوسرے سے، یا اپنے افسروں سے مستعار لے لیتے ہیں۔ لیکن وہ

ہجوم جس میں ایک بھی مرد نہ ہو، رحم کے قابل بھی نہیں ہوتا ــــــ لہذا اب تمہارے لئے صرف ایک ہی راستہ ہے۔ دم دباؤ اور دفع ہو جاؤ اور جا کر اپنے اپنے بل میں گھس جاؤ۔ اگر تم میں سے کسی کے دل میں سزا دینے کا جذبہ عود کر آیا، تو وہ خود بخود رات کے وقت اپنے مشن پر نکل پڑے گا۔ یعنی جنوب کی روایت کے مطابق چہرے پر نقاب ڈال کر ایک مرد کی قیادت میں آئے گا ــــــ بس اب دفع ہو جاؤ۔ اور اپنے اس نیم مرد کو بھی ساتھ لیتے جاؤ" اور یہ کہتے وقت اس نے پستول کی نالی کو بائیں بازو پر رکھ کر شست باندھ لی۔

ہجوم بلکلخت پیچھے کی طرف پلٹا۔ اور پھر وہ بھگدڑ مچی کہ جدھر جس کے سینگ سمائے، وہ اسی طرف چل دیا۔ بک ہارنیس بھی ان کے پیچھے پیچھے بھاگ اٹھا۔ اس طرح بھاگتا ہوا وہ نہایت مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ صرف میں ہی ایسا تھا جو، اگر چاہتا، تو وہیں رکا رہتا۔ لیکن میری طبیعت وہاں رکنے کی نہیں تھی۔

وہاں سے میں نے سیدھا سرکس کا رُخ کیا اور اس کے پچھواڑے آوارہ گردی کرتا رہا۔ جب پہرے دار گزر گیا، تو میں چپکے سے خیمے کا کپڑا اٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔ یہ بات نہیں تھی کہ میرے پاس پیسے نہیں تھے۔ بیس ڈالر کا سونے کا سکہ اب بھی میری جیب میں تھا۔ تاہم میں نے سوچا کہ کیوں نہ اسے بچا کر رکھا جائے، گھر سے دور، اجنبیوں کے درمیان میں رہتے ہوئے، نہ جانے کب اس کی ضرورت پڑ جائے۔ لہذا احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ ہاں البتہ اگر کوئی اور صورت نہ ہوتی تو سرکس کی خاطر پیسہ خرچ کرنے میں مجھے کوئی اعتراض نہ تھا۔ لیکن فضول پیسہ ضائع کرنے سے فائدہ؟

سرکس واقعی بہت اچھا تھا خصوصاً وہ منظر تو بہت ہی اچھا تھا جب سب جوڑے یعنی ایک ایک مرد اور ایک ایک عورت گھوڑوں پر سوار اکھاڑے میں داخل ہوئے۔ مردوں نے زیر جامے پہن رکھے تھے۔ نہ ان کے پاؤں میں جوتی تھی، نہ رکاب۔ وہ رانوں پر ہاتھ رکھے بڑے مزے سے گھوڑوں کی سواری کر رہے تھے۔ ان کی تعداد بیس کے قریب ہو گی۔ اور عورتوں کے رنگ کا تو کہنا ہی کیا تھا۔ وہ تو مجسم حُسن تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے یہ سب کی سب رانیاں ہوں۔ ان کی پوشاکوں پر جو ہیرے

پڑے تھے، ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کے لباس کی قیمت لاکھوں ڈالر ہو گی۔ کیا خوبصورت منظر تھا! ایسا حسن میں نے زندگی بھر نہیں دیکھا۔ اور پھر ایک ایک کرکے وہ گھوڑوں کی پیٹھ پر کھڑے ہو گئے اور گھوڑے سرپٹ دوڑتے ہوئے اکھاڑے میں چکر کاٹنے لگے۔ کیا شاندار نظارہ تھا۔ دراز قد اور تنے ہوئے جسموں والے مرد جو دھندلے دھندلے سے نظر آ رہے تھے، اور جن کے سر اوپر خیمے کی چھت کے قریب تیر سے رہے تھے۔ عورتوں کے گلاب کی تیلیوں ایسے ریشمی کپڑے ان کی کمر کے گرد یوں پھڑپھڑا رہے تھے جیسے یہ کوئی بہت خوبصورت رنگین چھاتا ہو۔

گھوڑوں کی رفتار اور بھی تیز ہو گئی اور ان پر کھڑے ہوئے لوگ ناچنے لگے۔ یعنی پہلے وہ ایک پاؤں اٹھا کر خلا میں لہرا دیتے، پھر دوسرا، پھر پہلا اور پھر دوسرا — چکر کاٹتے ہوئے گھوڑے ایک طرف کو جھکے ہوئے تھے۔ اور جوں جوں ان کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ ان کا جھکاؤ بھی بڑھتا گیا۔ رنگ ماسٹر وسطی ستون کے گرد تیز تیز چکر کاٹ رہا تھا اور بار بار چابک سے پٹاخے چلاتا ہوا زور زور سے چلا رہا تھا! "ہائی — ہائی" — ادھر وہ مسخرا اس کے پیچھے پیچھے مذاق کی پھلجھڑیاں چھوڑتا چلا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ان سواروں نے لگامیں چھوڑ دیں، عورتوں نے اپنے ہاتھ کمر پر رکھ لئے، اور مردوں نے اپنے ہاتھ سینے پر باندھ لئے۔ پھر گھوڑوں نے اگلی ٹانگیں جھکا کر سب کو سلام کیا۔ اس کے بعد مرد اور عورتیں اچھل کر اکھاڑے کے اندر جا کھڑے ہوئے اور جھک کر سلام کرکے باہر دوڑ گئے۔ تماشائی خوشی سے تالیاں پیٹنے لگے۔

سرکس والوں نے واقعی بہت سے حیرت انگیز کرتب دکھائے۔ اور مسخرے نے وہ مذاق کئے کہ ہنس ہنس کر سب کی پسلیوں میں درد ہونے لگا۔ رنگ ماسٹر کے منہ سے لفظ نکلتے ہی یہ مسخرا پلٹ کر وہ جواب دیتا کہ لوگ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ جاتے ہیں تو حیران ہو رہا تھا کہ اس شخص کو چٹکی بجاتے ہی اتنے برمحل جواب کیسے سوجھ جاتے ہیں۔ میں تو سال بھر بھی لگا رہوں تو بھی ایسا جواب نہ دے سکوں۔ تھوڑی دیر بعد ایک آدمی جو شاید نشے میں تھا شور مچانے لگا کہ اسے بھی اکھاڑے کے اندر جانے کی اجازت دی جائے۔ وہ مصر تھا کہ وہ بھی اکھاڑے کے اندر گھوڑا دوڑائے گا۔ اس لئے یہ چیلنج بھی دیا کہ جس کا جی چاہے اس کے مقابلے میں گھڑ سواری کر لے۔ لوگوں نے اسے بہت سمجھایا۔ پر وہ تو کسی کی سنتا ہی نہیں تھا۔ تماشہ بند ہو گیا۔ اور لوگوں نے

اس پر آوازے کس نے شروع کر دیئے اس سے وہ اور بھی ضد کرنے لگا اور لگا گالیاں دینے۔ اب لوگوں کو بھی غصہ آ گیا اور وہ نشستیں چھوڑ کر اکھاڑے کی طرف لپکا۔ "مارو اسے" "باہر نکالو" کی آوازیں آنے لگیں۔ دو ایک عورتوں کی تو چیخیں بھی نکل گئیں۔ اس پر رنگ ماسٹر نے ایک مختصر سی تقریر کی اور لوگوں سے درخواست کی کہ گڑبڑ نہ کریں پھر اس نے اس شخص سے وعدہ کیا کہ اگر وہ خاموش ہو جائے تو اسے سواری کرنے کی اجازت دے دی جائے گی۔ لیکن یہ اجازت صرف اسی صورت میں دی جائے گی جب رنگ ماسٹر کو یہ یقین آ جائے کہ وہ گھوڑے سے گر نہیں پڑے گا۔ اس پر ایک قہقہہ لگا اور لوگوں نے باواز بلند اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔ وہ آدمی گھوڑے پر سوار ہو گیا لیکن اس کے سوار ہوتے ہی گھوڑے نے اچھلنا کودنا شروع کر دیا اور سرکس کے دو آدمی لگام پکڑ کر اسے قابو میں کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ شرابی ایال پکڑ کر گھوڑے کی گردن سے چپک گیا جب گھوڑا اچھلتا تو اس کی ایڑیاں ہوا میں لہرانے لگتیں۔ یہ تماشہ دیکھ کر سب لوگ یوں کھلکھلا کر ہنسنے اور شور مچانے لگے کہ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آخر ان سرکس والوں کی کوشش کے باوجود گھوڑا لگام چھڑا کر اکھاڑے میں سرپٹ دوڑتا ہوا چکر کاٹنے لگا۔ وہ شرابی اس کی گردن سے چپکا رہا۔ کبھی تو اس کی ٹانگ اس طرف زمین کو چھونے لگتی، کبھی اس طرف۔ ہنسی کے مارے لوگوں کا برا حال تھا۔ لیکن مجھے یہ تماشہ ذرا بھی نہ بھایا۔ ہر لمحہ مجھے اس کی جان کا خطرہ لگا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے لگام قابو میں کر لی اور اچک کر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ گیا، اور ادھر اُدھر جھولنے لگا۔ لیکن اگلے ہی لمحہ اس نے لگام چھوڑ دی اور اچھل کر گھوڑے کی پیٹھ پر کھڑا ہو گیا! گھوڑا یوں سرپٹ بھاگ رہا تھا جیسے کسی گھر میں آگ لگی ہوئی ہو۔ لیکن وہ شخص اب یوں مزے سے کھڑا تھا جیسے اسے کبھی نشہ ہوا ہی نہیں تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنے کپڑے اتار اتار کر پھینکنے شروع کر دیئے۔ اس نے اتنے لباس اتارے کہ ہر طرف کپڑے ہی کپڑے پھڑپھڑانے لگے۔ اس نے کل سترہ لباس اتارے ہوں گے۔ جب یہ لباس اتر گئے تو ہم نے دیکھا کہ اس کا توانا متناسب جسم ایک بہت ہی قیمتی لباس میں ملبوس ہے۔ اس نے گھوڑے کو چابک ماری اور گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ بالآخر وہ گھوڑے پر سے کود کر نیچے آ گیا اور سلام کر کے اندر ڈریسنگ روم میں چلا گیا سارے حیرت اور خوشی کے تماشائیوں کی صفوں میں وہ شور مچا کہ

کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

اب رنگ ماسٹر کو پتہ چلا کہ اسے بدھو بنایا گیا ہے۔ شروع شروع میں تو مجھے بھی یہی محسوس ہوا کہ اسے یوں اپنی کھلّی اُڑوانے پر خفت سی ہو رہی ہے۔ یہ تو اس کا اپنا ہی آدمی نکلا جس نے کسی کو بتائے بغیر یہ مذاق اختراع کیا تھا۔ اس طرح دھو کا کھا جانے پر خفت تو مجھے بھی ہوئی لیکن اس رنگ ماسٹر بچارے کے ساتھ تو واقعی بہت برا ہوا تھا ـــــ قصہ کوتاہ یہ سرکس واقعی بہت اچھا تھا۔ اس سے اچھے سرکس بھی دنیا میں موجود ہوں گے لیکن ایسا سرکس میں نے زندگی بھر نہیں دیکھا۔ مجھے تو یہ بیحد پسند آیا۔ جہاں کبھی یہ سرکس مجھے دوبارہ نظر آیا' میں ہر بار اس کا پہلا گاہک ہوا کروں گا۔

اس رات ہم نے بھی اپنا ڈرامہ کیا۔ لیکن تماشائیوں کی تعداد دس بارہ سے زیادہ نہ تھی۔ اس سے بمشکل خرچ پورا ہوا۔ وہ بات بات پر ہنس دیتے اور ان کے اس برتاؤ سے ڈیوک غصّے سے پاگل ہو گیا۔ وہ لوگ شو ختم ہونے سے پہلے ہی ہال میں سے چلے گئے۔ صرف ایک ہی لڑکا ہال میں رہ گیا اور وہ بھی اس لئے کہ وہ سو گیا تھا۔ ڈیوک بولا: ارکان سا کے یہ گنوار شیکسپیئر کو کیا خاک سمجھیں گے۔ انہیں تو صرف سستا قسم کا مزاحیہ ڈرامہ چاہیئے۔ اور شاید یہ بھی ان کے معیار سے اونچا ہو۔ انہیں تو صرف کوئی گھٹیا سا ناٹک ہی پسند آسکتا ہے۔" اس کے بعد وہ کہنے لگا۔" اب میں نے ان کا معیار سمجھ لیا ہے"، اگلی صبح وہ بازار سے پیکنگ پیپر کے چند بڑے بڑے تختے اور کچھ سیاہ روغن خرید لایا اور اشتہار لکھ کر سارے قصبہ میں لگا آیا۔ ان اشتہاروں کی عبارت یہ تھی:

کورٹ ہاؤس میں

صرف

تین راتوں کے لئے

دنیا کے مشہور المیہ اداکار۔ لندن اور کانٹی نینٹل تھیٹرز

کے شہرت یافتہ

ڈیوڈ گیرک دی ینگر

اور

ایڈمنڈ کین دی ایلڈر
کو دیکھیے
رونگٹے کھڑے کر دینے والی ٹریجڈی
"بادشاہ کا شتر گاؤ"

عرف

"شاہی عجوبہ"

ٹکٹ پچاس سینٹ۔

اشتہار کے نیچے موٹے موٹے لفظوں میں یہ عبارت لکھی تھی۔

"عورتوں اور بچوں کا داخلہ ممنوع"

"بالکل ٹھیک!" ڈیوک بولا۔ "اگر اس سطر کو پڑھ کر بھی وہ لوگ نہ آئیں تو میں یہ تسلیم کر لوں گا کہ میں ارکانساکے لوگوں سے واقف نہیں ہوں!"

۲۳۔ فروخت۔ شاہی موازنہ۔ جم کی اداسی ......

سارا دن ڈیوک اور بادشاہ جان توڑ محنت کرتے رہے۔ انہوں نے اسٹیج بنائی۔ پردہ لگایا؛ اور فٹ لائٹ کے لئے موم بتیاں جلا کر ان کی قطار بنا دی۔ اس رات لوگ یوں امڈ کر آئے کہ فوراً ہی ہال کھچا کھچ بھر گیا۔ جب ہال میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی، تو ڈیوک گیٹ سے ہٹ آیا اور پیچھے سے آ کر اسٹیج پر پردے کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے ایک مختصر سی تقریر کی جس میں اس المیہ ڈرامے کی تعریف کرتے ہوئے اس نے کہا کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا المیہ ڈرامہ ہے۔ اس کے بعد وہ دیر تک اس ڈرامے کی اور ایڈمنڈ کین دی ایلڈر کی تعریفوں کے پل باندھتا رہا جس نے ہیرو کا کردار ادا کرنا تھا۔ تماشائیوں کی توقعات کو یوں ہوا دے کر اس نے پردے کو لپیٹ کر اوپر اٹھایا۔ پردہ اٹھتے ہی بادشاہ ہاتھ پاؤں کے بل اچھلتا، کودتا ہوا اسٹیج پر وارد ہوا۔ وہ بالکل ننگا تھا۔ اس کے تمام جسم پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ ہر قسم کے رنگ میں یوں دائرے، دھاریاں اور لہریے بنائے گئے تھے

کہ ان پر قوسِ قزح کا گمان ہوتا تھا ــــ اور ــــ لیکن خیر، اس کے باقی کے لباس کے ذکر کو چھوڑیے قصہ کوتاہ وہ بالکل ایک وحشی، جنگلی آدمی دکھائی دے رہا تھا۔ ویسے ایک بات ہے یہ منظر تھا کافی مزاحیہ! لوگ ہنستے ہنستے دھرے ہو گئے۔ اور جب بادشاہ اس طرح کلانچیں بھرتا، دولتیاں مارتا سٹیج سے چلا گیا، تو لوگوں نے وہ شور مچایا، وہ تالیاں پیٹیں اور وہ ہاؤ ہو کی، کہ بادشاہ کو دوبارہ سٹیج پر آ کر یہی حرکتیں ایک مرتبہ پھر دھرانی پڑیں۔ اس کے بعد تیسری بار بھی یہی کچھ ہوا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسے اس طرح کلانچیں بھرتا دیکھ کر تو شاید گائے بھی اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکتی۔

اس کے بعد ڈیوک نے پردہ گرا دیا اور جھک کر حاضرین کو سلام کرتے ہوئے بولا: "یہ عظیم المیہ ڈرامہ صرف دو راتوں کو اور کھیلا جائے گا، کیونکہ کمپنی کو جلد از جلد لندن پہنچنا ہے۔ جہاں ڈرروری لین تھیٹر میں سب سیٹیں پہلے ہی سے بک ہو چکی ہیں۔" ــــ اس کے بعد اس نے ایک بار پھر جھک کر سلام کیا اور حاضرین سے درخواست کی کہ اگر ان معزز حضرات کو یہ کھیل پسند آیا ہو، تو ان کی نوازش ہو گی اگر وہ اپنے دوستوں سے بھی اس کی سفارش کریں، اور انھیں یہ کھیل دیکھنے کیلئے راغب کریں۔"

فوراً بیس آدمیوں کی آوازیں آئیں: "کیا کہا؟ کھیل ختم ہو گیا؟ ابھی سے؟"

ڈیوک بولا: "جی ہاں، ختم ہو گیا۔"

بس پھر کیا تھا، لوگ بپھر گئے، ہر طرف سے "دھوکہ" "دھوکہ" کی آوازیں آنے لگیں اور لوگ غصے میں دیوانے ہو کر سٹیج کی طرف لپکے تاکہ ان المیہ اداکاروں سے نبٹ لیں۔ لیکن ایک خوبرو سا شخص کود کر ایک بنچ پر چڑھ گیا اور انہیں مخاطب کر کے بلند آواز میں بولا: "حضرات ذرا رک کیے۔" لوگ رک گئے۔ پھر وہ بولا:

یہ درست ہے کہ ہمارے ساتھ دھوکہ ہوا ہے، سخت دھوکہ ہوا ہے۔ لیکن کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ کل سارا قصبہ ہماری کھلی اڑائے، یہ مذاق عمر بھر کے لئے ہمارے ساتھ چپک جائے۔ نہیں، یہ ہرگز نہیں ہو گا۔ لہذا ہمیں چاہیئے کہ نہایت خاموشی سے یہاں سے چلے جائیں اور اس کھیل کی خوب تعریف کریں تاکہ باقی کے لوگ جنہوں نے یہ کھیل نہیں دیکھا کل آ کر اسے دیکھ جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ پھر ہم سب ایک ہی کشتی میں سوار ہوں گے اور

کوئی کسی کا مذاق نہیں اڑا سکے گا۔ کیوں ؟ آئی بات سمجھ میں ؟"

ہر طرف سے جواب آیا "ٹھیک ہے، جج بالکل ٹھیک کہتا ہے"۔

"اچھا تو پھر چپکے سے چلے جاؤ۔ اس دھوکے کی بھنک بھی نکلنے نہ پائے۔ اب آپ لوگ گھر چلے جائیں۔ اور ہر شخص سے یہی کہیں کہ وہ بھی اس المیہ ناٹک کو دیکھ جائے"۔

اگلے روز تمام قصبے میں ہر طرف یہی چرچا تھا کہ یہ کھیل بہت شاندار ہے۔ اس رات بھی ہال کھچا کھچ بھر گیا۔ اس ہجوم کے ساتھ بھی ہم نے وہی سلوک کیا۔ اس رات شو کے بعد میں، اور بادشاہ، اور ڈیوک بیڑے پر واپس آگئے اور کھانا وہیں کھایا۔ اس کے بعد کوئی آدھی رات کے وقت جم کو اور مجھے حکم ملا کہ ہم بیڑے کو واپس دریا میں لے چلیں، راسے دریا کے وسط میں کھینتے ہوئے قصبہ سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر جا کر کہیں چھپا دیں۔

تیسری رات پھر ہال کھچا کھچ بھر گیا۔ لیکن اس رات تماشائی وہی پرانے ہی تھے یعنی وہی لوگ جو پچھلی دو راتوں میں اس کھیل کو دیکھ چکے تھے۔ میں ڈیوک کے ساتھ گیٹ پر کھڑا تھا۔ جب بھی کوئی شخص اندر جاتا، تو مجھے یوں لگتا کہ اس کی جیب پھولی پھولی سی ہے۔ اگر جیب پھولی نہ ہوتی تو پھر اس نے کوٹ کے اندر کچھ نہ کچھ ضرور چھپایا ہوتا۔ اور اس میں تو کوئی شک نہیں تھا کہ ان کے پاس خواہ کچھ بھی ہو، کم از کم عطر کی شیشیاں نہیں تھیں۔ مجھے تو درجنوں سڑے ہوئے انڈوں اور منوں گلی سڑی گوبھی اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کی بو آرہی تھی۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ اگر کوئی مردہ بلی کہیں نزدیک پڑی ہو تو اس کی بو جھٹ مجھ تک پہنچ جاتی ہے (اور یہ حقیقت ہے کہ میں مردہ بلی کی بو پہچانتا ہوں) ؟ تو جناب اس رات میں نے کم از کم چونسٹھ مردہ بلیاں ہال کے اندر جاتی محسوس کی ہوں گی۔ میں صرف ایک منٹ کے لئے ہال کے اندر گیا ہوں گا لیکن وہاں اتنی تیز بو تھی اور یہ اتنی مختلف قسموں کی تھی کہ میرے لئے ایک لمحہ بھی اندر ٹھہرنا محال ہو گیا ——— خیر جب ہال کھچا کھچ بھر گیا، تو ڈیوک نے ایک شخص کو پچیس سینٹ کا سکہ دے کر اسے گیٹ پر کھڑا کر دیا، اور خود عقبی راستے سے سٹیج کی طرف جانے لگا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ لیکن جونہی ہم ایک تاریک سے کونے میں پہنچے، وہ بولا: "تیز تیز قدم اٹھا کر ان مکانوں کے آگے سے ہوتے ہوئے چلے جاؤ

جونہی مکان ختم ہوں، بھاگ اٹھو، اور سیدھا بیڑے کا رُخ کرو۔ بس یوں سمجھو کہ کوئی بلا تمہارے تعاقب میں ہے۔"

میں نے ایسا ہی کیا۔ اس نے خود بھی یہی کچھ کیا۔ ہم دونوں ایک ساتھ ہی بیڑے پر پہنچے۔ دو ہی سیکنڈ بعد بیڑا دھیرے دھیرے دریا کی لہروں پر پھیل رہا تھا۔ تاریکی اور سناٹے کے عالم میں ہم نے دریا کے عین وسط کا رُخ کیا۔ ہم میں سے کسی نے ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا۔ میں بادشاہ کے بارے میں پریشان تھا کہ جانے اس بچارے پر کیا بیت رہی ہوگی۔ اور تماشائی اس کی کیسی گت بنا رہے ہوں گے۔ لیکن میں تو خواہ مخواہ ہی فکر مند ہو رہا تھا۔ کیونکہ تھوڑی ہی دیر بعد وہ جھونپڑی میں سے رینگ کر باہر نکلا اور بولا:

"کیوں ڈیوک؟ آج کا شو کیسا رہا؟" ظاہر تھا کہ حضرت یہیں بیٹھے تھے اور شہر گئے ہی نہیں تھے۔

جب تک ہم قصبے سے کوئی دس بارہ میل آگے نہیں نکل گئے۔ ہمیں لالٹین جلانے کی بھی جرأت نہ ہوئی۔ بالآخر ہم نے لالٹین جلائی اور کھانا کھا کر فارغ ہوئے۔ اس کے بعد ڈیوک اور بادشاہ دونوں اپنی اس کارگزاری پر کہ کس صفائی سے انہوں نے قصبے کے لوگوں کو بیوقوف بنایا ہے، خوب ہنسے۔ ڈیوک بولا:-"

یہ لوگ تو نرے احمق ہیں۔ ایک دم بدھو۔ اس کا تو خیر مجھے یقین تھا ہی کہ پہلے روز والے تماشائی اس کی بھنک تک نہیں نکالیں گے، اور یہی چاہیں گے کہ باقی کے لوگ بھی ان کی طرح بدھو بن جائیں۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں تھا کہ تیسری رات وہ ضرور ہم سے بدلہ لیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ تیسری رات کا کھیل وہ خود کھیلیں گے اور یہ تھی بھی حقیقت۔ کس اہتمام کے ساتھ انہوں نے اس کی تیاری کی تھی! کاش ہمیں پتہ چل سکتا کہ وہ اپنی باری کا کہاں تک فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ویسے اگر وہ چاہیں تو اچھی خاصی پکنک کا بندوبست کر سکتے ہیں۔ ان کے پاس پکنک کا سارا سامان موجود ہے۔"

جب حساب کیا گیا تو پتہ چلا کہ ان ٹھگوں نے ان تین راتوں میں ان سے چار سو پینسٹھ ڈالر ہتھیائے تھے۔ سکوں کا اتنا بڑا انبار کم از کم میں نے تو اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔

جب وہ سو گئے اور ان کے خراٹوں کی آواز آنے لگی تو جم بولا:

"ہک! ان بادشاہوں کی کرتوتیں دیکھ کر تمہیں تعجب نہیں ہوتا؟"

"نہیں تو۔ بالکل نہیں" میں نے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"اس لئے کہ ان کے خون کی یہی خاصیت ہوتی ہے۔ سب بادشاہ لوگ ہوتے ہی ایسے ہیں"

"لیکن ہک! یہ ہمارے بادشاہ تو نرے غنڈے ہیں۔ بالکل ٹھگ۔"!

"ہاں، یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ جہاں تک مجھے علم ہے، بادشاہ غنڈے ہی ہوتے ہیں"

"اچھا؟"

"ایک دفعہ ان کے کارنامے پڑھ کر دیکھو۔ تمہیں خود بخود پتہ چل جائے گا۔ ہنری ہشتم ہی کو لے لو۔ اس کے سامنے تو یہ ہمارا بادشاہ طفل مکتب دکھائی دیتا ہے۔ یا پھر چارلس دوم، یا چودھویں لوئی یا پندرھویں لوئی، یا جیمز دوم، یا ایڈورڈ دوم، یا رچرڈ سوم یا ایسے ہی بیسیوں بادشاہوں کو لے لو۔ ان کے علاوہ وہ ہفت شخصی اینگلو سیکسن حکومتیں بھی تھیں جو پرانے زمانے میں یوں دندناتی پھرا کرتی تھیں کہ ہابیل اور قابیل کے قصوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ کاش تم نے ہنری ہشتم کو اس کی جوانی کے ایام میں دیکھا ہوتا! وہ تو قیامت تھا۔ قیامت! ہر روز وہ ایک نئی بیوی سے بیاہ رچاتا اور اگلے دن اس کا سر قلم کروا دیتا۔ اور لطف یہ ہے کہ قتل کا حکم دیتے وقت وہ یوں سر دھری بڑبڑاتا جیسے قتل کا حکم اتنا ہی معمولی ہو جتنا یہ حکم دینا "ارے کوئی ہے، ذرا انڈے تو لے آؤ"۔ یعنی وہ کہتا: "نیل گوین کو لاؤ" اور نیل گوین اس کے سامنے پیش ہو جاتی۔ اگلی صبح وہ کہتا: "اس کا سر کاٹ دو" اور اس کا سر کاٹ دیا جاتا۔ پھر وہ کہتا "جین شور کو حاضر کرو" اور وہ حاضر ہو جاتی۔ اور اگلی صبح وہ کہتا: "اس کا سر کاٹ دو" اور وہ قتل کر دی جاتی۔ "فیئر روزامن کو بلاؤ" فیئر روزامن آجاتی۔ اور اگلی صبح "اس کا سر کاٹ دو" وغیرہ وغیرہ۔ اور ہر رات وہ ہر عورت سے ایک کہانی سنتا۔ اور یہ عمل تب تک جاری رہا۔ جب تک، کہ اس کے پاس ایک ہزار ایک قصے جمع نہ ہو گئے۔ اس کے بعد اس نے ان قصوں کو ایک

کتاب کی صورت میں یکجا کیا اور اس کتاب کا نام رکھا: "کتابِ قیامت"، یہ نام واقعی موزوں تھا اور حسب حال بھی۔ ارے بھائی تم کیا جانو ان بادشاہوں کو۔ میں ان کی کرتوتوں سے خوب واقف ہوں۔ یہ ہمارا بادشاہ تو ان تمام بادشاہوں سے ہزار درجے بہتر ہے، جن کا ذکر میں نے تاریخ میں پڑھا ہے۔ ہنری ہی کی بات سنو۔ اس کے جی میں آیا کہ ہمارے ملک کے ساتھ جھگڑا کیا جائے۔ جانتے ہو، اس نے کیا کیا؟ تم سمجھتے ہو، اس نے نوٹس دیا ہوگا؟ یا اس ملک کو تیاری کا موقع دیا؟ نہیں صاحب ہرگز نہیں۔ نہ وجہ، نہ سبب۔ اور اس نے بوسٹن بندرگاہ میں پڑی سب چائے سمندر میں پھنکوا دی۔ اور پھر ایک اعلان آزادی مرتب کر کے سب کو چیلنج دیا کہ کر لو جو تمہارے جی میں آئے۔ اس شخص کا تو وطیرہ ہی یہی تھا۔ یعنی کسی کو بالکل موقع ہی نہ دو۔ ایک بار اسے اپنے باپ ڈیوک آف ولنگٹن کی نیت پر شک ہو گیا۔ تو جانتے ہو، اس نے کیا کیا؟ کیا اسے بلا کر اس سے بات چیت کی؟ نہیں صاحب، ہرگز نہیں۔ بس اسے پکڑ کر مردہ بلی کی طرح پانی کے حوض میں پھنکوا دیا۔ یہی نہیں، اگر کوئی شخص کوئی قیمتی چیز یا روپیہ پیسہ بھول جاتا، تو جانتے ہو، وہ کیا کرتا؟ وہ اسے ہضم کر جاتا۔ اور سنو، فرض کرو کہ اس نے کسی شخص کے ساتھ کوئی کام کرنے کا معاہدہ کیا ہے؟ اور اس دوسرے شخص نے اسے رقم بھی پیشگی دیدی ہے۔ اگر یہ دوسرا شخص ہر وقت وہاں سر پر بیٹھ کر یہ نہ دیکھتا رہے کہ کام کیسا ہو رہا ہے تو یہ بادشاہ معاہدے کے ایک دم خلاف کام کرے گا۔ یہی نہیں، ہر بار جب بھی اس نے منہ کھولا، تو اگر اس نے اسے فوراً ہی بند نہ کر لیا، تو جو لفظ بھی اس کے منہ سے نکلا، جھوٹ کا پلندہ ہی تھا۔ تو جناب! یہ ہنری بھی اسی قسم کا بادشاہ تھا۔ اگر ان موجودہ بادشاہوں کی جگہ وہ اس وقت ہمارے ساتھ ہوتا تو یقیناً ان قصبے والوں کے پاس ایک کوڑی باقی نہ چھوڑتا، ان کی ساری پونجی ٹھگ لیتا میں یہ تو نہیں کہتا کہ ہمارے یہ بادشاہ معصوم ہیں۔ ان کی کرتوتوں کو دیکھتے ہوئے یہ ماننا ہی پڑے گا کہ معصومیت تو انہیں چھو تک نہیں گئی۔ لیکن پھر بھی یہ اس ہنری کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ بہرحال پھر بھی یہ کہوں گا کہ بادشاہ بادشاہ ہی ہوتے ہیں اور ان کی بہت سی باتوں کو درگزر کرنا پڑتا ہے۔ غور سے دیکھو تو ان میں کچھ بھی خصوصیت نہیں ہوتی۔ وہ بھی ہماری تمہاری طرح انسان ہوتے ہیں۔ ہاں، ان کی پرورش ضرور خاص ڈھنگ سے ہوتی ہے۔"

"لیکن ہک! اس بادشاہ سے تو ہر وقت شراب کی بو آتی رہتی ہے۔"

"بو تو سبھی سے آتی ہے۔ مگر اس بُو کا کچھ علاج بھی تو نہیں اور تاریخ بھی اس معاملے میں خاموش ہے۔"

"لیکن یہ ڈیوک، کئی لحاظ سے تو وہ واقعی نیک آدمی ہے۔"

"ہاں۔ ویسے بھی ڈیوک بادشاہ سے کچھ مختلف ہی ہوتا ہے۔ لیکن فرق کچھ خاص زیادہ نہیں ہوتا۔ جہاں تک اس ڈیوک کا تعلق ہے، یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ واقعی ڈیوک ہی ہے یا بادشاہ ہے۔ کیونکہ جب یہ نشے میں ہوتا ہے۔ تو اس میں اور بادشاہ میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

"خیر، میرے لئے تو ان بادشاہوں کو سنبھالنا ہی مشکل ہو رہا ہے۔ مجھے اب کسی مزید بادشاہ کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"پریشان تو میں بھی ہوں، مگر کیا کیا جائے؟ وہ پلے جو پڑ گئے ہیں۔ ان کے مرتبے کا دھیان تو رکھنا ہی پڑے گا، اور ان کی کرتوتوں کو بھی درگذر کرنا ہی پڑے گا۔ کئی دفعہ تو میں یہ دعا مانگنے لگتا ہوں کہ کاش کوئی ایسا ملک ہو، جو ان بادشاہوں سے پاک ہو۔"

اب بھلا، جم کو یہ بتانے کا کیا فائدہ کہ یہ بادشاہ اور ڈیوک دونوں نقلی ہیں۔ اس سے کوئی بھی تو مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اور پھر میں نے کہا ناں، ان میں اور حقیقی بادشاہ یا حقیقی ڈیوک میں فرق ہی کیا تھا؟

مجھے نیند آگئی اور میں سو گیا۔ جم جاگتا رہا اور اس نے مجھے اس وقت بھی نہ جگایا جب پہرا دینے کی میری باری تھی۔ پہلے بھی وہ کئی بار خود ہی میری جگہ پہرا دے چکا تھا۔ خیر، جب صبح کے وقت میری آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ جم گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا ہے اور ہولے ہولے سسکیاں بھر کر رو رہا ہے۔ میں نے اسے چپ کرانے کی کوشش نہ کی کیونکہ میں بخوبی جانتا تھا کہ اسے کس چیز کا غم ہے۔ اسے دراصل اپنی بیوی اور بچوں کی یاد ستا رہی تھی، جو اس سے بچھڑ گئے تھے۔ وہ اداس ہو گیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ پہلے کبھی گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ ویسے یہ بات جچتی تو نہیں، لیکن میرا خیال یہی تھا کہ بیوی بچوں کی یاد اسے بھی اتنا ہی پریشان کرتی ہے۔ جتنا ہم گوروں کو بارہا ایسا ہوا کہ رات کو جب وہ یہ سمجھتا کہ میں سو گیا ہوں، وہ اسی طرح سسکیاں بھر بھر کر رونے لگتا؛ اور اپنے آپ سے کہتا: "بچاری الزبتھ۔ بچارا جانی۔۔ نہ جانے ان پر کیا کیا آفتیں آئیں گی۔ شائد اب مجھے ان کا منہ دیکھنا کبھی نصیب نہ ہو گا۔"

جم واقعی بہت نیک حبشی تھا۔

نہ جانے کیوں، اس روز میں نے اس کی بیوی بچوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بولا:
جانتے ہو ہک! مجھے کیا ہوا ہے؟۔ بات یہ ہے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے ایک آواز سنی جیسے کوئی کسی کو تھپڑ مار رہا ہو۔ اس سے مجھے وہ واقعہ یاد آگیا جب میں نے اپنی بچی الزبتھ کو پیٹا تھا۔ اس وقت وہ صرف چار برس کی تھی۔ اور انہی دنوں بیماری سے اٹھی تھی۔ اس بچاری نے بڑا دکھ جھیلا تھا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ صحت یاب ہو گئی۔ ہاں تو، اس روز وہ میرے پاس کھڑی تھی۔ میں نے کہا:

"دروازہ بند کر دو ـــــــ"

اس نے دروازہ بند نہ کیا بس وہیں کھڑی میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہی۔ مجھے غصہ آگیا۔ میں نے چلا کر کہا: "سنا نہیں؟۔ دروازہ بند کر دو" لیکن وہ پھر بھی کھڑی مسکراتی رہی۔ میرا خون کھولنے لگا۔ میں نے کہا: "ٹھہرو تمہیں بتاؤں کہ حکم عدولی کیسے کی جاتی ہے"۔ اور یہ کہہ کر میں نے اس کے سر پہ زور سے ایک تھپڑ جو مارا تو وہ نیچے فرش پر گر گئی۔ میں دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ دس منٹ بعد جب میں واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دروازہ ویسے ہی کھلا ہے اور وہ خود دروازے میں کھڑی رو رہی ہے۔ اس کی گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ لیکن میرے اوپر تو جیسے بھوت سوار تھا۔ میں پھر اس کی طرف لپکا۔ عین اسی وقت ہوا کا ایک جھونکا آیا اور دروازہ زور سے بند ہو گیا (دروازہ اندر کی طرف کھلتا تھا) حیرانی کی بات یہ تھی کہ اس دھماکے کے بعد بھی وہ وہیں کھڑی رہی اور اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں۔ میرا تو اندر کا سانس اندر اور باہر کا سانس باہر رہ گیا۔ میرے جی کو کچھ ہونے لگا۔ میں رینگتا ہوا باہر نکلا اور آہستہ آہستہ دروازہ کھول دیا۔ پھر میں دبے پاؤں بچی کے پیچھے جا کر زور سے چلایا "بھوں، بھوں!" لیکن وہ پھر بھی نہ ہلی۔ کیا بتاؤں ہک! میں بچوں کی طرح بلکنے لگا۔ اور اسے گود میں اٹھا کر خدا سے بولا: "اے خدا! میری یہ معصوم بچی! خدایا مجھے معاف کر دے۔ میں زندگی بھر اپنی اس بربریت کو نہیں بھولوں گا"۔ کیا بتاؤں، میری اس وقت کیا حالت تھی۔ بیماری میں وہ بچی بالکل گونگی اور بہری ہو گئی تھی۔ جی ہاں، اور میں نے اس گونگی اور بہری بچی کو پیٹا تھا!"

۲۴ - جم کا شاہی لباس - نیا ملاقاتی - نئی خبر - ماتم -

اگلی رات ہم نے بیڑے کو دریا کے وسط میں ایک خشکی کے ٹکڑے پر باندھ دیا۔ یہاں بید کی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں - دریا کے دونوں کناروں پر چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے - بادشاہ اور ڈیوک ان قصبوں سے مال ہتھیانے کے منصوبے بنانے لگے - جم نے ڈیوک سے عرض کی: "مجھے امید ہے، اب کی بار آپ جلد لوٹ آئیں گے - بات یہ ہے کہ سارا دن ہاتھ پاؤں بندھوا کر اس کھپریل کے نیچے پڑے رہنے سے مجھے بہت کوفت ہوتی ہے۔" جب ہم اسے بیڑے پر چھوڑ کر جایا کرتے تھے، تو اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیا کرتے تھے - اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر کوئی شخص اچانک ادھر آ نکلتا اچانک ادھر آ نکلتا اور جم کو آزاد بیٹھے پاتا، تو ہمارا گھڑا ہوا قصہ کہ یہ بھگوڑا غلام ہے، جھوٹا ثابت ہو جاتا - ڈیوک بولا: "کہنے کو تم ٹھیک ہو - اس طرح جکڑے پڑے رہنا تو واقعی آفت ہے - اچھا دیکھو، میں کوئی ترکیب سوچتا ہوں۔"

یہ ڈیوک واقعی بہت ذہین تھا - تھوڑی ہی دیر میں اس نے ایک ترکیب سوچ لی - اس نے جم کو شاہ لیئر کا لباس پہنا دیا - یعنی ایک لمبا سا چغہ جو چھپے ہوئے پردے کو کاٹ کر بنایا گیا تھا، اور گھوڑے کے بالوں کی بنی ایک سفید ٹوپی، اور اسی رنگ کے بالوں کی داڑھی اور مونچھیں - اس کے بعد اس نے میک اپ کا سامان لے کر جم کے چہرے اور ہاتھوں، کانوں اور گردن پر نیلے رنگ کی موٹی موٹی تہیں جما دیں - اب وہ یوں لگتا تھا، جیسے نو دن پانی میں ڈوبا رہا ہو - اس کی شکل بہت ڈراؤنی بن گئی تھی - پھر ڈیوک نے ایک تختی لے کر اس پر یہ عبارت لکھی "بیمار عرب۔ لیکن جب دماغ ٹھیک ہو، تو کچھ نہیں کہتا۔"

پھر یہ تختی ایک لاٹھی کے ساتھ ٹھونک دی گئی اور ڈیوک نے اس لاٹھی کو کھپریل سے تقریباً چار پانچ فٹ ادھر گاڑ دیا۔

جم اب مطمئن تھا - اس کا خیال تھا کہ "ہاتھ پیر بندھوا کر برسوں پڑے رہنے سے تو یہی بہتر ہے اس میں تو ہر وقت خدشہ لگا رہتا تھا - جب بھی کوئی کھٹکا ہوتا، مجھ پر لرزہ طاری ہو جاتا"۔۔۔۔۔

ڈیوک بولا: "بس اب تم آرام سے بیٹھے رہا کرو۔ اگر کبھی کوئی شخص بیڑے پر چڑھ کر دخل در معقولات کرنے لگے، تو تم کھپریل میں سے نکل کر کلانچیں بھرنا شروع کر دینا اور جنگلی درندے کی مانند دو ایک بار غرّانا۔ بس وہ لوگ یقیناً بھاگ اٹھیں گے اور دوبارہ ادھر آنے کا نام تک نہ لیں گے۔" بات واقعی معقول تھی۔ ویسے جم کی شکل ہی ایسی ڈراؤنی تھی کہ شاید غرّانے کی نوبت ہی نہ آتی۔ وہ تو مُردوں سے بھی زیادہ خوفناک دکھائی دے رہا تھا۔

ان ٹھگوں کی خواہش تھی کہ اس قصبے میں بھی "شاہی عجوبے" کو آزمایا جائے۔ کیونکہ اس سے خاصی رقم ہاتھ لگ جاتی تھی۔ لیکن بالآخر انہوں نے ارادہ بدل لیا۔ انہیں خدشہ تھا کہ ان کی کرتوت کی خبر کہیں یہاں نہ پہنچ گئی ہو۔ انہوں نے بہت سوچا، لیکن جب کوئی مناسب منصوبہ ان کے ذہن میں نہ آیا، تو ڈیوک بولا: "مجھے ذرا ایک گھنٹہ آرام سے لیٹ کر سوچنے دو۔ شاید ایسی کوئی ترکیب ذہن میں آجائے، جو ارکانساس کے کارنامے کو بھی مات کر دے۔" بادشاہ بولا: "تب تک میں اس دوسرے گاؤں کو دیکھ آتا ہوں۔" بادشاہ کے ذہن میں کوئی منصوبہ نہ تھا، وہ تو خدا کے توکّل پر نکل پڑا تھا کہ شاید قسمت یاوری کرے اور کوئی منافع بخش صورت نکل آئے۔ قسمت سے شاید اس کی مراد شیطان سے تھی۔ جس جگہ ہم نے پچھلی بار پڑاؤ ڈالا تھا، وہاں ہم سب نے ایک مکان سے کپڑے خریدے تھے۔ بادشاہ نے اپنے کپڑے پہن لئے اور مجھ سے بھی تیار ہوتے کے لئے کہا۔ میں بھی کپڑے پہن کر تیار ہو گیا۔ بادشاہ کا لباس کالے رنگ کا تھا اور اس میں خوب تکلف لگا ہوا تھا۔ اسے پہن کر اس کی شخصیت نہایت باوقار بن گئی تھی۔ میرے وہم میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ لباس سے انسان کی شخصیت بھی یکسر بدل جاتی ہے۔ پہلے وہ ایک بالکل ادنیٰ سا انسان لگتا تھا، لیکن اب جب وہ سر سے سفید ہیٹ اتار کر مسکراتے ہوئے آداب بجالاتا تو اس قدر باوقار سا اور فرشتہ صورت دکھائی دیتا جیسے وہ ابھی ابھی نوح کی کشتی سے اتر کر آرہا ہو۔ یا پھر اسے دیکھ کر یہ گمان ہوتا گویا کوئی کاہن وعظ کرنے کرتے ادھر آنکلا ہو۔

جم نے ناؤ صاف کر دی اور میں نے چپو تیار کر لئے۔ شہر سے تین چار میل دور ساحل پر ایک سٹیم بوٹ کھڑی تھی۔ وہ شاید دو گھنٹے سے وہاں کھڑی تھی اور سواریاں اور سامان لاد رہی تھی۔ بادشاہ بولا:۔

"جو لباس میں نے پہن رکھا ہے، اُس میں تو یہی مناسب ہے کہ میں یوں ظاہر کروں جیسے میں سینٹ لوئیس یا سنسناٹی یا ایسے ہی کسی بڑے شہر کا رہنے والا ہوں ہکل بری! اس بوٹ کی طرف چلو۔ ہم اسی پر سوار ہو کر گاؤں جائیں گے"

مجھے تو جیسے منہ مانگی مراد مل گئی۔ میں سٹیم بوٹ پر چڑھنے کے لئے بے تاب تو تھا ہی۔ فوراً ناؤ کھے کر گاؤں سے آدھ میل اُدھر سامنے کے ساحل پرے گیا۔ تھوڑی دیر تک ہم ساحل کے قریب ساکن پانی میں بہتے رہے۔ اسی اثناء میں ہماری نظر ایک معصوم سے دیہاتی پر پڑی جو ایک درخت کے تنے پر بیٹھا پسینہ پونچھ رہا تھا۔ اس روز گرمی بے انتہا تھی۔ اس دیہاتی کے قریب دو بڑی بڑی گٹھریاں رکھی تھیں۔ بادشاہ بولا "کشتی کو کنارے پر لے چلو" اور جب ہم کنارے پر پہنچ گئے تو اس نے پوچھا:

"کیوں جوان — کدھر کا ارادہ ہے؟"

"سٹیم بوٹ تک پہنچنا ہے۔ مجھے اورلینز جانا ہے"

"ادھر ناؤ پر چلے آؤ" بادشاہ بولا: اور جب وہ گٹھریاں اٹھانے لگا تو بادشاہ نے اسے روک دیا اور بولا "ایک منٹ رکو۔ میرا نوکر انھیں رکھوا دے گا۔ ایڈالفس! صاحب کی مدد کرو" ایڈالفس سے مراد میں تھا۔

میں نے سامان لدوا دیا، اور پھر کشتی میں بیٹھ کر اسے کھینے لگا۔ دیہاتی ہمارا بے حد مشکور تھا، کیونکہ اس موسم میں اتنا سارا سامان اٹھا کر چلنے میں اسے بہت دقت ہو رہی تھی۔ اس نے بادشاہ سے پوچھا: "آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟"

"میں آج صبح ہی یہاں پہنچا ہوں۔ سٹیم بوٹ نے مجھے ادھر اس گاؤں میں اتار دیا تھا۔ اب میں اپنے ایک دوست سے ملنے جا رہا ہوں۔ جو یہاں سے کچھ دور ایک فارم پر رہتا ہے"

"جب میں نے آپ کو دیکھا، تو پہلے تو مجھے یہی خیال آیا کہ شاید آپ مسٹر ولکس ہیں، اور میں سوچنے لگا کہ لگتے تو مسٹر ولکس ہی ہیں مگر ذرا دیر سے پہنچے ہیں۔ لیکن پھر فوراً ہی مجھے خیال آیا کہ آپ مسٹر ولکس نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اگر آپ مسٹر ولکس ہوتے تو یوں ناؤ میں سفر نہ کرتے۔ کیوں آپ ولکس تو نہیں ہیں ناں؟"

"نہیں میرا نام بلاجٹ ہے۔ الگزینڈر بلاجٹ۔ یا پادری بلاجٹ ہی کہہ لو۔ کیونکہ میں خدا کا ایک ادنےٰ سا خادم ہوں خیر، مسٹرولکس کے بروقت نہ پہنچنے سے ان کا جو نقصان ہوا ہے، مجھے اس کا افسوس ہے۔ لیکن مجھے امید ہے کہ ان کا کوئی خاص نقصان نہیں ہوا۔"

"جائداد تو خیر اسے مل ہی جائے گی۔ اس لئے اس کا کوئی مالی نقصان نہیں ہوا۔ لیکن وہ بچارا اپنے بھائی پیٹر کا آخری دیدار نہ کر سکا۔ نجانے اسے اس کا رنج ہے بھی یا نہیں۔ کسی کے دل کا کیا پتہ ؟ لیکن اس کا بھائی بچارا تو مرنے سے پہلے اس سے ملنے کے لئے بہت بے قرار تھا۔ ان تین ہفتوں میں اس کے منہ سے اس کے سوا اور کوئی بات ہی نہیں نکلی۔ دونوں بھائی بچپن میں ہی ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے۔ اور ایسے بچھڑے کہ پھر ایک دوسرے سے ملنے کا موقع ہی نہ ملا۔ اپنے دوسرے بھائی ولیم کو تو اس نے بالکل دیکھا ہی نہیں تھا۔ ولیم گونگا اور بہرا ہے اس کی عمر تئیس چوبیس سے زیادہ نہیں۔ اپنے خاندان میں سے صرف پیٹر اور جارج نے ہی یہاں ہجرت کی تھی۔ جارج شادی شدہ تھا۔ وہ اور اس کی بیوی ابھی پچھلے برس ہی فوت ہوئے ہیں۔ اب ان بھائیوں میں سے صرف ہاروے اور ولیم ہی زندہ ہیں لیکن میں نے کہا نا، وہ بچارے بھی وقت پر نہ پہنچ سکے۔"

"لیکن کسی نے انہیں اطلاع دی بھی تھی ؟"

"ہاں، دی کیوں نہیں تھی۔ انہیں اطلاع دیئے ہوئے تو تقریباً دو ماہ ہو گئے ہیں۔ انہیں تو اسی وقت خبر کر دی گئی تھی جب پیٹر کو پہلا دورہ پڑا تھا۔ نہ جانے کیوں، پیٹر کو یہ وہم تھا کہ اب کی بار وہ جانبر نہ ہو سکے گا۔ ویسے بھی اب وہ بہت بوڑھا ہو گیا تھا اور اس کا کوئی رفیق نہ تھا جس سے وہ دو گھڑی بات چیت ہی کر لے۔ جارج کی بیٹیاں بچاری بہت کم سن تھیں۔ ہاں، کبھی کبھی وہ سرخ بالوں والی میری جین سے بات چیت کر کے دل بہلا لیا کرتا تھا۔ خاص طور پر جارج اور اس کی بیوی کے انتقال کے بعد تو وہ بہت اداس اداس سا رہنے لگا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے زندگی میں اسے کوئی دلچسپی نہ رہی ہو۔ اس کی ایک ہی تمنا تھی کہ مرنے سے پہلے ہاروے سے ملاقات ہو جائے۔ ویسے تو ولیم سے ملنے کا بھی وہ بہت خواہاں تھا۔ دراصل

وہ ان لوگوں میں سے تھا جو وصیت نامہ وغیرہ لکھوانے کے حق میں نہیں۔ ہاں اس نے ہارو ے کے نام ایک خط چھوڑا ہے جس میں اس نے بتایا ہے کہ اس کی دولت کہاں کہاں رکھی ہوئی ہے خط میں یہ ہدایت بھی کی گئی ہے کہ باقی کی تمام جائداد جارج کی لڑکیوں میں بانٹ دی جائے۔ جارج بچارا نادار تھا اور اپنی لڑکیوں کے لئے کچھ بھی نہ چھوڑ کر نہیں مرا تھا۔ مرنے سے پہلے پیٹر نے بس یہی ایک خط لکھا تھا۔"

"لیکن تمہیں یہ خیال کیسے آیا کہ ہاروے نہیں آئے گا۔ وہ رہتا کہاں ہے؟"

"اوہ! وہ تو انگلستان میں رہتا ہے شیفیلڈ میں۔ وہاں وہ پادری ہے۔ اور یہاں اس ملک میں تو وہ کبھی آیا ہی نہیں۔ شاید اس کے پاس فرصت ہی نہیں۔ اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ خط اسے ملا ہی نہ ہو۔"

"بچارا پیٹر! مرنے سے پہلے بھائی سے ملاقات بھی نہ ہو سکی۔ اچھا' تو تم اورلینز جا رہے ہو؟ لیکن مجھے تو وہاں سے بھی آگے جانا ہے۔ اگلے بدھوار میں وہاں سے جہاز پر چڑھ کر ریو جینیرو جاؤں گا جہاں میرا چچا رہتا ہے۔"

"یہ تو بہت لمبا سفر ہے۔ لیکن خیر' یہ سفر ہوگا نہایت دلچسپ۔ کاش! مجھے بھی ایسا سفر کرنے کا موقع مل سکتا! اچھا تو' یہ میری جین سب سے بڑی لڑکی ہو گی؟ تو پھر باقیوں کی عمریں کیا ہوں گی؟"

"میری جین انیس برس کی ہے' سوسن پندرہ کی اور جوآنا چودہ سال کی۔ یہ جوآنا ہمیشہ رفاہِ عام کے کاموں میں مدد کرتی رہتی ہے۔ اس کا اوپر کا ہونٹ کٹا ہوا ہے۔"

"بچاری لڑکیاں! اس بے درد زمانے میں یوں بے سہارا ہو گئیں۔"

"ان کی حالت تو اور بھی بدتر ہوتی' لیکن بھلا ہو پیٹر کے دوستوں کا۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ انہیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔ ان میں سے ایک تو بپٹسٹ پادری ہاکسن ہے۔ اس کے علاوہ ڈیکن لاٹ ہاروے ہے' بین زکر ہے' ایبنر شیکلفورڈ ہے' لیوی بیل ہے جو وکالت کرتا ہے' اور ڈاکٹر رابنسن اور ان سب کی بیویاں' اور ان کے علاوہ بیوہ بارٹلے ہے۔ ویسے تو اس کے کئی دوست تھے۔ لیکن ان لوگوں کے ساتھ اس کے تعلقات دوسروں کی نسبت زیادہ گہرے تھے۔ جب بھی وہ اپنے بھائیوں کو خط لکھتا تو ان لوگوں کا ضرور ذکر کرتا۔ لہذا جب ہاروے آئے گا تو یہ لوگ اس کیلئے

اجنبی نہیں ہوں گے۔

یوں وہ بڈھا، یعنی بادشاہ، اس سے کرید کرید کر سوال پوچھتا رہا حتےٰ کہ کوئی بات ایسی نہ رہی جس پر مزید روشنی ڈالنے کی ضرورت ہو۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو اس نے اس شہر کی ایک ایک شے اور ایک ایک باشندے کے بارے میں مکمل تفصیلات حاصل کر لیں۔ اور ولکس خاندان کے بارے میں اور پیٹر کے کاروبار اور جارج کے کاروبار اور ہاروے کے کاروبار کے متعلق اس نے تمام معلومات حاصل کیں۔ اسے بھی یہ علم ہو گیا کہ پیٹر چمڑا رنگنے کا کام کرتا تھا، جارج بڑھئی تھا۔ اور ہاروے پادریوں کے اس طبقے سے تعلق رکھتا تھا، جو پرانی باتوں کی اندھا دھند تقلید نہیں کرتے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد وہ بولا!

"لیکن تم اس بوٹ پر سوار ہونے کے لئے اتنی دور کیوں جا رہے ہو؟"

"بات یہ ہے کہ یہ بوٹ اورلینز سے آئی ہے، اور مجھے ڈر تھا شاید یہ ہمارے گاؤں میں نہ رکے جب یہ کشتیاں دریا کے وسط میں ہوتی ہیں، تو چاہے آپ کتنی آوازیں دیں، یہ رکتے ہی نہیں۔ ہاں، سنسنائی سے آنے والی بوٹ ضرور رک جاتی ہے۔ لیکن یہ تو سینٹ لوئیس کی ہے۔"

"پیٹر ولکس خاصا امیر ہوگا"

"ہاں، خاصا خوشحال تھا۔ اس کی زمینیں تھیں، مکان تھے۔ اور میرا اندازہ ہے کہ اس نے کم از کم تین چار ہزار ڈالر بھی کہیں نہ کہیں ضرور چھپا رکھے ہوں گے۔

"کیا بتایا تھا تم نے؟ کب ہوئی تھی یہ موت؟"

"ہاں یہ بات تو میں نے آپ کو بتائی ہی نہیں۔ لیکن۔ خیر، موت کل رات ہوئی تھی۔"

"تو پھر جنازہ شاید کل اٹھے گا۔"؟

"ہاں، دوپہر کے قریب۔"

"خاصا المناک قصہ ہے۔ لیکن ایک نہ ایک دن تو ہم سب کو ہی جانا ہے اگر انسان اس وقت کے لئے ہمیشہ تیار رہے، تو پھر اسے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔"

"جی ہاں آدمی کی موت کے لئے ہمیشہ تیار رہنا چاہئے۔ میری ماں بھی یہی کہا کرتی تھی۔"

جب ہم سٹیم بوٹ کے نزدیک پہنچے تو سامان قریب قریب لد چکا تھا۔ ہمارے پہنچتے ہی بوٹ چل پڑی۔

بادشاہ نے اس پر سوار ہوتے کی کوشش ہی نہ کی اور جہاز پر چڑھنے کی میری حسرت دل کی دل ہیں رہ گئی۔ جب بوٹ چلی گئی تو بادشاہ نے مجھ سے کہا کہ کشتی کھے کر اور آگے لے جاؤں۔ ایک میل پرے ایک اجاڑ سی جگہ پر پہنچ کر بادشاہ کشتی سے اتر گیا اور بولا: "اب فوراً لوٹ جاؤ۔ اور ڈیوک کو یہاں لے آؤ۔ اور ہاں، وہ تھیلے بھی لیتے آنا اگر ڈیوک وہاں نہ ہو اور دریا کے پار اُدھر دوسرے گاؤں میں چلا گیا ہو، تو تم اس کے پیچھے وہیں چلے جانا اور اس سے کہنا کہ وہ سب کام چھوڑ چھاڑ کر چلا آئے۔ بس اب جلدی کرو — جاؤ۔"

مجھے یہ بھانپنے دیر نہ لگی کہ اس کے ارادے کیا ہیں لیکن میں خاموش رہا۔ جب میں ڈیوک کو لے کر واپس آیا، تو سب سے پہلا کام ہم نے یہ کیا کہ کشتی کو کسی اچھی سی جگہ پر چھپا دیا۔ اس کے بعد وہ دونوں ایک درخت کے تنے پر بیٹھ گئے اور بادشاہ نے وہ ساری بات لفظ بلفظ کہہ سنائی جو اس نے اس نوجوان دیہاتی سے سنی تھی۔ بات چیت کرتے وقت بادشاہ نے اپنا لب و لہجہ بالکل انگریزوں جیسا بنا لیا۔ اس نے یہ بہروپ اس خوبی سے نبھایا کہ میں عش عش کر اٹھا۔ اور تو اور باتیں کرتے وقت اس نے انگریزوں کی طرح شانے بھی جھکائے۔ مجھ میں اتنی صلاحیت تو ہے نہیں کہ اس کی نقل اُتار سکوں لہٰذا میں نقل اتارنے کی کوشش کروں گا ہی نہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ نظارہ واقعی قابل دید تھا۔ بالآخر اس نے پوچھا:

"بلج واٹر! گونگا اور بہرا بننے میں تمہیں کہاں تک مہارت حاصل ہے؟"

"تم یہ بات مجھی پر چھوڑ دو میں سب بندوبست کر لوں گا۔ سٹیج پر میں نے کئی بار گونگے اور بہرے کا پارٹ کیا ہے۔"

اس کے بعد وہ کسی سٹیم بوٹ کے گزرنے کا انتظار کرنے لگے۔

جب سہ پہر آدھی کے قریب بیت گئی، تو دو چھوٹی چھوٹی سٹیم بوٹ ادھر سے گزریں۔ لیکن یہ بوٹ یہیں کہیں نزدیک سے ہی آئی تھیں۔ وہ پھر انتظار کرنے لگے۔ بالآخر ایک بڑی سی سٹیم بوٹ ادھر سے گزری اور انہوں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ بوٹ سے ایک کشتی کنارے پر بھیجی گئی اور ہم اس میں بیٹھ کر بوٹ تک چلے گئے۔ یہ بوٹ سنسناٹی سے آئی تھی۔ جب ملاحوں کو پتہ چلا کہ ہم تو صرف چار یا پانچ میل دور جانے والی سواریاں ہیں، تو وہ بہت جھنجھلائے اور لگے گالیاں دینے۔ انہوں نے یہ دھمکی بھی دی کہ وہ اس گاؤں میں رکیں گے ہی نہیں۔ بادشاہ بڑے تحمل سے یہ سب کچھ سنتا رہا اور بالآخر کہنے لگا: "اگر کوئی شخص ایک ڈالر فی

میل کے حساب کرایہ دینے کو تیار ہو، تو شاید اس بوٹ کو اس میں کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ سواریوں کو کشتی میں بٹھا کر ساحل سے بوٹ تک لے جائیں، اور بوٹ سے ساحل پر پہنچا دیں۔"

اس پیش کش سے ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ جب ہم گاؤں کے نزدیک پہنچے، تو وہ ہمیں کشتی میں بٹھا کر ساحل تک چھوڑ آئے۔ کشتی کو دیکھتے ہی دس بارہ آدمی ساحل پر جمع ہو گئے اور جب بادشاہ نے پوچھا: "آپ میں سے کوئی صاحب بتا سکیں گے کہ مسٹر ہیٹر ولکس کہاں رہتے ہیں؟" تو وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ دیکھ کر یوں سر ہلانے لگے گویا کہہ رہے ہوں: "کیوں، کیا کہا تھا میں نے؟" تھوڑی دیر بعد ایک شخص نے آہستہ سے جواب دیا: "مجھے نہایت افسوس ہے۔ جناب۔ لیکن اب تو ہم آپ کو صرف یہی بتا سکتے ہیں کہ کل شام تک وہ کہاں رہتے تھے۔"

آناً فاناً بڈھا اس شخص کے گلے سے لپٹ گیا، اور اس کے کندھے پر سر رکھ کر زار زار رونے لگا، اور بین کرنے لگا: "ہائے! ہمارے بھائی نے ہمارا انتظار ہی نہ کیا، اور ہمارے آنے سے پہلے ہی چلا گیا ہائے! ہم اس کا منہ بھی نہ دیکھ سکے۔ واہ ری قسمت! ہماری تقدیر کتنی کھوٹی نکلی۔"

پھر وہ سسکیاں بھرتا ہوا مڑا اور ہاتھوں سے عجیب عجیب اشارے کر کے ڈیوک کو کچھ سمجھانے لگا۔ فوراً ہی ڈیوک نے تھیلا زمین پر ٹیک دیا اور زار زار رونے لگا۔ یہ لوگ واقعی غضب کے دھوکہ باز تھے۔

اب خاصی بھیڑ جمع ہو گئی تھی۔ مجمع میں سے ہر شخص ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرنے لگا۔ گاؤں والے ہمارے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آئے، اور ہمارا سامان اٹھا کر پہاڑی کی طرف چل پڑے۔ یہ دونوں باری باری ان کے کندھوں کا سہارا لے کر رونے لگ جاتے۔ گاؤں والوں نے بادشاہ کو اس کے بھائی کی موت کے وقت کی سب تفصیلات بتائیں، اور پھر بادشاہ نے یہ سب باتیں اشاروں کی مدد سے ڈیوک کو سمجھائیں۔ یہ دونوں اس مرحوم چمڑا رنگنے والے کے لئے یوں سوگوار تھے جیسے عیسیٰؑ کے بارہ شاگرد کہیں کھو گئے ہوں۔ یقین مانئے ایسا نظارہ میں نے عمر بھر کبھی نہیں دیکھا۔ ان کی کرتوتوں پر تو پوری نسل آدم کو شرم سے زمین میں گڑ جانا چاہیئے۔

۲۵- یہ کون؟ حمد- بھیانک چوک- ماتمی جشن- گھاٹے کا سودا-

یہ خبر دو ہی منٹ میں پورے قصبہ میں پھیل گئی- ہر طرف سے لوگ آ آ کر انھیں دیکھنے لگے- کچھ لوگ تو یوں جلدی میں نکل پڑے تھے کہ انھیں کوٹ پہننے کا بھی وقت نہ ملا تھا اور وہ اسے راستے میں ہی پہنتے آ رہے تھے- تھوڑی ہی دیر میں ایک اچھا خاصا مجمع ہمارے گرد جمع ہو گیا- بھاگتے ہوئے لوگوں کے قدموں کی چاپ یوں آ رہی تھی جیسے کوئی فوج مارچ کر رہی ہو- انہیں دیکھنے کے لئے لوگ کھڑکیوں اور دروازوں میں کھڑے ہو گئے- قدم قدم پر کوئی نہ کوئی شخص جو اپنے جنگلے کے اندر کھڑا ہوتا، دوسرے سے پوچھتا: "کیوں، یہی ہیں وہ؟" اور اس جلوس میں سے ایک آدمی جواب دیتا: "جی ہاں- یقیناً"

ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی لوگوں کی ایک بھیڑ سی گھر کے سامنے گلی میں جمع ہو چکی تھی تینوں لڑکیاں دروازے پر کھڑی انتظار کر رہی تھیں- میری جین کے بال واقعی سرخ رنگ کے تھے- پر اس سے کیا؟ تھی تو وہ خوبصورت- اس کا چہرہ اور اس کی آنکھیں یوں چمک رہی تھیں، جیسے وہ سر تا پا نور ہو- اپنے دونوں چچاؤں کی آمد سے وہ بہت خوش تھی- اسے دیکھتے ہی بادشاہ نے بازو پھیلا دیے اور میری جین دوڑ کر اس کے سینے سے لگ گئی- دوسری لڑکی جس کا ہونٹ کٹا ہوا تھا، ڈیوک سے چمٹ گئی- دیر تک وہ ان سے چمٹی روتی رہیں- ہر شخص اس خاندان کے یوں اکٹھا ہو جانے پر خوش تھا- سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، عورتوں کے آنسو تو صاف نظر آ رہے تھے-

بادشاہ نے ڈیوک کو چپکے سے کہنی ماری (البتہ میں نے اس کی یہ حرکت دیکھ لی) اور پھر اس کی نگاہیں ادھر ادھر تابوت کو تلاش کرنے لگیں جو ایک طرف کونے میں دو کرسیوں کے اوپر پڑا تھا- وہ اور ڈیوک دونوں ایک ہاتھ سے ایک دوسرے کے کندھے کا سہارا لئے اور دوسرے ہاتھ سے آنکھیں ڈھانپے، آہستہ آہستہ نپے تلے قدموں سے تابوت کی طرف بڑھے- سب لوگ راستہ چھوڑ کر ایک طرف ہو گئے، ہونٹوں پر انگلی رکھ کر دوسروں کو خاموش رہنے کا اشارہ کرنے لگے- ماحول پر یکلخت سناٹا چھا گیا- مردوں نے ہیٹ اتار لئے اور سر جھکا کر کھڑے ہو گئے- تابوت کے نزدیک پہنچ کر ان دونوں نے ایک بار جھک کر اس کے اندر جھانکا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگے- وہ اتنے اونچے سروں میں رو رہے تھے-

کہ میرا خیال ہے انکی آواز نیو اور لبنز تک پہنچ رہی ہوگی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی باہنیں ایکدوسرے کے گلے میں ڈالدیں اور ایک دوسرے کے کندھے پر ٹھوڑی رکھ کر تین چار منٹ تک زار زار روتے رہے۔ میں نے زندگی بھر اتنے آنسو نہیں دیکھے ہوں گے جتنے میں نے ان تین چار منٹوں میں دیکھ لئے تھے۔ بچی نہیں۔ وہاں کھڑے ہوئے ہر شخص کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور سارا فرش گیلا ہو گیا تھا۔ اس کے بعد بادشاہ تو تابوت کے ایک طرف گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور ڈیوک دوسری طرف اور پھر وہ دونوں تابوت کے کناروں پر سر رکھ کر دعا مانگنے لگے۔ جب یہ کارروائی شروع ہوئی، تو جیسے دفعتاً مجمع کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ تمام لوگ بلند آواز میں سسکیاں بھرنے اور رونے لگے۔ ان بچاری لڑکیوں کی سسکیاں تو تھمنے میں ہی نہ آتی تھیں انہیں یوں روتا دیکھ کر تمام عورتیں باری باری ان کے پاس جاتیں، اور خاموش کھڑی رہتیں۔ پھر وہ چپکے سے ان کی پیشانی چوم لیتیں اور ان کے سر پہ ہاتھ رکھ کر روتی ہوئی اوپر آسمان کی طرف دیکھنے لگتیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کا ضبط جاتا رہتا اور وہ سسکیاں بھرتی آنکھیں پونچھتیں ہوئی چلی جاتیں۔ ایسا دلخراش منظر میں نے زندگی بھر کبھی نہیں دیکھا۔

تھوڑی دیر بعد بادشاہ اٹھا اور سسکیاں بھرتا، آنسو بہاتا، ایک دو قدم مجمع کی طرف بڑھا اور رقت انگیز لہجے میں بولا: "میرے اور میرے بھائی کے لئے یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ مرحوم سے ہماری ملاقات نہ ہو سکی۔ اور وہ بھی اس بات کے باوجود کہ ہم چار ہزار میل کی دوری سے آئے ہی اسی مقصد کے لئے تھے۔ تاہم اس تیرہ و تاریک ماحول میں روشنی کی ایک ہی کرن ہے اور وہ یہ کہ آپ لوگوں کی ہمدردی نے اور ہمارے غم میں آپ کی شرکت نے اس لمحے کو ہمارے لئے متبرک بنا دیا ہے۔" اس کے بعد اس نے اپنے اور اپنے بھائی کی طرف سے ان کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ اور کہا کہ "آپ کی اس ہمدردی سے ہم اتنے متاثر ہوئے ہیں کہ ہمیں آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لئے موزوں الفاظ نہیں ملتے۔ اور پھر اگر الفاظ ہوں بھی، تو یہ سرد بے حس جملے کیونکر ہمارے جذبات کی ترجمانی کر سکتے ہیں؟" وہ اسی قسم کی باتیں کرتا رہا۔ اور مجھے اس کی باتیں سن سن کر گھن آنے لگی۔ اس کے بعد اس نے نہایت صدق دلی سے "آمین" کہا اور ایک طرف کو لپکا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

جونہی اس کی تقریر ختم ہوئی، مجمع میں سے کسی نے حمد کی دھن بجانی شروع کر دی اور لوگ بلند آوازمیں بھجن گانے لگے۔ کیونکہ اس سے دل پاک صاف ہو جاتا ہے اور آدمی یوں محسوس کرنے لگتا ہے جیسے وہ گرجا سے ہو کر آرہا ہو۔ موسیقی تو یوں بھی مسحور کن ہوتی ہی ہے۔ لیکن روح کو متاثر کرنے والی ان چکنی چپڑی باتوں کے بعد تو اس نے واقعی سامعین کو روحوں کی طہارت کر دی تھی اس وقت موسیقی نے واقعی معجزہ کر دکھایا تھا۔

تھوڑی دیر بعد بادشاہ کے جبڑے پھر ہلے اور وہ بولا: اس خاندان کے عزیز دوست اگر آج رات ہمارے ساتھ کھانا تناول فرمائیں، اور مرحوم کی مٹی کو ٹھکانے لگانے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں تو میں اور میری بھتیجیاں ان کے عین مشکور رہوں گے۔" وہ خاموش ہو گیا اور چند لمحوں کے توقف کے بعد پھر بولا: میں اس بات سے بخوبی واقف ہوں کہ اگر میرا بھائی زندہ ہوتا، تو وہ کن کن لوگوں کے نام لیتا، یہ وہ نام ہیں جو اسے بہت عزیز تھے۔ اور ان ناموں کا اس نے بارہا اپنے خطوں میں ذکر کیا ہے۔ یعنی ریورینڈ مسٹر ہابسن ڈیکان لاٹ ہاوے، مسٹر بین رکر۔ ایبز ٹرنر۔ لیوی بیل، ڈاکٹر رابنسن، ان کی بیویاں اور بیوہ بارٹلے۔

ریورینڈ ہابسن، اور ڈاکٹر رابنسن قصبے کے پرلے سرے پر اکٹھے شکار کھیل رہے تھے۔ میرا مطلب ہے کہ ڈاکٹر صاحب تو ایک مریض کو راہئ ملک عدم کر رہے تھے اور پادری صاحب اس کے سفر کا انتظام کر رہے تھے۔ وکیل بیل کاروبار کے سلسلے میں لوئس ویل گیا ہوا تھا۔ ان کے سوا باقی کے سب افراد وہیں موجود تھے۔ وہ باری باری آگے بڑھے اور بادشاہ سے مصافحہ کیا اور پھر اس کا شکریہ ادا کر کے بات چیت کرنے لگے۔ اس کے بعد انہوں نے ڈیوک کے ساتھ مصافحہ کیا۔ ڈیوک کے ساتھ انہوں نے بات چیت تو کوئی نہ کی البتہ مسکرا مسکرا کر احمقوں کی طرح سر ہلاتے رہے۔ ڈیوک بھی ہاتھوں سے عجیب عجیب قسم کے اشارے کرتا رہا اور منہ سے گو۔ گو ــــ گو۔ گو کی آوازیں نکالتا رہا، بالکل اس بچے کی طرح جس نے ابھی بولنا نہ سیکھا ہو۔

خیر، بادشاہ ادھر ادھر کی بات چیت کرتا رہا اور اس طرح اس نے اس قصبے کے بارے میں ہر قسم کی معلومات حاصل کرلیں۔ حتیٰ کہ اب وہ یہاں کے ہر باشندے سے لے کر ہر کتے تک کے نام سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا۔ اور اب وہ بات چیت کے دوران میں کئی ایسے چھوٹے

موٹے واقعات کا ذکر بھی کر دیتا جو کبھی اس قصبے کو، یا جارج کے خاندان کو، یا خود ہیٹر کو پیش آئے تھے ان کا ذکر کرتے وقت وہ یہ کہنا نہ بھولتا کہ خود ہیٹر نے اسے ان کے بارے میں لکھا تھا، حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ یہ معلومات تو اس نے اس بدھو سے حاصل کی تھیں جسے کشتی میں بٹھا کر ہم سٹیم بوٹ تک لے گئے تھے۔

اس کے بعد میری جین وہ خط لے آئی جو اس کا باپ لکھ کر چھوڑ گیا تھا۔ بادشاہ نے اسے باآواز بلند پڑھا اور اس کے ایک ایک لفظ پر سر دھنا۔ اس خط کی رُو سے رہائشی مکان اور سونے کے تین ہزار ڈالر کے سکے لڑکیوں کو ملنے تھے۔ اور کارخانہ (جس کا کاروبار اچھا چل رہا تھا)، اور چند دیگر مکان، اور زمین (جن کی مالیت کوئی سات ہزار ڈالر کے قریب ہوگی) اور تین ہزار ڈالر کے سونے کے سکے ہاروے اور ولیم کے حصے میں آئے۔ اس خط میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ وہ چھ ہزار ڈالر کہاں رکھے ہیں۔ یعنی تہ خانے میں۔ فوراً یہ ٹھگ بولے: "ہم ابھی جا کر اس رقم کو لے آتے ہیں تاکہ حساب صاف ہو جائے۔ ہک! تم موم بتی لے کر ہمارے ساتھ آؤ۔"

ہم نے تہ خانے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور اس رقم کو تلاش کرنے لگے۔ بالآخر جب وہ تھیلی ان کے ہاتھ آ گئی تو انہوں نے فوراً اسے فرش پر الٹ دیا۔ کیا خوبصورت منظر تھا۔ سونے کے پیلے ہوئے سکوں کا ڈھیر ہمارے سامنے تھا۔ اتنے سارے سکوں کو دیکھ کر بادشاہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے ڈیوک کی پیٹھ تھپتھپائی اور بولا:

"واہ! واہ! یہ خواب نہیں، حقیقت ہے۔ کیوں بلج واٹر؟ اس نے اس شاہی عجوبے والے کارنامے کو بھی مات کر کے رکھ دیا ہے۔ کیوں؟ ٹھیک ہے نا؟" اور بھلا ڈیوک کو اس بات سے کیونکر انکار ہو سکتا تھا!

اس کے بعد وہ سکوں کو ہتھیلی میں لے لے کر ان کے لمس کا حظ اٹھاتے رہے۔ جب یہ سکے انگلیوں میں سے پھسل کر فرش پر گرتے تو وہ وجد کے سے عالم میں ان کی کھنکار سنتے رہتے۔ بالآخر بادشاہ بولا: "بلج، چھوڑو ان باتوں کو۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں کسی مرحوم امیر کے بھائی، اور ننھے منے وارثوں کے نمائندے بننے کا پیشہ اختیار کر لینا چاہیے۔ دیکھ لیا ناں، خدا پر توکل رکھنے کا یہ پھل ملتا ہے! خدا پر توکل

آخرکار رنگ لے ہی آتا ہے۔ میں نے بہت پاپڑ بیلے ہیں۔ لیکن اب مجھے یقین ہے کہ خدا پر توکل رکھنے سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔"

ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس ڈھیر کو دیکھ کر ہی اس کا اطمینان ہو جاتا اور وہ اس رقم کو گننے کی ضرورت نہ سمجھتا۔ لیکن صاحب یہ ٹھگ تو اسے گننے پر مصر تھے۔ جب گنتی کی گئی تو یہ رقم چار سو پندرہ ڈالر کم نکلی۔ بادشاہ بولا: "ہت تیرے کی! خدا جانے وہ مردہ مرنے سے پہلے ان چار سو پندرہ ڈالروں کو کہاں رکھ گیا ہوگا۔"

چند منٹ وہ اس نقصان پر اظہار افسوس کرتے رہے اور ادھر ادھر تلاش کرتے رہے کہ شائد یہ رقم یہیں کہیں تہ خانے میں رکھی ہو۔ تب ڈیوک بولا: "وہ بیمار تو تھا ہی۔ ممکن ہے گننے میں غلطی کر گیا ہو —— چلو چھوڑو۔ ہمیں تو اس کمی کا ذکر ہی نہیں کرنا چاہیئے۔ آخر ہماری حیثیت اتنی تو ہے کہ یہ معمولی سا نقصان برداشت کر لیں۔"

"ہاں اتنی توفیق تو ہم میں ہے ہی۔ مجھے اس نقصان کی کوئی پروا نہیں۔ میں تو صرف گنتی سے پریشان ہوں۔ بات یہ ہے کہ اس جگہ ہمیں بالکل دیانتدار اور حساب کتاب کا صاف بن کر دکھانا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اوپر جا کر اس رقم کو سب کے سامنے گنا جائے تاکہ کسی کو کوئی شک نہ رہے۔ کیونکہ جب مرحوم نے خود کہا ہے کہ یہ رقم چھ ہزار ڈالر ہے تو، ظاہر ہے کہ . . . . ."

"سنو!" ڈیوک بولا "ہم خود ہی کیوں نہ یہ کمی پوری کر دیں؟ اتنا کہہ کر وہ اپنی جیب میں سے سکے نکالنے لگا۔"

"شاباش۔ بہت اچھی تجویز ہے یہ! ڈیوک! تمہارے دماغ کی داد نہیں دی جا سکتی۔" بادشاہ بولا: "یوں لگتا کہ وہ "شاہی عجوبہ" یہاں بھی ہمارے کام آئے گا" اور یہ کہہ کر وہ بھی اپنی جیب میں سے سکے نکالنے لگا۔

ہر چند کہ اس کمی کو پورا کرنے میں ان کا دیوالہ نکل گیا پھر بھی انھوں نے چھ ہزار ڈالر پورے کر ہی دیئے۔ پھر ڈیوک بولا: "سنو، میری ایک صلاح ہے۔ ہم یہ کیوں نہ کریں کہ اوپر جا کر پہلے تو یہ رقم گن کر اس میں سے اپنا حصہ لے لیں، اور پھر یہ ساری کی ساری رقم مع اپنے حصے کے، ان لڑکیوں

کو دے دیں ؟"

"واہ واہ ڈیوک! جی چاہتا ہے تمہیں سینے سے لگا لوں۔ اس سے بہتر تجویز تو انسان کے ذہن میں آنی ممکن ہی نہیں۔ تمہارا دماغ واقعی لاجواب ہے۔ یہ سکیم تو واقعی لاثانی ہے۔ بالفرض اگر کسی کو ہماری نیت پر شک ہے بھی، تو ہماری اس حرکت سے وہ بھی رفع ہو جائے گا۔"

ہم اوپر آگئے اور جب تمام لوگ میز کے ارد گرد جمع ہو گئے تو بادشاہ نے ان سکوں کو گن گن کران کی ڈھیریاں لگانی شروع کر دیں۔ ہر ڈھیری میں تین تین سو ڈالر تھے۔ کچھ ہی دیر بعد بیس ڈھیریاں میز پر جھلمل جھلمل کرنے لگیں۔ ان ڈھیریوں کو دیکھ کر سب کے منہ سے رال ٹپکنے لگی۔ جب یہ رقم دوبارہ تھیلی میں ڈال دی گئی، تو میں نے بادشاہ کی طرف دیکھا۔ وہ ایک مختصر سی تقریر کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ اب وہ یوں گویا ہوا: "دوستو! میرے مرحوم بھائی نے، جو اس وقت اس کونے میں لیٹا ہوا ہے۔ اپنے عزیزوں کے تئیں جنہیں وہ اس غم کی وادی میں رونے دھونے کے لئے چھوڑ گیا ہے بہت فراخدلی دکھائی ہے۔ وہ ان معصوم بچیوں کے ساتھ بھی، جنہیں وہ بہت پیار کرتا تھا، اور جو اس کی موت سے یتیم اور لاوارث ہو گئی ہیں، بہت فراخدلی سے پیش آیا ہے۔ ہم جو اس کے مزاج سے واقف ہیں، یہ جانتے ہیں کہ اگر اسے یہ ڈر نہ ہوتا کہ اس سے عزیز ولیم کے اور میرے جذبات کو ٹھیس لگے گی، تو شاید وہ ساری کی ساری رقم ان بچیوں ہی کے نام کر جاتا۔ کم از کم مجھے تو اس میں مطلق شبہ نہیں کہ اگر اسے یہ یقین ہوتا کہ ہم برا نہیں مانیں گے، تو یقیناً وہ ایسا ہی کرتا۔ لہذا، اگر ہم اس کی اس نیک خواہش کے راستے میں روڑا بنیں، تو کیا ہم اس کے بھائی کہلانے کے حقدار ہوں گے؟ اور اگر ہم ان معصوم بچیوں کا پیسہ ہتھیا لیں، جنہیں وہ جان سے بھی عزیز سمجھتا تھا، تو کیا ہم ان کے چچا کہلانے کے حقدار ہوں گے؟ ــــ اگر میں ولیم کے جذبات کو سمجھتا ہوں، اور مجھے یقین ہے کہ واقعی میں ان جذبات سے واقف ہوں ــــ ٹھہرو، اس سے پوچھ ہی کیوں نہ لوں؟" ــــ وہ مڑا اور ہاتھوں سے ڈیوک کو عجیب و غریب اشارے کرنے لگا۔ پہلے تو ڈیوک احمقوں کی طرح اس کی طرف دیکھتا رہا جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا ہو۔ لیکن فوراً ہی اس نے یوں ظاہر کیا جیسے بات اس کی سمجھ میں آگئی ہے اور خوشی سے اچھل کر گوگو کرتا ہوا بادشاہ کے قریب چلا گیا اور اس کے سینے سے جا چمٹا۔ اور کوئی پندرہ بار وہ اس سے یوں بغل گیر ہوتا رہا ہے اس کے بعد

بادشاہ نے پھر مجمع کو مخاطب کیا اور بولا: "ولیم کے ردِ عمل کے بارے میں مجھے مطلق شبہ نہ تھا لیکن اب تو خیر آپ سب کو یقین ہو گیا ہو گا کہ اس کے بارے میں اس کے محسوسات کیا ہیں۔ میری جین آ، سوسن! جوآنا! ___ ادھر آؤ۔ یہ ساری کی ساری رقم تمہاری ہے۔ اور یہ اس شخص کا عطیہ ہے، جو ادھر اس کونے میں لیٹا ہوا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی روح اس بات پر خوش رہی ہو گی"

بس پھر کیا تھا۔ میری جین اس سے چمٹ گئی اور سوسن اور کٹے ہوئے ہونٹ والی لڑکی ڈیوک کے گلے لگ گئیں۔ واہ کس طرح وہ ایک دوسرے کے سینے سے چمٹے ہیں! اور کیا انہوں نے ایک دوسرے کو چوما ہے!! ایسا نظارہ میں نے زندگی بھر کبھی نہیں دیکھا۔ حاضرین کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اور وہ لوگ کچھ اس طرح ان ٹھگوں سے مصافحہ کرنے لگے جیسے ان کے بازو اکھاڑ کر ہی دم لیں گے ہر شخص کی زبان پر ایک ہی بات تھی۔ ہر کوئی یہی کہتا تھا: "خدا کے نیک بندو! تم کتنے نیک ہو۔ کوئی اور ہوتا تو یہ کچھ نہ کرتا"

اس کے بعد پھر مرحوم کا چرچا شروع ہو گیا۔ سب نے اس کی نیکیوں کا ذکر کیا اور اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ اس کی موت سے جو نقصان پہنچا ہے، وہ ناقابلِ تلافی ہے۔ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ مضبوط جبڑوں والا ایک شخص اندر داخل ہوا اور نہایت غور سے یہ سارا منظر دیکھنے لگا۔ وہ چپ چاپ ان کی باتیں سنتا رہا۔ جب وہ داخل ہوا تھا تو بادشاہ کچھ بول رہا تھا، اور لوگ اس کی باتیں سننے میں اتنے محو تھے کہ کسی نے اس نووارد کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ بادشاہ کہے جا رہا تھا:-

"کیونکہ وہ اس خاندان کے خاص عزیزوں میں سے ہیں۔ اسی لئے تو انہیں آج شام کھانے پر دعوت دی گئی ہے۔ لیکن ہماری دلی خواہش ہے کہ کل ہر شخص تشریف لائے۔ جی ہاں، ہر شخص۔ کیونکہ مرحوم ہر شخص کی عزت کرتا تھا۔ ہر شخص سے پیار کرتا تھا۔ لہٰذا مناسب یہی ہے کہ ہر شخص اس کے جنازے کے ساتھ چلے، اور ماتمی جشن میں شرکت کرے"

بس وہ اسی رو میں بولتا گیا، بولتا گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے اپنی آواز بہت بھلی لگ رہی ہو۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد وہ پھر ماتمی جشن کا ذکر لے بیٹھتا۔ آخر ڈیوک سے مزید برداشت نہ ہو سکا۔

اور اس نے کاغذ کے ایک پُرزے پر لکھا: "جشن نہیں، رسوم کہو! بیوقوف بڈھے!" بادشاہ نے اسے پڑھ کر جیب میں ڈال لیا اور کہتا چلا گیا: "بچارا ولیم! حالانکہ اسے بہت صدمہ پہنچا ہے، تاہم اس کے دل و دماغ کا توازن برقرار ہے۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ میں سب لوگوں کو جنازے میں شرکت کرنے کے لئے مدعو کروں۔ وہ چاہتا ہے کہ میں سب کو دعوت دوں۔ لیکن اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں خود بھی تو یہی کہنے جا رہا تھا۔" اس کے بعد اس نے پھر وہی پرانی رٹ شروع کر دی۔ اور بغیر جھجکے بغیر جھینپے پہلے ہی کی طرح 'جشن' کا لفظ استعمال کرتا رہا۔ لیکن تیسری بار یہی لفظ دہراتے کے بعد وہ بولا:

"لفظ 'جشن' میں جان بوجھ کر استعمال کر رہا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ یہ عام استعمال کا لفظ ہے، عام استعمال کا لفظ تو 'رسوم' ہے۔ لیکن اس لئے کہ موزوں لفظ یہی ہے۔ لفظ 'ماتمی رسوم' اب انگلستان میں مستعمل نہیں۔ اس کی جگہ 'جشن' نے لے لی ہے۔ یہ موخرالذکر لفظ بالکل برمحل ہے۔ جس لفظ کا یہ ترجمہ ہے' وہ دو الفاظ کا مرکب ہے۔ ان میں سے ایک تو یونانی لفظ ہے جس کا مطلب ہے کشادہ' یعنی کھلا۔ اور دوسرا لفظ عبرانی زبان سے ہے اور اس کا مطلب ہے بونا' ڈھانپنا' یعنی قبر میں اتارنا۔ تو اس نسبت سے 'ماتمی جشن' کا مطلب ہوا' "پبلک جلوسِ جنازہ۔"

میں نے اپنی زندگی میں بہت سی بے ہودہ باتیں سنی ہیں' لیکن ایسی بے ہودہ بات میں نے آج تک نہیں سنی۔ خیر' بادشاہ کی بات ختم ہوتے ہی وہ مضبوط جبڑوں والا شخص وہیں سب کے سامنے کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔ اس بے محل قہقہے سے ہر شخص کو صدمہ پہنچا' اور سب ایک ساتھ بول اٹھے: "کیوں ڈاکٹر' کیا بات ہے؟" ____ اور ایبنر ٹسیکلفورڈ تو اسے مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا: "کیوں رابنسن تمہیں خبر نہیں ملی؟ یہ ہاروے ولکس ہے۔"

بادشاہ بڑے تپاک سے مسکرایا اور اپنا لمبا سا ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھاتے ہوئے بولا: تو آپ ہی میرے بھائی کے عزیز دوست اور ڈاکٹر ہیں؟ میں ____"

لیکن ڈاکٹر نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور کہنے لگا: دور رکھو اپنا ہاتھ۔ تو آپ انگریزوں کے سے انداز میں بولنے کی کوشش کر رہے ہیں! ہے نا؟ قسم خدا کی' ایسی بھونڈی نقل میں نے آج تک نہیں دیکھی تو جناب پیٹر ولکس کے بھائی بنے ہیں! لیکن میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ تم لگ ٹھگ ہو!"

یہ سُن کر مجمع میں ہل چل سی مچ گئی۔ وہ ڈاکٹر کے گرد جمع ہو کر اسے سمجھانے لگے اور اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ انہوں نے ڈاکٹر کو بتایا کہ اس شخص نے اپنے ہاروے ولکس ہونے کے چالیس مختلف ثبوت دیئے ہیں۔ یہاں تک کہ اسے ہر شخص کے نام سے لے کر ہر کتے کے نام تک کا علم ہے۔ انہوں نے ڈاکٹر سے التجا کی کہ وہ اپنے برتاؤ سے ہاروے کے اور ان بچاری معصوم بچیوں کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچائے۔ وغیرہ وغیرہ ــــ لیکن ڈاکٹر اپنی بات پر اڑا رہا، اور نہایت غصے سے بولا: "اگر کوئی شخص اپنے انگریز ہونے کا سوانگ بھرتا ہے، اور ان کی زبان کی ایسی بھونڈی نقل اتارتا ہے، جیسی اس شخص نے اتاری ہے، تو وہ محض ایک ٹھگ ہے، جھوٹا ہے۔" اس پر وہ بچاری لڑکیاں بادشاہ سے چمٹ گئیں اور زار زار رونے لگیں۔ دفعتاً ڈاکٹر ان کی طرف مڑا اور یوں مخاطب ہوا:

"میں تمہارے باپ کا دوست تھا، میں تمہارا بھی دوست ہوں۔ ایک دوست کی حیثیت سے اور ایک ایسے مخلص بہی خواہ کی حیثیت سے جو تمہاری حفاظت کرنا چاہتا ہے اور تمہیں مصیبت اور خطرے سے دور رکھنا چاہتا ہے، میں تمہیں متنبہ کرتا ہوں کہ اس بدمعاش سے کنارہ کشی اختیار کر لو، اور اس سے کوئی تعلق نہ رکھو۔ یہ تو کوئی جاہل آوارہ ہے۔ اس کی یونانی اور عبرانی محض ایک تُک ہے۔ یہ تو ایک گھٹیا قسم کا بہروپیا ہے۔ خدا جانے کہاں سے اس نے یہ نام اور یہ باتیں سُن لی ہیں اور تم سمجھتی ہو کہ یہ ثبوت ہیں۔ تمہارے اس طرح ٹھگے جانے میں احمقوں کی اس بھیڑ کا بھی ہاتھ ہے۔ تم تو خیر بچے ہو، کم از کم ان لوگوں کو تو عقل سے کام لینا چاہیئے تھا۔ سنو میری جین! یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ میں تمہارا دوست ہوں، اور بے غرض دوست ہوں۔ میری بات مانو اور اس بدمعاش کو یہاں سے دفان کر دو۔ خدا کے لئے اسے چلتا کرو۔ نکالو اسے یہاں سے۔"

لیکن میری جین تن کر کھڑی ہو گئی۔ اوہ خدایا! غصے میں وہ کتنی حسین لگتی تھی! وہ بولی: "میرا جواب یہ ہے:" اور یہ کہکر اس نے وہ تھیلی بادشاہ کے ہاتھ میں دے دی اور بولی "آپ یہ چھ ہزار ڈالر لیجئے اور میری اور میری بہنوں کی طرف سے آپ کو پورا اختیار ہے کہ جہاں آپ کا دل چاہے، اس رقم کو جمع کروا دیجئے۔ ہمیں آپ سے کوئی رسید وسید نہیں چاہیئے۔"

اس کے بعد اس نے اپنا بازو بادشاہ کی کمر میں ڈال دیا، سوسن اور کٹے ہونٹ والی نے دوسری

طرف اپنے بازو حمائل کر دیئے۔ مجمع نے تالیاں پیٹیں اور لوگ فرطِ مسرت سے یوں ناچنے کودنے لگے جیسے طوفان آ رہا ہو۔ بادشاہ نے سر اوپر اٹھایا اور فخر سے مسکرانے لگا۔ ڈاکٹر بولا:

"بہت اچھا۔ اب میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن میں کہے دیتا ہوں کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب اس دن کی یاد ایک بھیانک مرض کی طرح تمہیں ستایا کرے گی۔ اور یہ کہکر وہ چلا گیا۔

"بہت خوب، ڈاکٹر صاحب" بادشاہ نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا: "اس وقت ہم آپ کو علاج کے لئے بلا بھیجیں گے"۔ ——— یہ سن کر سب ہنسنے لگے اور بولے " واہ کیا چوٹ کی ہے"!

۲۶۔ پارسا بادشاہ۔ شاہی پادری۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ کمرے میں چھپنا۔ ہک نے رقم چرائی

سب لوگوں کے چلنے کے بعد بادشاہ نے میری جین سے پوچھا " تمہارے یہاں کوئی فالتو کمرہ بھی ہے ؟" وہ بولی: " ایک کمرہ ہے وہ چچا ولیم کے لئے ٹھیک رہے گا۔ آپ کو میں اپنا کمرہ دیدوں گی کیونکہ وہ قدرے بڑا ہے۔ اور میں خود ادھر اپنی بہنوں کے کمرے میں چلی جاؤں گی اور وہیں ان کے ساتھ چارپائی پر سو رہا کروں گی۔ اس کے علاوہ اوپر مچان میں ایک طرف کو ایک چھوٹا سا کمرہ بھی ہے جس میں ایک گدا بچھا ہے"۔

بادشاہ بولا:" بس ٹھیک ہے۔ یہ کمرہ میرے خادم کے لئے ٹھیک رہے گا" خادم سے مراد میں تھا۔

اس کے بعد میری جین نے اوپر بالاخانے پر لے جا کر ہمیں ہمارے کمرے دکھا دیئے کمرے نہایت سادہ مگر اچھے تھے۔ اس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر اس کے فراک اور دوسرے کپڑوں کے کمرے میں رہنے سے چچا ہاروے کو کوئی دقت پیش آتی ہو تو وہ انہیں بھی یہاں سے لے جائیگی لیکن بادشاہ بولا:" نہیں۔ اس میں دقت کی کون سی بات ہے۔ فراک دیوار پر ٹنگے تھے اور ان کے

سامنے جھول دار کپڑے کا ایک بڑا سا پردہ لٹکا تھا، جو نیچے فرش کو چھو رہا تھا۔ ایک کونے میں ایک پرانا سا ٹرنک رکھا تھا اور دوسرے میں گٹار کا بکس۔ ان کے علاوہ بہت سی چھوٹی موٹی اشیا، جن سے لڑکیاں اپنے کمرے سجاتی ہیں، ادھر اُدھر پڑی تھیں۔ بادشاہ بولا: "ان کپڑوں اور ان چیزوں کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں اپنے ہی گھر میں ہوں۔" لہٰذا اس نے کہا کہ ان چیزوں کو ہٹانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ڈیوک کا کمرہ تھا تو چھوٹا، لیکن تھا بہت ہی اچھا۔ رہا میرا کمرہ تو وہ بھی ٹھیک ہی تھا۔

اس رات خاصی بڑی دعوت ہوئی جس میں سب مرد اور عورتیں شریک ہوئے۔ میں بادشاہ اور ڈیوک کی کرسیوں کے پیچھے کھڑا انہیں کھانا کھلاتا رہا۔ باقی لوگوں کو حبشی غلاموں نے کھانا کھلایا۔ میری جین نے میزبان کی نشست سنبھالی۔ سوسن اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ میری جین بار بار یہی کہتی رہی کہ بسکٹ اچھے نہیں بنے، مربہ ٹھیک نہیں ہے، مرغ تلتے تلتے جل کر سخت ہو گیا ہے وغیرہ وغیرہ یعنی ایسی باتیں جو عورتیں عموماً اس لیے کیا کرتی ہیں کہ مہمان کہیں: "نہیں، نہیں، یہ تو بہت لذیذ ہے۔" اور ان کی تعریف کریں۔ کھانے واقعی اچھے بنے تھے اور مہمانوں نے ان کی خوب تعریف کی۔ مثلاً: "تم بسکٹوں کا رنگ بھورا کیسے کر لیتی ہو؟" یا "اتنا لذیذ مربہ تم نے کہاں سے لیا ہے؟ ذرا ہمیں بھی تو بتاؤ۔" اور اسی قسم کی فضول سی باتیں جو لوگ عموماً دعوتوں پر کیا کرتے ہیں۔

جب دعوت ختم ہو گئی تو میں نے اور اس کٹے ہونٹ والی لڑکی نے رسوئی میں بیٹھ کر بچا کھچا کھانا کھا لیا۔ گھر کے باقی لوگ حبشیوں سے صفائی کرواتے رہے۔ وہ لڑکی مجھ سے انگلینڈ کے بارے میں سوال پوچھنے لگی اور میں ڈرنے لگا کہ اب بھانڈا پھوٹا کہ پھوٹا۔ اس نے پوچھا: "تم نے کبھی بادشاہ کو بھی دیکھا ہے؟" "کسے؟ ولیم چہارم کو؟ ہاں، دیکھا ہے۔ وہ ہمارے ہی گرجا میں تو آتا ہے۔" میں نے جواب دیا حالانکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اسے مرے برسوں ہو گئے ہیں۔ اور یہ سفید جھوٹ بولتے وقت میں ذرا بھی نہ جھجکا۔ یہ سن کر کہ وہ ہمارے ہی گرجا میں آتا ہے، وہ بولی: "واقعی؟ بلا ناغہ؟"

"ہاں۔ بلا ناغہ۔ اس کی نشست ہمارے عین سامنے ہے۔ منبر کے اُس طرف"

"لیکن میرا خیال تھا کہ وہ لندن میں رہتا ہے؟"

"ہاں، رہتا تو وہیں ہے۔ اور کہاں رہے گا؟"

"لیکن تم تو شیفیلڈ میں رہتے ہو ناں؟"

اب مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے کتنی بڑی غلطی ہوئی ہے۔ میں نے فوراً یوں ظاہر کیا جیسے میرے حلق میں مرغ کی ہڈی پھنس گئی ہو، اور کھانسنے لگا تاکہ کچھ وقت مل جائے اور میں کوئی تدبیر سوچ سکوں۔ تھوڑی دیر بعد میں بولا: "میرا مطلب ہے کہ جب بھی وہ شیفیلڈ آتا ہے، تو بلاناغہ ہمارے ہی گرجا گھر میں آتا ہے۔ اور وہ ہمارے شہر میں صرف گرمیوں کے موسم میں آتا ہے۔ سمندر میں نہانے کے لئے۔"

"تم بھی عجیب باتیں کرتے ہو۔ شیفیلڈ بھلا سمندر کے کنارے ہے؟"

"میں نے کب کہا ہے کہ شیفیلڈ سمندر کے کنارے ہے۔"

"تم نے ہی تو کہا ہے"

"نہیں۔ میں نے ہرگز نہیں کہا۔"

"تم نے کہا ہے۔"

"میں نے نہیں کہا"

"تم نے کہا ہے۔"

"میں نے ہرگز یہ بات نہیں کہی"

"اچھا تو پھر تم نے کیا کہا تھا؟"

"میں نے کہا تھا کہ وہ سمندری اشنان کرنے آتا ہے۔ بس یہی"

"تو پھر؟ اگر شیفیلڈ سمندر کے کنارے نہیں، تو وہ سمندری اشنان کرے گا کیسے؟"

"سنو!" میں نے جواب دیا "تم نے کبھی 'کانگرس جل' دیکھا ہے؟"

"ہاں۔"

"تو کیا 'کانگرس جل' لینے کے لئے کانگریس جانا پڑتا ہے۔"

"نہیں تو"

"بس سمندری اشنان کرنے کے لئے بھی یہ ضروری نہیں کہ ولیم چہارم سمندر پر ہی جائے۔"

"تو پھر وہ کرتا کیا ہے؟"

"وہی، جو لوگ 'دمانگر میں جل' کے بارے میں کرتے ہیں یعنی پیپوں میں بھر کے لانا شیفیلڈ میں اس کا جو محل ہے اس میں بھٹیاں بنی ہیں۔ وہ ہمیشہ گرم پانی سے ہی نہاتا ہے اور اتنا پانی تو سمندر کے کنارے گرم ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے لئے سامان کہاں ہے؟" "اوہ سمجھی یہ یہ بات تم نے پہلے ہی کیوں نہ کہہ دی؟ خواہ مخواہ وقت ضائع کیا۔"

اب میری جان میں جان آئی کہ چلو مصیبت ٹلی۔ میں خوش ہو ہی رہا تھا کہ وہ پوچھنے لگی۔

"تم بھی گرجا جاتے ہو گے؟"

"ہاں۔ بلاناغہ۔"

"کہاں بیٹھتے ہو؟"

"کیوں؟ اپنی نشست پر۔"

"اپنی؟ اپنی کس کی؟"

"بھئی، تمہارے چچا بارو کی۔"

"اس کی؟ کیوں؟ اسے نشست کی کیا ضرورت ہے؟"

"ہے کیوں نہیں۔ بیٹھنے کے لئے، اور کس لئے؟"

"لیکن وہ کیوں بیٹھنے لگا۔ اسے تو منبر پر کھڑا ہونا چاہئے۔"

لعنت ہو اس پر۔ میں بھول ہی گیا تھا کہ یہ حضرت پادری ہیں۔ میں نے پھر خواہ مخواہ مصیبت مول لے لی تھی۔ لہذا ایک بار پھر مجھے حلق میں ہڈی پھنس گئی تاکہ کوئی تدبیر سوچ لوں۔ تھوڑی دیر بعد میں نے جواب دیا:

"تم بھی کیسی باتیں کرتی ہو؟ تمہارا خیال ہے کہ گرجا میں صرف ایک ہی پادری ہوتا ہے؟"

"کیوں؟ ایک سے زیادہ پادریوں کا کام کیا ہے آخر؟"

"ہے کیوں نہیں۔ بادشاہ کے سامنے وعظ کرنے کے لئے ایک ہی پادری سے کہاں کام چلتا ہے؟ تم تو نری بدھو ہو۔ اس گرجا میں تو کم از کم سترہ پادری ہیں۔"

"سترہ؟!! اوہو! میں تو کبھی اتنے وعظ نہ سنوں، چاہے اس سے سیدھی جنت میں ہی

جگہ کیوں نہ ملے! انہیں سننے میں تو کم از کم ایک ہفتہ لگ جاتا ہوگا؟"

"ارے نہیں۔ سب کے سب پادری ایک ہی دن وعظ نہیں کرتے۔ وہاں تو باری مقرر ہے اور ہر آدمی اپنی باری پر وعظ کرتا ہے"

"اچھا؟ تو اس روز باقی کے پادری کیا کرتے ہیں؟"

"کچھ نہیں۔ صرف ادھر اُدھر پھرنا۔ چندہ اکٹھا کرنا۔ یا یہی کوئی چھوٹا موٹا کام۔ لیکن کوئی خاص کام نہیں"

"تو پھر انہیں رکھا کس مطلب کے لئے ہے؟"

"شان و شوکت کے لئے، تم کیا سمجھتی ہو؟"

"مجھے ایسی احمقانہ باتیں سمجھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ خیر، یہ تو بتاؤ کہ انگلستان میں نوکروں کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کیا جاتا ہے؟ ہمارے یہاں کے حبشیوں سے بہتر؟"

"اجی نہیں۔ نوکر کی تو وہاں کچھ بھی حیثیت نہیں۔ اس کے ساتھ کتوں سے بھی بدتر سلوک ہوتا ہے" "یعنی انہیں چھٹیاں بھی نہیں ملتیں، جیسے ہم یہاں اپنے نوکروں کو دیتے ہیں؟ یہی کرسمس کی چھٹیاں، نئے سال پر ایک ہفتہ کی چھٹی۔ اور چار جولائی کی چھٹی"

"تم سنتی تو ہو نہیں۔ بس اسی ایک بات سے پتہ چل جاتا ہے کہ تم نے انگلستان کبھی نہیں دیکھا۔ سنو، ہونٹ کٹی ـــــ سنو جوآنا! انگلستان میں نوکروں کو سال بھر میں ایک بھی چھٹی نہیں ملتی۔ وہ نہ تو کبھی سرکس دیکھ سکتے ہیں، نہ تھیٹر جا سکتے ہیں۔ نہ کھیل تماشہ دیکھ سکتے ہیں ـــــ وہ تو کہیں بھی نہیں جاتے"

"گرجا گھر بھی نہیں جاتے؟"

"نہیں"

"لیکن تم تو ہمیشہ گرجا جاتے ہو"

بس ایک دفعہ پھر معاملہ چوپٹ ہو گیا۔ میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ میں اس بڈھے کا نوکر ہوں۔ خیر مجھے فوراً ہی ایک بات سوجھ گئی اور میں نے کہا کہ ایک خادم کا مرتبہ نوکر سے ذرا مختلف ہوتا ہے

وہ گرجا گھر جانا چاہتا ہو یا نہ — اسے جانا ہی پڑتا ہے، اور یہی نہیں وہاں جا کر خاندان کے باقی افراد کے ساتھ ہی بیٹھنا پڑتا ہے کیونکہ یہ وہاں کا قانون ہے۔ لیکن میری اس وضاحت کے باوجود اس کی تسلی نہ ہوئی۔ اور جونہی میں نے بات ختم کی، وہ بولی: "قسم کھا کر بتاؤ، آج تم نے کتنے جھوٹ بولے ہیں۔"

"ایک بھی نہیں!" میں نے کہا۔

"ایک بھی جھوٹ نہیں؟"

"ایک بھی نہیں۔ ہرگز نہیں"

"اچھا، اس کتاب پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ۔"

جب میں نے یہ دیکھا کہ وہ کتاب محض ایک ڈکشنری ہے، تو میں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اپنا ہاتھ اس پر رکھ دیا اور قسم کھالی۔ اس سے اس کی تسلی ہو گئی اور وہ بولی:

"اچھا، تو میں کچھ کچھ یقین کئے لیتی ہوں، لیکن خدا جانے مجھے تمہاری باقی باتوں پر بھی یقین آئے گا یا نہیں۔"

"جو آ! کس بات پر یقین نہیں آرہا تمہیں؟" میری ممی نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔ اس کے پیچھے پیچھے سوسن بھی آگئی، "تمہارے لئے یہ ہرگز مناسب نہیں کہ اس کو ایسی باتیں کہو۔ یہ بدتمیزی ہے۔ یہ لڑکا یہاں اجنبی ہے اور گھر والوں سے بچھڑ کر اتنی دور یہاں آیا ہے۔ تم اس کی جگہ ہوتیں، تو کیا ایسا سلوک برداشت کرتیں؟" میری ممی نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"ممی! بس یہی تو تمہاری عادت ہے۔ ہمیشہ دوسروں کی مدد کرنے پر آمادہ رہتی ہو، چاہے ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچی بھی ہو یا نہیں۔ میں نے اسے کیا کہا ہے؟ اس کی مبالغہ آرائی پر میں نے اگر اتنا کہہ دیا کہ مجھے یقین نہیں آتا۔ تو کیا آفت آگئی۔ بس یہی کچھ کہا ہے میں نے اور میرا خیال ہے اتنی سی بات کا اسے بُرا نہیں ماننا چاہیے۔"

"بات اتنی تھی یا اُتنی۔ اس سے کیا؟ وہ یہاں مہمان ہے اور اجنبی ہے۔ لہٰذا تمہیں یوں نہیں کہنا چاہیے تھا۔ اگر اس کی جگہ تم ہوتیں۔ تو کیا تمہیں نہ بُرا لگتا؟ لہٰذا دوسروں کو ایسی بات نہیں کہنی چاہیے جس کا مقصد انہیں اپنی غلطی پر شرمسار کرانا ہو۔"

"لیکن دیدی! اس نے ....."

"اس نے کیا کہا اور کیا نہیں کہا، اس سے تمہیں کیا؟ تمہارا فرض صرف اتنا ہے کہ اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرو۔ اور ایسی باتیں مت کہو جس سے اسے یہ احساس ہو کہ وہ ایک اجنبی دیس میں اور اجنبی لوگوں کے درمیان ہے۔"

یہ سُن کر میں نے اپنے آپ سے کہا: "واہ رے ہک! ایک تُو ہے کہ اس لڑکی کو ٹھگنے میں ان بدمعاشوں کی مدد کر رہا ہے۔"

ابھی جین کی ڈانٹ ختم نہیں ہوئی تھی کہ سوسن برس پڑی اور اس نے اس بچاری ہونٹ کٹی کو اتنا سخت سست کہا کہ وہ مارے خفت کے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔

اور میں نے پھر اپنے آپ سے کہا: "واہ رے ہک! اور ایک تو ہے کہ اس لڑکی کو ٹھگنے میں ان بدمعاشوں کا ہاتھ بٹائے گا۔"

اس کے بعد ایک بار پھر میری جین نے اس لڑکی کو ڈانٹ ڈپٹ کی اور پھر ہنستی مسکراتی رسوئی کے اندر آ گئی۔ میری جین ہر وقت ہنستی مسکراتی رہتی تھی۔ لیکن اس لعن طعن سے اس ہونٹ کٹی کی وہ بُری حالت ہوئی کہ بچاری پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"اچھا! اب تم اس سے معافی مانگ لو۔" وہ لڑکیاں بولیں۔

اس نے مجھ سے معافی مانگ لی۔ اور معافی بھی اس انداز سے مانگی کہ میرا جی چاہنے لگا کہ میں ہزار بار اور جھوٹ بولوں تاکہ یہ لڑکی ایک بار پھر یوں ہی مجھ سے معافی مانگے۔ اور میں نے اپنے آپ سے کہا: "ہک! اور یہ تیسری لڑکی ہے جسے ٹھگنے میں تم ان کی مدد کر رہے ہو۔"

جب وہ معافی مانگ چکی تو وہ سب یوں ہنس ہنس کر بے تکلفی سے باتیں کرنے لگیں کہ مجھے بے اختیار یہ محسوس ہونے لگا جیسے میں اپنے ہی عزیز و اقارب میں بیٹھا ہوں۔ مجھے بہت تاسّف ہوا اور میں خود اپنی نظروں میں اس قدر گر گیا کہ میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ جیسے بھی ہوگا، میں اس رقم کو کسی ایسی جگہ چھپا دوں گا، جس سے یہ ان بدمعاشوں کے ہاتھ نہ آئے۔

تھوڑی دیر بعد میں نیند کا بہانہ کر کے رسوئی سے باہر آ گیا۔ آپ سمجھیں گے کہ میں نے پھر جھوٹ بول دیا۔

لیکن یہ جھوٹ تو نہ تھا۔ میں نے یہ کب کہا تھا کہ میں ابھی جا کر سو جاؤں گا۔ میں نے تو صرف اتنا کہا تھا کہ مجھے نیند آ رہی ہے۔ بہر حال، باہر آ کر میں نے اس معاملے پر خوب غور کیا۔ میں نے سوچا: ''اگر میں ڈاکٹر کے پاس چلا جاؤں اور چپکے سے سارا راز ظاہر کر دوں، تو —؟ لیکن نہیں اس سے کام نہیں چلے گا۔ اگر اس نے میرا نام لے دیا کہ یہ راز میں نے اسے بتایا ہے، تو بادشاہ اور ڈیوک مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ —— چپکے سے میری جین کو ساری بات بتا دوں؟ —— نہیں۔ یہ بھی مناسب نہیں۔ اگر اس کے چہرے سے یہ بات ذرا بھی عیاں ہو گئی، تو یہ ٹھگ اس رقم کو لے کر کھسک جائیں گے۔ اور اگر میری جین نے شور مچایا، تو میں بھی خواہ مخواہ پھنس جاؤں گا۔ لہٰذا ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ میں خود ہی کسی نہ کسی طرح وہ رقم چرا لوں، اور چراؤں بھی ایسی ترکیب سے کہ انہیں مجھ پر مطلق شبہ نہ ہو۔ یہاں یہ ٹھگ خوب کھل کھیلیں گے اور تب تک یہاں سے نہیں ٹلیں گے جب تک کہ اس شہر اور اس کے باشندوں کو پوری طرح ٹھگ نہ لیں۔ لہٰذا ابھی میرے لئے کافی وقت ہے۔ میں اس رقم کو چرا کر کہیں چھپا دوں گا۔ اور یہاں سے رخصت ہو کر جب ہم کافی دور جا پہنچیں گے۔ تو میں میری جین کو ایک خط لکھ کر بتا دوں گا کہ یہ رقم کہاں رکھی ہے۔ اگر ممکن ہو تو آج ہی کیوں نہ اس رقم کو چرا لوں ہو سکتا ہے ڈاکٹر کو کچھ اور بھی باتوں کا علم ہو، اور اس کے ڈر سے یہ لوگ جلد از جلد بھاگ جائیں!''

خیر، میں نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے ان کے کمروں کی تلاشی لی جائے۔ اوپر ہال میں اندھیرا تھا۔ تاہم ڈیوک کا کمرہ ڈھونڈنے میں مجھے کوئی خاص دقت پیش نہ آئی۔ کمرے میں جا کر میں ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگا۔ لیکن دفعتاً مجھے خیال آیا کہ بادشاہ ان لوگوں میں سے نہیں، جو رقم کو دوسروں کی نگرانی میں چھوڑ دیتے ہیں۔ رقم تو اس نے اپنے ہی پاس رکھی ہو گی۔ لہٰذا میں نے فوراً اس کے کمرے کا رخ کیا اور وہاں ادھر ادھر ٹٹولنے لگا۔

اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا اور اتنی جرأت مجھ میں تھی نہیں کہ روشنی کروں۔ میں نے سوچا کوئی دوسری ترکیب سوچنی چاہیئے۔ یعنی جب وہ آئیں تو میں چپکے سے یہیں بیٹھا ان کی باتیں سنتا رہوں۔ لیکن اسی وقت باہر ان کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور میں فوراً پلنگ کی طرف بڑھا تاکہ اس کے نیچے چھپ جاؤں۔ لیکن میرا اندازہ غلط نکلا۔ پلنگ اس جگہ نہیں تھا،

جہاں میرے خیال میں اسے ہونا چاہیئے تھا۔ خیر، اس افراتفری میں وہ پردہ جس کے پیچھے میری جین کے فراک رکھے تھے، میرے ہاتھ آگیا۔ میں فوراً اس کے پیچھے جا کر کپڑوں کے درمیان چھپ گیا اور سانس روک کر انتظار کرنے لگا۔

اندر آکر انہوں نے دروازہ بند کیا اور اس کے فوراً بعد ڈیوک نے جھک کر پلنگ کے نیچے ادھر ادھر جھانکا۔ میں نے خدا کا شکر کیا کہ میں اس وقت پلنگ کے نیچے نہیں تھا۔ ویسے اگر میں نے پلنگ کے نیچے چھپنے کی کوشش کی تھی، تو اس میں میرا کوئی قصور نہ تھا۔ یہ تو فطری بات ہے کہ ایسے موقع پر انسان کا دھیان سب سے پہلے پلنگ ہی کی طرف جاتا ہے۔ خیر، جب وہ بیٹھ گئے تو بادشاہ بولا:

"ہاں، اب کہو۔ اور مختصراً کہو۔ کیونکہ ہمارا فرض یہ ہے کہ اس وقت نیچے بیٹھ کر ماتم کریں، نہ کہ یہاں بیٹھ کر وقت ضائع کریں اور دوسروں کو موقع دیں کہ ہماری غیر حاضری میں ہمارے متعلق باتیں کریں۔"

"بھئی کیپٹ! بات یہ ہے کہ میں ابھی تک پریشان ہوں۔ مجھے اس ڈاکٹر سے ڈر لگتا ہے۔ کیا ارادہ ہے تمہارا؟ میری ایک تجویز ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ ہے بھی موزوں۔"

"کون سی تجویز، ڈیوک!؟"

"یہی کہ ہم تین بجے سے پہلے پہلے یہاں سے کھسک جائیں اور جو کچھ بھی ہمارے ہاتھ آگیا ہے، اسی پر قناعت کریں۔ ہمیں خدا کا شکر کرنا چاہیئے کہ اتنی ساری رقم بغیر کسی تردد کے ہمیں مل گئی۔ یوں سمجھو کہ یہ رقم اپنے آپ ہماری جھولی میں ڈال دی گئی ہے حالانکہ ہم اسے چرانے کی نیت باندھے بیٹھے تھے۔ تو پھر کیوں نہ اسی پر قناعت کر کے یہاں سے نکل چلیں۔"

یہ سُن کر مجھے بہت مایوسی ہوئی۔ اگر یہی بات وہ گھنٹہ دو گھنٹہ پہلے کرتا، تو شاید مجھے دکھ نہ ہوتا۔ لیکن اب تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی چیز میرے ہاتھوں سے چھین لی گئی ہو۔ بادشاہ نے فوراً جواب دیا:

"کیا مطلب؟ یعنی باقی کی جائداد یونہی چھوڑ جائیں؟ یعنی بیوقوفوں کی طرح [illegible] چل دیں اور آٹھ نو ہزار ڈالر کی جائیداد یہیں رہنے دیں؟ اور وہ بھی اس وقت جب ہمیں اس کے [illegible]

اور کچھ نہیں کرنا کہ اسے بیچ کر رقم وصول کرلیں۔ یہ ساری کی ساری جائداد ایسی ہے، جو فوراً بک جائیگی۔"

ڈیوک زیرِ لب کچھ بڑبڑانے لگا۔ پھر وہ بولا:

"کیوں، سونے کی تھیلی کافی نہیں؟ اس سے زیادہ لالچ ٹھیک نہیں ہوگا۔ کم از کم میرا تو جی نہیں چاہتا کہ ان یتیموں سے سب کچھ ہتھیا لیا جائے۔"

"تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو؟" بادشاہ بولا "ہم ان یتیموں سے تو اس تھیلی کے سوا اور کچھ نہیں لے رہے۔ اس جائداد میں نقصان تو ان لوگوں کا ہوگا جو اسے خریدیں گے۔ کیونکہ جونہی یہ راز کھلا کہ ہم اس جائداد کے اصل مالک نہیں ہیں (اور یہ راز ہمارے جانے کے فوراً بعد ہی کھل جائے گا) تو یہ سودا غیر قانونی مانا جائے گا اور ساری جائداد انہیں واپس مل جائے گی۔ ان یتیموں کو ان کا مکان واپس مل جائے گا، اور ان کے لئے یہی کافی ہے۔ وہ جوان ہیں، چست ہیں، اور اپنی روزی خود کما سکتی ہیں۔ انہیں کوئی خاص نقصان نہیں ہوگا۔ ذرا سوچو تو! اس دنیا میں ہزاروں ایسے لوگ بھی ہیں جو بالکل مفلس اور نادار ہیں۔ بس پھر ان یتیموں کو اور کیا چاہیئے؟"

بادشاہ کی ان باتوں کے سامنے ڈیوک بالکل لاجواب ہوگیا۔ وہ بادشاہ کے ساتھ متفق تو ہوگیا۔ تاہم اس کی ذاتی رائے ابھی تک یہی تھی کہ یہاں مزید ٹھہرنا محض حماقت ہے۔ اور خاص طور پر اس وقت جب ڈاکٹر کا خطرہ سر پر ہے۔ لیکن بادشاہ بولا:

"اجی لعنت بھیجو ڈاکٹر پر۔ ہمیں اس کی کیا پرواہ؟ کیا اس شہر کے سارے احمق ہمارے ساتھ نہیں ہیں؟ ۔۔۔ اور کسی بھی قصبے میں اتنی بھاری اکثریت کیا فیصلہ کُن نہیں ہوتی؟"

جب وہ نیچے جانے لگے، تو ڈیوک بولا: "میرا خیال ہے کہ ہم نے اس رقم کو مناسب جگہ پر نہیں رکھا"

یہ سن کر میں بہت خوش ہوا کیونکہ اب تک مجھے اس رقم کا کوئی سُراغ نہیں ملا تھا، اور میں تقریباً مایوس ہو چلا تھا۔

"کیوں؟" بادشاہ نے پوچھا۔

"کیونکہ آج کے بعد میری حبشن ماتمی لباس پہنا کرے گی۔ لہٰذا سب سے پہلا کام وہ یہ کرے گی کہ اس حبشی کو، جو ان کمروں کی صفائی کرتا ہے، یہ حکم دے گی کہ ان کپڑوں کو ٹرنک میں بند کر کے رکھ دے۔ اور تم جانتے ہی ہو کہ اگر حبشی کو روپیہ پیسہ نظر آئے۔ تو وہ اس میں سے کچھ نہ کچھ ضرور اُڑا لیتا ہے۔"

"ڈیوک، تم واقعی بہت ذہین ہو۔" بادشاہ بولا، اور پردے کو ٹٹولنے لگا۔ اس کے ہاتھ مجھ سے دو تین فٹ پرے ٹٹولنے میں مصروف تھے۔ میں دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ سانس رک گیا۔ میرے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ اگر انہوں نے مجھے پکڑ لیا تو۔؟ میرا دماغ کسی ایسے بہانے کو سوچنے لگا۔ جو اس موقع پر کام آسکے۔ میں ابھی بہانہ تلاش کر ہی رہا تھا کہ بادشاہ نے وہ تھیلی اٹھالی۔ اسے میری موجودگی کا مطلق علم نہ ہوا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے وہ تھیلی پلنگ کے نیچے پڑے بھوسے کے ایک پھٹے پرانے گدے کے اندر چھپا دی۔ یہ گدا ایک جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور انہوں نے یہ تھیلی دو تین فٹ آگے کر کے اچھی طرح سے بھوسے کے اندر چھپادی۔ اب وہ مطمئن تھے کیونکہ حبشیوں کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ پروں والے گدوں کی تو اچھی طرح دیکھ بھال کرتے ہیں، لیکن بھوسے کے گدوں کو سال میں ایک دو بار سے زیادہ نہیں چھیڑتے۔ لہذا اب چوری کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔

چوری کا خطرہ ہے یا نہیں۔ اس کے بارے میں میں ان کی نسبت بہتر جانتا تھا۔ ابھی وہ آدھی سیڑھیاں بھی نہیں اترے ہوں گے کہ میں نے وہ تھیلی اڑا لی۔ اور راستہ ٹٹولتا ہوا اپنی کوٹھڑی میں چلا گیا اور اسے وہاں چھپا دیا۔ میں چاہتا تھا کہ جب تک کوئی اچھا سا موقع نہیں ملتا، یہ تھیلی وہیں میرے پاس ہی رہے۔ میرا ارادہ تھا کہ موقع پا کر اسے گھر سے باہر کہیں دفنا دوں گا۔ اس میں تو کوئی شبہ نہیں تھا کہ جب انھیں تھیلی کے گم ہو جانے کا علم ہوگا، تو وہ سارے گھر کو الٹ پلٹ کر رکھ دیں گے۔

میں کپڑے اتارے بغیر بستر پر لیٹ گیا، لیکن مجھے نیند نہ آئی۔ میں اس معاملے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اس قدر بیتاب تھا کہ اگر میں چاہتا بھی، تو مجھے نیند نہ آتی۔ تھوڑی ہی دیر میں بادشاہ اور ڈیوک کے قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگی۔ میں منہ سے رضائی ہٹا کر سیڑھیوں پر ٹھوڑی رکھے یہ انتظار کرنے لگا کہ دیکھیں اب کیا گل کھلتا ہے۔ لیکن اس رات کوئی بات نہ ہوئی۔

میں تب تک انتظار کرتا رہا، جب تک کہ دیر تک جاگتے رہنے والوں کی آوازیں آتی بند نہ ہو گئیں۔ جلدی جاگنے والوں کی آوازیں ابھی آنی شروع نہیں ہوئی تھیں۔ میں چپکے سے باہر نکلا۔ اور سیڑھیاں اترنے لگا۔

۲۷- جنازہ۔ شوقِ تجسس۔ یک شنبہ۔ تربت بکری اور تھوڑا منافع

اپنے کمرے میں سے نکل کر میں ہاتھ پاؤں کے بل چلتا ہوا ان ٹھگوں کے دروازوں تک گیا اور کان لگا کر سننے لگا۔ وہ خراٹے لے رہے تھے۔ میں دبے پاؤں سیڑھیاں اتر گیا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ میں نے ڈائننگ روم کے دروازے کی دراڑ میں سے جھانکا۔ وہ لوگ جن کے ذمے لاش کی نگرانی تھی بڑے مزے سے اپنی اپنی کرسیوں پر پڑے سو رہے تھے۔ اس کمرے کا ایک دروازہ بیٹھک میں کھلتا تھا، جہاں لاش رکھی تھی۔ یہ دروازہ اس وقت کھلا تھا۔ دونوں کمروں میں موم بتیاں جل رہی تھیں۔ جب میں اور آگے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بیٹھک کا باہر والا دروازہ بھی کھلا ہے۔ اس کمرے میں پیٹر مرحوم کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ خیر، میں یہاں سے گزر کر باہر پھاٹک کی طرف ہو لیا۔ لیکن پھاٹک کو تالا لگا تھا، اور چابی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ اسی وقت میرے پیچھے کسی کے سیڑھیاں اترنے کی آواز آئی۔ میں دوڑ کر بیٹھک میں گھس گیا اور میری نظریں کسی محفوظ جگہ کو تلاش کرنے لگیں۔ لیکن اس کمرے میں اگر کوئی محفوظ جگہ تھی جہاں تھیلی چھپائی جا سکتی تھی، تو وہ تابوت تھا۔ تابوت کا ڈھکنا ایک فٹ پاؤں کی طرف سرکا ہوا تھا، اور مرحوم کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ لاش کفن میں لپٹی ہوئی تھی اور چہرے پر ایک گیلا کپڑا پڑا تھا۔ میں نے تھیلی کو تابوت میں ڈھکنے کے نیچے کھسکا کر اس جگہ پہنچا دیا جہاں مرحوم کے ہاتھ اس کی چھاتی پر بندھے تھے۔ یہ ہاتھ اس قدر سرد تھے کہ ان کے لمس ہی سے میرے جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ تھیلی چھپا کر میں دروازے کے پیچھے چھپ گیا۔

آواز جو میں نے سنی تھی، میری جین کے قدموں کی تھی۔ دبے پاؤں چلتی ہوئی وہ تابوت کے پاس گئی اور پھر دوزانو ہو کر اس کے اندر جھانکنے لگی۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ مجھے اس کی سسکیوں کی آواز سنائی تو نہ دے رہی تھی لیکن جب اس نے رومال نکال کر آنکھیں پونچھیں، تو مجھے پتہ چلا کہ وہ رو رہی ہے۔ میں چپکے سے باہر کھسک آیا۔ جب میں ڈائننگ روم کے پاس سے گزرا تو مجھے خیال آیا کہ کہیں ان پہرے داروں نے مجھے دیکھا تو نہیں۔ میں نے دراڑ میں سے اندر جھانکا لیکن وہ اسی طرح محوِ خواب تھے۔ انہوں نے کروٹ تک نہیں بدلی تھی۔

میں چپکے سے اپنے بستر میں گھس گیا۔ مجھے اپنے آپ پر بہت غصّہ آرہا تھا۔ اتنا خطرہ بھی مول لیا اور نتیجہ کیا نکلا؟ میں نے سوچا اگر یہ تھیلی یہیں پڑی رہے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ جب ہمارا بیڑا یہاں سے سو دو سو میل دور جا پہنچے گا، تب میں میری جین کو خط لکھ دوں گا اور وہ قبر کھود کر اپنی رقم واپس حاصل کرلے گی۔ لیکن تھیلی پڑی رہے، نتیجی تو؟ ہوگا یہ کہ جب ڈھکنا جوڑا جائیگا، تو یہ تھیلی خود بخود نظر آجائے گی اور واپس بادشاہ کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔ اس کے بعد کس کی مجال ہے جو اس کی شکل بھی دیکھ پائے۔ اسے دوبارہ چرانا تو دور کی بات ہے۔ جی تو بہت چاہتا تھا کہ ابھی جاکر اسے اٹھا لاؤں لیکن ہمّت نہ ہوتی تھی۔ ہر وہ منٹ جو گزرتا جارہا تھا، صبح کو قریب سے قریب تر لارہا تھا اور تھوڑی ہی دیر میں پہرے دار جاگ اٹھیں گے۔ اگر میں تھیلی نکالتا ہوا پکڑا گیا، تو سے؟ اور وہ بھی رنگے ہاتھوں! یعنی چھ ہزار ڈالر سمیت۔ اور رقم بھی چوری کی! لہٰذا میں فیصلہ کیا کہ اس جھمیلے میں نہ ہی پھنسوں تو بہتر ہوگا۔

صبح جب میں نیچے آیا تو بیٹھک کے دروازے بند تھے، اور پہرے دار جا چکے تھے۔ گھر میں صرف اس خاندان کے افراد، اور بیوہ بارٹلے، اور ہم ٹھگوں کا قبیلہ تھا۔ میں غور سے ان ٹھگوں کے چہرے دیکھے۔ لگا کہ کہیں ان کو پتہ تو نہیں چل گیا۔ لیکن ان کے چہروں پر مجھے کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔

دوپہر کے وقت تابوت بردار آیا۔ اس کے ساتھ اس کا نوکر بھی تھا۔ انہوں نے کمرے کے وسط میں دو کرسیوں کو جوڑ کر ان کے اوپر تابوت رکھ دیا۔ پھر ہمارے لئے کرسیاں لگائی گئیں۔ اس کے بعد پڑوسیوں سے کرسیاں مانگ مانگ کر لائی گئیں۔ حتٰی کہ ہال، بیٹھک، اور ڈائننگ روم میں کرسیاں ہی کرسیاں نظر آنے لگیں۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت اطمینان ہوا کہ ڈھکنے کو کسی نے نہیں چھیڑا تھا۔ پھر بھی مجھ میں اتنی ہمّت نہ ہوئی کہ اتنے سارے آدمیوں کی نظروں کے سامنے اس کے اندر جھانک کر دیکھ لوں کہ تھیلی موجود بھی ہے یا نہیں۔

اب لوگ آنے شروع ہو گئے تھے۔ تابوت کے سرہانے رکھی کرسیوں پر وہ تینوں لڑکیاں اور یہ دونوں ٹھگ بیٹھ گئے۔ تقریباً آدھ گھنٹے تک لوگوں کی ایک قطار سی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی تابوت کے پاس سے گزرتی رہی۔ وہ مرحوم کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے اور آگے بڑھ جاتے۔

کئی لوگوں کی آنکھوں سے تو دو ایک آنسو بھی ڈھلک پڑے۔ ماحول پر مکمل سناٹا اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ صرف لڑکیاں اور یہ ٹھگ سر جھکائے کبھی کبھی سسکیاں بھر لیتے اور رومال سے آنکھیں پونچھ لیتے۔ باقی سب خاموش تھے۔ ان کی سسکیوں کے علاوہ اگر کوئی آواز سنائی دیتی تھی تو وہ تھی فرش پر پیروں کے گھسٹنے کی آواز؛ یا ناک صاف کرنے کی۔ جب لوگ جنازے کے پاس ہوتے ہیں، یا گرجا گھر میں بیٹھے ہوتے ہیں، تو نہ جانے کیوں انھیں بار بار ناک صاف کرنے کی حاجت کیوں ہوتی ہے۔

جب سارا مکان لوگوں سے بھر گیا، تو تابوت بردار (جس نے سیاہ دستانے پہن رکھے تھے) مجمع میں ادھر ادھر پھر کر لوگوں کو دلاسہ دینے لگا۔ پھر اس نے تمام انتظام کا آخری جائزہ لیا۔ کچھ دیر تک اس کی نگاہیں حاضرین اور دوسری چیزوں کو ٹٹولتی رہیں۔ وہ اپنے فرائض نہایت خاموشی سے سرانجام دے رہا تھا، یوں جیسے بلّی دبے پاؤں چلتی ہے اور آہٹ تک نہیں ہونے دیتی۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا، صرف سر ہلا ہلا کر یا ہاتھ کے اشاروں سے لوگوں کو ادھر ادھر کرتا رہا یا دیر سے آنے والوں کے لئے تابوت تک پہنچنے کا راستہ بناتا رہا اور ان کے بیٹھنے کا انتظام کرتا رہا۔ جب سب انتظام ہو گیا، تو وہ واپس دیوار کے پاس اپنی جگہ پر چلا گیا۔ اس کی طرح دبے پاؤں چلنے والا اور بغیر کسی قسم کی آواز پیدا کئے کام کرنے والا شخص میں نے آج تک نہیں دیکھا، اس تمام کارروائی کے دوران بیچارہ نہایت سنجیدہ رہا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ نام کو بھی نہیں تھی۔

ایک ہارمونیم پہلے ہی سے مانگ کر رکھ لیا گیا تھا۔ یہ باجہ کچھ بے سُرا سا تھا۔ جب سب کارروائی ختم ہو گئی، تو ایک عورت اس کے پاس بیٹھ گئی اور اسے بجانے لگی۔ اس کے اندر سے عجیب و غریب قسم کی آوازیں نکلنے لگیں۔ سب لوگ آواز ملا کر گانے لگے۔ شائد پیٹر ہی واحد خوش قسمت انسان تھا جو خاموش تھا۔ اب پادری ہابسن کی باری آئی وہ نہایت دھیمی آواز میں ایک سنجیدہ سا وعظ کرنے لگا۔ اسی وقت تہہ خانے میں سے کچھ شور سنائی دیا۔ تھی تو یہ صرف ایک ہی کتے کے بھونکنے کی آواز، لیکن وہ اس قدر شور مچا رہا تھا کہ اس سناٹے میں اس کی آواز رونگٹے کھڑے کئے جا رہی تھی۔ کتا بہت دیر تک بھونکتا رہا اور پادری تابوت کے سرہانے خاموش کھڑا اس کے چپ ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ بچارا اور کرتا بھی کیا؟ ایسے ماحول میں ممکن

ہی نہ تھا کہ وہ کچھ سوچے اور بولے۔ یہ سارا منظر کچھ ایسا عجیب و غریب تھا کہ کسی کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ بالآخر لوگوں نے دیکھا کہ وہ لمبی ٹانگوں والا تابوت بردار پادری کو کچھ یوں اشارے کررہا ہے جیسے کہہ رہا ہو: "فکر مت کریں میں ابھی سب ٹھیک کئے دیتا ہوں"۔ اس کے بعد وہ جھک کر دیوار کے ساتھ یوں آہستہ آہستہ چلنے لگا کہ اس کا سر تو نظروں سے غائب تھا، صرف اس کے اٹھے ہوئے شانے لوگوں کے سروں کے اوپر نظر آرہے تھے۔ وہ یونہی آہستہ آہستہ چلتا رہا اور لمحہ بہ لمحہ وہ شور ناقابل برداشت ہوتا گیا۔ بالآخر دو دیواریں پار کرنے کے بعد وہ تہہ خانے میں اتر گیا اور اس کے ذرہی سیکنڈ بعد چابک کی آواز آئی اور کتا آخری بار چیخ کر خاموش ہو گیا۔ ماحول پر ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ اور پادری نے اپنی تقریر جہاں چھوڑی تھی وہیں سے شروع کر دی۔ دو ایک منٹ بعد تابوت بردار کی پیٹھ اور شانے دیوار کے ساتھ ساتھ کھسکتے ہوئے نمودار ہوئے۔ اور جب وہ تین دیواریں پار کر چکا، تو شانوں کو اوپر اٹھا کر سیدھا کھڑا ہو گیا اور لوگوں کے سروں کے اوپر سے گردن آگے بڑھاتے ہوئے، پادری سے بولا: "اس نے چوہا پکڑ لیا تھا"۔ اور یہ بات اس نے یوں دھیمے سے کہی جیسے اس کا گلا بیٹھا ہوا ہو، وہ سرگوشی میں باتیں کرنے پر مجبور ہو۔ اس کے بعد وہ پھر شانے جھکا کر دیوار کے ساتھ کھسکتا ہوا اپنی جگہ پر چلا گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ خبر سن کر لوگوں کی تسلی ہو گئی ہے۔ یہ تو ظاہر تھا ہی کہ لوگ وجہ جاننے کے لئے بے تاب تھے۔ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر لاگت تو کچھ آتی نہیں۔ لیکن آپ لوگوں کو خوش ضرور کر سکتے ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس قصبے میں اس تابوت بردار سے زیادہ ہر دلعزیز شخص اور کوئی نہ تھا۔

وعظ تھا تو بہت اچھا۔ لیکن تھا شیطان کی آنت کی طرح لمبا۔ اتنا طویل کہ آدمی سنتے سنتے اکتا جائے۔ پادری کے بعد بادشاہ کی باری آئی۔ اس نے بھی حسب معمول اپنی ایک عدد احمقانہ تقریر جھاڑ دی۔ خدا خدا کر کے یہ سلسلہ ختم ہوا اور تابوت بردار پیچ کس لے کر دبے پاؤں تابوت کی طرف بڑھا۔ میرے پسینے چھوٹ گئے اور میں نہایت غور سے اس کی ہر حرکت کو دیکھنے لگا۔ لیکن اس نے ڈھکنے کو ادھر ادھر کئے بغیر، اسے اوپر کھسکا کر تابوت کا منہ بند کر دیا، اور پھر آہستہ آہستہ پیچ کس دیئے جس سے ڈھکنا مضبوط ہو گیا۔ اب میرے سامنے ایک اور مسئلہ آن کھڑا ہوا۔ میں

وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ تھیلی اس میں ہے بھی یا نہیں۔ اگر کسی نے وہ تھیلی اڑالی ہو تو ــــــ؟
اور پھر جب مجھے ٹھیک طرح سے پتہ ہی نہیں تو میری جین کو خط کیسے لکھوں گا؟ اگر اس نے قبر کھدوائی
اور تھیلی وہاں نہ نکلی تو ــــــ؟ وہ میرے متعلق کیا سوچے گی؟ اس کا صرف ایک ہی نتیجہ نکلے گا اور
وہ یہ کہ مجھے ہی پکڑ کر جیل میں ڈال دیا جائے گا۔ لہذا بہتر یہی ہے کہ میں خاموش رہوں اور خط لکھنے
کا خیال ترک کر دوں۔ معاملہ کافی بگڑ گیا تھا اور سارا قصور میرا ہی تھا کہ اسے سلجھانے کی کوشش کرتے
کرتے الٹا اسے اور الجھا دیا۔ خواہ مخواہ ہی دخل در معقولات کا مرتکب ہوا۔ کاش میں اس
جھمیلے میں نہ پڑتا!

مُردے کو دفنا کر جب ہم واپس گھر پہنچے تو میں ایک بار پھر ان کے چہروں کا جائزہ لینے لگا
میں کرتا بھی کیا؟ مجھے چین تو پڑ نہیں رہا تھا۔ لیکن ان کے چہرے ایک دم سپاٹ تھے۔

شام کے وقت بادشاہ قصبے کے لوگوں سے ملاقات کرنے نکل گیا۔ وہ اس سے کافی متاثر
ہوئے اور اس نے ان کے دلوں کو جیت لیا۔ اب اس نے یہ چرچا شروع کر دیا کہ انگلستان میں اس
کے گرجا گھر کے لوگ اس کی غیر حاضری سے کافی پریشان ہوں گے۔ لہذا اسے جلد از جلد جائداد کو
ٹھکانے لگا کے واپس چلے جانا چاہیئے۔ اسے یوں جلد واپس چلے جانے کا بہت افسوس تھا۔ اور
افسوس تو قصبے کے لوگوں کو بھی تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ بادشاہ چند روز اور یہیں ٹھہرے لیکن کیا
کیا جا سکتا تھا۔ مجبوری تھی۔ بادشاہ نے یہ بھی اعلان کر دیا کہ وہ اور ولیم ان لڑکیوں کو بھی اپنے ساتھ
ہی لے جائیں گے۔ یہ سن کر لوگ بہت خوش ہوئے۔ اب لڑکیوں کے مستقبل کے بارے میں فکر
کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی، کیونکہ اب وہ اپنے ہی عزیزوں کے پاس رہیں گی۔ لڑکیاں اپنی جگہ
خوش تھیں۔ انہیں تو یہ تک یاد نہ آ رہا تھا کہ ابھی ابھی ایک دو روز پہلے ان پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا
اب انہوں نے بادشاہ کو مکمل اختیار دے دیا تھا کہ جب اور جیسے اس کا جی چاہے، جائداد کو بیچ
دے۔ وہ بچاری لڑکیاں اتنی خوش تھیں کہ انہیں یوں لٹتے دیکھ کر میرا دل تڑپنے لگا۔ لیکن میں بے بس
تھا۔ میرے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ کسی قسم کی مداخلت کر دوں۔

وقت ضائع کئے بغیر، بادشاہ نے مکان اور جائداد اور حبشیوں کی نیلامی کا اشتہار دے دیا۔

نیلامی کی تاریخ تجہیز و تکفین کے دو دن بعد مقرر کی گئی تھی۔ ہاں البتہ اگر کوئی شخص نیلامی سے پہلے ہی سودا طے کرنا چاہتا ہو، تو بھی اُسے کوئی اعتراض نہ تھا۔

جنازہ اٹھنے کے اگلے ہی دن ان لڑکیوں کے احساسِ مسرت کو پہلی ٹھیس پہنچی۔ اس روز دو تاجر ادھر آنکلے جو غلاموں کا بیوپار کرتے تھے۔ بادشاہ نے غلاموں کو ان کے ہاتھ مناسب قیمت پر بیچ ڈالا۔ قیمت ہنڈی کی شکل میں وصول کی گئی جس کی ادائیگی تین روز بعد ہونی تھی۔ غلام رخصت ہو گئے۔ دونوں بیٹے تو دریا کے منبع کی طرف میمفس شہر میں بیچ دیئے گئے اور ان کی ماں دہانے کی طرف اوورلینز میں۔ رخصت ہوتے وقت ان حبشیوں نے اور ان لڑکیوں نے رو رو کر وہ بُرا حال کر لیا کہ ان کو دیکھ کر میری اپنی حالت غیر ہونے لگی۔ لڑکیوں کا کہنا تھا کہ ان کے خواب میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ حبشیوں کا خاندان یوں بچھڑ جائے گا۔ اور اس کے افراد یک کریں ایک دوسرے سے دور چلے جائیں گے۔ ان حبشیوں اور ان لڑکیوں کو ایک دوسرے کے گلے سے چمٹ چمٹ کر رونے کا وہ منظر مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔ یہ دلدوز گریہ وزاری میری برداشت سے باہر تھی۔ پھر بھی میں خاموش رہا۔ میں نے ان ٹھگوں کا بھانڈا پھوڑ ہی دیا ہوتا لیکن مجھے یقین تھا کہ یہ سودا غیر قانونی ہے اور یہ حبشی دو ہفتے میں گھر لوٹ آئیں گے۔

اس سودے سے قصبے میں ہلچل سی مچ گئی اور فوراً بہت سے لوگوں نے آ کر یہاں تک کہہ دیا کہ ماں کو بچوں سے اس طرح جدا کرنا سراسر ظلم ہے۔ اس سے ان ٹھگوں کا ایک بار تو دم خشک ہو گیا۔ تاہم ڈیوک کے مشورے کے خلاف بادشاہ نے سودا طے کر ہی لیا۔ یہ دیکھ کر ڈیوک بہت گھبرانے لگا۔

اگلے روز نیلامی تھی۔ صبح ہی صبح ڈیوک اور بادشاہ میری میانی میں آگئے۔ ان کے چہروں سے عیاں تھا کہ ضرور کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ بادشاہ بولا:

"کل رات تم میرے کمرے میں گئے تھے؟"

"نہیں جہاں پناہ۔" (جس وقت کوئی غیر شخص پاس نہ ہوتا تھا، تو میں اسے جہاں پناہ کہہ کر ہی پکارا کرتا تھا)

"اور کل دن میں؟ یا گزشتہ رات؟"

"نہیں جہاں پناہ"

"قسم کھاؤ۔ جھوٹ مت بولنا۔"

"قسم سے جہاں پناہ۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ اس وقت کے بعد جب میری جین نے آپ کو اور ڈیوک کو آپ کے کمرے دکھائے تھے، میں نے اس کمرے میں قدم تک نہیں رکھا"

ڈیوک بولا "کسی اور کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تھا؟"

"نہیں سرکار۔ مجھے تو یاد نہیں آرہا کہ کوئی دوسرا شخص بھی آپ کے کمرے میں گیا ہو۔"

"اچھی طرح یاد کرو۔"

میں تھوڑی دیر سوچ میں غرق رہا۔ مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ میں بولا:

"ہاں، میں نے حبشیوں کو کئی بار اس کمرے میں آتے جاتے دیکھا تھا۔"

وہ دونوں اچھل پڑے۔ ایسا لگتا تھا کہ اس انکشاف کی انہیں ہرگز توقع نہیں تھی لیکن اگلے ہی لمحے مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے انہیں صرف اسی جواب کی توقع تھی۔ تب ڈیوک بولا۔

"کیا سب کے سب اس کمرے میں آجا رہے تھے؟"

"نہیں سرکار۔ سب اکٹھے تو نہیں۔ ہاں وہ اکیلے اکیلے آتے جاتے رہے تھے۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"جس روز جنازہ اٹھا تھا۔ اس روز سویرے ہی سویرے۔ ہاں البتہ بہت سویرے بھی نہیں۔ کیونکہ اس روز میں ذرا دیر سے اٹھا تھا۔ میں سیڑھیاں اتر رہا تھا جب میں نے انہیں کمرے میں کھڑے دیکھا۔"

"ہاں تو، پھر؟ جلدی بولو۔ وہ وہاں کیا کر رہے تھے؟ تمہیں ان کے انداز میں کوئی خاص بات نظر آئی؟"

"جہاں تک میرا خیال ہے، وہ کوئی خاص کام نہیں کر رہے تھے۔ دان کے انداز میں کوئی خاص بات بھی۔ اور چونکہ وہ دبے پاؤں چل رہے تھے، میں نے سمجھا شاید وہ جہاں پناہ کا کمرہ ٹھیک ٹھاک کرنے آئے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ آپ جاگ گئے ہونگے مگر جب انہوں نے دیکھا کہ آپ سو رہے ہیں تو وہ آپکو جگائے بغیر چپکے

سے کھسک گئے۔ شاید اس لئے کہ اگر آپ جاگ گئے تو ناراض ہوں گے۔"

"باپ رے ـــــ یہ بھی ایک ہی رہی"۔ بادشاہ بولا، اور ان کے چہرے ایک دم یوں زرد پڑ گئے کہ ان کی شکلیں احمقوں ایسی بن گئیں۔ ایک منٹ تک وہ سر کھجلاتے سوچتے رہے۔ اور پھر دفعتاً ڈیوک ایک مختصر سی ہنسی ہنستے ہوئے بولا: "ان حبشیوں نے تو کمال کر دیا ہے۔ ظاہر تو وہ یوں کرتے تھے جیسے انہیں یہاں سے جاتے ہوئے انتہائی دکھ ہو رہا ہے۔ اور میں بھی یہی سمجھ بیٹھا کہ انہیں واقعی یہاں سے جانے کا غم ہے۔ اور مجھ ہی پر کیا موقوف، خود تمہارا اور باقی سب لوگوں کا بھی یہی خیال تھا۔ آج کے بعد کون کہے گا کہ یہ حبشی اداکاری نہیں جانتے۔ جس قسم کی اداکاری انہوں نے اس وقت کی تھی، اس سے تو کوئی بھی آدمی دھوکہ کھا سکتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ان حبشیوں کی بدولت آدمی لکھ پتی بن سکتا ہے۔ اگر میرے پاس ایک تھیٹر اور کچھ سرمایہ ہوتا، تو واقعی میں اور کچھ نہ مانگتا۔ لیکن ہم ہیں کہ انہیں کوڑیوں کے مول بیچ دیا۔ اور لطف یہ کہ وہ کوڑیاں بھی ابھی ہاتھ نہیں لگیں۔ اچھا، بتاؤ تو وہ ہنڈی ہے کہاں؟"

"بینک میں۔ وصولی کے لئے۔ اور کہاں؟"

"پھر تو وہ ٹھیک ہی ہو گی۔ شکر ہے، ایک چیز تو ٹھیک نکلی۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا: "کیا کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے؟"

بادشاہ ایک دم میری طرف مڑا اور غصے سے بولا: "تمہیں کیا؟ تم اپنا دماغ مقفّل رکھو اور اپنے کام سے کام رکھو۔ اور جب تک اس قصبے میں ہو، اس نصیحت کو مت بھولنا، سُنا!" اس کے بعد وہ ڈیوک سے کہنے لگا: "یوں لگتا ہے کہ یہ کڑوا گھونٹ ہمیں پینا ہی پڑے گا۔ اور اس سارے معاملے کے متعلق خاموشی اختیار کرنی پڑے گی۔ مکمل خاموشی۔"

جب وہ میانی کی سیڑھی اتر رہے تھے، تو ڈیوک ایک بار پھر مختصر سی ہنسی ہنسا اور بولا:

"ترت بکری اور تھوڑا منافع ـ واقعی یہ سودا کافی منافع بخش رہا ہے! کیوں؟"

بادشاہ نے فوراً پیچھے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور غرّایا: "میں تو اپنے اور تمہارے بھلے کے لئے ہی انہیں جلدی بیچ دینا چاہتا تھا۔ اور اگر اس سودے میں کوئی نفع نہیں ہوا، تو اس میں نہ

میرا قصور ہے، نہ تمہارا۔ اور نفع تو درکنار پلّے سے سرمایہ بھی جاتا رہا"

"اگر میری بات مان لی جاتی، تو معاملہ اس کے برعکس ہوتا یعنی وہ لوگ تو یہیں ہوتے، اور ہم یہاں سے کہیں بہت دور پہنچ لئے ہوتے"

بادشاہ نے بھی جل بھن کر کچھ ایسا ہی جواب دیا، تو سہی لیکن ذرا محتاط ہو کر۔ اس کے بعد وہ پھر مجھ پر برس پڑا۔ اب کی بار میرا قصور یہ تھا کہ میں نے اسے پہلے ہی یہ اطلاع کیوں نہ دی کہ حبشی دبے پاؤں اس کے کمرے میں سے نکلے تھے کیونکہ احمق سے احمق آدمی کو بھی ان کے اس انداز سے سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ اس کے بعد وہ پاؤں پٹختا ہوا اپنے آپ کو کوستے لگا کہ اگر رات کو وہ تھوڑی دیر اور جاگ لیتا اور اپنی نیند دن میں پوری کر لیتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ اب تو اسے سبق مل گیا تھا اور اس نے قسم کھائی کہ آئندہ ایسی کوتاہی کبھی نہ ہونے دیگا۔ وہ اسی رو میں باتیں کرتے چلے گئے۔ میں بہت خوش تھا کہ کس صفائی سے میں نے سارا قصور ان حبشیوں کے سر منڈھ دیا ہے۔ اور لطف یہ کہ اس سے حبشیوں پر بھی کوئی آنچ نہیں آسکتی تھی۔

۲۸۔ انگلستان کا سفر "وحشی"۔ میری جین کی رخصتی۔ ہک کا میری جین سے بچھڑنا۔ کنسوئے، حریف آگئے

دھیرے دھیرے دن نکل آیا اور جاگنے کا وقت ہو گیا۔ تو میں سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا۔ لڑکیوں کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور میری جین ٹرنک کے پاس بیٹھی۔ اس میں کپڑے وغیرہ رکھ رہی تھی۔ وہ انگلستان جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ نہ جانے کیوں، کپڑے رکھتے رکھتے وہ رک گئی اور رونے لگی۔ اس کی گود میں ایک تہہ کیا ہوا گاؤن رکھا تھا۔ اسے روتا دیکھ کر میرا دل تڑپنے لگا۔ میں تو کیا، اسے یوں روتا دیکھ کر کسی بھی شخص کا کلیجہ پھٹ جاتا۔ میں اندر چلا گیا اور بولا:

"مس میری جین۔ آپ کسی کا دکھ نہیں دیکھ سکتیں۔ نہ ہی مجھ میں اتنی تاب ہے کہ کسی کو غمگین دیکھوں۔ بتائیے نا، بات کیا ہے؟"

اس نے اپنا دکھڑا مجھے سنایا۔ وہی حبشیوں کا قصہ انگلستان کے سفر میں اسے جو لطف آتا تھا وہ ابھی سے ختم ہو چکا تھا "یہ احساسِ گناہ کہ ماں اور بیٹوں کو ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے۔ مجھے عمر بھر خوش نہ ہونے دے گا" اس نے کہا اور زار زار رونے لگی، اور پھر بازو پھیلا پھیلا کر جیسے بین کرنے لگی: "ہائے! اب وہ کبھی ایک دوسرے کا منہ نہیں دیکھ سکیں گے"۔

"دیکھیں گے کیوں نہیں؟ ضرور دیکھیں گے اور وہ بھی تو دو ہفتے کے اندر اندر۔ مجھے اس کا پورا یقین ہے"۔ میں بولا۔

ارے! یہ میں نے کیا کہہ دیا! بغیر سوچے سمجھے میں نے منہ سے بات نکال دی تھی اور پیشتر اس کے کہ میں آنا کانی کروں، میری جین نے اپنے بازو میری گردن میں حمائل کر دیئے اور بولی: ایک بار پھر کہو۔ پھر کہو نا یہی بات"۔

اب مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے کیسی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ میں نے سوچے سمجھے بغیر کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا، بات منہ سے نکال دی تھی۔ اور وہ بھی یوں کہ بات بدلنے کی گنجائش بھی نہ رہنے دی۔ میں بولا: "مجھے ایک منٹ سوچنے دیجئے"۔ وہ وہیں بیٹھ گئی۔ بے چین، بے تاب، مضطرب — اس وقت وہ واقعی بہت حسین لگ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ میری بات سے اسے کچھ راحت ملی ہے، ویسی ہی راحت جو دکھتا دانت نکلوانے سے ملتی ہے۔ میں نے اس معاملے پر بہت غور کیا اور بالآخر میں نے اپنے آپ سے کہا: "جب آدمی ایسی الجھن میں پھنس جائے جہاں سچ کہے بنا چارہ نہ ہو تو یوں سمجھو کہ اس آدمی نے ایک بہت بڑا خطرہ مول لے لیا ہے۔ ہر چند مجھے اس کا ذاتی تجربہ نہیں... اور نہ ہی میں وثوق سے کچھ کہہ سکتا ہوں؛ لیکن میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ جو کچھ میں نے کیا ہے وہ خطرے سے خالی نہیں۔ لیکن اب میں ایک ایسی مصیبت میں پھنس چکا ہوں کہ یہاں جھوٹ کی بجائے سچ بولنے میں ہی خیریت ہے۔ اور خیریت ہی نہیں اسی میں نجات ہے۔ لیکن یہ سارا معاملہ کچھ ایسا پیچیدہ اور عجیب و غریب ہے کہ مجھے اس پر ابھی مزید غور و خوض کرنا چاہیئے" —

خیر، بالآخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ اس خطرے کو مول لے ہی لیا جائے۔ کم از کم اس معاملے میں تو سچ سچ کہہ ہی دوں۔ حالانکہ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ کوئی شخص بارود کے ڈھیر پر بیٹھ کر خود ہی

اسے دیا سلائی دکھادے اور پھر یہ سوچے کہ دیکھیں اب کیا ہو گا!

میں بولا! "مس میری جین۔ کیا آپ تین چار دن کے لئے قصبے سے باہر کسی جگہ جا سکتی ہیں؟ میرا مطلب ہے کوئی ایسی جگہ ہے جہاں آپ تین چار دن کے لئے رہ سکیں؟"

"ہاں! میں مسٹر لاتھرآپ کے ہاں چلی جاؤں گی۔ لیکن کیوں؟"

"یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ لیکن فی الحال اگر میں آپ کو اتنا بتا دوں کہ میں کیوں کہتا ہوں کہ حبشی دو ہی ہفتے کے اندر اندر پھر اکٹھے ہو جائیں گے، اور وہ بھی اسی گھر میں ——— اور اگر میں ثابت کر دوں کہ یہ ہو کر ہی رہے گا۔ تو کیا آپ چار روز کے لئے مسٹر لاتھرآپ کے ہاں چلی جائیں گی؟"

"چار دن!" وہ بولی "میں ایک سال کے لئے جانے کو تیار ہوں۔"

"تو پھر وعدہ کرو۔" میں بولا "ویسے اگر آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا، تو میں اس سے انجیل چوم کر قسم کھانے کو کہتا۔ لیکن آپ صرف وعدہ کریں۔ یہی کافی ہے۔"

وہ مسکرانے لگی۔ اس کا چہرہ جیسے سُرخ ہو گیا۔ اس وقت وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ میں نے کہا "اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دوں"

میں دروازہ بند کر کے اس کے پاس جا بیٹھا اور بولا:

"شور مت مچانا۔ بس چپکے بیٹھے رہنا اور مردوں کی طرح اسے برداشت کر لینا۔ مس میری۔ جو کچھ میں کہنے جا رہا ہوں۔ وہ سو فیصدی سچ ہے لیکن اسے سُن کر تمہیں بہت صدمہ پہنچے گا۔ لیکن اس کا کیا علاج؟ بات یہ ہے کہ تمہارے یہ چچا نرے ٹھگ ہیں اور ان کا تمہارے ساتھ کوئی رشتہ نہیں۔ اس قصے کا یہی سب سے بدترین پہلو ہے، باقی تو خیر، تم برداشت کر لو گی۔"

یہ سن کر ایک بار تو وہ چونک پڑی۔ لیکن اب جب میں دریا میں اتر ہی پڑا تھا تو چند قدم اور چلنے میں کیا مضائقہ تھا؟ میں بولتا گیا اور اس کی آنکھیں غصے سے دہکنے لگیں۔ میں نے اسے سارا قصہ سنا دیا کہ کیسے ہماری ملاقات اس بدھو سے ہوئی تھی جو سٹیم بوٹ پر سوار ہونے کے لئے جا رہا تھا، اور پھر جب میں قصے کے اس حصے پر پہنچا جب ہم ان کے مکان کے گیٹ پر پہنچے تھے اور وہ بادشاہ کے سینے سے چمٹ گئی تھی اور اس نے سولہ سترہ بار اس کا منہ چوما تھا، تو وہ یوں اچھلی جیسے اسے

بجلی چھو گئی ہو۔ اس کا چہرہ غصے سے یوں دہکنے لگا جیسے اس پر شفق کے رنگ بکھر گئے ہوں۔ وہ بولی:
"درندہ! چلو، اٹھو۔ ایک منٹ کیا ایک سیکنڈ بھی ضائع نہ کرو۔ میں ابھی ان کا منہ کالا کروا کے اور ان کے سروں پر پروں کی کلغی لگوا کر انہیں دریا میں پھنکواتی ہوں۔"
لیکن میں نے اسے ٹوک دیا اور کہا: "خیر، یہ تو ایک نہ ایک دن ہو گا ہی! لیکن تمہارا مطلب ہے کہ ملا ٹھراپ کے ہاں جانے سے پہلے یا ——؟"
"اوہ! میں بھی کس قدر آپے سے باہر ہو گئی تھی۔" وہ بولی اور پھر بیٹھ گئی۔ "جو کچھ میں نے کہا ہے اس کا برا مت ماننا —— نہیں مانو گے ناں؟" اس نے کہا اور اپنا ریشم ایسا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا اور کچھ ایسے لہجے میں معافی مانگی کہ بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا: "آپ کی بات کا برا مانوں؟ اس سے تو یہی اچھا ہے کہ مجھے موت آ جائے۔"
"مجھے خیال ہی نہ تھا کہ میں اس قدر آپے سے باہر ہو جاؤں گی۔" وہ بولی؟ "اچھا تم اپنی بات کہو۔ میں وعدہ کرتی ہوں اب بیچ میں نہیں بولوں گی۔ تم کوئی ترکیب سوچو۔ اور جو تم کہو گے، میں وہی کرونگی۔"
"خیر،" میں نے کہا "یہ دونوں نہایت خطرناک قسم کے بدمعاش ہیں اور میری بدقسمتی یہ ہے کہ چار و ناچار مجھے کچھ دن اور ان کے ساتھ سفر کرنا ہے۔ کیوں کرنا ہے؟ یہ میں آپ کو نہیں بتاؤں گا یہ درست سہی کہ اگر آپ شہر والوں پر ان کی اصلیت کا بھید کھول دیں، تو میں ان کے پنجے سے چھوٹ جاؤں گا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ایک اور شخص جس کے بارے میں آپ بالکل لاعلم ہیں بہت بڑی آفت میں مبتلا ہو جائے گا۔ اور میں اس شخص پر ہرگز آنچ نہیں آنے دوں گا۔ لہذا فی الحال ہم ان کا بھانڈا نہیں پھوڑ سکتے۔"
یہ کہتے کہتے میرے ذہن میں ایک نئے خیال نے کروٹ لی۔ شاید کوئی ایسی ترکیب نکل آئے جس سے میں اور جم دونوں ان ٹھگوں کے چنگل سے بچ نکلیں۔ یعنی ان ٹھگوں کو جیل میں بند کروا کے اگر میں اور جم بھاگ نکلیں تو ——؟ لیکن اس میں ایک الجھن تھی اور وہ یہ کہ دن کو سفر کرتے وقت اگر کوئی مجھ سے پوچھ تاچھ کر بیٹھا تو ——؟ اور پھر اب تو مجھے اکیلے ہی اس کا جواب دینا ہو گا! لہذا میں چاہتا تھا کہ جب تک رات کافی نہ گزر جائے۔ اس بارے میں کوئی قدم نہ اٹھایا جائے۔ میں بولا:

"مس میری جین! مجھے ایک تجویز سوجھی ہے۔ اور اب آپ کو مسٹر لاتھراپ کے ہاں بھی زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا پڑے گا۔ لاتھراپ کا گھر یہاں سے کتنی دور ہو گا؟"

"یہی کوئی چار میل۔ اس طرف دیہات ہیں"

"پھر تو ٹھیک ہے۔" آپ اسی وقت وہاں کے لئے روانہ ہو جائیے، اور رات کو نو، ساڑھے نو بجے تک وہیں رہیے۔ پھر ان لوگوں سے کوئی بہانہ بنا دیجئے، مثلاً یہ آپ کو کوئی ضروری کام یاد آ گیا ہے، اور ان سے کہئے کہ آپ کو واپس یہاں چھوڑ جائیں۔ اگر آپ رات کے گیارہ بجے سے پہلے لوٹ آئیں تو کھڑکی میں موم بتی جلا کر رکھ دیجئے اور گیارہ بجے تک میرا انتظار کیجئے۔ اگر میں نہ آؤں تو سمجھ لیجئے کہ میں چلا گیا ہوں، اور بالکل خیریت سے ہوں۔ تب آپ قصبے کے لوگوں کو ساری بات بتا کر ان ٹھگوں کو پکڑوا دیجئے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ایسا ہی کروں گی" اس نے جواب دیا۔

"اور بالفرض اگر میں نہ جا سکوں، اور ان کے ساتھ مجھے بھی پکڑ لیا جائے، تو آپ میری صفائی میں یہ کہہ دیجئے کہ سارا بھید میں نے پہلے ہی آپ کو بتا دیا تھا۔"

"یقیناً میں تمہاری گواہی دوں گی۔ تمہارا بال بھی بیکا نہ ہونے پائے گا۔" اس نے کہا۔ اس وقت اس کے نتھنے پھڑک رہے تھے، اور اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

"اگر میں چلا گیا تو ظاہر ہے کہ میں ان لوگوں کے خلاف یہ شہادت دینے کے لئے موجود نہ ہوں گا کہ یہ ٹھگ ہیں، اور آپ کے رشتے دار نہیں۔ ویسے اگر میں یہاں موجود ہوا بھی، تو بھی میری شہادت کسی کام نہ آئے گی۔ میں زیادہ سے زیادہ یہی کہوں گا نا، کہ یہ ٹھگ ہیں، بدمعاش ہیں۔ اس شہادت کی اہمیت ہے تو سہی، لیکن اگر اس سے کہیں بہتر شہادت کا بندوبست ہو جائے، تو حرج کیا ہے؟ اور مجھ پر تو پھر بھی شک کیا جا سکتا ہے لیکن ان گواہوں کی شہادت پر کسی شخص کو شبہ نہیں ہو سکتا۔ میں آپ کو ان لوگوں کا اتا پتا بتائے دیتا ہوں۔ ذرا کاغذ پنسل تو دیجئے ـــ ہاں تو یہ رہا ان کا پتہ "شاہی عجوبہ، برکسویل"۔ اس کاغذ کو سنبھال کر رکھئے کھو نہ جائے۔ جب کبھی عدالت کو ان دونوں کے ماضی کی تفصیلات جاننے کی ضرورت پڑے تو ان سے کہئے کہ برکسویل قصبے میں یہ اطلاع بھیج دیں کہ وہ اشخاص جنہوں نے "شاہی عجوبہ" نام کا ڈرامہ کھیلا تھا، حراست میں ہیں اور ان کے خلاف شہادتیں درکار ہیں ـــ بس اتنا کہنے کی دیر ہے"

اور وہ سارے کا سارا قصبہ پلک جھپکتے میں یہاں آ پہنچے گا۔ اور آئیں گے بھی کس شان سے! ان کا خون کھول رہا ہوگا۔"

جب میں نے سمجھا کہ سارا معاملہ طے ہوگیا ہے، تو میں بولا: "نیلامی اگر ہو بھی جائے تو کیا؟ خریداروں کو رقم چکانے کے لئے کم از کم ایک دن کی مہلت ضرور ملتی ہے۔ اور یہ لوگ تب تک یہاں سے نہیں ٹلنے کے جب تک انہیں رقم وصول نہ ہو جائے۔ اگر ہماری سکیم کامیاب ہو گئی، تو ظاہر ہے کہ یہ سودا سرے نہیں چڑھے گا اور انہیں اس رقم سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ حبشیوں کے سودے میں بھی یہی خامی تھی۔ وہ سودا ہی غیر قانونی ہے۔ لہٰذا جلد ہی حبشی گھر لوٹ آئیں گے۔ ویسے بھی حبشیوں کی قیمت انہیں اتنی جلد کہاں ملے گی؟ خیر، مس میری! اب ان ٹھگوں کو نانی یاد آجائے گی۔"

"اچھا" وہ بولی "میں اب جاکر ناشتے کا بندوبست کرتی ہوں اور ادھر سے فارغ ہوتے ہی لانتھراپ کے ہاں چلی جاؤں گی۔" "لیکن مس میری جین! طے تو یہ پایا تھا کہ آپ ناشتے سے پہلے ہی روانہ ہو جائیں گی۔ بس ابھی چلی جائیے۔"

"کیوں؟"

"بھلا میں آپ کو وہاں کس مقصد سے بھیج رہا ہوں؟"

"مقصد جاننے کا تو مجھے خیال ہی نہیں آیا۔ مجھے کیا پتہ؟"

"اس لئے کہ آپ کا چہرہ بالکل ایک آئینے کی طرح ہے۔ اور آپ کے دل کی بات فوراً آپ کے چہرے سے عیاں ہو جاتی ہے۔ آپ کا چہرہ تو ایک ایسی کھلی کتاب ہے جس کی چھپائی موٹے حرفوں میں ہوئی ہو۔ آپ سمجھتی ہیں کہ جب آپ کے یہ چچا صبح بخیر کہہ کر آپ کا منہ چومیں گے، تو آپ خاموش رہیں گی"

"بس! بس! اب ان کی یاد نہ دلاؤ۔ میں ناشتے سے پہلے ہی چلی جاؤں گی۔ اور خدا ہی جانتا ہے کہ یہاں سے نکل کر مجھے کس قدر خوشی ہوگی۔ لیکن میں اپنی بہنوں کو ان ٹھگوں کے پاس کیسے چھوڑ جاؤں گی؟"

"ان کی فکر مت کیجئے۔ یہ عذاب اگر انہیں تھوڑی دیر اور سہنا پڑ جائے تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟ کیونکہ اگر آپ سب لوگ چلے گئے، تو عین ممکن ہے کہ انہیں شک ہو جائے۔ لہٰذا میں نہیں چاہتا کہ آج کے روز آپ ان ٹھگوں سے ملاقات کریں، یا اپنی بہنوں، یا کسی بھی شخص سے کوئی بات چیت

کریں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر کسی پڑوسی نے بھی آپ سے یہ پوچھ لیا کہ آپ کے چچا کیسے ہیں، تو آپ کے چہرے سے سارا بھید کھل جائے گا۔ لہٰذا مس میری جین! آپ فوراً چلی جائیے۔ میں سب بندوبست کروں گا۔ میں مس سوسن سے کہدوں گا کہ آپ کا پیار ان چچوں تک پہنچا کر انہیں یہ اطلاع دیدے کہ آپ چند گھنٹوں کے لئے آرام کرنے، یا ماحول کی تبدیلی کے لئے، یا کسی سہیلی کو ملنے گئی ہیں۔ اور آج رات تک یا کل صبح تک لوٹ آئیں گی۔"

"سہیلی کو ملنے کی بات ٹھیک رہے گی۔ لیکن میرا پیار اُن تک پہچانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"نہ سہی" میں نے کہا۔ اور ویسے بھی مس میری کو وقتی طور پر تسلی دینے کے لئے ایسا کہنے میں حرج کیا تھا؟ اتنی سی بات سے اگر وہ خوش ہو جائے، تو میرا کیا نقصان ہے؟ اور انہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے تو لوگوں کے دل کو جیتا جا سکتا ہے۔ چلو! اتنی سی بات سے میری خوش تو ہو گئی۔ خیر! میں نے کہا:

"ایک بات اور ——— وہ سکوں کی تھیلی"

"وہ تو انہی کے پاس ہے۔ اور اس بات کو یاد کر کے کہ یہ رقم کیونکر ان کے ہاتھوں میں پہنچی، مجھے اپنی حماقت پر شرم آتی ہے۔"

"بس یہیں تو آپ غلطی پر ہیں تھیلی۔ ان کے پاس نہیں"

"اچھا؟ تو پھر کس کے پاس ہے؟"

"اس کا تو مجھے بھی علم نہیں۔ ہاں البتہ مجھے اتنا ضرور پتہ ہے کہ ان کے ہاتھوں سے نکل کر یہ تھیلی میرے پاس آگئی تھی۔ اور یہ اس لئے کہ میں نے ہی اسے ان سے چرایا تھا۔ اس چوری سے میرا مقصد محض یہ تھا کہ یہ تھیلی آپ کو لوٹا دی جائے۔ مجھے یہ بھی علم ہے کہ اس تھیلی کو میں نے کہاں چھپایا تھا۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ شاید اب یہ وہاں نہ ہو۔ مجھے افسوس ہے، مس میری جین۔ نہایت افسوس ہے۔ لیکن اپنی طرف سے تو میں نے پوری کوشش کی تھی۔ یقین مانئے۔ اپنی طرف سے میں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ حتیٰ کہ میں تو رنگے ہاتھوں پکڑا بھی جانے لگا تھا۔ بس اس وقت جو جگہ سامنے نظر آئی، میں نے فوراً تھیلی وہیں چھپا دی۔ لیکن وہ جگہ بھی موزوں نہیں تھی۔"

"وہ چلو چھوڑو ——— اپنے آپ کو کیوں کوستے ہو؟ اپنے آپ کو کوسنا بہت برا ہوتا ہے۔ اور میں نہیں

نہیں یوں پشیمان نہ ہونے دوں گی۔ آخر اس میں تمہارا کیا قصور ہے؟ اچھا یہ تو بتاؤ، وہ تھیلی تم نے چھپائی کہاں تھی؟"

میں نہیں چاہتا تھا کہ اس بچاری کے زخم پھر سے ہرے ہو جائیں۔ لہذا میری ہمت نہ ہوئی کہ اسے وہ بات بتا دوں جس سے اس کے تصور میں وہ لاش اور وہ تابوت پھر سے ابھر آئیں، اور اس لاش کے پیٹ کے اوپر سکوں کی بھری تھیلی رکھی ہو۔ ایک منٹ خاموش رہنے کے بعد میں بولا:

"مس میری جین! اگر برا نہ مانو تو میں یہ بات بتانے سے انکار کر دوں؟ ہاں، ایک کام میں کر سکتا ہوں، اور وہ یہ کہ اسے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھ دوں اور اگر تم جاننا ہی چاہو، تو مسٹر لاتھراپ کے ہاں جاتے وقت راستے میں اسے پڑھ لینا۔ کیوں منظور ہے؟"

"ہاں، منظور ہے۔"

میں نے لکھا: "میں نے تھیلی تابوت میں رکھی تھی۔ جب تم رات کے وقت تابوت کے کنارے پر سر رکھ کر رو رہی تھیں، تو یہ تھیلی وہیں پڑی تھی۔ مس میری جین! اس وقت میں دروازے کے پیچھے کھڑا تھا، اور مجھے تمہاری حالت پر بے حد ترس آ رہا تھا۔"

جب میں یہ عبارت لکھ رہا تھا، تو وہ سارا منظر میرے ذہن میں کوند گیا اور اسے یاد کر کے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کس طرح وہ بچاری اکیلی رات کے وقت رو رہی تھی، جبکہ وہ بدمعاش اسی کی چھت کے نیچے بڑے مزے سے سو رہے تھے اور اسے ٹھگنے اور ذلیل کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ جب میں نے کاغذ تہہ کر کے اس کے ہاتھ میں دیا، تو اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر زور سے دبایا اور بولی: "خدا حافظ! میں بالکل ویسے ہی کروں گی، جیسا تم نے کہا ہے۔ اور اگر ہماری پھر ملاقات نہ بھی ہو سکے، تو یہ یاد رکھنا کہ تمہارا یہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔ تمہاری یاد مجھے بار بار آیا کرے گی، اور میں تمہارے لئے دعا کیا کروں گی۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

میرے لئے دعا! اگر اسے یہ علم ہوتا کہ میں کس قماش کا آدمی ہوں، تو شاید وہ اتنی بڑی ذمہ داری اپنے سر نہ لیتی۔ لیکن وہ بچاری اس قدر رحمدل تھی کہ اگر اسے میری اصلیت کا پتہ چل بھی

جاتا، تو بھی شاید وہ یہ بوجھ اٹھانے سے ہرگز نہ کتراتی۔ مجھے تو یہاں تک یقین ہے کہ اگر اس کے دماغ میں یہ خیال سما جاتا کہ یہوداہ کے لئے دعا کرنی چاہیئے، تو وہ شاید اس کے لئے بھی دعا کرتی رہتی۔ وہ تھی ہی ایسی۔ بس جو فیصلہ ایک بار کر لیا، اس سے پیچھے نہیں ہٹنا۔ آپ خواہ کچھ بھی کہیں، لیکن میں تو سمجھتا ہوں کہ اس لڑکی کے اندر وہ حوصلہ تھا جو آپ کو شاید ہی کسی اور لڑکی میں ملے۔ حوصلہ اور جرأت تو اس میں کوٹ کوٹ کر بھرے تھے۔ ممکن ہے آپ اسے چاپلوسی سمجھیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ جہاں تک حسن کا، اور نیکی کا تعلق ہے، وہ ان میں بھی سب کو مات کئے دیتی تھی۔

اس وقت کے بعد جب وہ دروازے سے باہر نکلی تھی، میری اس سے پھر ملاقات نہیں ہوئی لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نے اُسے لاکھوں بار یاد کیا ہو گا۔ اس کی یہ بات کہ وہ میرے لئے دُعا کرے گی، بار بار میرے ذہن میں ابھر آتی ہے۔ اگر مجھے یہ یقین ہو کہ اس کے لئے کی گئی دُعا قبول ہو جائے گی، تو خدا گواہ ہے کہ میں یہ بھی کر گذروں۔

ہاں تو، میری جین شاید پچھلے دروازے کے راستے گئی تھی کیونکہ کسی نے اسے گھر سے نکلتے نہیں دیکھا تھا۔ جب میری ملاقات سوسن سے اور اس ہونٹ کٹی لڑکی سے ہوئی، تو میں نے پوچھا "بھلا ان لوگوں کا کیا نام ہے۔ وہ جو ادھر دریا کنارے رہتے ہیں اور جنہیں ملنے تم لوگ کبھی کبھی جایا کرتی ہو"

وہ بولیں: "ادھر تو بہت سارے لوگ ہیں، لیکن زیادہ تر ہم پراکٹرز کے ہاں ہی جاتے ہیں۔"

"شاید یہی نام بتایا تھا" میں نے جواب دیا "میں تو بھول ہی گیا تھا۔ ہاں تو، مس میری جین کہہ گئی تھی کہ وہ وہیں جا رہی ہے۔ وہ بہت جلدی میں تھی۔ شاید ان کے ہاں کوئی بیمار ہے"

"کون؟"

"یہ تو مجھے علم نہیں۔ نام بھول گیا ہے۔ شاید ــــ"

"...اگر ے ہینیر نہ ہو!"

"مجھے افسوس ہے" میں نے کہا "لیکن نام تو یہی تھا"

"یہ تو بہت بُرا ہوا۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی تو وہ بھلی چنگی تھی۔ کیا بہت بیمار ہے؟"

"بیمار! مس میری جین تو کہتی تھی کہ ساری رات ان لوگوں نے اس کے سرہانے بیٹھ کر کاٹی ہے۔ وہ تو کوئی دم کی مہمان ہے۔"

"واقعی! اسے ہوا کیا ہے؟"

مجھے فوراً ہی کوئی موزوں سا نام نہ سوجھا۔ لہٰذا میں بول اٹھا "کن سوئے۔"

"کن سوئے، تمہارا سر! جن کو کن سوئے ہوتے ہیں، ان کے سرہانے بیٹھ کر رات کاٹنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

"نہیں ہوتی؟ لیکن اس قسم کے کن سوئیوں میں ہوتی ہے۔ یہ مرض ذرا مختلف نوعیت کا ہے۔ مس میری جین کہتی تھی کہ یہ کوئی نئی قسم کا مرض ہے۔"

"نئی کیسے؟"

"کیونکہ اس کے ساتھ اور بھی بہت سی پیچیدگیاں ہیں۔"

"کیسی پیچیدگیاں؟"

"مثلاً خسرہ، اور کالی کھانسی، اور برقان، اور سرسام، اور خدا جانے کیا کیا۔"

"اوہ! اور اس پر بھی اسے کن سوئے ہی کہا جا رہا ہے۔"

"مس میری نے تو یہی کہا تھا"

"اتنی ساری بیماریاں، اور پھر بھی یہ کن سوئے ہی رہے!"

"شاید اس لئے کہ یہ ہیں ہی کن سوئے۔ شروع میں تو کن سوئے ہی تھے۔"

"مجھے تو یہ بات بالکل نہیں جچتی، یہ تو وہی بات ہوئی کہ کسی کے پاؤں کو ٹھوکر لگی اور اس کے بعد اس نے زہر پی لیا، پھر کنوئیں میں گر گیا اور اس کی گردن ٹوٹ گئی اور سر پھٹ گیا۔ اور جب کسی نے پوچھا کہ موت کیسے ہوئی؟ تو ایک احمق نے جواب دیا کہ اس کے پاؤں کو ٹھوکر لگی تھی۔ بھلا تم ہی بتاؤ کیا جچتی ہے یہ بات؟ ہرگز نہیں۔ بس یہ بات بھی نہیں جچتی —— اچھا، خیر، یہ تو بتاؤ یہ مرض متعدی ہے؟"

"متعدی؟ تم بھی کیسی باتیں کرتی ہو! کیا سراؤن متعدی ہوتا ہے؟ یعنی رات کے وقت؟ اگر ایک دندانے سے بچ نکلو، تو دوسرا فوراً آپ سے چمٹ جائے گا۔ اور جب آپ اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کریں گے، تو سارے کا سارا سراؤن آپ کے پیچھے پیچھے گھسٹتا ہوا چلا آئے گا۔ بس یہ کینسوے بھی سراؤن ہی کی طرح ہوتے ہیں۔ اور یہ ان سراؤں میں سے نہیں، جو جلدی خلاصی کر دیتے ہیں۔ اس کے دندانے تو ساری عمر چمٹے ہی چلے جائیں گے۔" "اچھا! تب تو بہت برا ہوا" ہونٹ کٹی بولی "میں جا کر چچا پارو سے ——"

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں!" میں نے کہا "ضرور ضرور۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرتا"

"کیوں؟"

"ذرا دھیان سے سوچو۔ شاید بات تمہاری سمجھ میں آ جائے۔ یہ تو تمہیں علم ہے ہی کہ تمہارے چچیوں کو جلد از جلد انگلستان پہنچنا ہے۔ وہ اتنے کمینے تو ہیں نہیں کہ خود چلے جائیں اور تم لوگوں کو یہیں چھوڑ جائیں تاکہ تم بعد میں آ جاؤ۔ وہ تو تمہیں ساتھ لے کر ہی جائیں گے۔ خیر، یہ تو ہوا ایک رُخ۔ اب دوسرا رُخ یہ ہے کہ تمہارا چچا پارو سے پادری ہے۔ ہے نا؟ بھلا یہ تو بتاؤ کہ کیا کوئی پادری جہاز کے کلرک کو یا سٹیم بوٹ کے کلرک کو دھوکہ دے کر مس میری جین کو جہاز پر ساتھ لے جائے گا؟ یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولے گا۔ تو پھر وہ کیا کرے گا؟ یہی کہے گا نا، کہ "میری عدم موجودگی میں گرجا گھر کا انتظام خراب تو ہوگا ہی، لیکن میں کیا کروں؟ میری بھتیجی کینسوے والے مریض کے پاس سے ہو کر آئی ہے لہٰذا میرا فرض ہے کہ یہیں انتظار کروں۔ اور تین مہینے یہیں بیٹھا رہوں تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ کہیں اس لڑکی پر مرض کا اثر تو نہیں" —— خیر، میں تو یونہی کہہ رہا تھا۔ ویسے تمہاری مرضی ہے۔ چاہو تو اپنے چچا کو بتا دو ——"

"اور پھر یہیں پڑی سڑتی رہوں! یعنی اس وقت جب ہمیں انگلستان میں ہونا چاہیے ہم یہاں بیٹھے یہ انتظار کرتے رہیں کہ آیا میری جین پر مرض کا اثر ہے یا نہیں؟ تم بھی بالکل احمقوں جیسی باتیں کرتے ہو!"

"چلو چچا کو نہ سہی۔ کم از کم تم پڑوسیوں کو یہ خبر سنانے کے لئے تو بیتاب ہو گی ہی۔"

"واہ! یہ بھی ایک ہی رہی۔ تمہارے احمق ہونے میں رتی بھر شک کی گنجائش نہیں تمہیں اتنی بھی سمجھ نہیں کہ اگر پڑوسیوں کو پتہ چل گیا، تو وہ لوگ ضرور چچا کو بتا دیں گے۔ بس اس کا تو ایک ہی طریقہ ہے۔ یعنی منہ کو سی لینا۔"

"ہاں، شائد یہی ٹھیک ہے۔ تم واقعی ٹھیک کہتی ہو۔"

لیکن چچا ہارڈے کو یہ تو بتا دینا چاہئیے کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے باہر گئی ہے تاکہ وہ پریشان نہ ہوں۔"

"ہاں، مس میری جین کہہ بھی گئی تھی کہ میری بہنوں سے کہنا کہ چچا ہارڈے اور ولیم کو میرا پیار دیں اور ان کا منہ چومیں، اور پھر انہیں یہ اطلاع دے دیں کہ میں دریا پار مسٹر ــــ مسٹر ــــ کیا نام ہے اس اچھے سے خاندان کا، جس کا ذکر تمہارا چچا پیٹر اکثر کیا کرتا تھا؟ ــــ میرا مطلب ہے۔ وہ ــــ وہ ــــ وہ"

"شائد تم ایپتھارپ کا ذکر کر رہے ہو؟"

"ہاں ہاں وہی۔ ایسے ناموں کو یاد رکھنا بھی کتنا مشکل کام ہے۔ ہاں تو ان سے کہنا کہ میری جین اس کے ہاں گئی ہے تاکہ مسٹر ایپتھارپس سے کہے کہ وہ ضرور نیلامی میں آ کر اس مکان کو خرید لے۔ کیونکہ چچا پیٹر کی خواہش بھی یہی تھی کہ بجائے اس کے کہ کوئی غیر شخص اس مکان کو خریدے مسٹر ایپتھارپس اسے خرید لے تو بہتر ہے۔ مس میری تب تک وہاں سے واپس نہیں لوٹے گی جب تک وہ آنے کا وعدہ نہ کرے۔ اور اس کے بعد اگر وہ بہت تھکی ہوئی نہ ہو، تو شام تک لوٹ آئے گی، ورنہ کل صبح تو ضرور ہی پہنچ جائے گی۔ مس میری یہ بھی کہہ گئی تھی کہ انہیں یہ مت کہنا کہ میں پراکٹرز ہاں گئی ہوں۔ صرف ایپتھارپس کا ہی نام لینا۔ اور اس میں کوئی جھوٹ بھی نہیں۔ کیونکہ وہ ان کے ہاں جا کر ان سے مکان خریدنے کے لئے ضرور کہے گی۔ اس نے خود ہی تو مجھ سے یہ کہا تھا"

"اچھا، اچھا" وہ دونوں بولیں۔ اور باہر جا کر اپنے چچوں کا انتظار کرنے لگیں، تاکہ انہیں پیار دے کر یہ اطلاع ان تک پہنچا دیں۔

اب سب معاملہ ٹھیک ٹھاک ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ لڑکیاں کسی سے بھی اس بات

کا ذکر نہیں کریں گی، کیونکہ انہیں انگلستان جانے کی جلدی تھی۔ اور جہاں تک بادشاہ اور ڈیوک کا تعلق ہے، وہ اپنی جگہ خوش ہوں گے کہ میری جین خود جا کر نیلامی کے لئے گاہک اکٹھے کر رہی ہے۔ کیونکہ اگر وہ یہاں رہتی تو کسی وقت بھی اس کی ملاقات ڈاکٹر رابنسن سے ہو سکتی تھی۔ میں اپنی جگہ خوش تھا کہ میری سکیم سو فی صدی کامیاب ہو رہی ہے۔ شاید ٹام سائر بھی اس موقع پر اس سے بہتر سکیم نہ سوچ پاتا۔ ہاں البتہ وہ اس میں ایک متحدہ انداز ضرور پیدا کر دیتا۔ لیکن میں کیا جانوں یہ انداز و نداز۔ میں اس ماحول میں تو پلا نہیں تھا جہاں ہر چیز سٹائل سے ہوتی ہے!

سہ پہر کے فوراً بعد چوک میں نیلامی شروع ہو گئی۔ یہ نیلامی خاصی دیر تک چلتی رہی اس بڈھے کی شخصیت پورے جلال میں تھی۔ وہ نیلام کرنے والے کے ساتھ ساتھ رہتا، اور موقع دیکھ کر ایک دو آئتیں انجیل کی بول دیتا یا کوئی برمحل کہاوت سنا دیتا۔ ڈیوک گوگو کرتا ادھر ادھر پھیر رہا تھا اور لوگوں کی ہمدردی حاصل کئے جا رہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں کو جیتنے کا اس سے بہتر نسخہ اور کوئی نہیں جانتا تھا۔

بالآخر نیلامی ختم ہوئی اور سب چیزیں ایک ایک کر کے بک گئیں۔ صرف قبرستان میں زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بکنا باقی تھا۔ لیکن ان ٹھگوں کو چین کہاں۔ انہیں تو اس ٹکڑے کو بھی کسی نہ کسی کے ہاتھ بیچنا تھا۔ بادشاہ سے زیادہ حریص شخص میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ وہ تو یہ چاہتا تھا کہ سب کچھ ہڑپ کر جائے —— نیلامی ابھی جاری تھی کہ ایک سٹیم بوٹ آ کر قصبے میں رکی اور دو ہی منٹ بعد لوگوں کی ایک بھیڑ سیٹیاں بجاتی، شور مچاتی، اور قہقہے لگاتی ادھر سے گزری "لیجئے حریف بھی آ گئے۔ یہ رہے پیٹر ولکس کے وارثوں کی دو جوڑیاں۔ ایک دوسرے سے بالکل مختلف بس قیمت دیجئے، اور جو جوڑی آپ کو پسند ہو اسے لے جائیے۔" مجمع نیلامی کا مذاق اڑا رہا تھا۔

۲۹- رشتہ داری کے نئے دعویدار — چوری کی اطلاع - ہینڈ رائٹنگ کا مسئلہ - گڑامردہ اکھاڑنا - ہک کا نچ نکلنا-

یہ جلوس دو اجنبیوں کو ساتھ لئے آرہا تھا- ان میں سے ایک شخص بوڑھا تھا لیکن نہایت باوقار شخصیت کا حامل تھا- دوسرا نسبتاً کم عمر تھا لیکن تھا وہ بھی خوبرو- اس کے ایک ہاتھ پر پٹی بندھی تھی- کیا قابل دید نظارہ تھا! لوگوں کی ایک بھیڑ، چیختی، چلاتی، شور مچاتی، ہنستی ٹھٹھے اڑاتی، انہیں اپنے ساتھ لئے آرہی تھی- میں نے دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ یہ موقع مذاق کا نہیں- میرا خیال تھا کہ بادشاہ اور ڈیوک بھی اس منظر کو دیکھ کر کافی پریشان ہوں گے، اور ان کے چہرے زرد پڑ جائیں گے- لیکن نہیں صاحب! وہاں تو کچھ بھی اثر نہ تھا- ان کے چہرے پر پریشانی تو نام کو نہیں تھی- ڈیوک نے یہ تو سمجھ لیا تھا کہ معاملہ کیا ہے، لیکن اس نے اپنے شبہات کو بالکل ظاہر نہ ہونے دیا اور یوں خوش خوش ادھر اُدھر پھرتا گو گو، کرتا رہا جیسے لوٹے میں سے لسّی نکلتے وقت گڑ گڑ کی آواز آتی ہے- جہاں تک بادشاہ کا تعلق تھا، وہ ان نو واردوں کو نہایت افسردگی کے ساتھ یوں ٹکٹکی لگائے تکتا رہا، جیسے اسے یہ جان کر بڑا دکھ پہنچا ہو کہ اس دنیا میں ان نو واردوں جیسے ٹھگ اور اُچکے بھی موجود ہیں- اس کی یہ اداکاری واقعی بے مثال تھی- قصبے کے بہت سے معزز لوگ بادشاہ کے گرد جمع ہو گئے تاکہ اسے اپنی حمایت کا یقین دلائیں- وہ نو وارد بزرگ تو بولا گھبرایا ہوا تھا جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا ہو- اور جب اس نے بولنا شروع کیا- تو مجھے فوراً یہ احساس ہوا کہ اس کا لب و لہجہ واقعی انگریزوں جیسا ہے- یہ لب و لہجہ بادشاہ کے لب و لہجہ سے قطعاً مختلف تھا حالانکہ جہاں تک نقل کرنے کا تعلق ہے، بادشاہ نے کمال چابکدستی کا ثبوت دیا تھا- مجھے اب یہ تو یاد نہیں کہ اس بزرگ نے کہا کیا تھا، نہ میں اس کی نقل اتار سکتا ہوں لیکن بھیڑ کو مخاطب کر کے اس نے جو تقریر کی تھی، وہ کچھ اس قسم کی تھی:

"یہ سارا معاملہ کچھ ایسا عجیب و غریب ہے کہ میں تو واقعی اچنبھے میں پڑ گیا ہوں اور میری سمجھ

میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ میرے بھائی پر اور مجھ پر پہلے ہی کافی مصیبتیں آ چکی ہیں۔ اس کا بازو ٹوٹ گیا ہے اور پھر کل رات سٹیم بوٹ والوں نے غلطی سے ہمارا سامان پچھلے شہر میں ہی اتار دیا۔ میں پیٹر ولکس کا بھائی ہاروے ہوں۔ اور یہ اس کا بھائی ولیم ہے۔ بچارہ ولیم نہ تو سن سکتا ہے نہ بول سکتا ہے۔ صرف اشاروں ہی سے بات کرتا اور سمجھتا ہے۔ لیکن اب تو یہ اشارے بھی نہیں کر سکتا کیونکہ اس کا بازو ٹوٹ گیا ہے۔ ہم واقعی وہی ہیں۔ جس کا جو ہم دعوے کرتے ہیں۔ اور دو ایک دن میں جب ہمارا سامان یہاں پہنچے گا، تو میں تمام ثبوت مہیا کر دوں گا۔ لیکن تب تک میں اور کچھ نہیں کہوں گا۔ صرف ہوٹل میں بیٹھا اپنے سامان کا انتظار کرتا رہوں گا۔"

یہ کہکر وہ اور وہ نیا کھلونا وہاں سے چلے گئے۔ بادشاہ نے انہیں یوں جاتا دیکھ کر ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور بولا:

"حضرت کہتے ہیں کہ ان کا بازو ٹوٹ گیا ہے۔ لیکن عین ممکن ہے۔ یہ سب ڈھکوسلہ ہو۔ یہ بازو ٹوٹنے کا بہانہ بھی خوب رہا۔ کیونکہ اس نے تو اشاروں میں باتیں کرنی تھیں اور ممکن ہے اشارے ابھی اس نے سیکھے نہ ہوں۔ اور سنیئے! فرماتے ہیں، سامان کھو گیا ہے۔ یہ بہانہ بھی خوب ہے اور حالات کے عین مطابق ——"

یہ کہکر وہ ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔ اس کے ساتھ سارا مجمع بھی قہقہے لگا لگا کر ہنسنے لگا۔ صرف تین چار شخص ایسے تھے، جنہوں نے اس مذاق میں حصہ نہ لیا۔ ان میں ایک تو وہی ڈاکٹر تھا۔ دوسرا آدمی بھی قصبے کے شرفاء میں سے تھا اور یوں لگتا تھا کہ یہ شخص کافی جہاندیدہ ہے۔ اس کے پاس موٹے سے کپڑے کا ایک پرانی وضع کا تھیلہ سا تھا۔ یہ شخص ابھی ابھی سٹیم بوٹ پر سے اترا تھا اور ڈاکٹر سے سرگوشی میں کچھ کہہ رہا تھا۔ گاہے گاہے وہ بادشاہ کی طرف دیکھ کر سر ہلا دیتے۔ اس شخص کا نام لیوی بیل تھا۔ یہ وہی وکیل تھا جو لوئیس ویل گیا ہوا تھا۔ تیسرا آدمی خوب ہٹا کٹا تھا۔ اس نے نہایت غور سے اس بزرگ کی بات سنی تھی، اور اب اس کی توجہ بادشاہ کی باتوں پر مرکوز تھی۔ جونہی بادشاہ نے بات ختم کی، یہ آدمی بولا: "اگر تم واقعی ہاروے ولکس ہو، ذرا یہ تو بتاؤ کہ تم اس قصبے میں آئے کب تھے؟"

"جنازہ اٹھنے سے ایک روز پہلے۔"

"لیکن کس وقت؟"

"شام کو۔ یہی سورج چھپنے سے ایک دو گھنٹہ پہلے۔"

"اور یہاں پہنچے کیسے تھے؟"

"میں سنسناٹی سے "سوسن پاول" سٹیم بوٹ پر آیا تھا۔"

"جو کچھ تم کہتے ہو، اگر یہ سچ ہے، تو ذرا یہ تو بتاؤ کہ اس روز صبح صبح تم پائنٹ پر کیا کر رہے تھے؟ اُس وقت تم کشتی میں بیٹھے تھے۔"

"میں اس صبح ہرگز پائنٹ پر نہیں تھا۔"

"جھوٹ مت بولو!"

فوراً بہت سے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے اور بولے: "آپ اس بزرگ سے ایسی باتیں مت کہئے۔ اور یہ شخص بزرگ ہی نہیں، پادری بھی ہے۔"

"گولی مارو پادری کو! یہ پادری ہے؟ یہ تو ٹھگ ہے۔ مکار ہے۔ بلاشبہ یہ شخص اس صبح پائنٹ پر موجود تھا۔ میں وہیں تو رہتا ہوں۔ اس وقت میں گھر پر ہی تھا اور میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے وہاں دیکھا تھا۔ بلاشبہ یہ وہیں تھا۔ یہ ایک کشتی میں آیا تھا۔ ٹم کالنز اور ایک لڑکا اس کے ساتھ تھے۔"

یہ سُن کر ڈاکٹر فوراً بول اٹھا۔

"اچھا تو ہائنز! اگر تم اس لڑکے کو دیکھو تو اسے پہچان لوگے؟"

"شاید۔ لیکن وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔۔۔ ارے! یہی تو ہے وہ لڑکا! یقیناً وہی ہے"

اس کا اشارہ میری طرف تھا۔

ڈاکٹر بولا: "دوستو! ان نوواردوں کے متعلق ابھی میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ ٹھگ ہیں یا نہیں۔ لیکن ان لوگوں کے بارے میں شک کی مطلق گنجائش نہیں۔ یہ بلاشبہ ٹھگ ہیں۔ اگر یہ بات غلط نکلے تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔۔۔ اب ہمارا فرض یہ ہے کہ

جب تک ہم اس معاملے کی تہہ تک نہیں جاتے، یہ لوگ یہاں سے کھسکنے نہ پائیں۔ ہائنز! ادھر آؤ۔ آپ لوگ بھی آجائیے۔ میرا خیال ہے کہ ان کو لے کر ہوٹل میں چلا جائے اور ان کا اور ان نوواردوں کا آمنا سامنا کرایا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اس سے کافی دلچسپ انکشافات ہوں گے۔

مجمع کو اور کیا چاہیئے تھا؟ ایسے تماشے تو خدا انہیں روز روز دکھائے! ہاں! البتہ بادشاہ کے حامی سٹپٹا کر رہ گئے۔ خیر، ہم سب ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب شام ہو گئی تھی۔ مجھے ڈاکٹر نے قابو کیا ہوا تھا۔ اس کی گرفت قدرے ڈھیلی تھی، لیکن ایک پل کے لئے بھی اس نے میرا ہاتھ نہ چھوڑا۔

ہوٹل میں جا کر ہم لوگ ایک بڑے سے کمرے میں بیٹھ گئے۔ موم بتیاں جلادی گئیں۔ اس کے بعد ان نوواردوں کو طلب کیا گیا۔ اور کارروائی شروع کرنے سے پہلے ڈاکٹر یوں گویا ہوا:

"میں ان دونوں حضرات سے کسی قسم کا ناروا برتاؤ نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ ٹھگ ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے کچھ شریک جرم بھی یہاں ہوں! لیکن اس کے متعلق ابھی وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر واقعی کچھ لوگ ان کے ساجھی دار ہیں تو عین ممکن ہے کہ موقع ملتے ہی وہ لوگ سونے کے سکوں کی تھیلی لے اڑیں، جو پیٹر ولکس چھوڑ کر مرا ہے ——— اور اگر یہ لوگ ٹھگ نہیں تو پھر انہیں اس میں کیا اعتراض ہو گا کہ یہ تھیلی منگوا کر ہماری تحویل میں دیدیں؟ اور یہ تھیلی تب تک ہمارے پاس رہے جب تک کہ یہ لوگ اپنے دعوے کا ثبوت مہیا نہیں کر دیتے۔ کیوں؟ منظور ہے؟"

سب لوگوں نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ ظاہر تھا بسم اللہ ہی خراب ہوئی ہے تجویز یہ سنتے ہی بادشاہ نے رونی سی صورت بنالی اور بولا:

"معزز حضرات! کاش وہ رقم ہمارے پاس ہوتی! میری دلی خواہش بھی یہی ہے کہ اس سارے معاملے کی اچھی طرح چھان بین کی جائے۔ لیکن مجھے نہایت افسوس سے یہ بتانا پڑ رہا ہے کہ وہ رقم ہمارے پاس نہیں ہے۔ یقین نہ ہو تو آدمی بھیج کر کمرے کی تلاشی لے لیجئے۔"

"تو پھر گئی کہاں؟"

"جب میری بھتیجی نے وہ تھیلی میرے سپرد کی تو میں نے سیدھا اسے اپنے کمرے میں لے جا کر بکھو سے کے گدے کے اندر چھپا دیا تھا۔ ہمیں یہاں زیادہ دیر تو رکنا نہیں تھا لہٰذا اس رقم کو بنک میں جمع کروانا بیکار تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس گدے کو کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔ لیکن ہمیں ان حبشیوں کی کرتوتوں کا پتہ نہ تھا۔ ہمارا خیال تو یہی تھا کہ یہ لوگ بھی انگلستان کے نوکروں کی طرح ایماندار ہوتے ہوں گے۔ لیکن اگلے ہی روز جب میں نیچے بیٹھا تھا، تو ان حبشیوں نے تھیلی چرالی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت بھی جب میں نے ان حبشیوں کو فروخت کیا تھا، مجھے اس چوری کا علم نہ تھا۔ بس وہی اسے چرا کر لے گئے ہیں۔ حضرات! اگر آپ کو یقین نہ ہو تو میرے نوکر سے پوچھ لیجئے۔ اسے سب علم ہے۔"

"ہونہہ!" ڈاکٹر بولا۔ ظاہر تھا کہ باقی لوگوں کو بھی یہ بات کچھ جچی نہیں۔ ایک آدمی نے مجھ سے سوال کیا: "تم نے واقعی حبشیوں کو تھیلی چراتے دیکھا تھا؟"

"نہیں" میں نے جواب دیا۔ "البتہ میں نے انہیں دبے پاؤں کمرے سے نکلتے دیکھا تھا۔ اس وقت مجھے خیال ہی نہ آیا کہ انہوں نے چوری کی ہوگی۔ میں نے تو یہی سمجھا کہ شاید ان کی آہٹ سے میرا آقا جاگ اٹھا ہے۔ اور اب وہ ڈر کے مارے کھسک رہے ہیں کہ کہیں وہ ناراض نہ ہوں۔"

اس کے بعد مجھ سے اور کوئی سوال نہ پوچھا گیا۔ لیکن دفعتاً ڈاکٹر نے میری طرف مڑ کر کہا: "تم بھی انگریز ہو؟"

"جی ہاں" میں نے جواب دیا اور میرا یہ جواب سن کر بہت سے لوگ ہنسنے لگے اور بولے: "بکواس!"

اس کے بعد پوچھ تاچھ شروع ہوئی۔ ہماری حالت واقعی ناگفتہ بہ تھی۔ گھنٹوں پر گھنٹے گزر گئے لیکن لوگوں کے انہماک کا یہ عالم تھا کہ کسی کو یہ تک یاد نہ رہا کہ کھانے کا وقت بھی ہو گیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت انھیں بھوک کی بھی پروا نہیں تھی۔ بس سوالوں پر سوال ہوتے رہے۔ ایسی کڑی جرح میں نے آج تک نہیں سنی۔ پہلے تو بادشاہ سے کہا گیا کہ وہ اپنا قصہ بیان کرے۔ اس کے بعد اس بزرگ کی باری آئی۔ ان دونوں بیانوں کو سن کر ہر شخص کو یہ یقین ہو گیا کہ بزرگ سچا ہے، اور بادشاہ جھوٹا۔ ہاں اگر نہیں آیا تو صرف ان بیوقوفوں کو جو بادشاہ کی حمایت کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ اس کے بعد میری باری آئی اور مجھ سے کہا گیا کہ جو کچھ مجھے علم ہے بے کم وکاست بیان

کر دوں۔ بادشاہ نے کنکھیوں سے یوں میری طرف دیکھا گویا کہہ رہا ہو: "دیکھنا! اگر میرے خلاف کچھ کہا، تو خیر نہیں" لہٰذا میں نے خیریت اسی میں سمجھی کہ جو کچھ بادشاہ نے کہا ہے، اسی کی تائید کروں میں نے انہیں بتایا کہ ہم شیفلیڈ میں رہتے ہیں۔ اور اس کے بعد میں نے انگلستان میں رہنے والوں ولکنس بھائیوں کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ لیکن مجھے بولتے ابھی چند ہی لمحے ہوئے ہوں گے کہ ڈاکٹر کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔ اور لیوی بیل وکیل بولا:

"رہنے دو بیٹے! اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو یوں اپنے آپ کو اذیت نہ دیتا۔ تمہیں شاید جھوٹ بولنے کی عادت نہیں۔ اسی لیئے اٹک اٹک کر بول رہے ہو۔ ابھی تمہیں کافی مشق کی ضرورت ہے۔ تمہاری اداکاری کچھ خاص اچھی نہیں رہی ہے"

مجھے اپنی اس تعریف کی تو اتنی پروا نہیں تھی جتنی اس بات کی خوشی تھی کہ چلو، اس اذیت سے چھٹکارا تو ملا۔

ڈاکٹر کچھ کہتے کہتے رک گیا، اور مڑ کر وکیل سے کہنے لگا: "لیوی بیل! اگر تم اس وقت یہاں ہوتے ــــ" ابھی اس نے بات پوری بھی نہ کی تھی کہ بادشاہ نے اسے ٹوک دیا اور بولا: "تو آپ ہی ہیں، میرے بھائی کے دیرینہ دوست۔ جن کے متعلق وہ اکثر مجھے لکھتا رہا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے وکیل سے ہاتھ ملایا۔ وکیل مسکرانے لگا اور یوں ظاہر کرنے لگا جیسے اسے اس ملاقات سے واقعی بہت مسرت ہوئی ہے۔ پھر وہ اور بادشاہ تھوڑی دیر تک سب کے سامنے بات چیت کرتے رہے۔ اس کے بعد دونوں ایک طرف چلے گئے اور کچھ کھسر پھسر کرنے لگے۔ بالآخر وکیل بولا: "یہ ٹھیک ہے۔ میں تمہاری اور تمہارے بھائی کی عرضی پر مناسب کارروائی کروا دوں گا۔ پھر کسی کو اس بارے میں مطلق شک نہ رہے گا۔"

اس کے بعد کاغذ اور قلم منگوایا گیا۔ بادشاہ بیٹھ گیا اور گردن کو ایک طرف کو جھکا کر اور زبان کو دانتوں میں لے کر کاغذ پر کچھ لکھنے لگا۔ پھر قلم ڈیوک کے ہاتھ میں پکڑا دیا گیا۔ قلم کو دیکھتے ہی ڈیوک کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب ڈیوک کی ہمت جواب دے گئی۔ تاہم اس نے قلم لے لیا اور لکھنے لگا۔ اس کے بعد وکیل اس نووارد بزرگ سے مخاطب ہوا:

"آپ اور آپ کا بھائی دونوں اس کاغذ پر دو ایک سطریں لکھ کر اپنے دستخط کر دیجئے۔"

اس بزرگ نے بھی کچھ لکھا لیکن اس کی تحریر کسی کی سمجھ میں نہ آئی۔ وکیل بہت حیران ہوا اور بولا: "یہ تو واقعی بہت عجیب بات ہے!" اور یہ کہکر اس نے اپنی جیب سے بہت سے پرانے خط نکالے اور ان کا بغور معائنہ کیا۔ پھر اس نے اس بزرگ کی تحریر کا معائنہ کیا۔ اس کے بعد پھر خطوں کا معائنہ کیا اور بولا: یہ پرانے خط ہاردے ولکس کے لکھے ہوئے ہیں۔ اور یہ رہیں ان دونوں کی تحریریں۔ ایک اندھا بھی بتا سکتا ہے کہ یہ خط ان دونوں میں سے کسی نے بھی نہیں لکھے۔"

یہ سن کر بادشاہ اور ڈیوک کے چہرے اتر گئے۔ وکیل نے واقعی کمال ہوشیاری سے انہیں پھانسا تھا۔ پھر وکیل نے اس بزرگ کی طرف اشارہ کیا اور بولا: "یہ رہی ان بزرگ کی تحریر! ظاہر ہے کہ یہ خط ان کے لکھے ہوئے بھی نہیں ہیں۔ دراصل ان کی تحریر تو بس چند الٹی سیدھی لکیروں پر ہی مشتمل ہے۔ اسے تو تحریر کہنا ہی زیادتی ہو گی۔ خیر میرے پاس کچھ خط ——"

اس پر نووارد بزرگ بولا: "اگر آپ اجازت دیں تو کچھ عرض کروں۔ بات یہ ہے کہ میری تحریر میرے اس بھائی کے سوا اور کوئی نہیں پڑھ سکتا۔ اور یہی اسے نقل کرتا ہے۔ جو خط آپ کے پاس ہیں، وہ اسی کے لکھے ہوئے ہیں۔ میرے نہیں۔"

"یہ تو عجیب گورکھ دھندا ہے۔" وکیل بولا: "خیر، کوئی بات نہیں۔ میرے پاس ولیم کے لکھے ہوئے چند خط بھی ہیں۔ لہٰذا اگر آپ اس سے دو ایک سطریں لکھوا دیں، تو ہم موازنہ ——"

"لیکن وہ بائیں ہاتھ سے کیسے لکھے گا؟" بزرگ بولا: "اگر اس کا دایاں ہاتھ ٹھیک ہوتا، تو بلاشبہ آپ کو یقین ہو جاتا کہ میرے اور اپنے خط سب اسی کے لکھے ہوئے ہیں۔ آپ غور سے دیکھئے دونوں تحریریں ایک سی ہوں گی۔

وکیل نے غور سے وہ خط دیکھے، اور بولا: "لگتی تو ایک سی ہی ہیں۔ اور اگر ایک سی نہیں، تو کم از کم ان میں مشابہت واقعی غیر معمولی حد تک ہے۔ ہوں —— ں —— ں —— ہوں —— ں ۔ ۔ ۔ ۔ میرا خیال تھا کہ ان خطوں سے مسئلہ کچھ سلجھ جائے گا، لیکن یہ تو اور بھی الجھ گیا ہے۔ خیر، ایک بات تو روز روشن کی طرح عیاں ہے اور وہ کہ یہ دونوں شخص جعلی ولکس ہیں۔ اس کا اشارہ ڈیوک اور بادشاہ کی طرف تھا۔

کمال کی بات تو یہ ہے کہ وہ بیوقوف بڈھا اس پر بھی ہار ماننے کو تیار نہ ہوا۔ اس نے تو اُلٹا یہ اعتراض کیا کہ یہ طریقہ شناخت قابل اعتبار ہے ہی نہیں۔ وہ بولا: "میرا بھائی ولیم محل بے محل مذاق کرنے سے نہیں چوکتا۔ اس نے جو تحریر لکھی ہے، وہ اس کی اصل تحریر نہیں۔ جب ولیم نے کاغذ پر قلم رکھا تھا، مجھے تو اسی وقت شک ہو گیا تھا کہ یہ مذاق کرنے لگا ہے۔" بس وہ اسی رو میں بولتا گیا۔ وہ یوں جوش میں بول رہا تھا جیسے خود اسے اپنی باتوں پر مکمل یقین آنے لگا ہو۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اس بزرگ نے اسے ٹوک دیا اور کہا:

"مجھے ایک اور ترکیب سوجھی ہے۔ آپ میں سے کسی صاحب نے میرے بھا..... نہیں پیٹر ولکس کو قبر میں اتارنے میں مدد کی تھی؟"

"ہاں تو ——— ایک آواز آئی ——" میں نے اور ایب ٹرنر نے کی تھی ——— ہم دونوں حاضر ہیں۔

تب وہ بزرگ بادشاہ کی طرف اشارہ کر کے بولا: "شائد یہ صاحب جانتے ہوں گے کہ اس کی چھاتی پر کیا کھدا تھا؟"

اور یہ سب کچھ یوں اچانک اور تیزی سے ہوا کہ بادشاہ کو سوچنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ اگر وہ ایک پل بھی دیر کرتا تو وہ اس ساحل کی طرح ٹھس ہو کر رہ جاتا، جس کے نیچے سے زمین کٹ گئی ہو۔ اور وہ بچارا ہی کیا، اس غیر متوقع حملے سے تو چالاک سے چالاک آدمی بھی بڑبڑا جاتا۔ اب اس بچارے کو کیا پتہ کہ اس کی چھاتی پر کیا کھدا ہوا ہے! ——— لہٰذا اگر اس حملے سے اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا، تو اس میں اچنبھا کیا ہے؟ ماحول پر قبرستان کی سی خاموشی طاری تھی، اور ہر شخص گردن آگے کو کئے اسے ٹکٹکی لگا کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب بادشاہ یقیناً ہار مان لے گا۔ آخر مزید ڈھونگ رچانے سے فائدہ؟ لیکن یہ میری خام خیالی تھی۔ تعجب تو آپ کو بھی ہو گا لیکن یہ حقیقت ہے کہ بادشاہ نے پھر بھی ہار نہ مانی۔ شائد اس کی سکیم یہی تھی کہ اگر وہ اپنی بات پر اڑا رہے تو کبھی نہ کبھی تو یہ لوگ اکتا جائیں گے، اور ایک ایک کر کے کھسکنا شروع ہوں گے۔ جب تھوڑے سے لوگ رہ جائیں گے، تو وہ اور ڈیوک بآسانی بھاگ سکیں گے۔ خیر، چند لمحے سوچنے کے بعد وہ مسکراتے ہوئے بولا: "اوں ——— ہوں ——— یہ تو بہت ٹیڑھا سوال ہے۔ واقعی بہت ٹیڑھا ——— تاہم ——— بھلا میں یہ بھی نہیں

جانتا کہ اس کی چھاتی پر کیا کھدا تھا؟ اس کی چھاتی پر تو ایک نیلے رنگ کا ہلکا سا تیر بنا تھا۔ اور یہ تیر اس قدر مدھم تھا کہ جب تک اسے غور سے نہ دیکھا جائے یہ نظر نہیں آتا تھا ـــــ کیوں ٹھیک ہے ناں؟"

یقین مانئے۔ جھوٹ بولنے میں ایسی دیدہ دلیری کم از کم میں نے آج تک نہیں دیکھی۔

اس پر وہ نو وارد بزرگ فوراً ایک ٹرنر اور اس کے ساتھی کی طرف مڑا۔ اس کی آنکھیں یوں چمکنے لگیں جیسے اسے مکمل یقین ہو کہ اس نے بادشاہ کا بھانڈا پھوڑ کے رکھ دیا ہے۔ وہ بولا:

"سنا آپ نے! اب آپ ہی بتایئے کیا پیٹر کی چھاتی پر واقعی ایسا نشان تھا؟"

وہ دونوں یک زبان ہو کر بول اٹھے: "ہمیں تو کوئی ایسا نشان نظر نہیں آیا۔"

"بالکل درست،" بزرگ بولا، "جو نشان آپ نے اس کی چھاتی پر دیکھا تھا، وہ یہ تھا ـــ ایک چھوٹی سی مدھم سی 'P'، اور ایک B (یہ حرف اس کے نام کا حصہ ہوا کرتا تھا، لیکن بڑا ہو کر اس نے یہ نام ترک کر دیا تھا) اور ایک W" اس نے کاغذ پر یہ تینوں حروف لکھ دیئے۔ "کیوں؟ یہی دیکھا تھا ناں، آپ نے؟"

ایک بار پھر وہ یک زبان ہو کر بول اٹھے: "نہیں! ہمیں یہ بھی نظر نہیں آیا تھا۔ اس کی چھاتی پر تو کوئی نشان تھا ہی نہیں۔"

اب تو ہر شخص الجھن میں پڑ گیا۔ فوراً آوازیں آنے لگیں: "یہ سب کے سب ٹھگ ہیں۔ ان کی مشکیں کس کے دریا میں پھینک دو۔ چلو، انہیں ریل کی پٹڑی پر پھینک دیں" اور اس کے ساتھ ہی ہجوم نے سیٹیاں بجانی شروع کر دیں۔ بس پھر کیا تھا ہر طرف شور و غل مچنے لگا۔

تب وکیل اچھل کر ایک میز پر چڑھ گیا اور بولا:

"حضرات! سنئے۔ ذرا میری طرف توجہ دیجئے۔ صرف ایک منٹ کے لئے میری بات سنئے۔ اس مسئلے کا واحد علاج یہی ہے کہ لاش کو کھود کر اس بات کی تصدیق کر لی جائے۔"

"منظور ہے۔ منظور ہے۔" مجمع چلایا۔ وہ ہجوم تو اب یہ چاہتا تھا کہ فوراً قبرستان کا رخ کیا جائے۔ لیکن ڈاکٹر اور وکیل نے انہیں روک دیا اور بولے: "ذرا ٹھہرو! صبر کرو! پہلے ان چاروں آدمیوں کو اور اس لڑکے کو بھی قابو میں کر لو۔ انہیں بھی ساتھ لے جانا ہوگا۔"

"بالکل ٹھیک"! وہ چلائے "اور اگر لاش پر یہ نشان نہ ملے، تو ہم ان سب بدمعاشوں کو پھانسی پر لٹکا دیں گے"!

اب تو واقعی میرے ہوش خطا ہو گئے۔ لیکن کرتا کیا؟ چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ انہوں نے ہم سب کو پکڑ لیا اور قبرستان کی طرف روانہ ہو گئے جو دریا کے بہاؤ کے رُخ تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ جب قصبے کے لوگوں نے یہ شور و غل سُنا، تو وہ بھی ہمارے پیچھے پیچھے چلے آئے

اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔

جب ہم مکان کے قریب سے گزرے تو مجھے افسوس ہونے لگا کہ ناحق میں نے میری جین کو قصبے سے باہر بھیجا۔ اس وقت میرا ذرا سا اشارہ کرنے پر وہ فوراً آ کر مجھے چھڑا لیتی اور ان ٹھگوں کی خوب خبر لیتی ——

خیر ہم اس سڑک پر ہو لئے جو دریا کے ساتھ ساتھ جاتی تھی۔ اس قدر شور مچ رہا تھا جیسے جنگلی بلیوں کا کوئی جلوس گزر رہا ہو۔ آسمان پر بادل گھر آئے تھے تھوڑے تھوڑے وقفے بعد بجلی چمک اٹھتی اور درختوں میں ہوا سائیں سائیں کرنے لگتی۔ میں نے زندگی میں کافی مصیبتیں سہی ہیں، لیکن یہ آفت تو سب سے زیادہ پُرخطر تھی۔ میرا دماغ سُن ہو گیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ حالات کا رُخ یوں پلٹ جائے گا۔ میں سمجھتا تھا کہ جب تک چاہوں گا تماشہ دیکھتا رہوں گا، اور جب کوئی مصیبت آنے لگے گی، تو فوراً میری جین سے کہہ دوں گا اور وہ مجھے چھڑا لے گی۔ لیکن اب تو صرف ایک ہی چیز مجھے موت کے منہ سے چھٹکارا دلا سکتی تھی۔ اور وہ تھی مردے کی چھاتی پر بنے ہوئے نشان، اگر وہ نشان نہ ہوا —— تو —— ؟

اس خیال کے آتے ہی میں کانپ اٹھتا۔ لیکن اس کے سوا ذہن کسی اور طرف جاتا بھی تو نہیں تھا۔ اس اثنا میں بادل اور بھی گہرے ہو گئے تھے اور یہی بھاگ نکلنے کا بہترین موقع تھا، لیکن میرا ہاتھ تو اس لمبے تڑنگے، اُجڈ ہائنز کی آہنی گرفت میں جکڑا ہوا تھا، اور اس سے بھاگ نکلنا اتنا ہی

مشکل تھا جتنا جانی جولیٹ کو جل دینا۔ وہ جوش میں اس قدر تیز تیز چل رہا تھا کہ مجھے اس کے ساتھ ساتھ رہنے کے لئے دوڑنا پڑ رہا تھا۔ اگر کہیں میں پیچھے رہ جاتا، تو وہ گھسیٹ کر مجھے اپنے ساتھ ملا لیتا۔

قبرستان میں اتنے لوگ جمع ہو گئے تھے کہ یوں لگتا تھا، جیسے انسانوں کا ایک سیلاب نہ جانے کہاں سے اُمڈ آیا ہو۔ جب وہ قبر کے نزدیک پہنچے تو حالت یہ تھی کہ بیلچے تو اتنے اکٹھے ہو گئے تھے کہ ضرورت سے بھی سو گنا زیادہ ہوں گے، لیکن لالٹین لانے کا خیال کسی کو بھی نہیں آیا۔ تاہم بجلی کی چمک کی مدد سے انہوں نے قبر کھودنا شروع کیا۔ اسی اثنا میں ایک شخص کے ذمے یہ فرض سونپا گیا کہ وہ نزدیک ترین مکان سے (جو تقریباً آدھ میل دور ہو گا) لالٹین اٹھا لائے۔

قبر کھودنے کا کام بڑی تندہی سے ہوتا رہا۔ بادل اور بھی گہرے ہو گئے تھے، اور اب تو اکا دکا بوندیں بھی پڑنے لگی تھیں۔ ہوا کی سائیں سائیں تیز ہو گئی تھی اور بجلی اب تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد چمکنے لگی تھی۔ گاہے گاہے رعد کی کڑک فضا میں گونج اٹھتی تھی لیکن لوگ اپنے کام میں اس قدر منہمک تھے کہ کسی نے ان پر توجہ ہی نہ دی۔ جب بجلی چمکتی تو ایک لحظہ کے لئے سب چیزیں، سب چہرے یہاں تک کہ قبر میں سے نکلتے ہوئے مٹی کے ڈھیلے تک منور ہو جاتے۔ اور پھر اگلے ہی لمحے یوں گھپ اندھیرا چھا جاتا، کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا۔

بالآخر تابوت کو قبر میں سے نکالا گیا اور جب اس کے ڈھکنے کے پیچ کھولے جانے لگے تو ہر شخص ایک دوسرے کو دھکیلتا، ایک دوسرے پر گرتا پڑتا، شانے سے شانہ بھڑاتا، آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگا تاکہ لاش کو اچھی طرح دیکھ سکے۔ ایسی افراتفری میں نے آج تک نہیں دیکھی، اور تاریکی میں تو یہ منظر اور بھی زیادہ بھیانک لگ رہا تھا۔ ہائنز مجھے یوں گھسیٹ رہا تھا کہ میری کلائی دکھنے لگی تھی۔ شاید وہ یہ بھول ہی گیا تھا کہ میرا ہاتھ اس کی گرفت میں ہے۔

دفعتاً بجلی کوندی اور اس کے ساتھ ہی ایک آواز آئی: "ارے وہ رہی ۔۔ وہ سونے کی تھیلی ۔۔۔ وہ رہی چھاتی پر۔"

ہائنز کے منہ سے بے ساختہ سیٹی کی آواز نکل پڑی اور اسی پر کیا موقوف، ہر شخص کا حال یہی تھا۔ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور دھکم دھکا کرتا آگے بڑھا تاکہ اچھی طرح دیکھ سکے

میں نے موقع غنیمت جانا اور آؤ دیکھا نہ تاؤ ـ بس سر پر پاؤں رکھ کر تاریکی میں بھاگ اٹھا۔
بھاگ کیا اٹھا - اڑنے لگا۔ سڑک بالکل خالی تھی اور میں اکیلا مسافر۔ میرا مطلب ہے کہ گہری تاریکی، گاہے گاہے چمکتی ہوئی بجلی، ٹپ ٹپ کرتی بارش، سرسراتی ہوا، اور کڑکتی رعد کے سوا میں اکیلا ہی تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے عالم میں میری ٹانگوں نے کیا کیا کمال نہ دکھائے ہوں گے۔

جب میں قصبے میں داخل ہوا، تو سڑکیں بالکل سنسان تھیں۔ طوفان کی وجہ سے لوگ اپنے اپنے گھروں میں گھس گئے تھے۔ لہذا مجھے سڑکیں چھوڑ کر سنسان گلیوں میں جانے کی ضرورت نہ پڑی اور میں بڑی سڑک پر ہی بھاگتا چلا گیا۔ مکان کے قریب پہنچ کر میں نے اوپر کھڑکی کی طرف نگاہ کی۔ وہاں کوئی روشنی نہ تھی۔ مکان ہی بالکل اندھیرا تھا۔ نجانے کیوں مجھے یکلخت یاس اور افسردگی نے آگھیرا۔ لیکن بالآخر جب میں مکان کے آگے سے گزر رہا تھا تو کھٹ سے میری جین کی کھڑکی میں روشنی ہوئی میرا دل یوں اچھلا جیسے ابھی نکل کر باہر آگرے گا۔ اگلے ہی لمحے یہ مکان اور یہ قصبہ اور یہاں کی ہر چیز میرے پیچھے تاریکی میں لپٹی رہ گئی۔ اور میں نے قسم کھائی کہ دوبارہ اس شہر میں قدم نہ رکھوں گا۔ یہ حقیقت ہے کہ جتنی لڑکیاں میں نے دیکھی ہیں۔ وہ ان سب میں بے مثال تھی۔ اس کی نیکی اور اس کا حوصلہ بے مثال تھے۔

جونہی میں شہر سے باہر اس جگہ پہنچا جہاں سے کشتیاں باندھنے کا گھاٹ نظر آنے لگتا ہے، میری نگاہیں ادھر ادھر کسی کشتی کو تلاش کرنے لگیں۔ اسی اثنا میں بجلی کوندی اور میں نے دیکھا کہ ایک کشتی صرف ایک رسی سے بندھی کھڑی ہے۔ میں نے رسی کھولی اور روانہ ہو گیا۔ یہ کشتی بہت چھوٹی تھی اور گھاٹ ابھی بہت دور تھا۔ تاہم میں نے ایک پل بھی ضائع نہ کیا۔ بالآخر جب میں بیڑے کے قریب پہنچا تو اس قدر تھک گیا تھا کہ میرا جی چاہا کہ وہیں لیٹ کر ہانپنے لگ جاؤں۔ لیکن اتنی فرصت کسے تھی؟ میں اچک کر بیڑے پر جا چڑھا اور بولا:

"جلدی کرو! فوراً۔ ابھی۔ بس اب یہاں سے چل دو۔ خدا کا شکر ہے ان موذیوں سے نجات ملی۔"

میری آواز سنتے ہی جم جھونپڑی میں سے باہر آگیا اور دونوں بازو پھیلائے میری طرف دوڑا۔ وہ میرے لوٹ آنے پر بہت خوش تھا۔ لیکن اسی وقت بجلی کوندی اور اسے دیکھتے ہی میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ میں فوراً پچھلے پاؤں واپس مڑا اور دھڑام سے دریا میں گر پڑا۔ میں یہ بھول ہی

گیا تھا کہ وہ تو شاہ لیر اور پانی میں ڈوبے ہوئے عجب کا مرکب بنا ہوا ہے۔ اسے دیکھ کر میرا دماغ شل ہو گیا تھا اور خوف کے مارے میرا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا تھا۔ جم نے فوراً مجھے پانی میں سے باہر نکالا اور مارے خوشی کے مجھے سینے سے چمٹا کر خدا کا شکر ادا کرنے لگا جس نے اسے بادشاہ اور ڈیوک کے پنجے سے رہائی دلائی تھی۔ لیکن میں نے اسے ٹوک دیا اور کہا:

"ابھی نہیں — یہ سب بعد میں دیکھا جائے گا۔ بس ایک لمحہ بھی ضائع مت کرو۔ جلدی سے رسّی توڑ دو اور بھاگو —"

دو ہی سیکنڈ بعد بیڑا دریا میں بہنے لگا۔ اب ہم پھر اس وشال دریا پر تھے اور آزاد تھے۔ ہمیں اب کسی کی کوئی پروانہ تھی۔ ہم بہت خوش تھے۔ میں تو پھولا نہ سما رہا تھا اور خوشی سے ناچنے اور کودنے لگا تھا۔ میں نے ہوا میں ایک کلانچ بھری، اور اس کے بعد ایک اور۔ لیکن میں نے تیسری جست لگائی تو ایک جانی پہچانی آواز میرے کانوں میں آ پڑی۔ میں سانس روک کر سننے لگا۔ اور جونہی بجلی کوندی میں نے دیکھا کہ دو آدمی کشتی میں بیٹھے ہماری ہی طرف آ رہے ہیں۔ وہ تیز تیز چپو چلا رہے تھے اور ان کی ناؤ اُڑتی چلی آ رہی تھی۔ یہ وہی موذی تھے۔ یعنی بادشاہ اور ڈیوک۔

میں پیٹھ کے بل بیڑے کے فرش پر گر پڑا۔ میری طاقت جواب دے گئی۔ آنسو ضبط کرنے کے لئے میں اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتا تھا!

۳۰۔ بادشاہ کا حملہ — شاہی جھگڑا — گہری دوستی

بیڑے پر آتے ہی بادشاہ نے مجھے گریبان سے پکڑ لیا اور زور زور سے جھنجھوڑتا ہوا بولا: "ہمیں چھوڑ کر بھاگ رہے تھے، سؤر! ہم سے اکتا گئے ہو کیا؟"

میں نے جواب دیا: "نہیں جہاں پناہ، ہم آپ کو چھوڑ کر نہیں جا رہے تھے۔ جہاں پناہ! مجھے چھوڑ دیجئے!"

"تو بولو! کیا ارادے تھے تمہارے؟ ورنہ میں تمہاری آنتیں کھینچ لوں گا۔ بولو!"

میں بالکل سچ سچ بتاتا ہوں۔ جہاں پناہ! بالکل سچی بات کہوں گا۔ ہوا یہ کہ وہ آدمی

جس نے مجھے پکڑ رکھا تھا مجھ پر بہت مہربان رہا۔ سارا راستہ وہ یہی کہتا رہا کہ اس کا بھی ایک لڑکا تھا'
--- — — — — — — — — — — — تھا جو میرا ہی ہم عمر تھا۔ لیکن
گزشتہ برس اس کی موت ہو گئی۔ اسی لئے مجھے اس آفت میں پڑا دیکھ کر اسے بہت دکھ ہوا جب
سونے کی تھیلی کو دیکھ سب لوگ حیران ہو کر تابوت کی طرف بڑھے' تو اس نے موقع غنیمت جان کر
مجھے رہا کر دیا اور میرے کان میں کہا: بھاگو یہاں سے! ورنہ یہ لوگ تمہیں پھانسی پر ٹکا دیں گے"۔
بس میں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا اور بھاگ نکلا۔ ویسے بھی میرے وہاں رہنے سے آپ کو تو کوئی فائدہ
نہیں پہنچ سکتا تھا کیونکہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا اگر مجھے جان بچانے کا موقع
مل گیا تھا' تو کیوں نہ فائدہ اٹھاتا۔ اس کے بعد میں نے کہیں دم نہ لیا اور سیدھا ایک کشتی لے
کر یہاں بیڑے پر آ گیا۔ آتے ہی میں نے جم سے کہا: چلو۔ جلدی نکل چلو۔ نہیں تو وہ مجھے پکڑ کر
پھانسی دے دیں گے"۔ میں نے جم سے یہ بھی کہا: "شاید بادشاہ سلامت اور ڈیوک زندہ نہ بچیں۔
"یقین مانئے مجھے اور جم کو آپ کی موت کا از حد افسوس ہوتا۔ اب آپ کو صحیح سلامت پا کر ہماری
خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا"۔

جم نے میری تائید میں زبان کھولی ہی تھی کہ بادشاہ نے ڈانٹ کر اسے چپ کرا دیا اور
مجھ سے یوں مخاطب ہوا: "ہاں ہاں' خوش تو تم ہو ہی"۔ یہ کہہ کر اس نے پھر مجھے جھنجوڑنا شروع کر دیا۔
اور دھمکی دینے لگا کہ وہ مجھے دریا میں پھینک دے گا۔ لیکن ڈیوک بولا:
"چھوڑ دو اس لڑکے کو' بیوقوف بڈھے! اگر اس کی جگہ تم ہوتے' تو تم کیا کرتے؟ جب تم خود
بھاگے تھے' تو تم نے اس کا انتظار کیا تھا؟ کم از کم مجھے تو یاد نہیں کہ تم نے انتظار کیا ہو"۔

بادشاہ نے مجھے چھوڑ دیا اور لگا قصبے کے باشندوں کو صلواتیں سنانے۔ لیکن ڈیوک بولا:
"گالیاں دینی ہیں تو اپنے آپ کو دو۔ اگر کوئی شخص ان گالیوں کا مستحق ہے' تو وہ تم ہو۔ اس سارے
معاملے میں تم نے شروع سے لے کر آخر تک ہر موقع پر کوئی نہ کوئی حماقت کی ہے۔ صرف ایک جگہ
تم نے اپنی ذہانت کا ثبوت دیا تھا اور وہ اس وقت جب تم نے نہایت خود اعتمادی کے ساتھ تیر کے
اس نیلے نشان کا ذکر کیا تھا جس کا کبھی کوئی وجود تھا ہی نہیں۔ یہ واقعی تمہارا کمال تھا اور یہی

کمال کا کرشمہ ہے کہ ہم اس وقت زندہ ہیں۔ اگر اس وقت تم یہ پھانسہ نہ دیتے، تو وہ فوراً ہمیں حوالات میں ٹھونس دیتے۔ اور پھر جب ان انگریزوں کا سامان آجاتا، تو ہم لوگوں کے لئے جیل خانے کے سوا اور کوئی جگہ نہ ہوتی۔ لیکن تمہارے پھانسے ہیں آکر وہ لوگ قبرستان کی طرف چل پڑے اور پھر اس سونے کی تھیلی کا کرشمہ ظہور پذیر ہو گیا۔ اگر وہ لوگ سونے کو دیکھنے کے لئے یوں بے تاب نہ ہوتے، تو آج رات ہم پھانسی کا پھندا گلے میں ڈال کر ہی سوئے ہوتے۔ اور پھندا بھی ایسا مضبوط کہ چھڑائے نہ چھوٹے۔

ایک منٹ کے لئے وہ دونوں خاموش کھڑے کچھ سوچتے رہے۔ پھر اچانک بادشاہ بول اٹھا:

"اور ہم یہ سمجھے تھے کہ تھیلی کو حبشی چرا لے گئے ہیں۔"

میں تھر تھر کانپنے لگا۔ "ہاں" ڈیوک نے آہستہ سے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں طنز تھا۔ "واقعی ہم یہی سمجھتے تھے۔" لفظ 'ہم' کو اس نے خوب چبا چبا کر ادا کیا۔ آدھ منٹ کے توقف کے بعد بادشاہ آہستہ سے بولا: "کم از کم میں تو یہی سمجھا تھا۔"

ڈیوک نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا:

"نہیں —— اس کے برعکس میرا خیال ہے کہ میں نے ہی یہ سمجھا تھا"

بادشاہ کو غصہ آگیا۔ وہ بولا:

"سنو، بلج واٹر! آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

ڈیوک نے فوراً جواب دیا: "اگر تم جاننا ہی چاہتے ہو، تو میں تم سے پوچھ سکتا ہوں کہ تم کس بات کا ذکر کر رہے تھے؟"

"بکواس!" بادشاہ نے طنزاً کہا، "کم از کم میں تو اس ساری کارروائی سے بے خبر ہی رہا۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت تم غنودگی کے عالم میں ہو اور تمہیں پتہ ہی نہ چلا ہو کہ تم کر کیا رہے ہو۔"

اب تو ڈیوک کا پارہ چڑھ گیا۔ وہ بولا: "بکواس بند کرو! تم مجھے بیوقوف سمجھتے ہو۔ کیا مجھے اتنا بھی علم نہیں کہ کن حضرت نے وہ تھیلی تابوت کے اندر چھپائی تھی"

"جی ہاں۔ ضرور جانتے ہو گے۔ میں اس سے کب انکار کرتا ہوں —— تمہیں یقیناً علم ہو گا کیونکہ تم نے تو وہ ہی تو چھپائی تھی"

"جھوٹ!" ڈیوک چلّایا۔ اور بادشاہ پر پِل پڑا۔ بادشاہ گڑگڑایا: "چھوڑ دو۔ میرا گلا چھوڑ دو۔ میں اپنے الفاظ واپس لئے لیتا ہوں۔"

ڈیوک بولا: "پہلے یہ اقبال کرو کہ تم ہی نے وہ تھیلی وہاں چھپائی تھی۔ تم مجھ سے دغا کرکے بھاگنا چاہتے تھے۔ اور پھر واپس آکر سارے کا سارا مال نکال لیتے۔ اور اکیلے ہی اکیلے اسے ہڑپ کر جاتے۔"

"ڈیوک! ایک منٹ کے لئے میری بات سنو۔ میں تم سے فقط ایک سوال پوچھوں گا اور وعدہ کرو کہ تم اس کا جواب ایمانداری سے دو گے۔ اگر تم یہ کہدو کہ وہ تھیلی تم نے نہیں چھپائی تھی، تو مجھے یقین آجائے گا۔ اور میں اپنے الفاظ واپس لے لوں گا"

"بڈھے بدمعاش! میں نے نہیں چھپائی تھی۔ تم بخوبی جانتے ہو کہ میں نے نہیں چھپائی تھی۔ چلو اب اپنے الفاظ واپس لو ——"

"مجھے تم پر پورا اعتبار ہے۔ لیکن ایک سوال اور —— برا نہ ماننا —— اچھا! یہ بتاؤ۔ کیا تمہارے دل میں یہ خیال نہیں تھا کہ کسی طرح اس رقم کو غائب کر دیا جائے۔"

ایک لمحے کے لئے ڈیوک خاموش رہا۔ پھر بولا: "اگر تھا بھی، تو اس سے کیا؟ میں نے چھپائی تو نہیں۔ لیکن تم نے نہ صرف اس خیال کو اپنے دل میں جگہ ہی دی بلکہ اس پر عمل بھی کیا۔"

"ڈیوک! مجھ پر یقین کرو۔ خدا کی قسم۔ اگر میں نے یہ کام کیا ہو، تو تڑپ تڑپ کر مروں میں اس بات سے منکر نہیں کہ یہ خیال میرے دل میں آیا ضرور تھا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ میں اس کو عملی جامہ پہناؤں، تم نے —— میرا مطلب ہے کسی نے وہ تھیلی اڑالی۔"

"تم جھوٹ بکتے ہو۔ تم ہی نے وہ تھیلی اڑائی تھی۔ کرو اقبال ورنہ ——" ایک بار پھر بادشاہ کے حلق سے 'خر، خر' کی آوازیں نکلنے لگیں۔ وہ ہانپتا ہوا بولا: "مجھے چھوڑ دو۔ ...مجھے چھوڑ دو۔ میں اقبال کرتا ہوں۔"

یہ سُن کر میں بہت خوش ہوا۔ اور مجھے کچھ چین آیا۔ ڈیوک نے اس کا گلا چھوڑ دیا اور بولا۔

"اگر پھر تم نے کبھی اس سے انکار کیا، تو دریا میں پھینک دوں گا۔ تمہارے لئے یہی مناسب ہے کہ یہیں بیٹھے بچوں کی طرح روتے رہو۔ اب اور ہو بھی کیا سکتا ہے؟ میں نے تمہارے جیسا

حریص شخص زندگی بھر نہیں دیکھا، جو ہر شے کو ہڑپ کر جانا چاہتا ہو۔ یہ تو میری بیوقوفی تھی کہ تم پر یوں اعتبار کرتا رہا جیسے تم میرے ابا جان ہو۔ تمہیں اپنی کرتوتوں پر شرم آنی چاہیے۔ جب میں سارا الزام ان حبشیوں کے سر تھوپ رہا تھا تو تم مزے سے کھڑے سنتے رہے اور ان بچاروں کی حمایت میں ایک لفظ بھی تمہاری زبان سے نہ نکلا۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آرہا ہے کہ میں بھی کتنا احمق تھا جو تمہارے اس جھانسے میں آگیا۔ لعنت ہو تم پر! ۔ اب سمجھ میں آیا کہ تم اس کمی کو پورا کرنے کے لئے کیوں اتنے بے تاب تھے۔ تم تو وہ رقم بھی ہتھیا لینا چاہتے تھے، جو "شاہی عجوبے" میں میرے حصے میں آئی تھی۔ تم تو یہ چاہتے تھے کہ سارا مال خود ہڑپ کر جاؤ۔"

بادشاہ نے ڈرتے ڈرتے اور بچوں کی طرح بلکتے ہوئے کہا: "لیکن ڈیوک! کمی پوری کرنے کی تجویز تو تم نے ہی دی تھی۔ میں نے کہاں دی تھی؟"

"بکومت! میں تمہاری زبان سے ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتا۔" ڈیوک غصے میں بولا: "دیکھ لیا لالچ کا نتیجہ۔ نہ صرف ان لڑکیوں کو ان کا اپنا پیسہ واپس مل گیا۔ بلکہ ہمارا پیسہ بھی انہی کے پاس پہنچ گیا۔ جاؤ، اب جا کر سو رہو۔ اگر آئندہ کبھی میرے ساتھ کمی پوری کرنے کی بات کی، تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

بادشاہ چپکے سے جھونپڑی میں کھسک گیا۔ اور شراب کی بوتل نکال کر غم غلط کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ڈیوک نے بھی اپنی بوتل نکال لی۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر ان بدمعاشوں میں پھر گہری چھننے لگی۔ جوں جوں نشہ چڑھتا گیا، وہ ایک دوسرے کے ساتھ زندگی سے موت تک کا رشتہ استوار کرتے رہے، اور بالآخر ایک دوسرے کے بازوؤں میں ہی خراٹے لینے لگے۔ تمام پچھلی باتیں بھلا دی گئیں۔ مجھے اگر کوئی خوشی تھی تو یہ کہ بادشاہ چاہے اور جو کچھ کر لے وہ یہ کہنے کی کبھی جرأت نہیں کرے گا کہ تھیلی اس نے نہیں چھپائی تھی۔ ان کے سونے کے بعد میں اور جم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے، میں نے جم کو سب کچھ بتا دیا۔

۳۱۔ خطرناک منصوبے۔ جم کی خبر۔ پرانی یادیں۔ بھیڑ کا قصہ۔

اہم اطلاع

اس کے بعد کئی دنوں تک ہماری جرأت نہ ہوئی کہ کسی قصبے میں رُک جائیں۔ بیڑا دریا کے بہاؤ کے رخ بہتا رہا، بہتا رہا۔ حتیٰ کہ ہم دور جنوبی ریاستوں میں پہنچ گئے۔ یہاں خاصی گرمی تھی۔ اب ہم گھر سے بہت دور نکل آئے تھے اور اس علاقے میں پہنچ گئے تھے جہاں درختوں کی ٹہنیوں پر لمبی بھوری داڑھیاں لٹکی ہوتی ہیں۔ ایسی داڑھیاں میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں ان کی وجہ سے درخت بہت افسردہ افسردہ سے نظر آتے تھے۔ یہاں پہنچ کر ٹھگوں نے سُکھ کا سانس لیا۔ اب چونکہ وہ خطرے کی زد سے باہر تھے، لہٰذا انہوں نے اردگرد کے گاؤں میں پھر سے اپنا وہی پرانا دھندا شروع کر دیا۔

پہلے تو انہوں نے نشہ بندی پر ایک لیکچر جھاڑا۔ لیکن اس میں اتنی رقم ہاتھ نہ لگ سکی کہ دونوں سیر ہو کر شراب پی لیتے۔ اگلے گاؤں میں انہوں نے ناچ سکھانے کا اسکول کھولا، لیکن جانوروں کی اچھل کود سے زیادہ ناچ کے بارے میں انہیں کوئی علم نہ تھا۔ بس ادھر انہوں نے ناچنا شروع کیا ادھر لوگ بھڑ گئے اور انہیں مار مار کر وہاں سے بھگا دیا۔ ایک جگہ انہوں نے تقریر بازی سکھانے کا دھندا شروع کیا، لیکن ان کی تقریر شروع ہوتے ہی سامعین نے اٹھ کر وہ بے نقط سنائیں، کہ انھیں بھاگتے ہی بنی۔ اس کے بعد انہوں نے وعظ، جادو، ڈاکٹری، نجوم، اور اسی قسم کے تقریباً ہر کام میں قسمت آزمائی کی، لیکن سب بے سود۔ آخر جب وہ بالکل قلاش ہو گئے تو انہوں نے ساحل پر جانا ہی چھوڑ دیا اور وہیں بیڑے پر پڑے پڑے نہ جانے کیا سوچتے رہتے۔ لگا تار پانچ پانچ، چھ چھ گھنٹے وہ چپ سادھے بیٹھے رہتے۔ کسی سے کوئی بات نہ کرتے۔ بس یونہی بیٹھے رہتے غمگین، اداس، پریشان۔

لیکن کچھ ہی دنوں میں ان کے پرانے رنگ ڈھنگ پھر سے عود کر آئے۔ اب وہ سر جوڑ کر جھونپڑی میں بیٹھ جاتے، اور دو دو، تین تین گھنٹے کھسر پھسر کرتے رہتے۔ ان کے تیور

دیکھ کر مجھے اور جم کو تشویش ہونے لگی۔ یقیناً ان کے ارادے ٹھیک نہیں تھے۔ اور ہمارا اندازہ تھا کہ وہ پھر کسی بہت بڑی حرامزدگی کے لئے پر تول رہے ہیں۔ ہم نے کئی بار قیاس آرائی کرنے کی کوشش کی کہ اب کی بار کیا گل کھلے گا۔ اور بالآخر ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ شائد اس بار کسی مکان یا دکان میں نقب لگانے کی تیاری کر رہے ہیں، یا پھر جعلی سکے بنانے کے منصوبے بنا رہے ہوں گے یا اسی ہی قسم کا کوئی اور کارنامہ کرنے کی سوچ رہے ہوں گے۔ ہم ڈر گئے اور یہ فیصلہ کیا کہ ایسے کے بعد ہم ان کی حرکتوں سے بالکل کسی قسم کا واسطہ نہ رکھیں گے۔ اور اگر کبھی موقع ملا تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ ایک دن صبح سویرے ہمیں ایک معمولی سا گاؤں نظر آیا۔ ہم نے بیڑے کو دو میل ادھر ہی روک لیا اور ایک اچھی سی محفوظ جگہ دیکھ کر اسے چھپا دیا۔ اس گاؤں کا نام پائکسویل تھا۔ بادشاہ ساحل پر اتر گیا اور جاتے وقت ہم سے بولا: "تم لوگ ہوشیاری سے چھپے رہنا۔ میں قصبے میں چکر لگا کر دیکھتا ہوں کہ کہیں ہمارے "شاہی عجوبے" کی خبر یہاں تک تو نہیں پہنچ گئی۔ (تو جناب نقب لگانے جا رہے ہیں؟" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "لیکن یاد رکھئے کہ جب تک آپ نقب لگا کر لوٹیں گے۔ میں، اور جم، اور یہ بیڑا یہاں سے رفوچکر ہو چکے ہوں گے اور ساری عمر آپ یہی سوچتے رہیں گے کہ ہم لوگ کیوں اور کہاں غائب ہو گئے")۔ اس کے بعد وہ مجھ سے اور ڈیوک سے بولا: "اگر میں دوپہر تک نہ آؤں، تو تم لوگ سمجھ لینا کہ سب خیریت ہے۔ اور قصبے میں چلے آنا۔"

خیر، ہم چھپ کر بیٹھ گئے۔ ڈیوک نہایت بے تابی کے عالم میں ادھر ادھر چہل قدمی کرنے لگا اس کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔ وہ بات بات پر بگڑ اٹھتا اور ہمیں کوسنے لگتا کہ ہم کوئی بھی کام ڈھنگ سے نہیں کرتے۔ اب ہمیں یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو کوئی گل کھل کر ہی رہے گا۔ لہذا جب دوپہر ہو گئی اور بادشاہ واپس نہ لوٹا، تو میں بہت خوش ہوا کہ کم از کم اب اس ماحول سے چھٹکارا تو ملے گا۔ اور کون جانے، خدا اس عذاب سے ہمیشہ کیلئے چھٹکارا دلا دے۔ میں اور ڈیوک گاؤں میں چلے گئے اور لگے بادشاہ کو ڈھونڈنے تھوڑی دیر بعد وہ ہمیں ایک شراب خانے میں بیٹھا مل گیا۔ نشے میں دھت تھا اور بہت سے بدمعاش اس کے ارد گرد بیٹھے اسے چھیڑ رہے تھے۔ وہ گالیاں بکے جا رہا تھا اور سب کو مار ڈالنے کی دھمکیاں دیے رہا تھا۔ لیکن وہ نشے میں اس قدر مدہوش تھا کہ انہیں مارنا تو درکنار شاید وہ قدم بھی بغیر سہارے

کے سہارے نہ چل سکتا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر ڈیوک نے اسے خوب گالیاں دیں۔ لیکن بادشاہ نے اسے بھی رگید ڈالا۔ ان کی اس گالی گلوچ کا فائدہ اٹھا کر میں وہاں سے بھاگ نکلا اور ٹیلوں کو پھلانگتا ہوا دریا کنارے والی سڑک پر ہو لیا۔ میں ہرن کی طرح کلانچیں بھرتا چلا جا رہا تھا اور کیوں نہ ہو جاتا آخر وہ موقع آ ہی گیا تھا جس کی ہم تاک میں تھے۔ میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ یہاں سے حتی الوسع دور بھاگ جائیں گے تاکہ دوبارہ ان موذیوں کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہو۔ جب میں بیڑے کے قریب پہنچا تو، میرا سانس پھولا ہوا تھا لیکن میرا انگ انگ خوشی سے پھڑک رہا تھا۔ میں نے آواز دی: "جم! بیڑا کھول دو۔۔۔ سب ٹھیک ہو گیا ہے۔"

لیکن مجھے کوئی جواب نہ ملا نہ ہی کوئی جھونپڑی میں سے باہر نکلا۔ جم کہاں چلا گیا؟ میں نے زور زور سے آوازیں دیں۔ اور جب پھر بھی کوئی جواب نہ آیا، تو اور زور سے چلا چلا کر اسے پکارا۔ اور پھر چیختا چلاتا، زور زور سے آوازیں دیتا، اِدھر اُدھر درختوں میں دوڑنے لگا۔ لیکن جم ہوتا تو ملتا۔ آخر مایوس ہو کر میں ایک جگہ بیٹھ گیا اور رونے لگا۔ اس کے علاوہ اور کرتا بھی کیا؟ لیکن بیٹھ کر رونے سے فائدہ؟ تھوڑی دیر بعد میں پھر سڑک پر آ گیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کروں میں وہاں بیٹھا یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک لڑکا ادھر آ نکلا۔ میں نے پوچھا: "تم نے یہاں کوئی اجنبی حبشی دیکھا ہے؟" اور اس کے بعد میں نے اُسے بتایا کہ جم نے کس کس قسم کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ لڑکے نے جواب دیا: "ہاں دیکھا ہے۔"

'کہاں؟'

"یہاں سے دو میل دور سیلاس فیلپس کے ہاں۔ وہ حبشی بھگوڑا غلام تھا اور لوگوں نے اسے پکڑ لیا ہے۔ کیوں، تم اسی کو تو نہیں ڈھونڈ رہے ہو؟" "نہیں تو! اسے ڈھونڈ کر کیا کروں گا تقریباً دو گھنٹے ہوئے، میں نے اسے اسی جنگل میں دیکھا تھا۔ اس نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے ذرا بھی شور مچایا، تو وہ میرا پیٹ پھاڑ دے گا۔ اور یہ بھی کہا کہ میں یہاں سے ہلوں تک نہیں۔ یہیں بیٹھا رہوں۔۔۔ میں خوفزدہ ہو کر وہیں بیٹھ گیا اور تب سے یونہی بیٹھا ہوں۔"

"لیکن اب ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ پکڑا گیا ہے۔ کہتے ہیں وہ کہیں جنوب سے بھاگ نکلا تھا۔

"شکر ہے، وہ پکڑا گیا۔"

"وہ پکڑا کیوں نہ جاتا! اس کو پکڑنے کا دو سو ڈالر انعام بھی تو تھا! اور یہ انعام حاصل کرنا اتنا ہی سہل تھا جیسے کسی کو سڑک پر چلتے چلتے تھیلی مل جائے۔"

"بات تو واقعی ٹھیک ہے۔ اگر میں ذرا اور بڑا ہوتا تو شاید یہ رقم میرے ہاتھ آتی یہ سب سے پہلے تو میں نے ہی اسے دیکھا تھا۔ اچھا! یہ تو بتاؤ اسے پکڑا کس نے تھا؟"

"اسے پکڑنے والا کوئی اجنبی تھا۔ بوڑھا سا۔ لیکن اس نے چالیس ڈالر کے عوض اپنا انعام کسی اور کو بیچ دیا ہے۔ کہتا تھا: 'مجھے دریا کے منبع کی طرف جانا ہے اور میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ بیٹھا انتظار کرتا رہوں' ـــــ ہے نا عجیب بات! اگر اس کی جگہ میں ہوتا، تو ان دو سو ڈالروں کے لئے اگر سات برس بھی انتظار کرنا پڑتا، تو کر لیتا۔"

"میری تو قسمت ہی ایسی ہے۔ پکی پکائی کھیر کوئی اور اٹھائے جاتا ہے۔ لیکن خیر، اس بار مجھے کوئی افسوس نہیں۔ اگر دو سو ڈالر کا انعام صرف چالیس ڈالر کے عوض بک سکتا ہے، تو ظاہر ہے، دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ اس انعام میں ضرور کوئی گڑبڑ ہو گی۔"

"نہیں ـــ گڑبڑ تو کوئی نہیں۔ میں نے خود وہ اشتہار دیکھا ہے۔ جو حلیہ اس میں لکھا ہے، وہ ہو بہو اسی حبشی کا ہے۔ بس یوں سمجھو، جیسے اس کی تصویر کھینچ دی گئی ہو۔ اشتہار میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ نیو اورلینز کے کسی فارم سے بھاگا ہے ـــ نہیں صاحب ـــ اس انعام میں تو رتی بھر بھی گڑبڑ نہیں ـــ اچھا، تمہارے پاس تمباکو کا ٹکڑا ہے؟ ـــ اگر ہو، تو دے دو ـــ"

میرے پاس تمباکو نہیں تھا۔ لہٰذا وہ چلا گیا۔ میں بیڑے پر جا کر اس جھونپڑی میں بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کیا جائے، لیکن کوئی ترکیب ذہن میں نہ آئی۔ سوچتے سوچتے میرا دماغ شل ہو گیا۔ جم کو بچانے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ اتنا لمبا سفر طے کیا، ان بدمعاشوں کی اتنی خدمت کی، اور حاصلِ محنت پھر بھی صفر! تمام محنت رائیگاں گئی اور وہ صرف اس لئے کہ ان بدمعاشوں کو جم کے ساتھ دھوکہ کرتے شرم نہ آئی۔ جم اب پھر غلامی کی زنجیروں میں جکڑا جائے گا، اور وہ اجنبیوں کے درمیان، اور صرف چالیس ڈالر کے عوض ـــــ

اگر جم کو غلام ہی رہنا تھا تو اس سے تو یہی بہتر تھا کہ وہیں اپنی آقا کی ہی غلامی کرتا رہتا۔ کم از کم اس کے بیوی بچے تو اس کے ساتھ ہی ہوتے۔ لہٰذا میں نے سوچا کیوں نہ ٹام سائر کو خط لکھ کر اس سے کہوں کہ مس واٹسن کو جم کے پکڑے جانے کی اطلاع کر دے۔ لیکن فوراً ہی میں نے یہ خیال دماغ سے نکال دیا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ مس واٹسن یقیناً جم سے نالاں ہوگی کہ وہ اس قدر ناشکرا نکلا اور اپنی مالکن کو یوں چھوڑ کر چلا آیا۔ لہٰذا جونہی وہ واپس پہنچے گا، وہ فوراً اسے بیچ ڈالے گی۔ اور اگر نہ بھی بیچے، تو بھی جم کے لئے زندگی دوبھر ہو جائے گی۔ کیونکہ ناشکرا حبشی کسی کو اچھا نہیں لگتا۔ بات بات پر اس کی بے عزتی ہوا کرے گی۔ اس کے علاوہ مجھے اپنا بھی تو ڈر تھا۔ سب کو یہ پتہ چل جائے گا کہ ہک فن نے ایک حبشی غلام کے بھاگنے میں اس کی مدد کی۔ میں شہر کے کسی شخص کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا —— یہی تو دنیا کا دستور ہے۔ پہلے تو کوئی بُرا کام کر لیا۔ مگر جب اس کے نتائج بھگتنے کا موقع آیا تو لگے ڈرنے۔ انسان سمجھتا ہے کہ منہ چھپا کر وہ بے عزتی سے بچا رہتا ہے۔ میرا مسئلہ بھی یہی تھا۔ جتنا میں اس پر غور کرتا، میرا ضمیر مجھے اتنی ہی ملامت کرتا اور میں اپنی نظروں میں اور بھی گر جاتا۔ مجھے دفعتاً یہ احساس ہوا کہ کسی غیر مرئی ہستی نے میرے منہ پر تھپڑ مار کر مجھے یہ یاد دہانی کرائی ہے کہ کوئی ہستی ایسی بھی ہے جو اعمال کی نگرانی کرتی ہے۔ میں نے ایک غریب بڑھیا کا، جس نے میرے ساتھ کبھی کوئی بُرائی نہیں کی تھی، غلام چرا لیا تھا۔ میرا یہ گناہ اس ہستی کی نگاہوں سے چھپا نہ رہ سکا۔ اور اس نے مجھے یہ احساس دلا دیا کہ "اے بندے سن! یہ حدِ فاصل ہے۔ اس سے ایک قدم بھی اور آگے نہ بڑھنا" —— اس خیال کے آتے ہی مجھ پر خوف طاری ہو گیا اور میں وہیں سجدے میں گر گیا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اپنے اس احساس جرم کو کم کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی جواز تلاش کر لوں (مثلاً یہ کہ میں تو شروع سے ہی گناہ کے ماحول میں پلا ہوں، لہٰذا مجھے بھلے بُرے کی تمیز کہاں ؟) لیکن میرے اندر کوئی شے مجھے ملامت کرتی ہی رہی۔ اور کہتی رہی: "اتوار کے دن گرجا میں سکول بھی تو لگتا تھا۔ اگر تم نے کبھی وہاں جانے کی کوشش کی ہوتی، تو کم از کم تمہیں یہ تو پتہ چل جاتا کہ وہ لوگ جو اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں، جس قسم کی تم نے اس حبشی کے معاملہ میں کی ہیں۔ انہیں دوزخ کی آگ میں جلنے کے لئے پھینک دیا جاتا ہے۔"

میں خوف سے تھر تھر کانپنے لگا اور میں نے ارادہ کیا کہ خدا کے حضور دعا مانگوں کہ وہ مجھے اتنی ہمت دے کہ میں ان برے کاموں سے کنارہ کشی کرلوں اور نیکی کی طرف راغب ہو جاؤں۔ میں سجدے میں گر گیا لیکن میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ مگر کیوں؟ وجہ ظاہر تھی۔ بھلا خدا سے بھی کوئی بات چھپی رہتی ہے؟ لہٰذا اسے دھوکہ دینے کی کوشش کرنا بے سود ہے۔ اور پھر میں اپنے آپ سے کیا چھپاتا؟ مجھے خوب اچھی طرح علم تھا کہ میرے منہ سے توبہ کا ایک لفظ بھی کیوں نہیں نکل سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرا دل صاف نہ تھا، میری نیت میں کھوٹ تھا! اس وقت بھی جب میں گناہ سے توبہ کرنا چاہتا تھا، میرے دل کے اندر ایک بہت بڑا گناہ موجود تھا۔ میرا منہ توبہ کہنا چاہتا تھا: "اے خدا! آج سے میں سیدھے راستے پر چلوں گا اور ایماندار بنوں گا۔ میں ابھی جاکر اس غلام کی آقا کو خط لکھ کر یہ اطلاع دوں گا کہ اس کا غلام کہاں ہے" ــــــ لیکن میرا ضمیر جانتا تھا کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ یقیناً خدا کو بھی اس جھوٹ کا علم ہوگا۔ اور آپ جھوٹی دعا نہیں مانگ سکتے ــــــ کم از کم میرا تجربہ تو یہی تھا۔

میں بہت پریشان تھا۔ اتنا پریشان کہ مجھے کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ کیا کروں ــــــ آخر مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ میں نے سوچا کہ پہلے جاکر وہ خط لکھ آؤں، پھر دعا مانگوں۔ پھر شائد میرے منہ سے مناسب الفاظ نکل سکیں۔ حیرت تو یہ ہے کہ اس خیال کے آتے ہی میرے دل سے تمام بوجھ اتر گیا۔ میری پریشانی دور ہو گئی۔ خوشی خوشی میں نے کاغذ پنسل لی اور جوش میں لکھنا شروع کیا:

"مس واٹسن۔

آپ کا بھگوڑا غلام جم یہاں پائکسوئل سے دو میل دور مسٹر فیلپس کے قبضے میں ہے اگر آپ انعام کی رقم بھیج دیں، تو وہ غلام آپ کے حوالے کر دے گا۔

ہک فن"

اتنا لکھ کر میں مطمئن ہو گیا۔ آج زندگی میں پہلی بار مجھے احساس گناہ ہوا تھا لیکن اس خط کو لکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے سارے گناہ دھل گئے ہوں۔ مجھے بھروسہ تھا کہ اب میں

ضرور دعا مانگ سکوں گا۔ لیکن اب کی بار میں فوراً سجدے میں نہ گرا۔ بلکہ کاغذ رکھ کر سوچنے لگا کہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے مجھے گناہوں سے چھٹکارا دلوا دیا۔ ورنہ میں تو گمراہ ہو ہی چکا تھا اور دوزخ کا مستحق بننے والا تھا — میں اسی بارے میں سوچتا رہا، سوچتا رہا، اور دریا کا سارا سفر میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ میں نے دیکھا کہ جم میرے سامنے بیٹھا ہے۔ دن میں، رات میں، چاندنی راتوں میں، طوفانی راتوں میں، جم میرے سامنے بیٹھا ہے۔ ہمارا بیڑا دریا کے سینے پر پھسلتا چلا جارہا ہے اور ہم بیڑے پر بیٹھے باتیں کر رہے ہیں، گا رہے ہیں، ہنس رہے ہیں میں نے حافظے پر بہت زور دیا لیکن جم کے خلاف مجھے کوئی شکایت یاد نہ آئی۔ اس کے برعکس اس کی مہربانیاں ہی میرے ذہن میں ابھریں۔ میں نے دیکھا کہ وہ میری جگہ رات کو ڈیوٹی دے رہا ہے کیونکہ وہ نہیں چاہتا کہ مجھے جگا کر میری نیند خراب کرے۔ اور پھر میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر آگیا۔ جب میں دھند میں بھٹک جانے کے بعد واپس آیا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ کتنا خوش ہوا تھا! — اور پھر وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا جب میں اس جگہ جہاں دو کنبوں میں جنگ ہوئی تھی، دلدل میں اس سے ملنے گیا تھا۔ یہی نہیں ایسے ہی کئی منظر مجھے یاد آتے رہے۔ جم ہمیشہ مجھے "میرے عزیز" کہہ کر بلاتا تھا۔ مجھ سے پیار کرتا تھا اور جو کچھ بھی اس سے بن پڑتا تھا، میری خاطر کرنے کو ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ وہ مجھ پر کتنا مہربان تھا! — اور پھر مجھے یاد آیا کہ کس طرح میں نے اسے جھوٹ بول کر بچایا تھا۔ یعنی جب میں نے ان آدمیوں کو یہ کہہ کر بھگا دیا کہ بیڑے پر چیچک نکلی ہوئی ہے۔ وہ پھر کتنا شکر گزار تھا! اور اس نے کہا تھا کہ اگر جم کا اس دنیا میں کوئی دوست ہے تو وہ دوست میں ہوں۔ اور پھر فوراً مجھے خیال آیا کہ اس دنیا میں میرے سوا جم کا اور ہے بھی کون؟ اور اس خیال کے آتے ہی جونہی میں نے نگاہ اٹھائی، وہ کاغذ مجھے میرا منہ چڑاتا ہوا نظر آیا۔

وہ جگہ جہاں میں بیٹھا تھا، چاروں طرف درختوں سے گھری ہوئی تھی۔ میں نے کاغذ اٹھا لیا۔ میرے جسم پر لرزہ طاری تھا، کیونکہ مجھے دو راستوں میں سے کسی ایک کے متعلق قطعی فیصلہ کرنا تھا۔ اور میں بخوبی جانتا تھا کہ اس فیصلہ کی نوعیت کیا ہے۔ میں ایک منٹ تک

سوچتا رہا۔ اس ایک منٹ میں میرا سانس تک رُکا رہا۔ اور تب میں نے اپنے آپ سے کہا:
"مجھے دوزخ میں جانا منظور ہے" اور میں نے وہ کاغذ پھاڑ دیا۔

میں بخوبی جانتا تھا کہ میرا فیصلہ اور میرے الفاظ دونوں نہایت خطرناک ہیں۔ لیکن الفاظ زبان سے نکل چکے تھے اور میں انہیں واپس لینے کو تیار نہیں تھا۔ اس کے بعد میں نے اپنی عاقبت سدھارنے کے متعلق کبھی سوچا ہی نہیں اور اس سارے واقعے کو یکسر اپنے ذہن سے نکال دیا۔ اور فیصلہ کیا کہ چونکہ میرے مقدر میں بدی ہی لکھی ہے لہذا میں گناہگار ہی بنا رہوں گا۔ مجھ میں اور دوسروں میں ایک فرق ہے اور وہ یہ کہ میری پرورش ہی گناہ کے ماحول میں ہوئی ہے۔ لہذا میرے لئے اس کے سوا اور چارہ ہی کیا ہے کہ میں گناہ کا راستہ اختیار کروں اپنے اس فیصلے پر کاربند ہونے کے لئے میں نے ارادہ کیا کہ سب سے پہلا کام یہ کیا جائیگا کہ جم کو چرا کر اسے اس کی غلامی سے رہا کروایا جائے۔ اس کے بعد اگر کوئی اور بدتر گناہ سوجھا تو اس پر عمل کیا جائیگا۔ اب جب کہ میں نے گناہگار بننے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا، تو پھر کیوں نہ جی کھول کر گناہ کئے جائیں؟۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ جم کو چرایا کیسے جائے۔ میں نے بہت سی سکیمیں بنائیں، لیکن بالآخر ایک ترکیب مجھے جچ گئی۔ تھوڑی دور آگے جا کر دریا کے وسط میں ایک جزیرہ تھا جس پر درخت ہی درخت اُگے ہوئے تھے۔ میں نے اس جزیرے کے محل وقوع کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا اور رات ہوتے ہی بیڑا وہاں لے جا کر چھپا دیا۔ اس رات میں وہیں سویا۔ اگلے دن میں نے صبح ہونے سے پہلے پہلے ناشتہ کر لیا اور وہ نئے کپڑے پہن لئے جو میں نے ایک دوکان سے خریدے تھے۔ باقی کپڑے اور دو ایک متفرق اشیا میں نے ایک پوٹلی میں باندھ لیں اور اسے ناؤ میں رکھ کر ساحل کی طرف چل پڑا۔ جب میں اس جگہ سے ذرا آگے نکل گیا، جہاں میرے خیال میں فلپس کا گھر ہونا چاہیئے تھا۔ تو میں کشتی سے اتر پڑا۔ اس کے بعد میں نے اس پوٹلی کو تو جنگل میں چھپا دیا اور کشتی میں پانی اور پتھر بھر کر اسے ایک ایسی جگہ ڈبو دیا جہاں سے بوقت ضرورت میں اسے دوبارہ نکال سکتا تھا۔ یہ جگہ دریا کے کنارے پر واقع لکڑیاں چیرنے کے کارخانے سے (جو بھاپ سے

چلتا تھا، کوئی چوتھائی میل دور تھی۔

اس کے بعد میں سڑک پر ہو لیا۔ جب میں کارخانے کے قریب سے گزر رہا تھا، تو میری نظر اس سائن بورڈ پر پڑا جس پر لکھا تھا: "فیلپس کا لکڑیاں چیرنے کا کارخانہ"۔ دو تین سو گز اور آگے جا کر مجھے کھیتوں میں بنے ہوئے کچھ مکان نظر آئے۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھا لیکن مجھے کوئی آدمی نظر نہ آیا، حالانکہ اب کافی دن نکل آیا تھا۔ خیر، میں خود بھی تو فی الحال کسی سے ملاقات کا خواہشمند نہ تھا۔ اس وقت تو میں صرف یہ چاہتا تھا کہ اس جگہ کے محلِ وقوع کو اچھی طرح ذہن نشین کر لوں۔ میری سکیم یہ تھی کہ جب میں ان مکانوں کے قریب پہنچوں، تو ایسا راستہ اختیار کر دوں جس سے یہ ظاہر ہو کہ میں ادھر جنگل کی طرف سے نہیں بلکہ قصبے کی طرف سے آ رہا ہوں۔ لہذا اس جگہ کو ایک نظر دیکھ کر میں آگے بڑھ گیا۔ قصبے میں پہنچ کر سب سے پہلے جس شخص سے میری ملاقات ہوئی، وہ ڈیوک تھا۔ یہ حضرت "شاہی عجوبے" کے اشتہار لگا رہے تھے۔ یہ اشتہار ویسے ہی تھے، جیسے پہلے بھی ایک بار لگائے گئے تھے، یہاں بھی یہ ناٹک صرف تین راتوں کے لئے ہی کھیلا جانا تھا۔ میں نے سوچا: واہ رے ٹھگو! تمہاری یہ جرأت! — لیکن بیشتر اس کے کہ میں وہاں سے کھسکوں، ڈیوک نے مجھے دیکھ لیا اور حیران ہو کر بولا: "ارے — تو — تم کہاں سے ٹپک پڑے؟" اور یہ ظاہر کرتا ہوا کہ مجھے دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوئی ہے، وہ بڑے اشتیاق سے بولا: "بیڑا کہاں ہے؟ اسے کسی اچھی سی جگہ چھپا کر آئے ہو نا؟" — میں بولا: "کیا کہا؟ بیڑا؟ یہی سوال تو میں جناب سے پوچھنے والا تھا۔"

"مجھ سے پوچھنے کا مطلب؟" وہ بولا

میں نے جواب دیا: "کل جب میں نے بادشاہ کو شراب خانے میں لڑھکتے ہیں وقت دیکھا، تو میں نے سوچا کہ ان کا نشہ اترتے اترتے ابھی گھنٹوں لگیں گے اور ظاہر ہے کہ تب تک یہ ہمارے ساتھ واپس جانے کے قابل نہیں ہیں۔ تو پھر کیوں نہ قصبے کی سیر کر لی جائے؟ — میں قصبے کی سیر کر رہا تھا کہ ایک شخص میرے پاس آ کر بولا: اگر تم کشتی کو دریا کے اس پار لے جانے میں میری مدد کرو، تو تمہیں دس سینٹ دوں گا۔ میں نے اس پار سے ایک بھیڑ لانی ہے،

میں اس کے ساتھ چلا گیا، لیکن جب ہم بھیڑ کو کھینچ کر کشتی میں لادنے لگے، تو وہ مچل گئی۔ اس شخص نے رسی مجھے پکڑا دی اور خود پیچھے سے جا کر بھیڑ کو دھکیلنے لگا۔ لیکن بھیڑ بہت طاقتور تھی۔ رسّہ چھڑا کر بھاگ نکلی۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے بھاگتے رہے۔ ہمارے پاس کتّا تو تھا نہیں کہ اسے گھیر کر لے آتا۔ لہٰذا ہمارے لئے ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ اسے دوڑا دوڑا کر تھکا دیں، رات کو کہیں جا کر وہ ہمارے قابو آئی، اور ہم اسے لاد کر لے آئے۔ یہاں سے فارغ ہو کر میں نے بیڑے کا رخ کیا لیکن جب میں وہاں پہنچا تو بیڑا غائب تھا۔ میں نے سوچا: "وہ لوگ ضرور کسی آفت میں پھنس گئے ہوں گے تبھی تو انہیں یوں اچانک بھاگنا پڑا ہے۔ اس خیال سے کہ آپ لوگ میرا غلام بھی ساتھ لے گئے ہیں۔ اور یہی ایک غلام میری کل پونجی ہے اور اس کے سوا میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں اور میں ایک اجنبی جگہ میں پھنس گیا ہوں میں رونے لگا۔ رات میں نے جنگل میں سو کر کاٹی ہے۔ لیکن آپ لوگ تو یہیں ہیں۔ پھر بیڑے کو کون لے گیا؟ اور جم کہاں ہے؟ بے چارہ جم!"

"مجھے کیا پتہ؟ میرا مطلب ہے مجھے کیا پتہ کہ بیڑا کہاں ہے۔ اس بڈھے بیوقوف نے چالیس ڈالر کا ایک سودا کیا اور رقم وصول کر لی۔ جب ہم نے اسے شراب خانے میں دیکھا تھا۔ تو ان بدمعاشوں نے کوئی شرط لگا کر اس سے وہ چالیس ڈالر بھی ہتھیا لئے تھے۔ ان چالیس ڈالروں میں اس کے ہاتھ صرف وہی رقم لگی جس کی اس نے شراب پی لی تھی — خیر، بہت رات گئے جب میں اسے لے کر واپس پہنچا، تو دیکھا کہ بیڑا غائب ہے۔ ہم نے سوچا: اس ننھے بدمعاش نے ہمارا بیڑا چرا لیا ہے اور ہمیں یہیں چھوڑ کر تو بھاگ گیا ہے۔"

"لیکن میں اپنے غلام کو چھوڑ کر کیسے جا سکتا تھا؟ اس دنیا میں وہی غلام تو میری کل پونجی ہے۔"

"اس بات کا تو ہمیں خیال ہی نہیں آیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے ہم اپنا ہی غلام سمجھنے لگ گئے تھے۔ واقعی! جیسے وہ ہمارا ہی غلام ہو۔ خدا جانتا ہے کہ اس کی خاطر ہم نے کیا کیا مصیبتیں جھیلی ہیں۔ خیر، جب ہم نے دیکھا کہ بیڑا غائب ہے اور ہمارے پلّے پھوٹی کوڑی بھی نہیں، تو ہم نے سوچا کیوں نہ "شاہی عجوبے" کو ایک بار پھر آزمایا جائے۔ تب سے اب تک میں یہ کام کر رہا ہوں۔ اور ایک دھیلا بھی اڑ کر میرے منہ میں نہیں گئی — اچھا سنو، وہ دس سینٹ کہاں ہیں؟ لاؤ مجھے دو۔"

میرے پاس رقم تو کافی تھی۔ میں نے دس سینٹ اسے دے دیئے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا: "خدا کے لئے اس رقم سے کچھ کھانے پینے کا سامان لے آیئے اور مجھے بھی کچھ کھانے کو دیجئے میرے پاس یہی دس سینٹ ہیں اور میں نے بھی کل سے کچھ نہیں کھایا پیا"۔ — وہ خاموش رہا۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ مڑا اور بولا: "وہ حبشی کہیں ہمارا بھانڈا نہ پھوڑ دے۔ اگر اس نے سچ مچ پھوڑ دیا تو میں اس کی کھال کھینچ لوں گا۔"

"لیکن وہ بھانڈا پھوڑے گا کیونکر؟ وہ تو بھاگ گیا ہے نا۔" تمہارا سر! اس بڈھے بیوقوف نے اسے بیچ دیا ہے اور اس رقم میں سے اس نے مجھے ایک پائی بھی نہیں دی۔ اور اب یہ ساری رقم دوسرے لوگوں نے ہتھیالی ہے۔"

"بیچ دیا ہے!" میں نے کہا، اور رونے لگا۔ "لیکن وہ تو میرا غلام ہے۔ اس رقم پر تو صرف میرا ہی حق تھا۔ کہاں ہے میرا غلام؟ میرا غلام مجھے واپس لا دو۔"

"غلام تو اب واپس ملنے سے رہا۔ تو پھر رونے دھونے سے فائدہ؟ اچھا۔ تم تو ہمارا راز فاش نہیں کرو گے؟ مجھے تم پر اعتبار نہیں۔ لیکن سنو، اگر تم نے یہ راز —" وہ رک گیا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے، کر کے رہے گا۔ ایسی شیطانیت میں نے پہلے کبھی اس کی آنکھوں میں نہ دیکھی تھی۔ خیر، میں سسکیاں بھر بھر کر روتا رہا اور کہتا رہا: "میں کسی کا کوئی راز فاش نہیں کرنا چاہتا۔ میرے پاس اتنی فرصت ہی کہاں ہے؟ مجھے تو ابھی اپنے غلام کو ڈھونڈنا ہے۔"

ایسا لگتا تھا جیسے وہ کچھ پریشان سا ہو۔ وہ وہیں کھڑا کچھ سوچتا رہا۔ اشتہار اس کے بازو پر پھڑپھڑا رہے تھے، اس کی پیشانی پر بل پڑے تھے۔ بالآخر وہ بولا:

"ایک بات سنو۔ ہمیں یہاں تین دن رکنا ہے۔ اگر تم وعدہ کرو کہ اپنا منہ بند رکھو گے اور اس حبشی سے کہو گے کہ وہ بھی کسی سے کچھ نہ کہے، تو میں تمہیں اس کا پتہ بتا دیتا ہوں۔"

میں نے وعدہ کر لیا اور وہ بولا:

"ایک کسان جس کا نام سلاس فـ —" وہ رک گیا۔ شروع میں اس کا ارادہ سچ

بتانے کا ہی تھا، لیکن اب یوں لگتا تھا جیسے اس نے ارادہ بدل لیا ہے اور کوئی بہانہ سوچ رہا ہے۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ اسے واقعی مجھ پر اعتبار نہ تھا اور اسے اندیشہ تھا کہ میں کہیں ان کے منصوبوں کو ملیامیٹ نہ کر دوں۔ لہٰذا وہ یہ چاہتا تھا کہ تین دن کے لئے اس کانٹے کو راستے سے ہٹا دے۔ خیر، فوراً ہی اس نے بات بدل دی، اور بولا :۔

"جس شخص نے اسے خریدا ہے، اس کا نام ابرام فاسٹر ہے۔ ابرام جی۔ فاسٹر۔ اور وہ ادھر دیہات میں یہاں سے تقریباً چالیس میل دور کسی گاؤں میں رہتا ہے۔ لافائٹ والی سڑک پر۔" "خیر، کوئی بات نہیں۔ پیدل چل کر میں تین دن میں وہاں تک پہنچ جاؤں گا۔ میں آج ہی سہ پہر کو روانہ ہو جاؤں گا۔"

"سہ پہر کو نہیں ـــ ابھی! اسی وقت۔ وقت ضائع مت کرو ـــ اور ہاں دھیان رہے۔ راستے میں زبان بند رکھنا۔ بس منہ بند رکھو اور یہاں سے فوراً چل دو۔ پھر تمہیں ہم سے کوئی خطرہ نہیں ـــ سن لیا؟"

یہی تو میں بھی چاہتا تھا اور اسی حکم کے لئے میں نے یہ سارا ڈھونگ رچا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ان تین دنوں میں کوئی شخص میری سکیموں میں روڑا اٹکائے۔

"بس اب چل دو" وہ بولا "اور ہاں، مسٹر فاسٹر کو جو تمہارے جی میں آئے فقرہ گھڑ کے سنا دینا۔ شاید وہ تمہاری باتوں میں آجائے اور اسے یقین ہو جائے کہ جم تمہارا ہی غلام ہے کئی احمق ایسے بھی تمہیں مل جائیں گے ـــ اور جنوب میں ایسے احمقوں کی کمی نہیں ـــ جو بغیر کاغذات دیکھے ہی تمہارا یہ دعویٰ مان لیں گے۔ اور جب تم اسے یہ بتاؤ گے کہ انعام اور اشتہار دونوں جعلی ہیں، اور اپنے اس الزام کا کوئی قابلِ قبول ثبوت مہیا کر دو گے، تو شاید وہ یہ بات بھی مان لے گا ـــ اچھا، اب روانہ ہو جاؤ ـــ موقع محل دیکھ کر جو تمہارے جی میں آئے، اسے بتا دینا۔ لیکن یاد رہے۔ اس دوران میں تمہارا منہ بند رہے گا۔"

میں ناک کی سیدھ دیہات کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میری ہر حرکت کو تاڑ رہا ہے۔ لیکن مجھے اس کی پرواہ نہ تھی۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ باہمی دھوکے کے اس کھیل میں جیت میری

ہی ہو گی۔ میں سیدھا دیہات کی طرف چلتا رہا لیکن ایک میل جا کر میں رک گیا اور جنگل میں سے ہوتا ہوا واپس آ گیا۔ پھر میں نے فیلپس کے گھر کا رخ کیا۔ میرا ارادہ تھا کہ ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر اپنی سکیم پر فوراً عمل شروع کر دوں۔ میں چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے، جم کو تنبیہہ کر دی جائے کہ جب تک یہ ٹھگ یہاں ہیں، وہ خاموش رہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ خواہ مخواہ ان بدمعاشوں کے ساتھ جھگڑا مول لیا جائے۔ کیونکہ میری کوشش تو یہ تھی کہ جتنی جلدی ہو سکے، ان سے پیچھا چھڑایا جائے۔

۳۲۔ انوار جیسا سناٹا۔ پہچاننے میں غلطی۔ آفت۔ نئی الجھن۔

جب میں وہاں پہنچا تو وہ جگہ یوں سنسان اور خاموش تھی گویا آج اتوار کی چھٹی ہو۔ دھوپ تیز تھی اور موسم خاصا گرم تھا۔ نوکر چاکر سب کھیتوں میں گئے ہوئے تھے۔ فضا میں مکھیوں اور مچھروں کی بھنبھناہٹ تیز رہی تھی، جس سے ماحول اور بھی اداس ہو گیا تھا۔ اس بھنبھناہٹ کو سن کر تو یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے یہاں کے تمام انسان مر چکے ہوں۔ ایسے عالم میں اگر ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا پتوں کو سرسراتا ہوا نکل جائے، تو آپ یوں محسوس کرنے لگیں گے جیسے عالم ارواح میں پہنچ گئے ہوں اور روحوں کی سرگوشیاں سن رہے ہوں۔ ان روحوں کی سرگوشیاں جنہیں مرے مدتیں ہو گئی ہیں۔ آپ کو خواہ مخواہ یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ شاید یہ روحیں آپ ہی کی باتیں کر رہی ہیں۔ اور اس خیال کے آتے ہی آپ افسردہ ہو جائیں گے۔ ایسے ماحول میں انسان کی صرف ایک ہی خواہش ہوتی ہے اور وہ یہ کہ کاش وہ بھی مر چکا ہوتا تاکہ اس روز روز کے جھنجھٹ سے چھٹکارا تو نصیب ہو جاتا ــــــ

فیلپس کے کھیتوں میں کپاس اُگی تھی۔ زمین کچھ زیادہ نہیں تھی۔ دیکھنے میں بھی یہ جگہ باقی فارموں کی طرح ہی تھی۔ یعنی دو ایکڑ کے ایک احاطے کے چاروں طرف ایک جنگلہ۔ اس جنگلے کے آرپار جانے کے لئے لکڑی کی ایک سیڑھی جو شہتیریاں چیر کر بنائی گئی تھی۔ ان شہتیریوں کے ساتھ موٹے موٹے ڈنڈے جڑے تھے جو ان پیپوں کی طرح دکھائی دیتے تھے، جن کی لمبائی اور موٹائی یکساں نہ ہو۔ اس سیڑھی کا ایک مصرف اور بھی تھا۔ یعنی اس پر کھڑے ہو کر عورتیں گھوڑوں پر

سوار ہوا کرتی تھیں۔ اس احاطے میں کہیں کہیں مرجھائی ہوئی گھاس کے چھوٹے چھوٹے تختے بھی تھے
زمین زیادہ تر چٹیل اور ہموار تھی۔ اس پرانے ہیبٹ کی طرح جس کا اوپر کا اُبھرا ہوا حصہ چپک گیا ہو۔
اس سے پرے لکڑی کا بنا ہوا ایک دو منزلہ مکان تھا۔ یہ مکان، جو لکڑی کے تختے چیر کر بنایا گیا تھا،
گوروں کے لئے تھا۔ اس کی دراڑیں گارے اور چونے سے بند کردی گئی تھیں۔ گارے کی ان دھاریوں
پر کبھی کسی زمانے میں ضرور سفیدی ہوئی ہوگی۔ مکان کے ایک طرف رسوئی گھر تھا جو گول شہتیریوں سے
بنا تھا۔ یہاں سے لے کر مکان تک ایک چوڑا سا برآمدہ تھا جس پر چھت پڑی تھی۔ باورچی خانہ کے پیچھے
چمڑہ کمانے کا کمرہ تھا۔ یہ بھی شہتیریوں ہی سے بنایا گیا تھا۔ اس سے پرے تین کوٹھڑیوں کی ایک
قطار تھی۔ لکڑی کی یہ کوٹھڑیاں غلاموں کی رہائش کے لئے تھیں۔ مکان کی پچھلی طرف دور جنگلے
کے ساتھ ایک کوٹھری بالکل الگ تھلگ کھڑی تھی اور اس سے کچھ آگے چند اور کوٹھڑیاں بنی تھیں۔
اس کوٹھڑی کے قریب ایک تنور سا بنا تھا، اور اس کے پاس ایک بڑی سی دیگ رکھی تھی جو صابن
کاڑھنے کے کام آتی تھی۔ رسوئی گھر کے دروازے کے قریب ایک بنچ رکھا تھا جس پر پانی کی ایک
بالٹی اور تونبی پڑی تھی۔ باہر ایک کتا دھوپ میں سویا ہوا تھا۔ چند اور کتے ادھر اُدھر لیٹے ہوئے تھے۔
تھوڑی دور ایک کونے میں تین گھنیرے درخت تھے۔ ایک جگہ جنگلے کے ساتھ ساتھ پودینے کے
پودے اور بیروں کی جھاڑیاں اُگی تھیں۔ جنگلے کے باہر باغیچہ تھا اور تربوزوں کی ایک کیاری اس
کے بعد کپاس کے کھیت تھے اور کھیتوں کے بعد جنگل شروع ہو جاتا تھا۔

میں مکان کے پچھواڑے کی طرف چلا گیا اور تنور کے قریب بنی سیڑھیاں چڑھ کر جنگلے کے
اندر کود گیا۔ وہاں سے میں نے سیدھا رسوئی گھر کا رُخ کیا۔ تھوڑا آگے جا کر مجھے چرخے کی گھوں گھوں
کی مدھم سی آواز آئی۔ یہ آواز کبھی تو گریہ زاری کرتی ہوئی معلوم ہوتی اور کبھی خاموش ہو جاتی۔ میرا خیال ہے
کہ اس آواز سے زیادہ سوگوار اور کوئی شے اس کائنات میں موجود نہیں ہوگی۔ میرا جی چاہا کہ کاش
میں مر چکا ہوتا۔

میں چلتا رہا اس وقت میرے ذہن میں کوئی خاص سکیم نہ تھی۔ میں صرف خدا کے بھروسے
چل پڑا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اگر کسی نے مجھ سے کچھ پوچھا تو خدا خود بخود کوئی نہ کوئی جواب سمجھا دے گا

تجربے نے مجھے یہ سکھا دیا تھا کہ اگر میں خدا پر بھروسہ رکھوں، تو ایسے موقعوں پر وہ میرے منہ میں مناسب الفاظ ڈال ہی دیتا ہے۔

ابھی میں آدھا راستہ ہی گیا ہوں گا کہ پہلے تو ایک کتا اور پھر دوسرا اٹھ کر میری طرف لپکے۔ خیر، میں نے وہی کچھ کیا، جو ان حالات میں مناسب ہوا کرتا ہے۔ یعنی میں رک کر ساکت کھڑا ہو گیا اور انہیں گھورنے لگا۔ اس کے بعد وہ غل غپاڑہ مچا کہ خدا کی پناہ! پندرہ سیکنڈ کے اندر اندر ہی میں یوں گھر گیا جیسے میں کسی پہیئے کا مرکزی حصّہ ہوں اور یہ کتّے اس پہیئے کے دُھرّے۔ پندرہ بھونکتے، شور مچاتے کتّے دائرے کی شکل میں میرے گرد جمع تھے اور ان کی تھوتھنیاں اور گردنیں میری طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ اسی پر بس نہیں۔ باقی کتّے بھی لپکے چلے آ رہے تھے۔ اِدھر کے جنگلے کے اوپر سے، اُدھر کے جنگلے سے، اس کونے سے، اس کونے سے، کتّے نکل نکل کر میری طرف بھاگے چلے آ رہے تھے۔

ایک حبشن ہاتھ میں بیلن پکڑے رسوئی گھر سے دوڑتی ہوئی آئی اور کتّوں کو زور زور سے ڈانٹنے لگی: "دفع ہو جاؤ۔ ارے ٹائگر! ارے سپاٹ! جاؤ، دفع ہو جاؤ۔" اس کے ساتھ ہی اس نے پہلے ایک کتّے کو، پھر دوسرے کو اس زور سے بیلن مارا کہ وہ دونوں بلند آواز میں بھونکتے ہوئے وہاں سے چل دیئے۔ فوراً بعد دوسرے کتّے بھی رخصت ہو گئے۔ لیکن ایک ہی لمحے بعد آدھے کتّے دم ہلاتے واپس آ گئے اور مجھ سے دوستی کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ یہ کتّے بھی کتنے بے فکر ہوتے ہیں!

عورت کے پیچھے پیچھے ایک حبشی لڑکی اور دو حبشی لڑکے بھی چلے آئے تھے۔ ان بچّوں کے جسم پر گاڑھے کی ایک موٹی سی قمیض کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ وہ اپنی ماں کے گاؤن سے چمٹے اس کے پیچھے سے ڈرتے، شرماتے (جیسا کہ بچّوں کی عادت ہوتی ہے) میری طرف جھانک رہے تھے۔ فوراً ہی ایک گوری عورت بھی مکان میں سے دوڑتی ہوئی آ گئی۔ اس کی عمر یہی پینتالیس، پچاس برس کی ہوگی وہ سر سے ننگی تھی، اور اس کے ہاتھ میں چرخے کی ہتھی پکڑی تھی اس کے پیچھے پیچھے اس کے ننھے ننھے گورے بچّے کھڑے تھے وہ بھی حبشی بچّوں کی طرح ڈرتے شرماتے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ عورت کی باچھیں خوشی سے کھلی ہوئی تھیں۔ آتے ہی وہ بولی: "شکر ہے، تم آ گئے!"

اور میں نے بے سوچے سمجھے جواب دیا: "جی ہاں"۔

اس نے مجھے چھاتی سے چمٹا لیا اور پھر میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر زور زور سے انہیں دبانے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر گالوں پر گر رہے تھے، اور وہ مجھے زور زور سے بھینچتی چلی جا رہی تھی۔ اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہتی جاتی تھی: "میں تو سمجھتی تھی کہ تم ہو بہو اپنی ماں پر گئے ہوگے، لیکن نہیں۔ مشابہت کوئی ایسی زیادہ نہیں۔ لیکن اس سے کیا؟ میرے لئے تو یہی بہت ہے کہ تم آ تو گئے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ تمہیں سینے سے ہی چمٹائے رکھوں، ارے بچو یہ ہے تمہارا بھائی ٹام! اسے خوش آمدید کہو"۔

لیکن بچوں نے اپنے چہرے ماں کے گھٹنوں میں چھپا دیئے اور منہ میں انگلیاں دے کر اس کے پیچھے چھپ گئے۔ پھر وہ بولی: "لزی! بھاگ کر اس کے لئے گرم گرم ناشتہ لے آ، تم کہیں سٹیم بوٹ پر ہی تو ناشتہ نہیں کر آئے؟"

جب میں نے بتایا کہ میں سٹیم بوٹ پر ہی ناشتہ کر آیا ہوں، تو وہ مجھے بازو سے پکڑ کر گھر کی طرف چل پڑی۔ بچے بھی پیچھے پیچھے آ گئے۔ جب ہم کمرے کے اندر پہنچے، تو اس نے مجھے لکڑی کے بیلنڈے والی ایک کرسی پر بٹھا دیا اور خود ایک سٹول کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گئی اور میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی:

"ذرا مجھے جی بھر کر دیکھنے دو۔ مدتوں سے تمہیں دیکھنے کی تمنا تھی۔ اور آج جا کر کہیں یہ تمنا پوری ہوئی ہے۔ ہم تو دو تین دن تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ تمہیں اتنے دن کیسے لگ گئے؟ کیا بوٹ کہیں پھنس گئی تھی؟"

"جی —— بوٹ"

"جی مت کہو —— مجھے خالہ سیلی کہہ کر پکارو —— ہاں تو کہاں پھنسی تھی بوٹ؟"

میری سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا جواب دوں۔ مجھے تو یہ تک پتہ نہ تھا کہ بوٹ نے جہاز کے منبع کی طرف سے آنا تھا یا دہانے کی طرف سے۔ لیکن جبلی طور میں بہت چوکنا ہوں۔ فوراً مجھے سوجھا کہ جہاز دہانے کی طرف سے آنا چاہیئے۔ یعنی اورلینز سے لیکن اس سے بھی مسئلہ حل نہ ہوا۔

کیونکہ مجھے راستے میں آنے والی جگہوں کے نام یاد نہ تھے۔ تو پھر کیا بتاتا کہ جہاز کہاں پھنسا تھا۔
اب صرف ایک ہی صورت تھی۔ یعنی یا تو اس جگہ کا نام بھول جانے کا بہانہ بنایا جائے یا پھر کوئی نام
گھڑ لیا جائے۔ اور ــــ یا ــــ یا ــــ مجھے فوراً ایک ترکیب سوجھی۔ میں نے جواب دیا!

"جہاز پھنسنے کی وجہ سے تو کوئی خاص دیر نہیں ہوئی تھی۔ دیر کی وجہ یہ ہے کہ جہاز کا سلنڈر
پھٹ گیا تھا۔

"ارے! کوئی زخمی تو نہیں ہوا تھا؟"

"نہیں جی ــــ صرف ایک حبشی مرا تھا۔"

"پھر تو خدا کا شکر ہے ــــ سلنڈر پھٹنے سے کبھی کبھی بہت سے لوگ زخمی ہو جاتے ہیں۔
پچھلی کرسمس سے دو سال پہلے کا ذکر ہے، تمہارا خالو سلاس نیو اورلینز سے آ رہا تھا۔ جہاز کا نام
لالی رک تھا۔ راستے میں سلنڈر پھٹ گیا جس سے ایک آدمی کی ٹانگ کٹ گئی۔ شاید وہ بعد میں
مر گیا تھا۔ وہ آدمی بیپٹسٹ تھا۔ تمہارے خالو بیٹن روج پر ایک ایسے خاندان کو جانتے ہیں، جو اس
شخص کے گھر والوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ ہاں یاد آیا۔ وہ شخص واقعی مر گیا تھا۔ زخم خراب
ہو گیا تھا اور اس کی ٹانگ کاٹنی پڑی تھی۔ اس کے باوجود وہ جانبر نہ ہو سکا۔ ہاں ہاں یاد آیا
اس کی موت زخم کے خراب ہو جانے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اس کا سارا بدن نیلا پڑ گیا تھا۔ تاہم
مرتے وقت اسے یہ امید تھی کہ وہ پھر مردوں میں سے جی اٹھے گا۔ کہتے ہیں اس کی حالت دیکھ کر
آدمی لرز اٹھتا تھا ــــ تمہارا خالو ہر روز تمہیں لینے کے لئے شہر جاتا رہا ہے۔ ابھی ایک گھنٹہ
ہوا ہے اسے گئے ہوئے۔ وہ اب آتا ہی ہوگا۔ تمہاری اس سے سڑک پر ملاقات ہو گئی ہوگی؟
تمہیں وہ راستے میں نہیں ملا؟ ذرا بڑی عمر کا آدمی ہے۔ اور ــــ"

"لیکن خالہ سیلی۔ مجھے تو راستے میں کوئی نہیں ملا۔ دراصل بوٹ علی الصبح ہی یہاں پہنچ گئی
تھی اور میں اپنا سامان گھاٹ پر کھڑی ایک کشتی میں رکھ کر خود قصبے کی سیر کرنے چلا گیا۔ پھر میں
قصبے سے باہر کھیتوں میں نکل گیا۔ میں چاہتا تھا کہ دن نکلے گھر پہنچوں۔ تبھی تو میں پچھواڑے
کے راستے آیا ہوں۔"

"اپنا سامان کس کے سپرد کر آئے ہو؟"

"کسی کے بھی تو نہیں۔"

"اور اگر کوئی اٹھا لے گیا تو؟"

"کوئی نہیں لے جاتا۔ میں نے اسے اچھی طرح چھپا دیا تھا۔" لیکن بڈٹ پر تمہیں اتنی جلدی ناشتہ کیسے مل گیا؟"

میں ڈرنے لگا کہ کہیں بھانڈا ہی نہ پھوٹ جائے۔ تاہم میں بولا: "جب کپتان نے دیکھا کہ میں اترنے کی تیاری کر رہا ہوں، تو وہ کہنے لگا کہ ساحل پر جانے سے پہلے کچھ کھا پی لو۔ پھر وہ مجھے افسروں کے کھانے کے کمرے میں لے گیا اور میں نے حسب منشا ناشتہ کر لیا۔"

میں اس قدر الجھن میں تھا کہ میرا دھیان اس کی باتوں کی طرف جا ہی نہیں رہا تھا۔ میرا ذہن تو یہ سوچ رہا تھا کہ کب موقع ملے اور کب میں ان بچّوں کو ایک طرف لے جا کر ان سے یہ کہہ دوں کہ آخر میں ہوں کون؟ —— لیکن مسز نیبلیس ایک بار بولنے پر جو آئی، تو رُکنے کا نام نہ لیا۔ فوراً ہی بعد میری پیٹھ پر ٹھنڈی ٹھنڈی لہریں اٹھنے لگیں۔ کیونکہ وہ بولی: "ارے واہ! ہم یہاں اتنی دیر سے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں اور تم نے مجھے نہ تو دیدی کے بارے میں کچھ بتایا ہے، نہ گھر کے باقی لوگوں کے بارے میں۔ اچھا اب میں خاموش رہوں گی۔ اب تمہاری باری ہے —— مجھے ایک ایک بات بتاؤ۔ ایک ایک کا حال کہو۔ وہ کیسے ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟ انہوں نے میرے لئے کیا کیا پیغام بھیجے ہیں؟ —— سب باتیں بتانا —— جو کچھ بھی تمہیں یاد ہو ——"

اب میں واقعی پھنس گیا، اور پھنس کیا گیا، یوں سمجھو مارا گیا۔ اب تک تو قدرت میری مدد کرتی رہی تھی۔ لیکن اب تو میں ایسا پھنسا تھا کہ کوئی راہ فرار نظر نہ آ رہی تھی۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ اس ڈھونگ کو اور زیادہ دیر تک قائم رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیوں نہ ایمانداری سے شکست قبول کر لی جائے۔ لہٰذا میں نے اپنے آپ سے کہا: "ہک فن! یہ ایک اور ایسا مقام ہے، جہاں سچ کہے بغیر چھٹکارا نہیں ——" لیکن ابھی میں نے منہ کھولا ہی تھا کہ اس عورت نے مجھے دبوچ کر جلدی سے ایک پلنگ کے نیچے چھپا دیا، اور بولی:

"لو وہ آگیا ـــــ ذرا سر کو اور نیچے کر لو۔ بس ٹھیک ہے۔ اب وہ تمہیں نہیں دیکھ سکے گا۔ اسے بالکل پتہ نہ لگنے دینا کہ تم یہاں چھپے بیٹھے ہو۔ میں اس سے ایک دل لگی کروں گی ـــ بچو! خبردار جو اس کو بتایا!" ـــــ

اب تو میں واقعی الجھن میں پڑ گیا۔ لیکن گھبرانے سے فائدہ؟ خاموش رہنے کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا؟ اب تو یہی ایک صورت تھی کہ موقع کی تاک میں رہو، اور جونہی بات بگڑتی نظر آئے۔ فوراً کترا کے نکل جاؤ ـــــ خیر، اس اثنا میں وہ بڈھا اندر آگیا۔ میں اسے صرف ایک نظر ہی دیکھ پایا کیونکہ فوراً پلنگ نے اسے میری نظروں سے اوجھل کر دیا۔ مسز فیلپس اچھل کر اس کے پاس جا پہنچی اور بولی: "کیوں، آیا نہیں؟"

"نہیں" ـــ اس کے خاوند نے جواب دیا۔

"او خدایا!" وہ بولی "لیکن اس کے نہ آنے کی آخر وجہ کیا ہے؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا" اس بڈھے نے جواب دیا ـــ "مجھے تو خود تشویش ہو رہی ہے"

"تشویش!" وہ بولی "میری تو جان نکلی جا رہی ہے۔ وہ آیا ضرور ہو گا، مگر راستے میں تم اسے پہچان نہ پائے ہو گے۔ یقیناً یہی ہوا ہو گا۔ میرا دل کہتا ہے 'وہ آگیا ہے'"

"لیکن سیلی! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اسے پہچان نہ پاؤں! تم بخوبی جانتی ہو کہ یہ بات نہیں۔ اگر وہ آیا ہوتا' تو میں نے اسے پہچان لیا ہوتا"

"لیکن ـــــ لیکن ـــــ دیدی کیا کہے گی؟ وہ یقیناً آیا ہو گا اور تم نے اسے پہچانا نہ ہو گا۔ وہ ـــــ"

"مجھے اور پریشان نہ کرو ـــــ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر بات کیا ہو سکتی ہے؟ اب تو واقعی مجھے بھی فکر ہو رہا ہے۔ لیکن خیر، یہ تو حقیقت ہے کہ وہ آیا نہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ مجھے راستے میں نہ ملتا؟ سیلی! یہ تو بہت تشویشناک ہے کشتی کو کہیں راستے میں کوئی حادثہ نہ پیش آگیا ہو!"

"سیلاس! ادھر دیکھو ـــ وہ سڑک پر ـــ شاید کوئی آرہا ہے ـــ"

وہ اچھل لگا کر کھڑکی کی طرف بڑھا جہاں پلنگ کا سرہانہ تھا۔ اب مسز فیلیپس کو وہ موقع ہاتھ آگیا جس کی وہ تلاش میں تھی۔ اس نے فوراً جھک کر مجھے پلنگ کے نیچے سے باہر گھسیٹا اور جب وہ کھڑکی سے مڑا، تو یوں مسکرانے، ہنسنے لگی، جیسے انار چھوٹ رہے ہوں۔ میں اس کے پہلو میں کھڑا تھا۔ اور پسینے میں تر بتر تھا — بڈھا ٹکٹکی باندھ کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا:

"ارے یہ کون ہے؟"

"تمہارا کیا خیال ہے؟ کون ہوگا؟"

"مجھے تو بالکل پتہ نہیں — تم ہی بتاؤ۔"

"یہ ہی تو ٹام سائر ہے"

یہ سُن کر میں تو تقریباً بے ہوش ہی ہو چلا تھا۔ لیکن فوراً اس بڈھے نے مجھے دبوچ لیا، اور زور زور سے مصافحہ کرنے لگا۔ خدا جانے کتنی دیر تک وہ مصافحہ کرتا رہا۔ اس دوران میں وہ عورت ہمارے گرد ناچتی، ہنستی، اور روتی رہی — اور پھر وہ دونوں سِڈ، اور میری، اور گھر کے دوسرے لوگوں کے متعلق سوالات کی بوچھاڑ کرنے لگے۔

لیکن ان کی خوشی کا میری اس خوشی سے کیا مقابلہ جو مجھے یوں اپنی اصلیت کا پتہ چل جانے سے ہوئی تھی۔ میری تو یہ حالت تھی جیسے میرا دوبارہ جنم ہوا ہو — تقریباً دو گھنٹے وہ میرے ساتھ چپکے رہے۔ بولتے بولتے میرے جبڑے دُکھنے لگے۔ میں انہیں اپنے خاندان کے متعلق — میرا مطلب ہے ٹام سائر کے خاندان کے متعلق — وہ کچھ بتایا، جو شائد اس خاندان کی چھ پشتوں میں بھی نہ ہوا ہو — اب تو میں نے انہیں "وائٹ ریور" دریا میں داخل ہوتے وقت جہاز کے سلنڈر کے پھٹ جانے کا قصہ بھی تفصیلاً سُنا دیا۔ اور یہ بھی بتایا کہ اس سلنڈر کو ٹھیک کرنے میں تین دن لگے تھے۔ بس یہ بات ایسی نپی تلی تھی، کہ بالکل فٹ بیٹھ گئی۔ اب ان بچاروں کو کیا پتہ کہ اسے ٹھیک کرنے میں تین دن لگتے ہیں یا اس سے کم؟ اگر میں یہ کہہ دیتا کہ پیچ ڈھیلا ہو گیا تھا اور اسے کس نے میں تین دن لگ گئے، تو وہ اس پر بھی یقین کر لیتے۔

اب میری جان میں جان آگئی۔ ٹام سائر بننا میرے لئے بالکل مشکل نہ تھا۔ اور میں بڑے

مزے سے ٹام سائر بن بیٹھا ـــــ لیکن تھوڑی ہی دیر میں ایک جہاز کے رُکنے کی آواز آئی۔ میں نے سوچا: "فرض کرو اگر ٹام سائر اس جہاز سے آٹپکا تو ـــــ؟ اور اگر وہ اس جہاز پر آیا ہو گا، تو بس اسے یہاں پہنچا ہی سمجھو۔ اور اگر آتے ہی اس نے میرا نام لے کر مجھے پکارا، اور مجھے اتنی بھی مہلت نہ ملی کہ آنکھ کے اشارے سے اسے صورت حال ہی سمجھا سکوں، تو پھر کیا ہو گا۔؟ خیر اور چاہے جو کچھ ہو، یہ گڑبڑ نہیں ہونی چاہئے۔ اس سے تو سب کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ مجھے چاہئے کہ فوراً جا کر اسے راستے میں ہی پکڑ لوں" ـــــ تب میں نے ان لوگوں سے یہ بہانہ کیا کہ میں شہر میں سامان لینے جا رہا ہوں ـــــ وہ بڈھا بھی میرے ساتھ جانے کو تیار ہو گیا۔ مگر میں نے یہ کہہ کر اسے ٹال دیا کہ مجھے گھوڑا چلانا آتا ہے۔ لہذا انہیں تکلیف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

٣٣۔ حبشی چور۔ جنوب کی مہمان نوازی۔ طول طویل دعا۔ کالا مُنہ اور بیروں کا ناچ

میں چھکڑے میں بیٹھ کر شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ابھی میں آدھے راستے ہی میں تھا کہ مجھے ایک چھکڑا اس طرف سے آتا دکھائی دیا۔ اس میں یقیناً واقعی ٹام سائر ہی تھا۔ میں نے اپنا چھکڑا روک لیا اور انتظار کرنے لگا۔ جونہی وہ چھکڑا قریب آیا، میں نے اسے رُکنے کا اشارہ کیا اور پھر یہ دونوں چھکڑے پہلو بہ پہلو کھڑے ہو گئے ٹام سائر کا مُنہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور دو تین بار تھوک نگلنے کے بعد یوں جیسے اس کا گلا خشک ہوا جا رہا ہو، وہ بولا: "تم بخوبی جانتے ہو کہ میں نے کبھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑا ـــــ پھر تم یوں مجھے تنگ کرنے کیوں آ گئے ہو؟"

میں بولا: "میں گیا ہی کب تھا، جو واپس آیا ہوں؟" میری آواز سن کر اس کی ڈھارس بندھی۔ تاہم وہ ابھی پوری طرح مطمئن نہیں ہوا تھا۔ بولا: "دیکھو ـــــ میرے ساتھ دل لگی مت کرو۔ میں نے کبھی تمہارے ساتھ دل لگی نہیں کی۔ اچھا ـــــ قسم کھاؤ کہ تم بھوت نہیں ہو۔"

"قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں بھوت نہیں ہوں۔" میں نے جواب دیا "اچھا۔ اچھا۔ تب تو ٹھیک ہی ہو گا ـــــ لیکن بات میری سمجھ میں آئی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہیں قتل نہیں کیا گیا تھا؟"

"نہیں — میں قتل نہیں ہوا تھا — یہ تو میری ایک چال تھی، انھیں دھوکہ دینے کی۔ اگر اعتبار نہ ہو، تو مجھے چھو کر دیکھ لو۔"

اس نے مجھے چھو کر دیکھا۔ اور جب اس کی پوری تسلی ہو گئی، تو مجھے دوبارہ زندہ پا کر اس کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ وہ فوراً میری آپ بیتی سننے کے لئے بے تاب ہو اٹھا۔ یہ تو واقعی ایک کارنامہ تھا، اور کارنامہ بھی ایسا جو کسی کی سمجھ میں نہ آسکے۔ بس اسی قسم کے کارنامے تو اس کی جان تھے۔ لیکن میں نے کہا: "وقت آنے دو۔ سب سمجھا دوں گا۔" اس کے کوچوان سے یہ کہکر کہ وہ ذرا انتظار کرے، ہم ایک طرف کو چلے گئے۔ اور میں نے اسے اپنی مشکل سے آگاہ کیا جب میں نے کہا: "صلاح دو۔ اب کیا کیا جائے" تو وہ بولا: "مجھے ایک منٹ کے لئے تنہا چھوڑ دو — اور سوچنے دو۔" — بہت دیر سوچنے کے بعد وہ بولا:

ٹھیک ہے۔ میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔ تم میرا یہ ٹرنک اپنے چھکڑے میں رکھ لو اور وہاں جا کر یوں ظاہر کرنا جیسے یہ تمہارا ہی سامان ہے۔ بس اب تم واپس چلے جاؤ — اور ہاں، ذرا آہستہ آہستہ جانا تاکہ تمہیں اتنا وقت ضرور لگے جتنا شہر سے آنے جانے میں لگنا چاہیے میں شہر لوٹ جاتا ہوں، اور تمہارے پہنچنے سے کوئی پندرہ منٹ بعد میں بھی وہیں پہنچ جاؤں گا۔ مجھے دیکھ کر تم یوں ظاہر کرنا جیسے تم مجھے پہچانتے تک نہ ہو۔"

میں نے کہا: "اچھا۔ یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن سنو۔ ایک بات اور بھی ہے، اور یہ ایسی بات ہے جس کا میرے سوا اور کسی کو علم نہیں۔ اس گھر میں ایک حبشی بھی ہے جسے چُرا کر میں اسے غلامی سے رہائی دلانا چاہتا ہوں۔ اس کا نام جِم ہے۔ وہی مس واٹسن کا جِم۔"

وہ بولا: "کیا کہا؟ جِم! —" وہ دفعتاً رک گیا اور کسی گہری سوچ میں غرق ہو گیا — میں نے کہا: "میں جانتا ہوں، تمہارے دل میں کیا ہے۔ تم کہتے ہو گے یہ کمینہ پن ہے۔ لیکن اگر یہ کمینہ پن ہے تو ہوا کرے۔ میں ہوں ہی کمینہ۔ میں تو اسے چرا کر ہی دم لوں۔ بس تم خاموش رہنا اور کسی سے کچھ نہ کہنا۔ کیوں؟ منظور ہے؟"

اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی کوندگئی اور وہ بولا: "میں اس چوری میں تمہاری مدد کروں گا۔"

یہ سُن کر میرے ہاتھ پاؤں یوں ڈھیلے پڑ گئے، جیسے کوئی گولی میرے سینے کے پار ہو گئی ہو۔ ایسی عجیب بات میں نے آج تک نہیں سُنی تھی یقین مانیے، اسے سُن کر میری نظروں میں ٹام سائر کی قدرت بہت حد تک گر گئی۔ مجھے یقین نہ آ رہا تھا کہ ایسے الفاظ ٹام سائر کی زبان سے نکل سکتے ہیں۔ ٹام سائر؟ اور غلام چرائے گا؟ "چھوڑو، دل لگی رہنے دو" میں نے کہا۔

"یہ دل لگی نہیں"

"خیر، دل لگی ہے یا نہیں۔ اب اسے چھوڑو۔ اور یاد رکھو کہ اگر کوئی شخص کسی بھگوڑے حبشی غلام کا ذکر کرے، تو تم یوں ظاہر کرنا جیسے تمہیں اس کے متعلق کچھ علم نہیں۔ اور میں بھی یہی ظاہر کر دوں گا۔"

اس کے بعد اس کا ٹرنک میرے چھکڑے میں لاد دیا گیا۔ اور وہ اپنی راہ چلا گیا، اور میں اپنی۔ میں اتنا خوش تھا۔ اور میرا ذہن یوں طرح طرح کے خیالات سے اٹا پڑا تھا کہ مجھے اس بات کا دھیان ہی نہ رہا کہ مجھے آہستہ آہستہ چلنا چاہیئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں وقت سے بہت پہلے ہی لوٹ آیا۔ بڈھا دروازے پر کھڑا تھا مجھے دیکھتے ہی بولا۔ "ارے یہ تو واقعی کمال کر دیا۔ کون مانے گا کہ یہ گھوڑی اتنی تیز چل سکتی ہے! اور یہی نہیں اس کی پیٹھ پر پسینے کا قطرہ تک نہیں۔ اگر ہم نے وقت نوٹ کیا ہوتا، تو اس کی رفتار کا اندازہ ہو جاتا۔ یہ تو واقعی بہت عجیب بات ہے۔ اب تو میں اس گھوڑی کو سو ڈالر میں بھی نہ بیچوں۔ سچ "کبھی نہ بیچوں۔ حالانکہ کل تک اگر کوئی مجھے پندرہ ڈالر بھی دیتا، تو بھی میں اسے بیچ ڈالتا۔"

اس کے علاوہ اس نے کچھ نہیں کہا۔ اس جیسا معصوم، اور نیک شخص میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اور اس کا معصوم ہونا کوئی ایسا اچنبھا بھی نہ تھا۔ وہ صرف کسان ہی نہ تھا، بلکہ ایک پادری بھی تھا۔ کھیتوں کے پیچھے اس کا ایک چھوٹا سا گرجا تھا جو اس نے اپنے ہی خرچ سے بنوایا تھا۔ یہ گرجا گھر بھی تھا اور سکول بھی۔ اپنے وعظ کے لئے وہ کسی سے ایک پائی بھی نہیں لیتا تھا، حالانکہ وہ بہت اچھا مقرر تھا۔ جنوبی علاقوں میں اس جیسے اور بہت سے کسان تھے، جو کھیتی باڑی کے علاوہ وعظ بھی کیا کرتے تھے۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد ٹام کا چھکڑا سامنے کی سیڑھیوں کے پاس آکر رکا۔ خالہ سیلی نے کھڑکی میں سے اُسے آتے دیکھ لیا تھا۔ کھڑکی سے سیڑھیاں صرف پچاس گز دور تھیں اور باہر آنے جانے والی ہر چیز یہاں سے نظر آتی تھی۔ وہ بولی: "ارے کوئی آیا ہے۔ کون ہوگا یہ؟ لیکن یہ تو کوئی اجنبی ہے۔ جمی! (یکسی بچے کا نام تھا) ذرا جاکر لزمی سے کہہ کہ ایک مہمان کے لئے بھی کھانا لگا دے۔"

سب سامنے کے دروازے کی طرف دوڑے۔ ان علاقوں میں اجنبی روز روز نہیں آتے۔ لہٰذا جب کوئی اجنبی آتا ہے تو اس کی آمد سے اتنی ہی ہل چل مچتی ہے۔

جتنی کسی وبا کے آنے سے۔ ٹام نے سیڑھیاں پار کرلی تھیں، اور اب وہ مکان کی طرف آرہا تھا۔ اس کا تانگہ واپس قصبے کی طرف مڑ گیا تھا۔ ہم سب دروازے پر جمع ہوگئے۔ ٹام نے نئے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ سامعین بھی تھے ہی۔ ٹام سائر کو اور کیا چاہیئے؟ ان حالات میں تو وہ حسبِ موقع کوئی نہ کوئی چکر چلا ہی لیا کرتا تھا۔ وہ ان لڑکوں کی طرح نہیں تھا جو جھینپتے، شرماتے، بھیڑیوں کی طرح ڈرتے آتے ہیں۔ نہیں صاحب، وہ تو مینڈھے کی طرح بڑی خود اعتمادی سے چلتا آرہا تھا۔

جب وہ ہمارے قریب پہنچا، تو اس نے اپنا ہیٹ یوں اہتمام سے اتارا جیسے وہ کسی ایسے ڈبے کا ڈھکنا کھول رہا ہے جس میں تتلیاں سو رہی ہوئی ہیں۔ اور وہ ان کی نیند میں مخل نہیں ہونا چاہتا۔ وہ بولا:

"اگر میں غلطی نہیں کرتا، تو آپ مسٹر آرچیبالڈ نکولس ہیں۔"

"نہیں بیٹے ۔۔۔" بڈھے نے جواب دیا "مجھے افسوس ہے کہ کوچوان نے تمہیں دھوکا دیا ہے۔ نکولس کا مکان تو یہاں سے تین میل دور ہے۔ آؤ ۔۔۔ اندر آجاؤ۔"

ٹام نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا اور بولا: "اوہ! لیکن وہ کوچوان تو چلا گیا ہے۔"

"ہاں بیٹے وہ چلا گیا ۔۔۔ لیکن تم اندر آجاؤ۔ اور ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ ۔۔۔ اس کے بعد میں تمہیں اپنی بگھی میں بٹھا کر نکولس کے ہاں چھوڑ آؤں گا۔"

"لیکن میں آپ کو اتنی تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ ہرگز نہیں۔ میں پیدل ہی چلا جاتا ہوں۔ فاصلے کی کوئی بات نہیں۔" "لیکن ہم تمہیں ہرگز پیدل نہیں جانے دیں گے۔ یہ ہمارے جنوب

کے اصولِ مہمان نوازی کے خلاف ہوگا۔ آؤ اندر آؤ۔" "وہ آؤ نا" خالہ سیلی نے کہا" اس طرح پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ تمہیں رکنا ہی ہوگا۔ یہ تین میل کا راستہ کچا ہے اور ہم ہرگز تمہیں پیدل نہیں جانے دیں گے۔ اور پھر میں نے تمہیں آتے دیکھ کر تمہارے لئے بھی کھانا لگوا لیا ہے۔ اب ہمیں مایوس تو نہ کرو۔ آؤ، آؤ۔ اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔"

ٹام نے تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کیا اور ان کی بات مان لی۔ اندر آکر اس نے انہیں بتایا کہ وہ اس علاقے میں اجنبی ہے، اور ہکس وِل (اوہیو) سے آیا ہے، اور یہ کہ اس کا نام ولیم تھامسن ہے۔ یہ کہہ کر اس نے جھک کر انہیں سلام کیا۔

اب اس نے جو باتیں شروع کی ہیں، تو رکنے کا نام نہ لیا۔ ہکس وِل کے بارے میں اور اس کے ہر باشندے کے بارے میں، اس نے وہ وہ باتیں گھڑ کر سنائیں کہ میں خود پریشان ہو کر سوچنے لگا کہ آخر یہ کیسے میرے مسئلے کو حل کرنے میں کچھ مدد کریں گی۔ باتیں کرتے کرتے اس نے جھک کر خالہ سیلی کا منہ چوم لیا۔ اور پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر یوں باتیں کرنے میں مصروف ہو گیا، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ لیکن خالہ سیلی چونک کر کھڑی ہو گئی اور ہتھیلی کی پشت سے منہ پونچھتی ہوئی غصے سے بولی: "بدتمیز!"

ٹام نے یوں منہ بنا لیا جیسے اسے یہ بات بہت بری لگی ہو۔ اور بولا: "محترمہ! مجھے آپ کے رویے پر سخت حیرت ہے!" "تمہیں، حے ۔۔۔ ر ۔۔۔ ت ۔۔۔ تم نے مجھے سمجھا کیا ہے؟ میرا جی چاہتا ہے کہ تمہیں ۔۔۔ آخر تم نے میرا منہ کیوں چوما؟"

ٹام کے چہرے سے ندامت جھلکنے لگی اور وہ بولا:

"محترمہ! لیکن میری نیت میں کوئی فتور نہ تھا۔ میں۔ میں۔ تو یہ سمجھا تھا کہ شائد آپ اس سے خوش ہوں گی۔"

"احمق!" چرخے کی ہتھی کو پکڑ کر وہ کچھ اس طرح بولی جیسے اگر ٹام نے ایک لفظ اور منہ سے نکالا، تو وہ مزید ضبط نہ کر سکے گی: "تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں اس سے خوش ہوں گی؟"

"پتہ نہیں ۔۔۔ لیکن ان لوگوں نے تو یہی بتایا تھا۔"

"تو ان لوگوں نے بتایا تھا تمہیں یہ! خیر، جس کسی نے بھی تمہیں یہ بات بتائی تھی، اس کا دماغ یقیناً خراب ہو گا۔ ایسی حماقت میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ وہ لوگ ہیں کون؟"

"وہ — وہ — ان سب ہی نے تو کہا تھا"

اب خالہ کی برداشت کی حد ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھیں غصّے سے لال ہو گئیں اور اس کی انگلیاں یوں خم کھا گئیں، جیسے وہ اس کا منہ نوچ ڈالے گی۔ وہ بولی: "سب کون؟ ان کے نام بتاؤ۔ ورنہ میں تمہارا سر پھوڑ دوں گی۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کو خالہ کے اس برتاؤ سے سخت دکھ پہنچا ہے۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے اپنا ہیٹ اٹھایا، اور بولا:

"مجھے نہایت افسوس ہے۔ لیکن مجھے آپ سے اس برتاؤ کی ہرگز توقع نہ تھی۔ ان لوگوں نے ہی تو مجھے کہا تھا کہ آپ کا مُنہ چوم لوں۔ ان سب نے یہی کہا تھا۔ اور انہوں نے یہ یقین بھی دلایا تھا کہ آپ اس سے خوش ہوں گی۔ ہر شخص نے یہی کہا تھا۔ لیکن محترمہ! مجھے افسوس ہے! میں آئندہ ایسی حرکت نہیں کروں گا۔ یقین مانیئے، ہرگز نہیں کروں گا —"

"کیا کہا؟ یہ حرکت نہیں کروں گا —؟ ذرا کر کے تو دیکھو!"

"نہیں محترمہ! میں سچ کہتا ہوں ہرگز نہیں کروں گا۔ میرا مطلب ہے۔ جب تک آپ خود مجھ سے درخواست نہ کریں گی، تب تک نہیں۔"

"کیا؟ میں خود درخواست کروں گی؟ ایسی بات میں نے آج تک نہیں سُنی! یاد رکھو کہ مجھ سے ایسی درخواست آنے تک تم اور تم جیسے کئی اور، ابد کا حصّہ بن چکے ہوں گے۔"

"خیر" وہ بولا۔ "حیرت تو مجھے بھی بہت ہے، لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا، وہ سب تو یہی کہتے تھے کہ آپ اس سے خوش ہوں گی۔ میرا اپنا بھی یہی خیال تھا۔ لیکن —" وہ یکلخت رک گیا اور ادھر اُدھر یوں دیکھنے لگا جیسے ان اجنبیوں میں اسے کسی دوست کی تلاش ہو۔ آخر اس کی نظریں اس بزرگ کے چہرے پر ٹک گئیں۔ اور وہ بولا: "کیوں جناب، کیا آپ کا یہ خیال نہیں تھا کہ انہیں یہ بات پسند آئے گی؟"

"نہیں تو ـــــ نہیں تو ـــــ"

وہ پھر پہلے کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگا جیسے اس کی نگاہیں کسی کو تلاش کر رہی ہوں۔ بالآخر وہ مجھ سے بولا: "ٹام! کیا تم نے یہ نہیں کہا تھا کہ خالہ سیلی اپنے بازو پھیلا دے گی، اور کہے گی 'سِڈ سائر...'"

"ارے! تم ہو" خالہ نے اس کی طرف لپکتے ہوئے کہا "ٹھہر جا نامراد! سب کو یوں بیوقوف بناتا رہا ہے۔" اور یہ کہہ کر وہ اسے اپنے سینے سے چمٹانے لگی مگر ٹام نے اسے پیچھے دھکیل دیا اور بولا: "نہ۔ نہ۔ پہلے خود اپنے منہ سے یہ درخواست کیجئے کہ میں آپ کے سینے سے چمٹ جاؤں۔"

اور یہ ایسا مسئلہ نہ تھا جسے سوچنے میں خالہ ایک لمحہ بھی ضائع کرتی۔ اس نے سینے سے چمٹا لیا اور بار بار اس کا منہ چومنے لگی۔ اس کے بعد اس نے ٹام کو اپنے خاوند کے حوالے کر دیا اور رہی سہی کسر اس نے پوری کر دی۔ جب اِن کا جوش ٹھنڈا پڑا تو وہ بولی "ارے! ہمیں تو بالکل خیال ہی نہیں تھا کہ تم بھی آؤ گے۔ ہم تو صرف ٹام کے منتظر تھے۔ دیدی نے بھی تمہارے آنے کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔"

"پہلے تو صرف ٹام کے آنے کا ہی فیصلہ تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "لیکن میں نے بہت منت سماجت کی کہ مجھے بھی آنے دیا جائے۔ بالآخر اماں مان گئی ـــــ یہاں پہنچ کر ہم نے سوچا کہ اگر ٹام پہلے پہنچے اور میں بعد میں آکر اپنے آپ کو اجنبی ظاہر کروں، تو خاصہ مذاق رہے گا۔ لیکن خالہ سیلی! غلطی مجھی سے ہوئی۔ یہ جگہ اجنبیوں کو راس نہیں آسکتی۔"

"صرف بدتمیز اجنبیوں کو نہیں۔ سِڈ! تیرا تو مار مار کر منہ لال کر دینا چاہیئے۔ آج تک کسی نے مجھے یوں پریشان نہیں کیا۔ لیکن تمہارے لئے تو میں ایسی ایسی ہزاروں پریشانیاں برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن تمہاری وہ حرکت! جب تم نے دفعتاً میرا منہ چوم لیا، تو میں بالکل ہکّی بکّی رہ گئی۔"

ہم نے وہیں اسی برآمدے میں کھانا کھایا، جو مکان سے رسوئی گھر تک جاتا تھا۔ میز لدی ہوئی تھی، کہ اتنا سارا کھانا سات خاندانوں کے لئے بھی کم نہ ہوتا۔ اور کھانا بھی گرم اور لذیذ! یہ اس قسم کا گوشت نہ تھا جو تمام رات ایک سیلن والے تہ خانے کی الماری میں رکھا رہنے کے بعد

جب پکایا جاتا ہے، تو بالکل بدمزہ ہو جاتا ہے جیسے آپ انسانی کھال چبا رہے ہوں۔ کھانے سے پہلے خالو سلاس نے بہت طول طویل دعا مانگی۔ یہ کھانا واقعی تھا بھی ایسی ہی لمبی دعا کے قابل۔ عام طور پر دعا مانگنے کے دوران میں کھانے ٹھنڈے ہو جاتے ہیں، لیکن یہ کھانا جوں کا توں گرم رہا۔

تمام سہ پہر بات چیت ہوتی رہی۔ اس دوران میں میں اور ٹام کان کھڑے کئے اس حبشی کا ذکر سننے کے لئے بے تاب رہے۔ لیکن سب بے سود۔ اس کا کسی نے ذکر ہی نہ کیا۔ اور ہمارے لئے یہ مناسب نہ تھا کہ ہم خود اس کا ذکر چھیڑیں۔ لیکن رات کو کھانے پر ایک بچے نے کہا:

"ابا ــــ ٹام اور سِڈ اور میں ناٹک دیکھنے چلے جائیں؟"

"نہیں ــــ" اس کے باپ نے جواب دیا۔ "شاید آج ناٹک ہوگا ہی نہیں۔ اور اگر ہوتا بھی، تو میں تمہیں نہ جانے دیتا۔ اس حبشی نے برٹن کو بتا دیا ہے کہ وہ لوگ نرے ٹھگ ہیں۔ برٹن کہتا تھا کہ وہ جا کر سارے شہر والوں کو متنبہ کر دے گا۔ میرا خیال ہے شہر والوں نے ان ٹھگوں کو مار مار کر بھگا دیا ہوگا۔"

تو وہی بات ہو گئی جس کا مجھے اندیشہ تھا! لیکن اس میں میرا کیا قصور تھا؟ ٹام کو اور مجھے ایک کمرہ اور ایک چارپائی دے دی گئی۔ ہم نے بہانہ کیا کہ ہم بہت تھکے ہوئے ہیں۔ لہٰذا کھانے کے فوراً بعد ہم نے انہیں "شب بخیر" کہا اور اپنے کمرے میں چلے آئے، اور پھر کھڑکی میں سے نکل کر جاذبِ برق کے سہارے نیچے اُتر گئے اور شہر کا رُخ کیا۔ ظاہر ہے کہ بادشاہ اور ڈیوک کو حالات کے اس طرح پلٹا کھا جانے کا مطلق علم نہ تھا۔ لہٰذا مجھے ڈر تھا کہ اگر میں نے فوراً جا کر انہیں خطرے سے آگاہ نہ کیا تو ان کا حشر برا ہوگا۔

راستے میں ٹام نے مجھے بتایا کہ ہمارے شہر میں تو ہر کوئی یہی سمجھے بیٹھا تھا کہ میں قتل ہو چکا ہوں۔ اس واقعہ کے کچھ ہی دنوں بعد ابا بھی غائب ہو گیا تھا اور اس کے بعد ابھی تک اس کا کچھ اتا پتہ نہیں چلا۔ جم کے بھاگ جانے پر خوب واویلا مچا تھا ــــ وغیرہ وغیرہ ــــ میں نے بھی ٹام کو "شاہی عجوبے" کے ٹھگوں کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ اور بیڑے پر اپنے سفر کا حال

بھی مختصراً اس کے گوش گزار کر دیا۔

جب ہم شہر کے وسط میں پہنچے، تو اس وقت رات کے ساڑھے آٹھ بج چکے تھے، لوگوں کا ایک ہجوم مشعلیں لئے سیٹیاں بجاتا، شور مچاتا، ٹین پیٹتا، اور نفیریاں بجاتا ادھر سے گذر رہا تھا۔ ہم اچھل کر ایک طرف ہو گئے، تاکہ ہجوم کے راستے میں نہ آئیں۔ جب وہ ہجوم گزرا تو میں نے دیکھا کہ انہوں نے بادشاہ کو اور ڈیوک کو ایک شہتیری پر بٹھایا ہوا ہے۔ ویسے یہ تو میرا اندازہ تھا کہ وہ بادشاہ اور ڈیوک ہی ہوں گے کیونکہ ان دونوں حضرات کے منہ پر تار کول پتی ہوئی تھی اور ان کے سر پر پروں کے تاج رکھے ہوئے تھے۔ اور وہ کسی صورت بھی انسان نظر نہ آتے تھے بلکہ وہ تو یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے دو بڑی بڑی کلغیاں شہتیری پر پڑی ہوں۔ یہ منظر دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا۔ اور ان ٹھگوں کے خلاف میرے دل میں جو بھی کدورت تھی وہ غائب ہو گئی۔ میرا دل پھٹنے لگا۔ ایک انسان دوسرے انسان پر کتنا ظلم ڈھاتا ہے!۔

ہم دیر سے پہنچے تھے اور اب معاملہ ہمارے بس میں نہ تھا۔ جب ہم نے جلوس کے پیچھے پیچھے آنے والے اکا دکا لوگوں سے اس واقع کے متعلق استفسار کیا، تو ہمیں پتہ چلا کہ سب تماشائی ہال میں یوں معصوم بن کر بیٹھے جیسے انہیں مطلق شک نہ ہو۔ جب تک بادشاہ سٹیج پر آ کر اچھل کود نہ کرنے لگا۔ تماشائی بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ اور پھر ایک اشارے پر ہجوم ان پر پل پڑا اور انہیں پکڑ لیا۔

ہم واپس گھر کی طرف چل پڑے۔ میرے دل میں اب نہ وہ جوش تھا، نہ ولولہ۔ بلکہ اپنی نظروں میں میں اب ایک حقیر، ناچیز انسان تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس سارے حادثے کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ حالانکہ میرا اسکے ساتھ بالکل کوئی تعلق نہ تھا۔ شائد ضمیر کا یہی قاعدہ ہے کہ چاہے آپ بھلا کریں یا برا۔ یہ ناسمجھ ضمیر بس یونہی آپ کو کچوکا رہتا ہے۔ اگر آپ کا کتا اتنا ہی ناسمجھ ہو کہ انسانی ضمیر کی طرح ہر وقت بھونکتا رہے تو آپ یقیناً اسے زہر دے دیں گے۔ انسانی جسم میں شاید سب سے زیادہ جگہ ضمیر نے ہی گھیر رکھی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کا رتی بھر فائدہ نہیں۔ یہ تو بالکل بیکار

سی شے ہے ـــــ اس معاملے میں ٹام بھی میرا ہم خیال ہے۔

۳۴-قیدی کی کوٹھڑی - دیدہ دلیری - جاذب برق کے راستے اوپر چڑھنا - چڑیلوں کی چھیڑ چھاڑ

باتیں کرتے کرتے ہم خاموش ہو گئے اور سوچنے لگے کچھ دیر بعد ٹام بولا:

"ہک، ہم بھی کتنے بدھو ہیں کہ ہمیں ابھی تک اس کا خیال ہی نہیں آیا ـــ مجھے یقین ہے کہ جم وہیں ہوگا۔ میرے خیال میں اسے وہیں ہونا چاہیئے"

"کہاں؟"

"ادھر۔ تنور کے ساتھ والی اس جھونپڑی میں۔ سنو، تم نے نہیں دیکھا تھا کہ جب ہم کھانا کھا رہے تھے، تو ایک حبشی کھانے کی کچھ چیزیں لے کر اُدھر گیا تھا؟

"گیا تو تھا"

"تو پھر یہ کھانا کس کے لئے تھا؟"

"کتے کے لئے"

"پہلے تو میرا بھی یہی خیال تھا۔ لیکن اب مجھے یقین ہے کہ وہ کھانا کتے کے لئے نہیں تھا"

"وہ کیسے؟"

"کیونکہ تھالی میں ایک تربوز بھی تھا۔ یاد تو مجھے بھی آتا ہے، تربوز تو تھا۔ ارے یہ بھی عجیب بات رہی۔ مجھے یہ خیال ہی نہیں آیا کہ کتا تربوز نہیں کھاتا ـــ پس ثابت ہوا کہ کئی بار ہم دیکھ کر بھی نہیں دیکھتے"

"اور تمہیں یہ بھی یاد ہوگا کہ وہ حبشی تالا کھول کر کوٹھڑی کے اندر گیا تھا اور باہر آ کر اس نے پھر تالا لگا دیا تھا۔ اور جب ہم کھانا ختم کر کے اٹھنے والے تھے، تو اس نے ایک چابی لا کر خالہ کو دی تھی۔ یہ اسی تالے کی چابی ہوگی۔ تربوز ثابت کرتا ہے کہ اندر آدمی ہے۔ اور تالا ظاہر کرتا ہے کہ وہ قیدی ہے۔ اور اس چھوٹے سے فارم پر دو قیدی نہیں ہو سکتے۔ خصوصاً جب یہ لوگ اتنے رحمدل ہیں پس ثابت ہوا کہ وہ قیدی جم کے سوا اور کوئی نہیں، چلو خیر جاسوسی

کے طریقے سے ہی سہی۔ کم از کم ہم نے اسے ڈھونڈ تو لیا۔ طریقہ کوئی بھی ہو، ہمیں اس سے کیا! بس اب تم اپنے ذہن پر زور دے کر ایک ایسی ترکیب ڈھونڈ نکالو، جس سے ہم اسے چرا لینے میں کامیاب ہو جائیں۔ میں بھی اپنے ذہن پر زور دیتا ہوں۔ پھر جو ترکیب اچھی ہو گی، اسی پر عمل کیا جائیگا۔"

اب تو میں واقعی ٹام کا معتقد ہو گیا۔ اتنے سے لڑکے میں اتنی عقل! اگر میرے پاس ٹام سا گر جتنی عقل ہوتی، تو اگر کوئی مجھے اس کے عوض نواب، یا جہاز کا افسر، یا سرکس کا مسخرہ، یا کوئی اور رتبہ ہی کیوں نہ دیتا، میں کبھی اس سودے کو منظور نہ کرتا۔ خیر ذہن پر زور تو میں بھی دینے لگا۔ حالانکہ مجھے اچھی طرح علم تھا کہ بالآخر کس کی تجویز قابلِ قبول سمجھی جائے گی —— تھوڑی دیر بعد ٹام بولا:

"سوچا؟"

"ہاں"

"کہو —— جلدی۔"

"میری سکیم یہ ہے" میں نے کہنا شروع کیا۔ "یہ تو ہم نہایت آسانی سے پتہ لگا سکتے ہیں کہ اس کے اندر جو آدمی ہے وہ جم ہی ہے یا کوئی اور۔ اور پھر کل میں اپنی ناؤ لے آؤں گا اور اس کے بعد جا کر جزیرے سے اپنا بیڑا بھی نکال لوں گا۔ اور پھر جونہی اندھیری راتیں آئیں گی، ہم پہلی رات کو ہی جب یہ بڈھا سویا ہو گا، اس کی بر جس میں سے وہ چابی نکال لیں گے اور جم کو لے کر بیڑے پر بیٹھ کر یہاں سے رفوچکر ہو جائیں گے۔ دن کو ہم چھپ جایا کریں گے اور رات کو سفر کیا کریں گے۔ جیسے میں اور جم پہلے بھی کرتے رہے ہیں۔ کیوں؟ کیا خیال ہے؟ یہ سکیم قابلِ عمل ہے کہ نہیں؟"

"قابلِ عمل؟ —— یقیناً یہ قابلِ عمل ہے۔ لیکن یہ نہایت سیدھی سادھی سی سکیم ہے۔ اس میں رتی بھر بھی الجھن نہیں۔ اور ایسی سکیم کا کیا فائدہ جس میں ذرا بھی خطرہ نہ ہو؟ بس یہ تو بچوں کا کھیل ہے —— ہٹ! اس چوری کا تو اتنا بھی چرچا نہ ہو گا جتنا صابن کے کارخانے میں چوری کرنے سے ہوتا ہے۔"

میں خاموش رہا۔ مجھے اس سے اسی جواب کی توقع تھی۔ اور یہ تو میں جانتا ہی تھا

کہ جو سکیم وہ پیش کرے گا، اس میں اس قسم کا کوئی نقص نہیں ہو گا۔

اور اس کی سکیم میں واقعی کوئی نقص نہ تھا۔ جب ٹام نے مجھے اپنی اسکیم سنائی، تو مجھے فوراً یہ احساس ہوا کہ جہاں تک سٹائل کا تعلق ہے، میری پندرہ سکیمیں اس پر قربان کی جا سکتی ہیں۔ اور جہاں تک جِم کو رہا کرانے کا تعلق تھا۔ اس کی سکیم کی کامیابی بھی اتنی ہی یقینی تھی، جتنی میری سکیم کی۔ اس کے علاوہ اس میں خطرہ بھی تھا۔ ہماری جان جوکھوں میں پڑ سکتی تھی میری تسلی ہو گئی اور میں نے کہا کہ واقعی اس کی سکیم سن کر میں بہت خوش ہوا ہوں ۔۔۔ اس وقت میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ وہ سکیم کیا تھی کیونکہ مجھے یقین تھا کہ یہ سکیم قطعی نہیں تھی۔ ابھی تو اس میں بہت ردو بدل ہونے تھے۔ جوں جوں وہ اس پر مزید غور کرے گا، اس میں جہاں بھی گنجائش ہوئی اسے مزید خطروں سے آراستہ کیا جائے گا۔ اور ہوا بھی یہی ۔۔۔

خیر، ایک بات تو طے تھی۔ یعنی ٹام کی نیت پر کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ واقعی حبشی کو غلامی سے رہائی دلانے کے لئے بے تاب تھا۔ اس کی یہی ایک بات میری سمجھ سے باہر تھی۔ یعنی ایک معزز خاندان کا لڑکا جس کی پرورش مناسب ڈھنگ سے ہوئی تھی اور جس کا چال چلن قابلِ ستائش ہو، اور جس کے خاندان کے سب لوگ معزز ہوں، اور جو خود بڑا ذہین اور فہم و ادراک کا مالک ہو، کمینہ نہ ہو، بلکہ رحمدل ہو، ۔۔۔ وہ لڑکا یہ نیچ کام کرنے کو تیار ہو؟ یہ گرا ہوا کام کرتے ہیں اسے ذرا بھی عار نہ تھی۔ اسے اپنی عزت کا، یا گناہ اور ثواب کا کوئی خیال نہ تھا، حالانکہ اس کی اس حرکت سے اس کے اپنے نام کو اور خاندان کے نام کو بٹہ لگ سکتا تھا۔ یہ بات واقعی میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس کا یہ فیصلہ قابلِ نفرین تھا اور دوستی کے ناطے میرا یہ فرض تھا کہ اسے ان نتائج سے آگاہ کر دوں۔ اور اس سے کہوں کہ وہ اس سارے معاملہ سے کنارہ کش ہو جائے۔ لیکن جونہی میں نے یہ ذکر چھیڑا، وہ غصے سے بولا: خاموش رہو! تم سمجھتے ہو کہ مجھے اپنے بھلے بُرے کی کبھی تمیز نہیں؟ تم سمجھتے ہو کہ مجھے اتنا بھی پتہ نہیں کہ میں کر کیا رہا ہوں؟"

"ہاں"

"کیا میں نے وعدہ نہیں کیا تھا کہ میں اس حبشی کی چوری میں تمہاری مدد کروں گا؟"

"ہاں"

"پھر؟"

اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے کیونکہ مزید بحث بے کار تھی۔ جب ایک دفعہ اس کی زبان سے نکل گیا کہ یہ کام ہوگا تو وہ اسے کر کے ہی رہے گا۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر کیوں وہ اس میں شریک ہو کر یہ سارا خطرہ مول لے رہا ہے؟ بہرحال میں خاموش رہا اور اسے روکنے کے خیال کو میں نے ذہن سے نکال دیا۔ جب وہ فیصلہ کر ہی چکا ہے، تو میں اسے روکنے والا کون تھا؟

جب ہم گھر پہنچے، تو ہر طرف تاریکی اور سنّاٹے کا دور دورہ تھا۔ لہٰذا ہم سیدھے تنور کے قریب والی اس کوٹھری کی طرف چلے گئے تاکہ اس کی اچھی طرح جانچ پرکھ کر لیں۔ جان بوجھ کر ہم صحن میں سے گزرے تاکہ کتّوں کے ردّعمل کا اندازہ بھی کر لیں۔ لیکن کتّے تو ہم سے مانوس ہو ہی چکے تھے۔ لہٰذا انھوں نے صرف دو ایک بار بھوں بھوں کرنے پر ہی اکتفا کی۔ ان دیہاتی کتوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ جو شے بھی رات کے اندھیرے میں نظر آئے، اسے دیکھ کر دو ایک بار بھوں بھوں ضرور کرتے ہیں۔ جھونپڑی کے قریب پہنچ کر ہم نے اس کے سامنے والی اور دائیں بائیں کی دونوں دیواروں کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ اس کی شمالی دیوار میں ایک خاصا اونچا روشندان تھا۔ میں اس سے پہلے اس دیوار کی طرف کبھی نہیں گیا تھا۔

اس روشندان پر لکڑی کا ایک تختہ ٹھونک کر اسے بند کر دیا گیا تھا۔ میں نے کہا:

"بس ٹھیک ہے۔ اگر ہم کسی طرح اس تختے کو اکھاڑ لیں، تو جم بآسانی اس سوراخ میں سے باہر نکل سکتا ہے۔"

ٹام بولا: "لیکن یہ تو بہت ہی معمولی بات ہوگی۔ یہ تو نرا بچوں کا کھیل ہے۔ اس سے بہتر کوئی اور ترکیب سوچنی چاہیئے جس میں کچھ خطرہ تو ہو"

میں نے کہا: "اچھا تو پھر اس لکڑی کی دیوار کو چیر کر اسے نکال لیں گے۔ جیسے میں نے

کیا تھا؛ وہی اپنے قتل سے پہلے۔"

"ہاں یہ سکیم اس سے بہتر ہے۔" وہ بولا۔" یہ تو بات بھی ہوئی۔ کوئی سنسنی خیز معاملہ؛ کوئی پُرخطر مہم؛ — لیکن شاید اس سے بہتر بھی کوئی سکیم سوجھ جائے۔ جلدی کیا ہے؟ بس غور کرتے رہو۔ شائد —"

جھونپڑی اور جنگلے کے درمیان پچھواڑے کی طرف لکڑی کا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا؛ جس کی چھت اوپر جھونپڑی کی چھت سے ملحقہ تھی۔ لمبائی تو اس کمرے کی بھی جھونپڑی جتنی ہی تھی، لیکن چوڑائی کچھ کم تھی۔ یہی تقریباً چھ فٹ ہوگی — اس کا دروازہ جنوب کی طرف کھلتا تھا اور اس میں تالا لگا تھا۔ ٹام صابن ابالنے والی دیگ کے پاس جاکر کچھ تلاش کرنے لگا اور آخر اسے لوہے کی وہ چیز مل گئی جس سے ڈھکنا اٹھایا جاتا ہے۔ اس کی مدد سے اس نے ایک قبضہ کھول دیا۔ زنجیر کھول کر ہم اندر چلے گئے اور دروازے کو اندر سے بند کردیا۔ جب ہم نے دیا سلائی جلاکر دیکھا تو ہمیں پتہ چلا کہ یہ شیڈ اس جھونپڑی کے پیچھے تو ضرور بنی تھی، لیکن اس سے ملحق نہ تھی۔ اس شیڈ کا فرش کچا تھا اور اس کے اندر زنگ آلود دستہ شاخوں، پرانی کدالوں، بیلچوں اور ایک ٹوٹے ہوئے ہل کے سوا کچھ نہ تھا۔ جب دیا سلائی بجھ گئی تو ہم باہر آگئے اور زنجیر چڑھا کر ویسے ہی تالا لگادیا۔ ٹام اس کارگزاری سے بہت مطمئن تھا۔ وہ بولا:

"اب ٹھیک ہے۔ ہم یہاں سے اس جھونپڑی تک ایک سرنگ کھودیں گے، اور اسے نکال لیں گے۔ اس کام میں تقریباً ایک ہفتہ لگے گا۔"

اب ہم گھر کی طرف چل پڑے۔ میں تو پچھلے دروازے کے راستے اندر داخل ہوگیا (یہ نہایت آسان ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ پچھلے دروازے کو بند نہیں کرتے۔ صرف ایک رسّی سی کھینچنے سے دروازہ کھل جاتا ہے) ۔ لیکن ٹام کو یوں مکان میں داخل ہونے میں قطعاً دلچسپی نہ تھی۔ اسے تو صرف جاذبِ برق کے راستے اوپر چڑھنے سے ہی اطمینان ہوسکتا تھا لیکن جب دو تین بار آدھا آدھا راستہ چڑھ کر وہ نیچے پھسل گیا (کیونکہ اس کا ہاتھ چمنی تک نہ

پہنچ رہا تھا) تو اس نے سوچا کہ اس راستہ سے اوپر چڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا جائے۔ کیونکہ آخری بار تو وہ یوں دھڑام سے گرا کہ اگر ذرا بھی چوٹ زیادہ آتی، تو اس کا سر پھٹ جاتا۔ لیکن چند منٹ سستانے کے بعد اس نے ایک کوشش اور کی۔ اور اس بار وہ کامیاب ہو گیا۔

اگلے روز ہم علی الصبح ہی اٹھ بیٹھے اور حبشیوں کی جھونپڑیوں کی طرف چلے گئے تاکہ کتوں کو اور بھی زیادہ مانوس کر لیا جائے، اور اس حبشی سے بھی دوستی گانٹھی جائے جو جم کو کھانا کھلایا کرتا تھا۔ میرا مطلب ہے اگر وہ قیدی واقعی جم ہی تھا — حبشی ابھی ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے اور اب کھیتوں میں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ جم کو کھانا کھلانے والا حبشی ٹین کے ایک برتن میں گوشت، روٹی اور دوسری چیزیں رکھ رہا تھا۔ جب باقی لوگ چلے گئے، تو ایک شخص مکان سے چابی لے کر باہر نکلا۔

یہ حبشی نہایت خوش طبیعت اور ہنس مکھ تھا۔ اس کے بال دھاگے سے یوں بندھے ہوئے تھے، کہ اس کے سر میں بالوں کی چھوٹی چھوٹی گولیاں سی بن گئی تھیں۔ اس ٹونے کا مقصد یہ تھا کہ چڑیلوں کو ڈرا کر دور رکھا جائے۔ اس نے ہمیں بتایا کہ آج کل راتوں کو چڑیلیں اسے بہت پریشان کر رہی ہیں۔ اور اسے نہ جانے کیا کیا نظر آ رہا ہے، اور کیا کیا آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ تعجب تو یہ تھا کہ آج تک اسے کبھی چڑیلوں نے تنگ نہیں کیا تھا۔ وہ نہایت فکرمند تھا۔ اب جب وہ اپنے دکھڑے رونے لگا تو رکنے میں ہی نہ آیا۔ اور یہ بھول ہی گیا کہ اسے کوئی اور کام بھی کرنا ہے۔ ٹام نے پوچھا: ”یہ کھانا کس کے لئے ہے؟ کتوں کے لئے؟“

حبشی مسکرانے لگا۔ اور یہ مسکراہٹ یوں آہستہ آہستہ اس کے چہرے پر پھیل گئی جیسے کیچڑ کے جوہڑ میں پتھر پھینکنے سے آہستہ آہستہ لہریں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ بولا: ”ہاں ماسٹر سڈ! ایک کتے کے لئے۔ یہ کتا بالکل عجیب قسم کا ہے۔ اسے دیکھو گے؟“

”ہاں تو —“

میں نے ٹام کو کہنی ماری اور سرگوشی کے انداز میں کہا: ”کیوں دن کے اجالے میں جاؤ گے؟ یہ بات تو سکیم میں نہ تھی۔“

"تھی تو نہیں۔ لیکن اب ہے"۔

"ہت تیرے کی! خیر، ہم چل تو پڑے لیکن یہ بات مجھے پسند نہ آئی ــــ اندر اتنا اندھیرا تھا کہ جب ہم داخل ہوئے تو مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ البتہ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ شخص جم ہی ہے۔ اس نے ہمیں پہچان لیا، اور چھوٹتے ہی بولا!

"ارے ہک تم! ــــ اور یہ تو ماسٹر ٹام نظر آتا ہے"!

مجھے پہلے سے ہی اندیشہ تھا کہ ایسا ہوگا۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آیا کہ کیا کہوں۔ اور اگر کوئی بات مجھے سوجھ بھی جاتی، تو بھی میں کچھ نہ کر پاتا کیونکہ فوراً وہ حبشی بول اٹھا!

"ارے! تو تم ان صاحبوں کو جانتے ہو؟"

اب ہم تاریکی سے مانوس ہو چکے تھے۔ ٹام نے ٹکٹکی لگا کر حبشی کو یوں دیکھا جیسے اسے اس کی بات پر تعجب ہو رہا ہو۔ اور بولا: "ہمیں؟ ہمیں کون جانتا ہے؟"

"یہی ــــ یہ بھگوڑا غلام"

"میرا تو خیال نہیں یہ ہمیں جانتا ہے۔ لیکن تمہیں یہ بات کیسے سوجھی؟"

"کیسے سوجھی؟ ابھی ابھی تو اس نے آپ کو یوں پکارا تھا، جیسے آپ کو جانتا ہو"۔

ٹام نہایت حیرت سے اس کی طرف تکتے ہوئے بولا:

"بڑی عجیب بات ہے۔ کس نے پکارا تھا؟ اس نے کب پکارا تھا؟ کیا کہا تھا اس نے؟"

اور میری طرف مڑ کر بولا:

"تم نے کچھ سُنا؟"

ظاہر ہے اس سوال کا صرف ایک ہی جواب تھا۔ لہذا میں بولا: "نہ ــــ میں نے تو کچھ نہیں سُنا"۔

پھر وہ جم کی طرف مڑا اور اسے اجنبیوں کی طرح تکتے ہوئے بولا: تم نے کچھ کہا تھا؟"

"نہیں جناب" جم نے جواب دیا "میں نے تو کچھ نہیں کہا"۔

"ایک لفظ بھی نہیں؟"

"نہیں جناب — ایک لفظ بھی نہیں۔"

"تم نے پہلے کبھی ہمیں دیکھا ہے؟"

"نہیں جناب! ہرگز نہیں"

اب ٹام اس حبشی کی طرف مڑا جو پہلے ہی بہت پریشان تھا اور درشتی سے بولا: "تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ تمہیں کیسے پتہ چلا کہ کوئی پکار رہا ہے؟"

"کچھ نہیں — وہ سالی چڑیلیں پھر آگئی ہوں گی۔ کاش مجھے موت ہی آجائے۔ وہ ہمیشہ یوں ہی کرتی رہتی ہیں۔ اور مجھے ڈرا ڈرا کر مارے ڈالتی ہیں۔ آپ کسی سے اس واقعے کا ذکر نہ کیجئے ورنہ ماسٹر سلاس بہت ناراض ہوں گے۔ ماسٹر سلاس کہتے ہیں کہ چڑیلوں کا کوئی وجود نہیں۔ کاش وہ اس وقت یہاں ہوتے! اور اپنے کانوں سے سُن لیتے۔ پھر بتا۔ تو کہ ان کی کیا رائے ہے۔ کم از کم انہیں یقین تو ہو جاتا — یہی تو دنیا کا دستور ہے۔ وہ لوگ جو ایک عقیدے پر ایمان لے آتے ہیں، اپنے ہی عقیدے کو سب سے بہتر سمجھتے ہیں۔ وہ کوشش ہی نہیں کرتے کہ اپنے عقیدے سے باہر کسی اور چیز کو دیکھنے یا سمجھنے کی کوشش کریں۔ اور اگر کوئی دوسرا انہیں کچھ بتائے تو بھی انہیں اعتبار نہیں آتا۔"

ٹام نے اسے ایک سکہ دیا اور وعدہ کیا کہ وہ کسی کو یہ بات نہیں بتائے گا۔ اور اسے تاکید کی کہ وہ تھوڑا سا دھاگہ خرید کر کچھ اور بال باندھ لے۔ پھر وہ جم کو تکتے ہوئے بولا:

"پتہ نہیں خالو سلاس اس حبشی کو پھانسی دیں گے یا نہیں۔ اگر میں کسی ناشکرے غلام کو پکڑوں، تو کم از کم میں تو اسے ہرگز واپس نہیں کروں گا۔ بلکہ اسے پھانسی دے دوں گا۔"

—— اور پھر جب وہ حبشی دروازے کی طرف بڑھا، تاکہ روشنی میں اس سکے کو دیکھے کہ کھرا بھی ہے یا نہیں، تو وہ ہولے سے جم سے بولا:

"کبھی یہ ظاہر مت کرنا کہ تم ہمیں جانتے ہو۔ اگر رات کو تمہیں سرنگ کھودنے کی آواز آئے، تو سمجھ لینا کہ تمہیں رہا کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔"

جم نے آنکھ بچا کر جلدی سے ہمارا ہاتھ پکڑ لیا۔ اسی اثنا میں وہ حبشی واپس آگیا ہم

نے اسے پیش کش کی کہ اگر وہ چاہے، تو ہم اس کے ساتھ آجایا کریں گے۔ وہ بہت خوش ہوا اور بولا کہ خاص طور پر رات کو وہ ضرور ہمیں ساتھ لایا کرے گا، کیونکہ اندھیرے میں چڑیلیں بہت تنگ کرتی ہیں۔ لہذا اگر کوئی ساتھ ہو، تو بہتر ہی ہوگا۔

۳۵۔ باقاعدہ فرار۔ خطرناک منصوبے۔ چوری نہیں، مہم۔ گہری سُرنگ

ناشتے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ لہذا ہم گھر سے نکل پڑے اور جنگل کا رُخ کیا۔ ٹام کا کہنا تھا کہ تھوڑی سی روشنی ہونی ضروری ہے، تاکہ کھودتے وقت ہمیں کچھ نظر تو آئے۔ لالٹین کی روشنی خاصی تیز ہوتی ہے لیکن اسے استعمال کرنے میں یہ اندیشہ تھا کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو ہم پکڑے جائیں گے۔ یہ ہمارے مطلب کی چیز نہیں تھی۔ ہمارے مطلب کی چیز تو وہ تودے تھے جنہیں "لومڑی کی آگ" کہتے ہیں۔ اور جنہیں اگر کسی تاریک جگہ پر رکھ دیا جائے، تو وہ مدھم سی روشنی دینے لگتے ہیں۔ ایسے کچھ تودے ہم جنگل سے اکٹھے کر لائے اور انہیں سرکنڈوں میں چھپا کر تھوڑی دیر آرام کرنے کے لئے بیٹھ گئے۔ ٹام اب بھی مطمئن نہ تھا۔ وہ بولا:

"کیا مصیبت ہے! یہ مہم تو بچوں کے کھیل کی طرح آسان ہے۔ یہ کام اس قدر آسان ہے کہ کوئی مشکل اور پیچیدہ سکیم دماغ میں آتی ہی نہیں۔ نہ یہاں کوئی چوکیدار ہے جسے دوا پلا کر بےہوش کیا جائے۔ کم از کم چوکیدار تو ہونا چاہئے تھا۔ اور پھر جم کے پاؤں میں صرف دس فٹ لمبی ایک زنجیر ہے اور وہ بھی چارپائی کے پائے سے بندھی ہے۔ بس چارپائی اٹھائیے اور زنجیر اتار لیجئے۔ اور پھر خالو سلاس کا یہ حال ہے کہ انہیں ہر شخص پر اعتماد ہے حتےٰ کہ انہیں اس احمق حبشی کے ہاتھ میں چابی دینے میں بھی کوئی عذر نہیں۔ اور نہ ہی وہ اس بات کی کوئی ضرورت سمجھتے ہیں کہ کسی دوسرے آدمی کو اس کی نگرانی کے لئے ہی ساتھ بھیج دیں۔ اگر جم چاہتا تو کبھی کا اس کھڑکی کے راستے نکل گیا ہوتا۔ اور اس کے سوا کہ پاؤں میں دس فٹ لمبی زنجیر پہن کر سفر کرنے میں خاصی کوفت ہوتی ہے، اسے اور کوئی مشکل پیش نہ آتی۔ کیا بتاؤں ہک! اس سے گھٹیا انتظام میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ لہذا

اب ہمیں خواہ مخواہ مشکلات ایجاد کرنی پڑ رہی ہیں۔ لیکن اس میں ہمارا کیا قصور؟ ہم تو صرف یہی کر سکتے ہیں کہ اسی مواد کا بہترین استعمال کریں۔ خیر، ایک بات ہے۔ اسے ان مشکلات سے رہائی دلانے میں جو ناموری ہوگی، اس کا جواب نہیں۔ مصیبت صرف یہ ہے کہ جن لوگوں کا یہ فرض تھا کہ مشکلات ہمارے راستے میں پیدا کریں، انہوں نے اپنے فرض میں کوتاہی کی ہے۔ اور اب ہمیں اپنے دماغ پر زور دے کر ان مشکلات کو ایجاد کرنا پڑ رہا ہے۔ اب اس لالٹین والی بات کو ہی لو۔ ہمیں خواہ مخواہ یہ فرض کرنا پڑ رہا ہے کہ لالٹین میں خطرہ ہے۔ ورنہ جو حالت یہاں ہے اس کے مطابق تو اگر ہم مشعلوں کا جلوس لے کر بھی گھومتے رہیں، تو کوئی باز پرس کرنے والا نہیں۔ ہاں، یاد آیا۔ ہمیں جلد از جلد کوئی ایسی چیز ڈھونڈنی چاہیے جس سے آری کا کام لیا جا سکے۔

"آری؟ — آری کا ہم کیا کریں گے؟"

"آری کا کیا کریں گے؟ کیوں، ہمیں وہ چارپائی کا پایہ چیر کر زنجیر نہیں کھولنی کیا؟"

"لیکن ابھی ابھی تو تم نے کہا تھا کہ کوئی بھی شخص اس چارپائی کو اٹھا کر زنجیر کھول سکتا ہے"

"تم بھی نرے ہک ہی رہے! تمہارے دماغ میں تو صرف بچوں ایسی باتیں ہی آ سکتی ہیں۔ میرا خیال ہے تم نے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ مثلاً بیرن ٹرینک، یا کاسانووا، یا بینونیٹو چیلینی، یا ہنری چہارم، یا اسی قسم کے کسی ہیرو کی کوئی کتاب؟ آج تک کسی نے یہ بھی سنا ہے کہ کسی قیدی کو اس قسم کے عورتوں ایسے طریقے سے رہا کرایا گیا ہو؟ اونہہ ہونہہ — ہیرو لوگ تو یہ کرتے ہیں کہ پائے کے دو ٹکڑے کر کے انھیں پھر سے یوں جوڑ دیا جائے کہ کسی کو پتہ تک نہ چلے کہ پایہ کٹا ہوا ہے۔ پھر اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے بُرادے کو پھانک لیتے ہیں تاکہ کسی کو اس کا نشان تک نہ ملے۔ اور اس کے بعد کچھ مٹی اور تیل وغیرہ اِدھر اُدھر یوں بکھیر دیتے ہیں کہ محتاط جوکیداروں کو بھی یہ وہم تک نہ ہو کہ پایا چیرا گیا ہے۔ اس کے برعکس اسے تو پایہ بالکل صحیح و سالم نظر آئے۔ بس اس کے بعد جس رات آپ کا پروگرام ہو اس پائے کو ایک ٹھوکر ماریئے اور زنجیر اتار لیجئے۔ پھر میدان صاف ہے۔ رسّی کی سیڑھی کو فصیل سے باندھیئے اور نیچے کود جائیے۔ اور چونکہ یہ سیڑھی کم از کم انیس فٹ چھوٹی ہوگی لہٰذا کھائی میں کودتے وقت ٹانگ ٹوٹنا لازمی ہے۔ اُدھر آپ کے گھوڑے اور وفادار خادم تیار کھڑے ہوں گے

جو آپ کو اٹھا کر زمین پر بٹھا دیں گے، آپ یہ جا، وہ جا۔ اپنے شہر لانگوڈاک یا نوآرے یا جو بھی آپ کا شہر ہوگا، جا پہنچیں گے۔ لیکن یہ ہمارا کھیل تو بہت ہی گھٹیا ہے۔ کاش اس جھونپڑی کے چاروں طرف ایک کھائی ہوتی؛ اگر فرار کی رات وقت ملا، تو ہم اسے بھی کھود ڈالیں گے۔"

میں نے کہا: "اگر ہم نے اسے سرنگ کے راستے ہی باہر نکالنا ہے، تو پھر کھائی کا کیا کام؟"

لیکن اس نے میری بات سنی ان سنی کر دی اور اپنی ٹھوڑی کو ہتھیلیوں پر رکھ کر یوں غرق ہو گیا کہ ایسا لگتا تھا جیسے وہ مجھے تو کیا، اپنے گرد و پیش کی ہر ہر چیز کو بھول گیا ہے۔ جلد ہی اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولا:

"اونہہ ہونہہ۔ اس سے کام نہیں چلے گا۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"کس کی ضرورت نہیں؟"

"جم کی ٹانگ چیرنے کی۔" وہ بولا۔

"واہ بھئی واہ!" میں نے کہا "اس کی تو واقعی کوئی ضرورت نہیں۔ آخر ٹانگ چیرنے سے فائدہ؟"

اچھے ہیرو یہی کیا کرتے تھے۔ جب ان سے زنجیر نہیں اترتی تھی، تو وہ اپنا ہاتھ کاٹ کر ہی نکل بھاگتے تھے۔ ہاتھ کاٹنے کی نسبت، ٹانگ کاٹنا تو اور بھی بہتر ہے۔ لیکن خیر، اس تجویز کو خیر باد کہنا ہی پڑے گا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ اور دوسری یہ کہ جم محض ایک حبشی ہے؛ اور یہ ٹانگ کاٹنے والی بات اس کی سمجھ میں آئے گی نہیں۔ کیونکہ اسے یہ علم نہیں کہ یورپ میں یہی طریقہ کار استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا اس تجویز کو تو رہنے ہی دیا جائے۔ لیکن ہم ایک کام تو پھر بھی کر سکتے ہیں۔ یعنی رسّی کی سیڑھی کا تو استعمال ہو ہی سکتا ہے۔ اور یہ ہے بھی بہت آسان۔ ہم اپنی چادریں پھاڑ کر سیڑھی بنا لیں گے اور اسے ایک بڑی سی روٹی کے اندر چھپا کر اس تک پہنچا دیں گے۔ قیدی تک چیزیں پہنچانے کے لئے عموماً یہی طریقہ استعمال میں لایا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ روٹی بڑی عجیب سی لگے گی، لیکن خدا جانے اس سے بھی کتنی بُری روٹیاں کبھی کبھی خود ہمیں کھانے کو ملی ہیں۔"

"لیکن بھیا ٹام سائر، تم بھی کیسی عجیب باتیں کرتے ہو!" میں نے کہا "جم اس سیڑھی کو

کرے گا کیا؟"

"کیا کرے گا؟ یہ سیڑھی تو اس کے لئے ناگزیر ہے۔ تم بھی کیا احمقوں ایسی باتیں کرتے ہو!
تمہیں پتہ تو کچھ ہے نہیں۔ اسے یہ رسّی کی سیڑھی ضرور ملنی چاہئے۔ سب لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔"

"لیکن قسم خدا کی، میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اسے کرے گا کیا؟"

"کیا کرے گا؟ وہ اسے اپنی چارپائی کے نیچے چھپا کر رکھ دے گا۔ سب لوگ یہی کرتے ہیں۔
اور اسے بھی یہی کچھ کرنا پڑے گا۔ ہک! تم میں بس یہی ایک نقص ہے۔ تم اس مہم کو قاعدے سے
سرانجام نہیں دینا چاہتے اور ہمیشہ کوئی نئی بات کرنا چاہتے ہو۔ چلو، فرض کیا کہ وہ سیڑھی سے
کچھ بھی کام نہیں لیتا۔ تاہم جب وہ بھاگ جائے گا اور یہ سیڑھی اس کی چارپائی کے نیچے چھپی ملے
گی، تو یہ اچھا خاصا سراغ ہوگا۔ اور جانتے ہو، ان لوگوں کو سراغ کی ہی تو جستجو ہوگی۔ ایک تم
ہو کہ کوئی سراغ چھوڑنا ہی نہیں چاہتے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ کیوں؟ کیا خیال ہے تمہارا؟ کم از کم
میں نے تو ایسی بات کبھی نہیں سنی۔"

"اچھا۔ اگر یہی بات ہے اور قاعدے کی رو سے سیڑھی ہونی ہی چاہیے، تو چلو یونہی سہی۔
میں یہ نہیں چاہتا کہ قاعدے کی خلاف ورزی ہو۔ لیکن ٹام سائر! ایک بات ضرور ہے۔ اگر ہم سیڑھی
بنانے کے لئے چادروں کو پھاڑیں گے تو یقیناً خالہ سیلی بہت ناراض ہوگی۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ درخت
کی چھال کی سیڑھی بنالی جائے۔ اس پر نہ تو کچھ خرچ آئے گا، اور نہ کوئی چیز ضائع ہوگی۔ دوسرے
اسے کپڑے کی سیڑھی کی طرح آسانی سے کسی بڑی سی روٹی میں چھپایا بھی جا سکتا ہے۔ جب یہ جم کے
پاس پہنچ جائے گی، تو وہ بھی اسے آسانی سے گدیلے کے اندر چھپا سکے گا۔ رہا سوال جم کا۔ اسے کوئی
تجربہ تو ہے نہیں، لہذا اسے کیا فرق پڑتا ہے کہ کونسی سیڑھی ——"

"اوہ! ہک فن! تم بھی کتنے احمق ہو! اگر میں بھی تمہاری ہی طرح احمق ہوتا، تو خاموش رہنے
میں ہی بہتری سمجھتا۔ آج تک کسی نے یہ بھی سنا ہے، کہ کوئی شاہی قیدی درخت کی چھال کی بنی سیڑھی
سے بھاگ نکلا ہو؟ یہ تو نہایت ہی مضحکہ خیز بات ہوگی۔"

"اچھا، اچھا۔ بھئی ٹام سائر! جیسا چاہو، کرو۔ لیکن میری مانو، تو بہتر یہی ہے کہ جب چادریں

سوکھنے کے لیئے رسّی پر ڈال دی جائیں، تو میں ان میں سے ایک آدھ چادر "اُدھار" لے لوں۔"

یہ تجویز اسے پسند آئی۔ اس کے بعد اسے ایک اور خیال سوجھا۔ وہ بولا:

"ساتھ ہی ایک قمیص بھی "ادھار" لے لینا۔"

"لیکن قمیص کا فائدہ؟"

"اس پر حجم اپنی ڈائری لکھا کرے گا۔"

"ڈائری کی ایسی تیسی! اسے تو لکھنا آتا ہی نہیں"

"نہ آتا ہو۔ لیکن وہ اس قمیص پر لکیریں تو ڈال سکتا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اگر ہم لوہے کے کسی پرانے سے پیپے کی تار یا کسی پرانے سے مٹی کے چمچ کا قلم بنا کر اسے دیدیں تو وہ اس قلم سے کچھ نہ کچھ نشان تو بنا ہی لے گا۔"

"لیکن ٹام۔ اگر ہم کسی بطخ کا پر اکھاڑ لیں، تو اس سے کہیں بہتر قلم بن سکتا ہے۔ اور وہ بھی جلدی۔"

"واہ رے بُدھو! قیدیوں کی جیل میں بطخیں نہیں گھوما کرتیں کہ آپ جب چاہیں، پر اُکھاڑ کر قلم بنالیں۔ ان کے قلم ہمیشہ سخت سے سخت چیزوں کے ہوتے ہیں اور چیزیں بھی وہ جو نہایت دشواری سے دستیاب ہوں۔ مثلاً پیتل کا شمعدان! یا اسی قسم کی کوئی اور شے جسے حاصل کرنے میں بہت دشواری اٹھانی پڑے۔ اور اسے رگڑ رگڑ کر قلم بنانے میں ہفتوں، بلکہ مہینوں لگ جائیں۔ ظاہر ہے قلم بنانے کے لیئے اسے دیوار پر رگڑنا پڑے گا۔ لہذا اگر انہیں پر کا قلم مل بھی جائے تو بھی وہ لوگ اسے استعمال نہیں کریں گے۔ ایسا کرنا قاعدے کی خلاف ورزی ہوگی۔"

"اچھا، تو پھر سیاہی کس چیز کی بنے گی؟"

"بہت سے لوگ تو زنگ کو آنسوؤں میں بھگو کر سیاہی بنا لیتے ہیں۔ لیکن یہ نہایت گھٹیا طریقہ ہے اور نہایت آسان بھی۔ بہترین ہیرو اپنے خون کو بطور سیاہی استعمال کرتے ہیں۔ حجم کو بھی یہی کرنا پڑے گا۔ جب اُسے کوئی مختصر سا پیغام بھیجنا مقصود ہو جس سے دنیا کو یہ پتہ چل جائے کہ وہ کس جگہ قید ہے۔ تو اسے چاہیئے کہ کلنے کی مدد سے لوہے کی طشتری کے پیندے پر یہ پیغام لکھدے

اور اس طشتری کو کھڑکی سے باہر پھینک دے۔ "آہنی نقاب پوش" بھی یہی کچھ کیا کرتا تھا۔ اور یہی طریقہ بہترین بھی ہے"

"لیکن تم کے پاس لوہے کی طشتریاں کہاں سے آئیں؟ اسے تو اس ٹین کی پرات میں ہی کھانا بھیجا جاتا ہے" "پھر کیا ہوا؟ ہم خود اسے کچھ طشتریاں مہیا کردیں گے" "لیکن یہاں اُس کا لکھا ہوا پیغام پڑھے گا کون؟"

اس سے کیا؟ قاعدہ یہ ہے کہ وہ طشتری پر لکھ کر اس طشتری کو باہر پھینک دے۔ یہ کہاں ضروری ہے کہ کوئی اس کے پیغام کو پڑھ بھی سکے۔ بیشتر ایسا ہی ہوتا ہے کہ جو کچھ یہ قیدی ٹین کی طشتریوں پر، یا کہیں اور لکھتے ہیں، اسے کوئی پڑھتا ہی نہیں۔"

"تو پھر طشتریاں ضائع کرنے سے فائدہ؟"

"بھئی واہ! یہ طشتریاں قیدی کی اپنی تو ہوتی نہیں۔"

"لیکن کسی کی تو ہیں!"

"اس سے کیا؟ قیدی کو اس سے کیا غرض کہ طشتری کس کی ــــ" وہ یکلخت رُک گیا۔ مکان سے بگل بجنے کی آواز آرہی تھی، جو ناشتے کا بلاوا تھا۔ ہم فوراً گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

اگلی صبح جب کپڑے سوکھنے کے لئے ڈالے گئے، تو میں نے رسّی پر سے ایک چادر اور ایک سفید قمیص "ادھار" لے لی۔ اس کے بعد کہیں سے ایک بوری ڈھونڈ کر یہ کپڑے اس میں چھپائے پھر ہم نے دو تودے بھی لے آئے اور انہیں بھی اسی بوری میں ڈال دیا۔ "ادھار" کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا ہے کہ ابا اس کام کے لئے یہی اصطلاح استعمال کیا کرتا تھا۔ ہاں البتہ ٹام کا خیال تھا کہ یہ "ادھار" نہیں بلکہ چوری ہے تاہم اس نے یہ جواز پیش کیا کہ ہم اس وقت اپنے آپ کو قیدیوں کا نجات دہندہ سمجھتے ہیں۔ اور جہاں تک قیدیوں کا تعلق ہے، انہیں تو صرف مطلوبہ شے ملنی چاہیئے۔ اس بات سے انہیں کیا سروکار کہ یہ شے کیسے حاصل کی گئی ہے؟ نہ ہی کوئی انہیں اس بات کے لئے موردِ الزام ٹھہرا سکتا ہے۔ ٹام کا کہنا تھا کہ اگر کوئی قیدی کسی ایسی شے کی چوری کرے جس کی مدد سے وہ بھاگ نکلنا چاہتا ہو، تو یہ جرم نہیں سمجھا جاتا۔ یہ تو اس کا

حق ہے۔ لہٰذا جب تک ہم اس قیدی کے مفاد کو مدِنظر رکھیں گے، ہمیں پورا حق ہوگا کہ ہر اس شے کو چرالیں جو اسے قید سے چھٹکارا دینے میں معاون ثابت ہو سکتی ہو۔ ہاں اگر ہم قیدی کے نمائندے نہ ہوتے، تو بات دوسری تھی۔ اُس حالت میں صرف کمینے انسان کے دل میں ہی چوری کا خیال آسکتا ہے۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ ہم ہر اس شے کو، جو کسی بھی کام آسکتی ہو، چرالیں۔ اس کے باوجود جب ایک روز میں نے حبشیوں کی جھونپڑیوں کے قریب والے کھیت میں سے ایک تربوز چرا کر کھا لیا تو ٹام بہت ناراض ہوا۔ اس نے مجھے مجبور کیا کہ ان حبشیوں کو یہ بتائے بغیر کہ یہ رقم کس سلسلے میں ہے، انہیں دس سینٹ کا سکہ دے آؤں۔ اس کا کہنا تھا کہ ہمیں صرف وہی چیزیں چرانے کا حق ہے جن کی ہمیں ضرورت ہو۔ میں نے جواب دیا "ٹھیک ہے مجھے تربوز کی ضرورت تھی" ۔۔۔۔ لیکن ٹام کی دلیل یہ تھی کہ مجھے اس تربوز کی ضرورت قید سے رہائی کے سلسلے میں نہیں تھی۔ اور ان دونوں ضرورتوں میں یہی ایک فرق تھا۔ ہاں البتہ اگر میں تربوز اس لئے چھپاتا کہ اس میں چاقو چھپا کر جم تک پہنچا دیا جائے جس سے وہ چوکیدار کو قتل کر دے، تو یہ چوری بالکل جائز ہوتی ۔۔۔۔ میں نے اس معاملے پر مزید بات چیت کرنے کی ضرورت نہ سمجھی حالانکہ یہ بات میری سمجھ میں نہ آرہی تھی کہ اگر تربوز چراتے وقت مجھے پہلے بال کی کھال اتارنی پڑے تو پھر قیدیوں کا نمائندہ بننے سے فائدہ؟

ہاں، تو میں نے کہا نا، ہم ساری صبح انتظار کرتے رہے۔ اور جب ہر آدمی اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گیا اور ادھر پچھواڑے میں کوئی شخص نہ رہا، تو ٹام اس بوری کو اٹھا کر جھونپڑی میں لے گیا اور میں ایک طرف کو ہو کر نگہبانی کرتا رہا کہ کوئی آتو نہیں رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ جھونپڑی میں سے نکل آیا، اور ہم لکڑیوں کے ڈھیر پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ وہ بولا:

"بس سب بندوبست ٹھیک ہے۔ اگر کوئی کمی ہے، تو صرف اوزاروں کی۔ لیکن اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔"

"اوزار؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"اوزاروں سے کیا ہوگا؟"

"کیوں، کھدائی کس سے کرو گے؟ ہم چوہے کی طرح زمین کتر کتر کر اسے رہا کرانے سے تو رہے بابا"

"یہ ڈھیر ساری پرانی کدالیں جو وہاں پڑی ہیں۔ کیا یہ اس قابل نہیں کہ ہم ان سے سرنگ کھود کر ایک جبشی کو رہا کرالیں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے میری طرف یوں ترحم انگیز نظروں سے دیکھا، کہ میں رو ہی تو دیا۔ پھر وہ بولا:

"ہک فن! آج تک کسی نے یہ بھی سنا ہے کہ کوئی شاہی قیدی بیلچے، کدالوں، اور اسی قسم کے جدید اوزاروں کی مدد سے سرنگ کھود کر بھاگا ہو؟ اگر تم میں ذرا بھی عقل ہے تو ذرا یہ تو بتاؤ کہ اس طرح نکل کر وہ کبھی ہیرو کہلا سکتا ہے؟ اس سے تو یہ بہتر ہوگا کہ اس کے پہرے دار چابی اس کے حوالے کر دیں اور اس سے کہیں کہ نکل بھاگو۔ کدالیں اور بیلچے!! یہ چیزیں تو قید میں پڑے بادشاہ کو بھی نہیں دی جاتیں۔"

"اچھا، تو پھر اگر کدالوں اور بیلچوں سے کام نہیں لینا، تو کس سے لینا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بس، یہی، دو ایک چاقو"

"یعنی ان چاقوؤں سے بنیادیں کھود کر سرنگ بنائی جائے گی؟"

"بالکل"۔

"بھئی ٹام!۔ یہ تو بڑی حماقت ہے"

"حماقت ہے یا کچھ اور بہر حال قاعدے کی بات یہی ہے۔ اور یہی طریق کار درست بھی ہے۔ اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں۔ اور اگر ہے تو کم از کم میری نظر سے نہیں گزرا حالانکہ میں نے وہ سب کتابیں پڑھی ہیں جو اس موضوع پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ان کتابوں کے ہیرو تو چاقوؤں سے ہی کھدائی کرتے تھے۔ اور وہ بھی نرم زمین میں نہیں بلکہ سنگلاخ چٹانوں میں۔ اور اس میں انہیں کئی کئی ہفتے لگ جاتے تھے۔ بس یوں سمجھو کہ وہ خدا جانے کب تک کھدائی ہی کرتے رہتے تھے۔ ذرا اس قیدی کی حالت پر غور کرو جو مارسیلز بندرگاہ کے ڈیف قلعے کے تہہ خانے میں بند تھا۔ اور بالآخر چاقو کی مدد سے چٹانیں کھود کھود کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ کیا خیال ہے

تمہارا؟ اسے کتنا عرصہ لگ گیا ہوگا؟"

"پتہ نہیں۔"

"کچھ اندازہ؟"

"کہہ نہیں سکتا۔ شاید ڈیڑھ مہینہ۔"

"نہیں جناب سینتیس برس۔ اور پتہ ہے اس کی سرنگ کہاں جا نکلی تھی؟ — چین میں۔ یہ ہوتے ہیں ہیرو! کاش اس قلعے کا فرش بھی چٹانوں کا ہی ہوتا!"

"لیکن جم کی تو چین میں کوئی جان پہچان نہیں۔"

"اس کا اس بات سے کیا تعلق ہے؟ — اس دوسری قیدی کی بھی تو نہیں تھی لیکن تمہارا ذہن تو ہمیشہ ضمنی باتوں کی طرف مائل رہتا ہے۔ تم اصل بات پر توجہ مرکوز کیوں نہیں کرتے؟"

"اچھا اچھا! میری طرف سے جہنم میں جا نکلے۔ مجھے اس سے کیا؟ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ قید سے نکل آئے۔ بس۔ اور میرا خیال کہ شاید خود جم کو بھی اس بات کا تردد نہیں ہوگا کہ وہ کہاں جا کر نکلتا ہے۔ تاہم ایک بات ضرور ہے۔ جم اب کافی بوڑھا ہو گیا ہے اور اس میں اتنی ہمت نہیں کہ چاقو سے سرنگ کھود کر نکل آئے۔ اس طرح وہ زندہ نہیں بچے گا۔"

"اجی ضرور بچے گا! کیوں؟ تم سمجھتے ہو کہ اس نرم زمین کو کھودنے میں اسے سینتیس برس لگ جائیں گے؟"

"لیکن ٹام! آخر کتنا عرصہ لگے گا؟"

"بات دراصل یہ ہے کہ اگر ہم اس کام کو سرانجام دینے میں اتنا عرصہ لگائیں جتنا کہ قاعدے کی رُو سے لگنا چاہیئے، تو اس میں خطرہ ہو سکتا ہے۔ خالو سلاس کو اب نیو اورلینز سے جواب آنے ہی والا ہوگا۔ اور جب اسے پتہ لگے گا کہ جم کا اس علاقے سے کوئی تعلق نہیں، تو ظاہر ہے کہ اس کا اگلا قدم یہ ہوگا کہ جم کا اشتہار چھپوا دے۔ لہذا ہمارے پاس اتنا وقت ہے کہاں جتنا قاعدے کی رو سے سرنگ کھودنے میں لگنا چاہیئے؟ ویسے میری ذاتی رائے میں دو سال سے کم نہیں لگنے چاہئیں۔ لیکن ہم اسے اتنا وقت نہیں دے سکتے۔ ان غیر یقینی حالات میں میری تجویز

یہ ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے، کھدائی مکمل کر لیں۔ اور اس کے بعد فرض کر لیں کہ یہ عرصہ سینتیس برس کا تھا۔ اس کے بعد جب بھی ہمیں خطرے کی بھنک ملے، اسے لے کر نکل بھاگیں۔ یہی تجویز اچھی رہے گی ۔۔۔"

"یہ ہوئی بات" میں نے جواب دیا" فرض کرنے میں کیا لگتا ہے؟ اور کون سی مشکل پیش آتی ہے؟ ۔۔۔ اور اگر مقصد صرف اتنا ہی ہے تو مجھے تو یہ کہنے میں بھی تامل نہیں کہ ہم ایک سو پچاس برس تک کھدائی کرتے رہے تھے۔ اور نہ ہی اس سے میرے ہاتھ شل ہونے کا کوئی خطرہ ہے۔ اچھا۔ اب میں جاکر دو چاقو اڑانے کا بندوبست کرتا ہوں۔"

"بہتر ہے تین چاقو اڑالو" وہ بولا" ایک چاقو سے ہمیں آری کا کام بھی تو لینا ہے۔"

"سنو ٹام! اگر یہ قاعدے کی خلاف ورزی نہ ہو، اور اس سے کسی مذہبی عقیدے کو ضعف نہ پہنچتا ہو، تو میں عرض کروں کہ ادھر چمڑا کمانے والی کوٹھڑی کے پیچھے، ایک تختے کے نیچے ایک آرا پڑا ہے۔"

وہ یوں تھکی تھکی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا، جیسے میری بات سن کر اس کا دل ٹوٹ گیا ہو۔ وہ بولا: ہک! تمہیں تو سکھانے کی کوشش کرنا ہی بے سود ہے۔ چلو، اب بھاگ کر جاؤ اور چاقو اڑانے کا بندوبست کرو۔"

میرے لئے تعمیل کے سوا اور چارہ بھی کیا تھا۔

۳۶۔ جاذبِ برق ۔ حتے الوسع کوشش ۔ آئندہ نسلوں کے لئے تحفہ ۔ بڑی رقم ۔

اس رات جب ہمیں یقین ہو گیا کہ سب لوگ سو گئے ہیں، تو ہم جاذب برق کے راستے نیچے اتر آئے۔ کوٹھڑی میں جاکر ہم نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اور ان تو دوں کو نکال کر ان کی لو میں کام شروع کر دیا۔ پہلے تو ہم نے دیوار کے وسطی تختے کے آس پاس چار پانچ فٹ جگہ خالی کی اور سب سامان وہاں سے ہٹا دیا۔ ٹام بولا:" اب ہم جم کی چارپائی

کے عین پائینتی پر کھڑے ہیں۔ بس اسی جگہ سے کھودنا شروع کریں اور جب سرنگ مکمل ہو جائے گی، تو کسی کو اس کا پتہ بھی نہیں چلے گا کیونکہ تم کے بستر کی چادر چارپائی سے اتنی نیچے لٹکی ہوئی ہے کہ جب تک اس کو اٹھا کر چارپائی کے نیچے نہ جھانکا جائے، یہ پتہ ہی نہیں چل سکتا کہ یہاں کوئی سرنگ ہے بھی یا نہیں" —— لہذا ہم نے چاقوؤں سے کھدائی شروع کی اور آدھی رات تک کھودتے رہے۔ ہم تھک کر چور ہو گئے اور ہمارے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے۔ اس کے باوجود حالت یہ تھی کہ اگر آپ ہماری کارگزاری دیکھتے تو شاید یہی کہتے کہ کچھ کام نہیں ہوا۔ بالآخر میں نے کہا۔
"ٹام سائر! یہ مہم سینتیس برس کی نہیں بلکہ اڑتیس برس کی ہے"۔
اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کھودتے کھودتے یکلخت رک گیا اور کافی دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ پھر بولا:
"ہک! اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ بالکل بے کار ہے۔ اگر ہم خود قیدی ہوتے، تو شاید یہ ٹھیک رہتا، کیونکہ تب ہم جتنے برس تک چاہتے، لگے رہتے۔ اور ہمیں کوئی جلدی بھی نہ ہوتی —— ہمیں دن میں صرف چند منٹ کھدائی کرنے کے لئے نصیب ہوتے اور وہ بھی اس وقت جب پہرے دار بدل رہے ہوں۔ لہذا ہمارے ہاتھوں میں چھالے نہ پڑتے اور برسوں ہم یہ عمل جاری رکھ سکتے، اور ہر کام عین قاعدے کی رو سے سرانجام پاتا۔ لیکن اس وقت ہم ان جھمیلوں میں نہیں پڑ سکتے۔ ہمیں تو فوراً کام ختم کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ہمارے پاس وقت کہاں ہے؟ اگر ہمیں ایک رات بھی اور اسی طرح کام کرنا ہے، تو اس کے لئے ہمیں ایک ہفتے کی مہلت درکار ہو گی تاکہ یہ چھالے ٹھیک ہو جائیں۔ ایک ہفتے سے پہلے تو یہ ہاتھ چاقو کو چھونے سے رہے"
"تو ٹام! پھر کیا کیا جائے؟"
"سنو! ہے تو یہ غیر مناسب، اور غیر اخلاقی بھی۔ اور میں نہیں چاہتا کہ کسی کو اس کا پتہ چلے۔ لیکن اب ایک ہی راستہ باقی ہے۔ ہمیں کدالوں کی مدد ہی سے سرنگ کھودنی پڑے گی، لیکن ہم فرض یہ کریں گے کہ یہ سرنگ ہم نے چاقوؤں سے ہی کھودی ہے"
"یہ ہوئی نا بات" میں نے کہا "ٹام سائر! تمہارا دماغ اب ٹھکانے پر آتا جا رہا ہے ہمیں

کدالوں ہی سے کام لینا چاہیئے، چاہے یہ اخلاقی ہے یا غیر اخلاقی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، مجھے تو اس کے اخلاقی اور غیر اخلاقی ہونے کی کوئی پرواہ نہیں۔ جب میں یہ ارادہ کرتا ہوں کہ حبشی کو چرایا جائے، یا تربوز کی چوری کی جائے، یا سنڈے سکول کی کتاب چرالی جائے، تو میں طریق کار کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ کسی نہ کسی طرح مقصد پورا ہو جائے۔ میرا مقصد۔ اس وقت صرف یہ ہے کہ وہ حبشی یا وہ تربوز یا وہ سنڈے سکول کی کتاب میرے ہاتھ آجائے۔ لہٰذا اگر کدال سے بآسانی کام بنتا ہو، تو میں اسی کی مدد سے اس حبشی، اس تربوز، یا اس سنڈے سکول کی کتاب کو حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ اور اس بات کی ہرگز پرواہ نہیں کرونگا کہ اس بارے میں مستند آرا کیا ہیں۔"

"ہاں، ایسے معاملوں میں کدال استعمال کرنے کے لئے اور فرض کرنے کے لئے یہ کام چاقوؤں سے ہوا ہے واقعی جواز موجود ہے۔ ورنہ میں اس کی اجازت کبھی نہ دیتا۔ اور نہ ہی یہ برداشت کرتا کہ میری آنکھوں کے سامنے اصولوں کے خلاف ورزی ہو۔ درست پھر درست ہے، اور غلط، غلط۔ اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا، وہ غلط کام کرے۔ تمہارے لئے تو خیر یہ ٹھیک ہے کہ بغیر فرض کئے بھی کدال کی مدد سے جم کو نکال لو۔ کیونکہ تم انجان ہو۔ لیکن میرے لئے تو یہ بالکل نامناسب ہوگا کیونکہ میں تو انجان نہیں۔ اچھا، وہ ایک چاقو مجھے پکڑا دو۔"

اس کا چاقو اس کے پاس تھا۔ تاہم میں نے اپنا چاقو بھی اسے دے دیا۔ اس نے اسے پرے پھینک دیا اور بولا: "مجھے چاقو چاہیئے۔"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ لیکن فوراً ہی بات میری سمجھ میں آگئی۔ میں نے پرانے اوزاروں میں ادھر اُدھر ڈھونڈ کر ایک کدال نکالی اور اسے پکڑا دی وہ اسے لے کر چپ چاپ اپنے کام میں جُت گیا۔

وہ تو سدا ہی سے اصول کا پکا تھا۔ قواعد و ضوابط کا پابند۔

میں نے ایک بیلچہ لے لیا۔ وہ کدال سے مٹی کھودتا اور میں بیلچے سے اسے باہر پھینک دیتا۔ کوئی آدھ گھنٹہ ہم نہایت محنت سے کام کرتے رہے۔ اس کے بعد ہماری ہمت جواب دے گئی۔

تاہم اس دوران میں ہم نے اچھی خاصی سرنگ کھود ڈالی تھی۔ جب میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر اپنے کمرے میں آیا، تو میں نے کھڑکی میں سے دیکھا کہ ٹام جاذبِ برق کے راستے اوپر چڑھنے کی سر توڑ کوشش کر رہا ہے۔ لیکن اس کی ہتھیلیاں تو چھالوں سے اٹی پڑی تھیں اور اس کے لیے ایک ایک انچ کی چڑھائی عذاب بنی ہوئی تھی۔ بالآخر وہ بولا:

"اس سے کام نہیں چلے گا۔ یوں میں کبھی اوپر نہ پہنچ سکوں گا۔ اچھا تم ہی دماغ پر زور دے کر کوئی ترکیب نکالو۔"

"ایک طریقہ ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ قاعدے کی رو سے جائز نہیں ہوگا۔" میں نے جواب دیا "سیڑھیوں کے راستے چلے آؤ اور یہ فرض کر لو کہ یہ جاذبِ برق ہے۔"

اس نے یہی کیا۔

اگلے روز ٹام نے گھر سے ٹین کا ایک چمچ اور پیتل کا ایک شمعدان چرا لیا، تاکہ ان سے جم کے لیے کچھ قلم بنائے جائیں۔ اس کے علاوہ اس نے چھ موم بتیاں بھی چرا لیں۔ میں خود حبشیوں کی جھونپڑیوں کے چکر کاٹتا رہا اور موقع پاتے ہی ٹین کی تین طشتریاں چرا لیں۔ ٹام کا خیال تھا کہ طشتریاں کم رہیں گی۔ لیکن میں نے کہا کہ جو طشتریاں جم پھینکے گا، ان پر کسی کی نظر تو پڑے گی ہی نہیں۔ کیونکہ یہ طشتریاں کھڑکی کے نیچے اُگے ہوئے سرکنڈوں میں جا گریں گی۔ ہم جا کر انہیں اٹھا لایا کریں گے اور یوں جم انہیں بار بار استعمال کر سکے گا۔ یہ سُن کر ٹام کی تسلی ہو گئی اور وہ بولا:

"مسئلہ یہ ہے کہ یہ سامان جم تک پہنچے کیسے؟"

"جب ہم سرنگ مکمل کر لیں گے، تو اسی راستے سے اس تک پہنچا دیں گے" میں نے جواب دیا۔

اس نے نفرت سے میری طرف دیکھا۔ اور منہ ہی منہ بڑبڑایا کہ ایسی احمقانہ بات اس نے کبھی نہیں سُنی۔ اس کے بعد وہ گہری سوچ میں غرق ہو گیا اور تھوڑی دیر بعد بولا: "دو تین طریقے میرے ذہن میں آئے ہیں۔ لیکن فی الحال کسی ایک پر قطعی فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ

اس معاملے میں جم کی صلاح لینا بھی ضروری ہے"

اس رات ہم دس بجے کے بعد جاذبِ برق کے راستے نیچے اتر آئے اور ایک موم بتی لے کر جم کی کوٹھڑی کی طرف چل پڑے۔ اس کی کھڑکی کے نیچے کھڑے ہو کر ہم ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگے۔ جم کے خراٹوں کی آواز برابر آرہی تھی۔ ہم نے ایک موم بتی اندر پھینکی مگر وہ پھر بھی جاگا۔ اس کے بعد ہم بیلچہ اور کدال لے کر نہایت تندہی سے مصروفِ کار ہو گئے۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے میں سرنگ مکمل ہو گئی اور ہم جم کی چارپائی کے نیچے آنکلے۔ پھر ہم نے جھونپڑی میں اِدھر اُدھر اس موم بتی کی تلاش کی، اور اسے جلا کر جم کے سرہانے کھڑے ہو گئے۔ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ ہم نے اسے دھیرے دھیرے جگایا۔ ہمیں دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ وہ ہمیں "میرے عزیزو"، "میرے بچو"، اور اسی قسم کے پیارے پیارے ناموں سے پکارتا رہا۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ ہم کہیں سے چھینی ڈھونڈ کر فوراً اس کے پاؤں کی زنجیر کاٹ دیں۔ اور ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر وہاں سے رفوچکر ہو جائیں۔ لیکن ٹام نے اسے سمجھایا کہ یہ تو سراسر قاعدے کی خلاف ورزی ہو گی۔ پھر اس کے پاس بیٹھ کر ٹام نے اسے وہ ساری سکیم سمجھا دی جو ہم نے اس کی خاطر بنائی تھی۔ اس نے جم کو یہ تسلی بھی دی کہ جونہی کسی خطرے کا احساس ہو گا، ہم فوراً اس پلان میں مناسب تبدیلیاں کر لیں گے۔ لہٰذا جم کو خاطر جمع رکھنی چاہیے کیونکہ بلاشبہ ایک نہ ایک دن ہم اسے یہاں سے لے بھاگیں گے۔ یہ سُن کر جم مطمئن ہو گیا۔ اس کے بعد کچھ دیر وہ پرانے دنوں کی باتیں کرتا رہا۔ پھر ٹام نے اس سے بہت سے سوال پوچھے اور جم نے ہمیں بتایا کہ خالو سلاس ہر روز یا ایک دن چھوڑ کر اس کے پاس آتا ہے اور وہ دونوں اکٹھے دعا مانگتے ہیں۔ اور خالہ سیلی بھی آکر یہ دیکھ جاتی ہے کہ اسے کوئی تکلیف تو نہیں۔ اسے کھانا تو ٹھیک ملتا ہے۔ وہ دونوں اس پر بہت مہربان تھے۔ یہ سُن کر ٹام بولا:

"بس اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم ان کے ہاتھ تمہیں کچھ سامان بھیج دیا کریں گے۔"

میں نے کہا: "نہ ــــ یہ کام ہرگز نہ کرنا۔ اس سے بڑی حماقت اور کوئی نہ ہو گی"۔ لیکن ٹام نے میری بات نہ سُنی اور اپنے ہی منصوبے بناتا رہا۔ یہ اس کی عادت تھی کہ جب اسے کوئی بات

سوجھنی، تو وہ دوسرے کی بات پر توجہ ہی نہ دیتا۔

اس نے جم کو سب سمجھا دیا کہ کس طرح ہم نیٹ کے ہاتھ آٹے کے پیڑے میں چھپا کر وہ رسّی کی سیڑھی اور دوسرا سامان اس تک پہنچا دیں گے۔ نیٹ وہی حبشی تھا جو روزانہ اسے کھانا دینے آتا تھا۔ ٹام نے جم کو یہ تنبیہہ بھی کی کہ وہ اس سامان پر نگاہ رکھے اور جب یہ سامان اسے مل جائے، تو وہ قطعاً حیرت کا اظہار نہ کرے۔ اور نہ ہی نیٹ کے سامنے انھیں کھولے اس کے علاوہ چھوٹا موٹا سامان ہم خالو کے کوٹ کی جیبوں میں ڈال دیا کریں گے جم کا کام یہ ہو گا کہ جیسے بھی ہو، جیبوں میں سے یہ چیزیں نکال لے۔ کچھ چیزیں ہم خالہ کے پیش بند کے ساتھ باندھ دیا کریں گے یا اگر موقع ملا تو اس کے پیش بند کی جیبوں میں ڈال دیا کریں گے۔ ٹام نے اسے یہ بھی سمجھا دیا کہ یہ چیزیں کیا ہوں گی اور ان کا مصرف کیا ہے۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ جم کو قمیص پر اپنے خون سے روزنامچہ لکھنا ہو گا وغیرہ وغیرہ —— غرضیکہ ٹام نے سب باتیں اسے اچھی طرح سمجھا دیں۔ ان میں سے بہت سی باتیں تو جم کو نہایت ہی فضول لگیں تاہم وہ یہ سوچ کر خاموش رہا کہ ہم گورے لوگ اس سے کہیں زیادہ عقلمند ہیں۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ بالکل ٹام کی ہدایت کے مطابق عمل کرے گا۔

جم کے پاس بہت سے مکّی کے پائپ تھے اور تمبا کو بھی کافی تھا۔ لہٰذا ہم خوب گھل مل کر باتیں کرتے رہے اس کے بعد ہم کھڑکی کے راستے باہر نکل آئے اور گھر جا کر اپنے بستر پر سو گئے۔ ہمارے ہاتھوں کا یہ حال تھا جیسے کوئی انہیں دانتوں سے چبا تا رہا ہو۔ ٹام بہت خوش تھا۔ اس کا دعوےٰ تھا کہ جو مزہ اب اس مہم میں آئے گا، ویسا مزہ کبھی کسی مہم میں نہیں آیا ہو گا۔ اس سے ہماری ذہانت بھی مترشح تھی —— کاش کوئی ایسا طریقہ ہوتا جس سے تمام عمر ہم اسی طرح لطف لیتے رہتے۔ اور اس کے بعد جم کو اپنے بچوں کے حوالے کر دیتے تا کہ وہ بھی اسے پھر اُچھڑ کر لطف لیتے رہیں۔ اس کا خیال تھا کہ جوں جوں جم اس کا عادی ہوتا جائے گا اسے بھی اس میں لطف آنا شروع ہو جائے گا۔ اس کا اندازہ تھا کہ اس حساب سے ہم از کم اسی سال تک محظوظ ہو سکیں گے۔ اور یہ عرصہ اتنا لمبا ہو گا کہ ایک نیا ریکارڈ قائم ہو جائے گا۔ اور ہم لوگ جو اس معرکے کے اہم کردار ہیں، دنیا کی مشہور و معروف ہستیوں میں شمار ہونے لگیں گے۔

اگلی صبح ہم نے لکڑیوں کے ڈھیر پر جاکر کلہاڑی سے اس شمعدان کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیے۔ ٹام نے یہ ٹکڑے اور ٹین کا چمچ اپنی جیب میں ڈال لیے اور ہم حبشیوں کی جھونپڑیوں کی طرف چلے گئے۔ میں نے نیٹ کو باتوں میں لگا لیا اور ٹام نے جھٹ شمعدان کا ایک ٹکڑا اس روٹی میں چھپا دیا جو جم کی پرات میں رکھی تھی۔ اس کے بعد ہم نیٹ کے ساتھ چل پڑے تاکہ دیکھیں کہ ہماری سکیم کہاں تک کامیاب ہوئی ہے۔ سکیم واقعی نہایت شاندار تھی۔ جب یہ ٹکڑا جم کے دانتوں تلے آیا تو ہمیں یوں لگا جیسے ابھی اس کے سارے کے سارے دانت ٹوٹ کر باہر آجائیں گے بھلا اس سے بہتر کامیابی اور کیا ہو سکتی تھی؟ (یہ دعوے ٹام کا ہی ہے) جم نے اُف تک نہ کی اور یہ کہکر بات ٹال دی کہ روٹی میں کنکر آگیا تھا۔ اور روٹی میں کنکر آجانا معمولی بات ہے۔ ہاں اس کے بعد وہ ہر لقمے کو تین چار بار کانٹے سے ٹٹول لیتا تب کہیں جاکر اسے منہ میں ڈالتا۔

کوٹھری میں روشنی مدھم ہو گئی تھی۔ ابھی ہم وہیں کھڑے تھے کہ دو شکاری کتے جم کی چارپائی کے نیچے سے آنکلے۔ اور اس کے بعد ایک، اور پھر ایک اور۔ گیارہ کے گیارہ کتے کمرے میں آن کھڑے ہوئے، اور یوں جمگھٹا بنا کر جمع ہو گئے کہ سانس لینا دوبھر ہو گیا۔ اب ہمیں یاد آیا کہ ہم ملحقہ کوٹھری کا دروازہ بند کرنا بھول گئے تھے۔ نیٹ کے منہ سے صرف ایک ہی لفظ نکلا: "چڑیلیں" اور وہ وہیں فرش پر کتوں کے درمیان لیٹ گیا اور یوں کراہنے لگا جیسے بستر مرگ پر پڑا ہو۔ ٹام نے دروازے کو ذرا سا کھولا اور جم کی پرات میں سے گوشت کی ایک بوٹی اٹھا کر باہر پھینک دی۔ کتنے لمحے بھی ٹام بھی باہر لپکا اور دو ہی سیکنڈ بعد واپس لوٹ آیا، اور آکر دروازہ بند کر دیا۔ میں نے فوراً سمجھ لیا کہ وہ دوسرا دروازہ بھی بند کر آیا ہے۔ پھر وہ اس حبشی کے پاس جاکر اسے ہولے ہولے تھپکیاں دینے لگا اور پوچھنے لگا کہ بات کیا ہوئی ہے۔ کیا کہیں پھر اسے کوئی شے نظر آگئی ہے؟ وہ حبشی اٹھ کر آنکھیں جھپکنے لگا اور بولا: "ماسٹر سِڈ! تم تو یہی کہنے ہو گے کہ میں احمق ہوں۔ لیکن خدا جھوٹے کو غارت کرے۔ میں نے ابھی ابھی لاکھوں کتے دیکھے ہیں۔ وہ بھوت ہی ہوں گے یا ایسی ہی کوئی اور خبیث شے۔ یقین مانو، ماسٹر سِڈ! یہ واقعہ ہے۔ میں نے واقعی انہیں دیکھا ہے۔ کاش ان میں سے

ایک بیرے ہتھے چڑھ جانا۔ بس صرف ایک بار ہتھے چڑھ جانا ـــ لیکن ۔ لیکن ـــ وہ کیوں مجھے یوں دِق کرتے ہیں ؟"

ٹام بولا: "میں بتاؤں بات کیا ہے ۔ ذرا سوچو تو بھلا وہ اس وقت اس بھگوڑے حبشی کے کھانے کے وقت پر کیوں آن موجود ہوتے ہیں ۔ وجہ ظاہر ہے ۔ انہیں بھوک لگی ہوتی ہے ۔ تم ان کے لئے "چڑیلوں والی روٹی" بنا لایا کرو ۔ بس پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔" لیکن ماسٹر سِڈ! مجھے تو یہ روٹی بنانی نہیں آتی ۔ آج میں نے پہلی بار اس کا نام سنا ہے ۔"

"چلو، کوئی بات نہیں ۔ میں بنا لیا کروں گا۔"

"واقعی تم بنا لیا کرو گے ! میرے عزیز میں تمہارے پاؤں دھو دھو کر پیوں گا تمہارا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا ۔"

"تمہاری خاطر یہ کرنا ہی پڑے گا ۔ تم اتنے اچھے ہو ۔ تم نے ہمیں اس بھگوڑے حبشی کو دیکھنے کی اجازت دی ہے ۔ تو پھر میں تمہارے لئے یہ کام کیوں نہیں کروں گا ؟ لیکن تمہیں ایک احتیاط برتنی پڑے گی ۔ یعنی جب ہم یہاں آئیں، تو تم اپنی پیٹھ اِدھر کر لیا کرو ۔ اور جو کچھ بھی پرات میں رکھا ہو، اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھو ۔ جب جم پرات میں سے کھانا نکالنے لگے ، تب بھی مت دیکھو ۔ کون جانے ، کب کیا ہو جائے ؟ ـــ اور ہاں سب سے ضروری بات یہ ہے کہ تم کبھی چڑیلوں کے کھانے کو ہاتھ مت لگانا"

"ہاتھ لگانا ؟ ماسٹر سِڈ ! ہاتھ لگانا تو در کنار اگر کوئی مجھے کروڑوں ڈالر بھی دے ، تب بھی میں اسے انگلی تک نہ لگاؤں ۔"

۳۷ - گم شدہ قمیص - غم کا دورہ - دفع ہو جاؤ - چڑیلوں کی روٹی

سب کچھ طے ہو گیا تھا ۔ وہاں سے ہم سیدھے مکان کے پچھواڑے چلے گئے جہاں ٹوٹا پھوٹا سامان پڑا رہتا تھا ۔ مثلاً پرانے بوسیدہ بوٹ ، پھٹے پرانے کپڑے ، لوہے کی ٹوٹی پھوٹی چیزیں وغیرہ ، وغیرہ ـــ ہم نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس سامان میں سے کپڑے دھونے کی ایک

پرانی سی برات نکالی اور پھر حتے الامکان کوشش کر کے اس کے سوراخ بند کئے۔ یہ برات ہمیں چڑیلوں کی روٹی بچانے کے لئے درکار تھی۔ اس کے بعد ہم تہ خانے میں چلے گئے اور اس برات کو آٹے سے بھر لیا۔ اس کارگزاری سے فارغ ہو کر ہم ناشتے کے لئے چل پڑے۔ راستے میں ہمیں دو میخیں ملیں۔ ٹام نے انہیں بھی اٹھا لیا، کیونکہ اس کا کہنا تھا کہ قیدی ان کی مدد سے قید خانے کی دیواروں پر اپنا نام اور دکھڑا لکھ لیا کرے گا۔ ایک میخ ہم نے خالہ سیلی کے ایپرن میں ڈال دی جو کرسی پر رکھا تھا۔ دوسری میخ الماری پر رکھے خالو سلاس کے ہیٹ کے فیتے میں لگا دی گئی۔ ہم نے بچوں کی گفتگو سے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ ان کے پاپا اور ممی اس روز اس بھگوڑے حبشی کی کوٹھڑی میں جائیں گے اس کے بعد ہم ناشتے کی میز پر بیٹھ گئے۔ ٹام نے ایک چمچ لے کر خالو سلاس کے کوٹ کی جیب میں ڈال دیا۔ خالہ سیلی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ لہذا کھانا شروع کرنے کے لئے ہمیں تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑا۔

اور جب وہ آئی تو غصے سے اس کا چہرہ لال تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے دعا کے ختم ہونے تک اپنے آپ کو ضبط کیا، اس کے بعد وہ ایک ہاتھ سے کافی انڈیلنے لگی اور دوسرے ہاتھ سے اپنے سب سے قریب بیٹھے ہوئے بچے کے سر پر دو ہنٹر مار کر خالو سے بولی:

"میں نے اوپر سے نیچے تک سب جگہ چھان ماری ہے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا تمہاری قمیص کو کون کھا گیا ہے؟"

یہ سن کر میرا دل جو ڈوبا، تو سیدھا پھیپھڑوں اور جگر کے درمیان جا گرا۔ روٹی کا نوالہ حلق سے نیچے اترتا اترتا، کھانسی کے دورہ سے جا ٹکرایا اور اس صدمے کی تاب نہ لا کر واپس جو لوٹا تو گولی کی طرح منہ سے نکل کر سامنے بیٹھے بچے کی آنکھ میں جا لگا۔ بچہ تلملا کر کینچوے کی طرح بل کھانے لگا اور اس کے منہ سے دل دہلا دینے والی ایک چیخ نکل گئی۔ ٹام کے گلے کی رگیں نیلی پڑ گئیں۔ اور تقریباً پندرہ بیس سیکنڈ تک ناشتے کی میز پر یہ عالم رہا کہ اگر مجھے ذرا بھی موقع ملتا، تو اس مہم سے فوراً توبہ کر لیتا۔ لیکن پندرہ بیس سیکنڈ کے بعد مطلع صاف ہو گیا۔ دراصل یہ سب کچھ

یوں اچانک وقوع پذیر ہوا تھا کہ ہمیں سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ خیر، خالو سلاس بولا:
"یہ تو واقعی نہایت عجیب بات ہے۔ کم از کم میری سمجھ میں تو بالکل نہیں آ رہی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے قمیص اتار کر ـــــ کیونکہ ـــــ"
"کیونکہ وہ قمیص اس وقت تمہارے بدن پر نہیں۔ یہی نا؟ یہ تو مجھے بھی علم ہے کہ تم نے قمیص اتاری تھی۔ اور اس اطلاع کے لئے میں تمہاری ناقص یادداشت کی مرہونِ منّت نہیں ہوں۔ مجھے اس لئے علم ہے کہ کل میں نے خود اسے تار پر لٹکا دیکھا تھا۔ لیکن اب یہ غائب ہے۔ قصّہ کوتاہ۔ اب تمہیں وہ سُرخ فلالین کی قمیص ہی پہننی پڑے گی جب تک کہ مجھے نئی قمیص بنانے کی فرصت نہیں ملتی۔ اور ان دو برسوں میں یہ تمہاری تیسری قمیص ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر وقت تمہاری ہی قمیصیں سلتی رہیں۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا تم ان قمیصوں کو کرتے کیا ہو؟ اتنی عمر ہو گئی۔ اب تو تمہیں قمیصوں کو سنبھال کر رکھنے کی تمیز آجانی چاہیئے۔"
"سیلی، میں اپنی کمزوری جانتا ہوں اور اپنی طرف سے میں حتی الامکان کوشش بھی کرتا ہوں۔ لیکن سارا قصور میرے ہی سر مت تھوپو۔ جب وہ قمیص میرے جسم پر نہیں ہوتی، تو مجھے کیا پتہ کہ اس کو کون، کیا کرتا ہے؟ اور یہ تو کبھی نہیں ہوا کہ کوئی قمیص میرے جسم پر سے کھو گئی ہو۔"
"اگر تمہارے جسم پر سے کوئی قمیص ابھی تک نہیں کھوئی، تو اس میں قصور تمہارا نہیں اگر تمہارے بس میں ہوتا تو تم اپنے جسم پر پہنی ہوئی قمیص بھی کھو دیتے ـــــ اور صرف قمیص ہی غائب نہیں ہوئی ایک چمچ بھی گم ہے۔ اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ـــــ دس چمچ تھے اب صرف نو رہ گئے ہیں۔ چلو، اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ قمیص کو بچھڑے نے کھا لیا ہے، تو کم از کم عقل یہ تو باور نہیں کرتی کہ چمچ بھی اسی نے کھایا ہوگا۔"
"اچھا سیلی! کوئی اور چیز تو نہیں کھوئی؟"
"چھ موم بتیاں غائب ہیں۔ ہاں، ہاں۔ موم بتیاں بھی۔ موم بتّیاں تو خیر چوہے بھی لے جا سکتے ہیں۔ شائد لے بھی گئے ہوں۔ لیکن حیرت تو اس بات پر ہے کہ چوہے اب تک یہ سارا مکان کیوں اٹھا کر نہیں لے گئے۔ تم ہمیشہ یہی کہتے رہتے ہو کہ ان کے بِل بند کر دو گے۔ لیکن ابھی

تک ایک بھی بل بند نہیں ہوا۔ اگر ان چوہوں میں ذرا بھی عقل ہوتی، تو وہ تمہارے بالوں ہی میں سو جایا کرتے۔ کیونکہ تمہیں خاک پتہ چلے گا کہ تمہارے بالوں میں کوئی شے ہے بھی یا نہیں۔ لیکن چوہے تو نہیں لے جا سکتے۔ کم از کم مجھے تو اس بارے میں مطلق شک نہیں۔"

"اچھا، سیلی۔ میں مانتا ہوں کہ سارا قصور میرا ہی ہے۔ مجھی سے کوتاہی ہوئی ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ کل کا دن ختم ہونے سے پہلے پہلے یہ بل بند کر دوں گا۔"

"جلدی کیا ہے؟ اگلے سال ہو جائیں گے ـــــ اری ماٹِلڈا! اینجلینا! ایرانڈا! فیلپس!"
اس کے ساتھ ہی ایک دو ہتڑ بچی کے سر پر پڑا اور اس نے ہڑبڑا کر اپنی انگلیاں شکردانی میں سے نکال لیں، اور دبک کر بیٹھ گئی۔ عین اسی وقت وہ حبشی عورت برآمدے میں آ کر بولی:

"مِسز! ایک چادر غائب ہے!"

"ایک چادر غائب ہے؟ اوہ ـــــ ہ ـــــ و!"

"میں آج ہی بل بند کر دوں گا۔" خالو سلاس کھسیانا ہو کر بولا۔

"خاموش رہو ـــ تمہارا مطلب ہے، چادر بھی چوہے لے گئے ہوں گے!

"ہاں، لزی ـــــ کہاں گئی چادر؟"

"مس سیلی! خدا جانتا ہے، مجھے بالکل علم نہیں۔ کل تو یہ تار پر پڑی تھی۔ لیکن وہ ـــ اب وہاں نہیں ہے۔"

"بس اب قیامت آنے والی ہے! میں نے زندگی بھر ایسی بات نہیں سُنی۔ قمیص، چادر، چمچ، چھ موم بتیاں ـــــ"

"مِسز!" ایک زرد رنگ کی لڑکی آ کر بولی: "ایک شمعدان غائب ہے۔"

"دفع ہو جاؤ ـــــ یہاں سے ـــ ورنہ میں یہ دیگچی تمہارے سر پر دے ماروں گی۔"
خالہ اب واقعی غصے سے کھول رہی تھی۔ میں موقع تلاش کرنے لگا کہ اگر ممکن ہو تو کھسک کر باہر جنگل میں چلا جاؤں۔ اور جب تک مطلع صاف نہ ہو، وہیں رہوں۔ خالہ اکیلی دہاڑتی رہی اور ہر شخص بلی بنا اس کی پھنکاریں سنتا رہا۔ بالآخر خالو سلاس کا ہاتھ اچانک جیب میں چلا گیا

اور اس کے ساتھ ہی ایک چمچ جیب میں سے باہر نکل آیا۔ اس وقت خالو بالکل احمق دکھائی دے رہا تھا۔ خالہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اور وہ ہاتھ اوپر اٹھائے جیسے بت کی طرح ساکت ہو گئی۔ اس وقت میری یہ حالت تھی کہ اگر میرے پر ہوتے تو میں اڑ کر یروشلم یا ایسی ہی کسی اور جگہ چلا جاتا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں خالہ نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور بولی:

"بالکل وہی بات ہوئی، جو میں کہتی تھی! تو یہ چمچ جناب کی جیب میں پڑا تھا۔ ذرا اچھی طرح دیکھ لو شاید باقی کی چیزیں بھی وہیں ہوں۔ اچھا یہ تو بتاؤ، یہ چمچ جیب میں گیا کیسے؟"

"سیلی! مجھے بالکل علم نہیں۔" وہ معذرت آمیز لہجے میں بولا۔ "اگر مجھے علم ہوتا، تو میں بتا نہ دیتا؟ ـــ ناشتے سے پہلے میں 'اعمال' کے سترھویں باب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ ممکن ہے جیب میں انجیل ڈالنے کی بجائے میں نے غلطی سے چمچ ڈال لیا ہو۔ یقیناً یہی ہوا ہوگا۔ کیونکہ انجیل جیب میں نہیں ہے ـــ لیکن ذرا ٹھہرو۔ میں ابھی جا کر دیکھتا ہوں۔ اگر انجیل وہیں ہوئی تو ظاہر ہے کہ میں نے انجیل جیب میں نہیں ڈالی بلکہ اس کی بجائے چمچ اٹھا کر چلا آیا ـــ اور ـــ"

"خدا کے لئے میرا سر نہ کھاؤ۔ جاؤ سب دفع ہو جاؤ۔ بس اب میرے نزدیک نہ آنا جب تک کہ میرا غصہ ٹھنڈا نہ ہو جائے۔"

"اگر یہ بات اس نے اونچی آواز میں کہنے کی بجائے، اپنے دل ہی دل میں کہی ہوتی، تو بھی میں یہی سمجھتا کہ یہ حکم ہمیں ہی ملا ہے۔ اور اسے سنتے ہی میری بے جان لاش بھی فوراً اٹھ کھڑی ہوتی اور کمرے سے باہر نکلنے کے اس موقع کا پورا فائدہ اٹھا لیتی۔ جب ہم بیٹھک میں سے گزرے تو بڈھا بھی باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے ہیٹ اٹھایا اور اس کے ساتھ ہی وہ میخ فیتے میں سے نکل کر باہر آ گری۔ بڈھے نے اسے اٹھا کر آتشدان پر رکھ دیا اور کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ اس سے ٹام کو، جس نے اسے میخ اٹھا کر آتشدان پر رکھتے دیکھ لیا تھا، چمچ کے بارے میں یاد آ گیا۔ وہ بولا:

"اس کے ذریعے سامان بھیجنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کا کیا بھروسہ؟" اور پھر کہنے لگا: "خیر، کچھ بھی ہو ان جانے میں ہی سہی۔ لیکن چمچ کے معاملے میں اس نے ہمارے ساتھ نیکی تو

کی ہے۔ لہٰذا ہم بھی اس کو بتائے بغیر، اس کے ساتھ نیکی کریں گے۔ یعنی چوہوں کے بِل بند کردیں گے ——"

نیچے تہ خانہ میں بے حساب چوہے تھے۔ اور اس کام میں ہمیں پورا ایک گھنٹہ لگ گیا۔ لیکن ہماری کارگزاری واقعی لاجواب تھی۔ اس میں رتی بھر بھی خامی نہ تھی ہم ابھی فارغ ہوئے ہی تھے کہ سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی آواز ہوئی ہم نے بتی بجھادی اور چھپ کر انتظار کرنے لگے۔ یہ وہی بڈھا تھا۔ اس کے ایک ایک ہاتھ میں موم بتی پکڑادی تھی اور دوسرے میں بِل بند کرنے کا سامان۔ وہ نہ جانے کس دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ پہلے وہ ایک بِل کی طرف گیا، پھر دوسرے بِل کی طرف۔ اور یوں اس نے باری باری سارے بلوں کا معائنہ کیا۔ پھر وہ پانچ منٹ تک موم بتی کا پگھلا ہوا موم نوچتا ہوا نہ جانے کیا سوچتا رہا۔ اس کے بعد ہوتے ہوتے چلتا ہوا واپس مڑ گیا۔ وہ ابھی تک اپنے خوابوں کی دنیا میں کھویا ہوا تھا' اپنے آپ سے کہہ رہا تھا:

"مجھے تو بالکل یاد نہیں آتا کہ یہ بِل میں نے کب بند کئے تھے۔ اب میں جاکر اسے یہ بتاؤں گا کہ کم از کم چوہوں کے معاملے میں تو میں بری الذمہ ہوں —— لیکن۔ لیکن۔ خواہ مخواہ بات بڑھانے سے فائدہ؟"

وہ یونہی بڑبڑاتا ہوا سیڑھیاں چڑھ گیا۔ اس کے بعد ہم بھی تہ خانے سے نکل آئے۔ وہ بچارا واقعی بہت نیک تھا اور ہمیشہ نیک رہنے والے آدمیوں میں سے تھا۔

ٹام چمچ کو حاصل کرنے کے درپے تھا۔ اس کی رائے میں اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا۔ اس نے بہت دماغ لڑایا اور بالآخر جب ایک اسکیم اس کے ذہن میں آگئی، تو اس نے مجھے اعتماد میں لیا اور ہم چمچ رکھنے والی ٹوکری کے پاس جاکر خالہ سیلی کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ جونہی وہ آتی دکھائی دی، ٹام نے ان چمچوں کو گن گن کر ایک طرف رکھنا شروع کردیا۔ ایک چمچ میں نے اپنی آستین میں اُڑس لیا۔ ٹام بولا:

"خالہ سیلی! یہ تو اب بھی نو ہی چمچ ہیں۔"

وہ بولی: "جاؤ، جاکر کھیلو اور مجھے دق مت کرو۔ مجھے پتہ ہے چمچ کتنے ہیں۔ میں نے خود گنے ہیں۔"

"لیکن خالہ، میں نے دوبارا نہیں گنا ہے۔ یہ نو ہی نکلتے ہیں" ظاہر تھا کہ خالہ کے صبر کی حد ہو گئی ہے۔ تاہم وہ آکر چمچ گننے لگی۔ اسی پر کیا موقوف، کوئی بھی ہوتا، یہی کرتا۔

"یہ تو واقعی نو ہی ہیں۔" وہ بولی۔ "ارے یہ کیا! خدا کی مار ہو ان پر۔ ٹھہرو، میں پھر گنتی ہوں۔"

میں نے وہ آستین میں چھپا ہوا چمچ نکال کر باقیوں میں ملا دیا۔ جب گنتی ختم ہوئی، تو وہ بولی: "یہ کیا مذاق ہے! اب دس ہو گئے" ـــــ وہ واقعی تذبذب میں پڑ گئی۔ لیکن ٹام فوراً بولا:

"نہیں خالہ، یہ دس تو نہیں ہیں۔"

"بدھو کہیں کا! تم نے دیکھا نہیں، میں نے خود گنے ہیں۔"

"گنے تو ہیں ـــــ لیکن ـــــ"

"خیر، میں پھر گنے لیتی ہوں۔"

اب میں نے پھر ایک چمچ اُڑس لیا، اور اب کی بار وہ پہلے کی طرح نو ہی نکلے۔ اب تو واقعی خالہ کی پریشانی کی انتہا ہو گئی غصّے سے اس کا بدن کانپنے لگا۔ اس نے انھیں پھر گنا، دوبارہ گنا، سہ بارہ گنا۔ بار بار گنا۔ حتّے کہ وہ اس قدر سٹپٹا گئی کہ کئی بار وہ ٹوکری کو بھی چمچوں میں ہی گن جاتی۔ لہذا تین بار تو چمچ پورے نکلے، اور تین بار کم۔ بس پھر کیا تھا۔ اس نے ٹوکری کو اٹھا کر دیوار کے ساتھ دے مارا۔ اور بولی: "دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ مجھے تنگ نہ کرو۔ اگر تم نے رات کے کھانے سے پہلے مکان میں قدم رکھا تو تمہاری کھال کھینچ لوں گی۔" ـــــ اور جب وہ یہ حکم سُنا رہی تھی، تو ہم نے چپکے سے وہ چمچ اٹھا کر اس کے ایپرن کی جیب میں ڈال دیا۔ دوپہر سے پہلے پہلے چمچ اور میخ دونوں چیزیں جم کو مل گئیں۔ ہم اپنی کامیابی پر پھولے نہ سماتے تھے۔ ٹام کا دعویٰ تھا کہ اب خالہ جب بھی چمچ گنے گی، وہ ہمیشہ کم یا زیادہ نکلیں گے۔ اور اگر کبھی غلطی سے وہ ٹھیک نکل آئے، تو اسے اپنی گنتی پر یقین نہیں آئے گا۔ اور پھر ایک ہی دن بعد وہ اس گنتی سے اس قدر تنگ آ جائے گی کہ پھر کسی چیز کو گننے کا نام ہی نہ لے گی۔ اور اگر کبھی کسی نے گنتی کا ذکر کیا، تو اس کا سر پھوڑ کر رکھ دے گی۔

لہٰذا اس رات ہم نے وہ چادر واپس تار پر لٹکا دی اور اس کی بجائے ایک چادر الماری میں سے چرالی۔ دو تین بار ہم نے یہی وطیرہ رکھا۔ یعنی کبھی چادر چرالی، کبھی واپس رکھدی۔ حتیٰ کہ اُسے اتنا بھی یاد نہ رہا کہ چادریں تھیں کتنی۔ اور بولی: "جتنی بھی ہوں، اس سے کیا؟ میں اپنی تمام عمر ان چادروں کی گنتی کرنے میں صرف کرنے سے تو رہی۔ اب آئندہ میں کبھی انہیں نہیں گنوں گی۔ ایسی گنتی سے تو موت بھلی۔"

یوں قمیص، اور چادر، اور چمچ اور موم بتیوں کی بات آئی گئی ہو گئی۔ بھلا ہو بچھڑے کا، اور چوہوں کا اور گنتی کے اُس الجھاؤ کا جنہوں نے معاملہ سلجھا دیا۔ رہ گیا شمعدان تو یہ کوئی ایسی اہم شے نہیں تھی۔ رفتہ رفتہ یہ بھی ان کے ذہن سے اُتر جاتا۔

اصل مسئلہ تو اُس ڈبل روٹی کا تھا۔ خدا جانتا ہے کہ اسے پکانے میں ہمیں کیا کیا دقتیں پیش آئیں۔ ہم نے دور جنگل میں جا کر اسے پکانے کا بندوبست کیا۔ بالآخر جب روٹی تیار ہوئی، تو ہم واقعی اپنی کارگزاری سے مطمئن تھے۔ اس کام میں کئی روز لگ گئے۔ ہم نے کم از کم تین پرات آٹا اس پر صرف کیا، اور ہمارے ہاتھ بھی جھلس گئے اور آنکھیں دھوئیں سے اندھی ہو گئیں۔ ہم یہ چاہتے تھے کہ ڈبل روٹی کا اوپر کا چھلکا خوب اچھی طرح سکا ہوا ہو۔ لیکن ہمیں یہ پتہ نہیں تھا کہ اس کا کون سا پہلو آگ پر رکھنا چاہیے۔ آٹا بار بار نیچے بیٹھا جاتا تھا۔ بالآخر بہت سر مارنے کے بعد ہمیں ٹھیک طریقہ سوجھ ہی گیا۔ اور وہ یہ کہ سیڑھی بھی کیوں نہ اس کے اندر بھر دی جائے؟ اگلی رات ہم دونوں، اور جم اس چادر کے چھوٹے چھوٹے چیتھڑے بنا کر انہیں گانٹھیں دیتے رہے۔ صبح سے پہلے پہلے ایک خوبصورت رسّی تیار ہو گئی جس سے کسی بھی شخص کو بآسانی پھانسی دی جا سکتی تھی۔ لیکن ہم نے فرض یہ کیا کہ اس رسّی کو تیار کرنے میں ہمیں پورے نو مہینے لگے ہیں۔

اس سہ پہر کو ہم اس سیڑھی کو اپنے ساتھ جنگل میں لے گئے۔ لیکن سیڑھی بہت بڑی تھی، اتنی بڑی کہ ڈبل روٹی کے اندر سما ہی نہیں سکتی تھی۔ سیڑھی سالم چادر سے بنی تھی اور اس سے چالیس ڈبل روٹیاں بھری جا سکتی تھیں۔ شاید پھر بھی اتنی رسی بچ جاتی کہ

اگر ہم چاہتے تو اس سے پورے کا پورا ناشتہ تیار کر لیتے۔

لیکن ہمیں پورے ناشتے کی ضرورت تو تھی نہیں۔ ہمیں تو صرف ایک بڑی سی ڈبل روٹی درکار تھی۔ لہٰذا فالتو رسّی پھینک دی گئی۔ ڈبل روٹی ہم نے پرات میں نہیں پکائی کیونکہ اس سے ٹانکے پگھل جانے کا خطرہ تھا۔ خالو سلاس کے پاس پیتل کی ایک پرات تھی جس سے اسے بہت انس تھا۔ اس کا دستہ لکڑی کا تھا۔ یہ پرات اس کے آباؤ اجداد کی یادگار تھی۔ اور مے فلاور جہاز پر یا شاید اسی زمانے کے کسی دوسرے جہاز پر فاتح ولیم کے ساتھ انگلستان سے اس ملک میں آئی تھی۔ پرات دوسرے پرانے برتنوں کے ساتھ اوپر برساتی میں رکھی تھی۔ یہ برتن بہت قیمتی تھے، اس لئے نہیں کہ یہ قیمتی دھات کے بنے تھے (یہ دوسرے برتنوں جیسے تھے) بلکہ اس لئے کہ یہ پرانے زمانے کی یادگار تھے۔ ہم چوری چوری اس پرات کو نکال لائے۔ اور چھپا کر جنگل میں لے گئے۔ لیکن ہمیں طریقہ استعمال تو آتا نہ تھا۔ لہٰذا شروع شروع میں سب روٹیاں خراب ہو گئیں۔ البتہ آخری روٹی پکانے میں ہمیں خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔ ہم نے پرات کے اندر چاروں طرف گوندھے ہوئے آٹے کی ایک تہہ جما دی اور اسے کوئلوں پر رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ چیتھڑوں کی سیڑھی اس میں بھر کر اس کے اوپر گوندھے ہوئے آٹے کی ایک تہہ اور جما دی اور ڈھکنا اچھی طرح بند کر کے اس پر گرم گرم راکھ انڈیل دی اور لکڑی کے اس لمبے دستے کو پکڑ کر پانچ فٹ پرے جا کھڑے ہوئے۔ پندرہ منٹ کے اندر اندر روٹی پک کر تیار ہو گئی اور اسے دیکھ کر ہمیں کچھ اطمینان ہوا۔ البتہ ایک بات ضرور تھی۔ جو بھی شخص اس روٹی کو کھائے گا اسے کم از کم گھڑی بھر خلال درکار ہوں گے۔ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ اس سیڑھی کو کھانے کے بعد اس کے پاس خلال استعمال کرنے کے سوا اور کسی کام کے لئے فرصت باقی رہتی۔ یہی نہیں اس کے پیٹ میں وہ درد اٹھتا، وہ درد اٹھتا کہ وہ ساری عمر یاد رکھتا۔

جب ہم نے یہ ڈبل روٹی جم کی تھالی میں رکھی تو نیٹ نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اس کے بعد ہم نے تھالی میں کھانے کی چیزوں کے نیچے لوہے کی تین طشتریاں رکھ دیں۔ یہ سارا سامان جم کے پاس پہنچ گیا اور موقع پاتے ہی اس نے فوراً وہ ڈبل روٹی توڑی اور سیڑھی نکال کر اسے گدیلے کے اندر چھپا دیا۔ اس کے بعد اس نے ان طشتریوں پر

چند الٹی سیدھی لکیریں کھینچیں، اور انہیں کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

۳۸۔ خاندانی مارکا۔ ماہر جمعدار۔ خطرناک ناموری۔ داستانِ غم۔

قلم بنانے کا کام واقعی بہت دشوار تھا۔ ایسی ہی دشواری ہمیں آری کے معاملے میں پیش آئی۔ البتہ جم کو اگر کوئی کام مشکل نظر آتا تھا، تو وہ تھا وہ کتبہ جو قیدی نے دیوار پر لکھنا تھا۔ لیکن یہ ناگزیر تھا کیونکہ ٹام کا کہنا تھا کہ اس کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ بھلا کسی نے یہ بھی سنا ہے کہ کوئی شخص شاہی قیدی بنا ہو، اور کتبہ یا کوٹ آف آرمز (یعنی خاندانی مارکہ) دیواروں پر چھوڑ کر نہ گیا ہو۔

"لیڈی جین گرے ہی کو لو۔" وہ بولا "یا گلفورڈ ڈڈلے کو، یا اس بوڑھے نارتھمبرلینڈ کو۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ کام بہت مشکل ہے، تو بھی اسے کرنا ہی پڑے گا۔ اس کے بغیر کام کیسے چلے گا؟ خواہ کچھ بھی ہو، جم کو یہ کتبہ اور یہ کوٹ آف آرمز تو لکھنا ہی پڑے گا۔ سب قیدی ایسا ہی کرتے ہیں۔"

جم بولا:

"لیکن ماسٹر ٹام! میرے پاس تو کوئی کوٹ ہے ہی نہیں۔ میرے پاس تو اس قمیص کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور تم بخوبی جانتے ہو کہ اس قمیص پر مجھے ڈائری لکھنی ہے۔"

"جم! تم سمجھے نہیں۔ کوٹ آف آرمز کوئی اور ہی شے ہوتی ہے۔"

میں نے کہا: "جب جم یہ کہتا ہے کہ اس کا کوئی کوٹ آف آرمز نہیں تو اس میں غلط کیا ہے؟ اس کا واقعی کوئی کوٹ آف آرمز نہیں۔"

"جی ہاں، یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔" ٹام بولا، "لیکن یہاں سے نکلنے سے پہلے اسے کوئی نہ کوئی کوٹ آف آرمز حاصل کرنا ہی پڑے گا۔ اس مہم میں ہر کام قاعدے کے مطابق ہو گا۔ اور اس تاریخی واقعے میں کسی قسم کی خامی نہیں رہنی چاہیے۔"

لہٰذا جم اور میں تو اینٹوں پر رگڑ رگڑ کر قلم کی نوک بنانے لگے (جم پینل کے ٹکڑے رگڑنے

میں مصروف تھا، اور میں چمچ کی نوک بنا رہا تھا) اور ٹام اس خاندانی مارکے کے بارے میں دماغ لڑانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بولا: "دراصل مجھے ایسے ایسے ڈیزائن سوجھے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا، ان میں سے کس کو اپنایا جائے۔ ایک ڈیزائن تو مجھے بہت ہی اچھا لگتا ہے۔ یعنی تختی کے وسط میں بائیں کونے میں دو متوازی لکیریں ہوں گی جن کے درمیان ارغوانی رنگ کی ایک چلیپائی شکل بنائی جائے گی۔ جس کے اندر اکڑوں بیٹھے کتے کی تصویر بنی ہو گی جو جھپٹنے کی تیاری کر رہا ہو۔ کتے کے پاؤں تلے ایک زنجیر ہو گی جو غلامی کی علامت ہے۔ اس کے علاوہ درخت کی ایک شاخ ہو گی جس کے اندر خاندانی نشان بنا ہو گا جو کافی نمایاں ہو گا۔ نیلے پس منظر پر نیچے کی طرف جھکتے ہوئے تین خط ہوں گے جن کے کٹے پھٹے سرے ادھر ادھر پھیلتے چلے جائیں گے۔ سب سے اوپر ایک بھگوڑا حبشی (سیاہ فام) اپنی گٹھڑی کندھوں پر رکھے چاندی کی پٹی پر بیٹھا ہو گا۔ دو سرخ رنگ کے فیتے اس پٹی کو سہارا دیئے ہوں گے۔ ان فیتوں سے مراد تم اور میں ہوں گے۔ اس خاندانی مارکے کا ایک ماٹو بھی ہو گا۔ یہ ماٹو میں نے ایک کتاب میں سے لیا ہے اور اس کا مطلب ہے: 'جتنی جلدی کرو گے رفتار اتنی ہی کم ہو گی' ——"

"ارے۔ رے۔ رے!" میں نے کہا: "اور باقی سب چیزوں کا مطلب کیا ہے؟"

"ہمارے پاس اتنا وقت ہی کہاں ہے جو ان کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتے رہیں؟" وہ بولا "ہمیں تو وہی کرنا ہے جو سب کرتے ہیں۔"

"اچھا" میں نے کہا "لیکن ان میں سے کسی ایک کا کچھ مطلب تو ہو گا۔ یہ درمیانی حصے کی چلیپائی شکل کیا ہوتی ہے؟"

"یہ۔ یہ —— لیکن تم یہ جان کر کیا کرو گے؟ جب وقت آئے گا میں خود ہی سکھا دوں گا کہ یہ کیسے بنتی ہے۔"

"واہ بھئی ٹام!" میں نے کہا "اگر بتا دو، تو تمہارا کوئی حرج ہے؟ اچھا —— یہ فیتہ کیا ہوتا ہے؟"

"مجھے کچھ پتہ نہیں —— تاہم اسے یہ حاصل کرنا ہی ہو گا، کیونکہ یہ شے سب امراء کے پاس ہوتی ہے۔"

ٹام میں یہی ایک نقص تھا۔ اگر اسے کوئی بات نہیں بتانی تو خواہ آپ ایک ہفتہ اس کے

پیچھے پڑے رہیں، اس سے کچھ اگلوا نہ سکیں گے۔"

اب چونکہ خاندانی مارکے کی سب تفصیلات طے ہو گئی تھیں، اس نے اپنی تمام تر توجہ باقی ماندہ کام کو ختم کرنے میں لگا دی یعنی وہ تحریر جس میں ٹام نے اپنا دکھڑا رونا تھا۔ اور یہ تحریر بہت ضروری تھی کیونکہ ہر قیدی اس قسم کی کوئی نہ کوئی تحریر ضرور لکھ کر چھوڑ جاتا ہے۔ اس نے بہت سی عبارتیں سوچیں اور انہیں کاغذ پر لکھ کر ہمیں سنایا ——— مثلاً

۱۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں ایک قیدی کا دل ٹوٹا تھا۔

۲۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں ایک بے بس قیدی جس کو اپنے اور پرائے سب نے بھلا دیا تھا، ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔

۳۔ یہاں سینتیس برس کی قید تنہائی کے بعد ایک درد بھرا دل ٹوٹ گیا اور ایک تھکی ماندی روح نے ابدی آرام پایا۔

۴۔ یہاں سینتیس برس کی کڑی قید کے بعد ایک شریف النفس قیدی، جو لوئیس چہاردہم کا بیٹا تھا، اپنے عزیز و اقربا سے دور، بے یار و مددگار گھل گھل کر مرا۔

ان تحریروں کو پڑھتے وقت اس کی آواز لڑکھڑا گئی اور اس کا گلا بھر آیا۔ یہ سب تحریریں اتنی عمدہ تھیں کہ وہ یہ فیصلہ ہی نہ کر پایا کہ ان میں سے کون سی عبارت جم کو دیوار پر لکھنی ہوگی۔ بالآخر وہ کہنے لگا کہ جم ان سب تحریروں کو ہی کیوں نہ دیوار پر لکھ ڈالے۔ لیکن جم نے اعتراض کیا کہ اتنی ساری عبارت کو لکڑی کے تختوں پر نقش کرنے میں اسے پورا ایک سال لگ جائے گا۔ اور پھر اسے لکھنا بھی تو نہیں آتا تھا۔ لیکن ٹام بولا کہ وہ خود اسے یہ عبارت لکھ کر دے دے گا۔ اور تب جم کا کام صرف یہ ہوگا کہ ان لکیروں کے اوپر اوپر کھودتا چلا جائے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ٹام کو ایک اور بات سوجھی۔ وہ بولا:

"لیکن ان تختوں سے بھی تو کام نہیں چلے گا۔ قید خانے کی دیواریں تختوں کی نہیں ہوتیں۔ یہ عبارت تو چٹانوں پر لکھی جانی چاہیئے۔ ہمیں ایک بڑا سا پتھر لانا پڑے گا۔"

لیکن جم نے اعتراض کیا کہ پتھر پر لکھنا تو تختوں پر لکھنے سے بھی زیادہ دشوار ہے۔ اگر

اسے کہیں اسے پتھر پر لکھنا پڑا تو شاید اس کی ساری عمر اسی میں بیت جائے اور قید خانے سے رہائی کی نوبت ہی نہ آئے۔ لیکن ٹام نے اسے دلاسا دیا اور مجھ سے کہا کہ اس کی مدد کیا کروں۔ اس کے بعد وہ یہ دیکھنے لگا کہ میں اور جم قلم بنانے میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ قلم رگڑنے والا کام بہت ہی تھکا دینے والا تھا اور نوک تھی کہ بننے میں نہ آرہی تھی۔ میرے ہاتھوں کو اتنی مہلت بھی نصیب نہیں ہوتی تھی جس سے ان کے چھالے ٹھیک ہو جائیں، یہ کام ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔ ٹام بولا:

"ٹھیک ہے۔ مجھے ایک تدبیر سوجھی ہے۔ ہمیں خاندانی مار کے کے لئے اور یہ رودادِ غم لکھنے کے لئے ایک بڑا سا پتھر درکار تو ہے ہی۔ کیوں نہ ایک تیر سے دو شکار کئے جائیں۔ ادھر چکی پر ایک بہت بڑا سا پاٹ رکھا ہے۔ ہم اسے اٹھا لائیں گے اور اس پر یہ تحریریں بھی نقش کریں گے، اور اپنے قلم اور آری بھی رگڑ لیں گے۔"

لیکن یہ تجویز اتنی سہل نہ تھی کیونکہ یہ پتھر کوئی ایسا چھوٹا نہ تھا جسے بآسانی اٹھا کر لایا جا سکے۔ تاہم ہم نے وعدہ کیا کہ ہم اس تجویز پر ضرور عمل کریں گے ــــ آدھی رات سے ذرا پہلے جم کو اس کا کام سپرد کر کے ہم دونوں چکی کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم نے وہ پاٹ چرا لیا اور اسے لڑھکاتے ہوئے گھر کی طرف چل دیئے۔ لیکن پتھر بہت وزنی تھا اور یہ کام ہمارے بس کا نہ تھا۔ ہماری ہر ممکن کوشش کے باوجود پاٹ کئی بار گر گیا۔ اور جب بھی وہ گرتا، ہمیں ہر لحظہ یہی خطرہ رہتا کہ اب اس کے نیچے آئے کہ آئے۔ ٹام کہنے لگا کہ گھر پہنچنے سے پہلے پہلے یہ پاٹ ہم دونوں میں سے کسی ایک کی جان لے کر رہے گا۔ ابھی ہم نے مشکل سے آدھا راستہ ہی طے کیا ہو گا کہ ہم تھکن سے چور ہو گئے اور ہمارا رُواں رُواں پسینے میں شرابور ہو گیا۔ ہم نے سمجھا کہ یوں بات نہیں بنے گی۔ کیوں نہ جم کو بلا لیں۔ جم نے چارپائی کا پایہ اٹھا کر زنجیر کھولی اور اسے گردن کے گرد لپیٹ کر تیار ہو گیا۔ ہم سرنگ کے راستے باہر نکل آئے۔ اب میں اور جم اس پتھر کو یوں لڑھکاتے ہوئے لے آئے جیسے یہ کوئی بہت ہی ہلکی پھلکی سی شے ہو۔ ٹام جمعداری کرتا رہا۔ میری ذاتی رائے ہے کہ جمعداری کرنے کے معاملے میں وہ کسی بھی لڑکے کو مات دے سکتا تھا۔ اسے تو ہر کام کی اور ہر شے کی پوری پوری واقفیت تھی۔

سرنگ تھی تو خاصی چوڑی، لیکن اتنی نہیں کہ یہ پاٹ اس میں سے گزر سکے۔ جم نے کدال

اٹھائی اور فوراً اسے کھود کر پاٹ کے گزرنے کا راستہ بنا لیا۔ اس کے بعد ٹام نے ایک کیل لے کر وہ عبارت اس پر لکھ دی اور پھر یہ کیل اور ایک چھینی (جو ہمیں ساتھ والی کوٹھڑی کے اندر ٹوٹے پھوٹے سامان میں سے ملی تھی) جم کو دے کر کہنے لگا کہ وہ اس کیل کو بطور تیشہ اور چھینی کو بطور ہتھوڑا استعمال کر کے اس تحریر کو اس پتھر پر نقش کر دے۔ ٹام کی ایک ہدایت یہ بھی تھی کہ جب تک موم بتی نہ بجھ جائے، جم کام میں جُتا رہے۔ اور جب بتی بجھ جائے تو وہ اس پاٹ کو اپنے گدیلے کے نیچے چھپا کر سو جائے۔ اس کے بعد ہم نے جم کی زنجیر پائے کے ساتھ باندھنے میں اس کی مدد کی۔ اور فیصلہ کیا کہ اب جا کر سویا جائے۔ لیکن ٹام کو ایک اور بات سوجھ گئی وہ بولا:

"جم! یہاں مکڑیاں بھی ہیں کیا؟"

"جی نہیں — ماسٹر ٹام خدا کا شکر ہے، یہاں مکڑیاں نہیں ہیں۔"

"چلو، کوئی بات نہیں۔ ہم خود بندوبست کر لیں گے۔"

"لیکن، سنو! مجھے مکڑیوں وکڑیوں کی کوئی ضرورت نہیں مجھے تو ان سے بہت ڈر لگتا ہے۔ مکڑیوں کی نسبت تو یہی بہتر ہے کہ میری کوٹھڑی میں سانپ چلے آئیں۔"

ٹام نے دو ایک منٹ دماغ لڑایا۔ پھر بولا:

"تجویز تو واقعی معقول ہے۔ اور میرا خیال ہے پہلے بھی کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی قیدی نے اس پر ضرور عمل کیا ہوگا۔ یقیناً کیا ہوگا! اور کیوں نہ ہو، بات جچتی بھی ہے۔ واقعی یہ تو بہت ہی اچھا خیال ہے۔ اچھا، تم اسے رکھو گے کہاں؟"

"کسے — ماسٹر ٹام؟"

"سانپ کو — اور کسے!"

"زندہ سانپ! ماسٹر ٹام! اگر کوئی سانپ ادھر آنکلا تو میں یہ تختوں کی دیوار توڑ کر نکل بھاگوں گا۔ خواہ مجھے سر کی ٹکروں سے ہی یہ دیوار کیوں نہ توڑنی پڑے۔"

"واہ! جم! تم بھی عجیب آدمی ہو — ارے بھائی۔ تھوڑے ہی دنوں میں جب تم اس سے

مانوس ہو جاؤ گے، تو پھر تمہیں اس سے بالکل ڈر نہیں آئے گا۔ تم اسے سدھا لینا۔"

"سدھا لوں!"

"ہاں۔ ہاں ــــ یہ تو نہایت ہی آسان کام ہے۔ اگر کسی جانور کے ساتھ نیک سلوک کیا جائے اور اس کے ساتھ شفقت سے پیش آیا جائے، تو وہ اس احسان کی اتنی قدر کرتا ہے کہ اپنے کرم فرما کو نقصان پہنچانے کا خیال تک اس کے دل میں نہیں آتا۔ ہر کتاب یہی کہتی ہے۔ پس تم ایک بار آزما کر دیکھ لو۔ پہلے تو یہی دو تین روز کے لئے رکھو۔ تھوڑے ہی دنوں میں تم یوں اس کا دل جیت لو گے کہ وہ تم سے پیار کرنے لگے گا۔ اور نوبت یہاں تک آئے گی کہ وہ تمہارے ہی ساتھ سویا کرے گا اور تم سے ایک پل بھی جدا نہ ہو گا؛ یہاں تک کہ اگر تم اسے اپنی گردن کے گرد لپیٹ کر اس کا سر اپنے منہ کے اندر بھی لے جاؤ، تو بھی وہ تمہیں کچھ نہ کہے گا۔"

"خدا کے لئے، ماسٹر ٹام! یوں مت کہو۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ اس کا ذکر بھی سنوں۔ یعنی اگر میں اس کا سر اپنے منہ کے اندر لے جاؤں، تو بھی وہ کچھ نہ کہے گا! ـــ لیکن بھائی صاحب! اگر سانپ ساری عمر بھی انتظار کرتا رہے، تو بھی میں یہ ہرگز نہیں کروں گا۔ اور ـــ اور ـــ میں ہرگز اسے اپنے ساتھ نہیں سلانا چاہتا۔"

"جم! تم بھی کیا احمقوں ایسی باتیں کرتے ہو! ایک قیدی کے پاس کوئی نہ کوئی ایسا پالتو جانور ضرور رہنا چاہیئے، جو منہ سے گونگا ہو۔ اگر کبھی کسی نے سانپ کو نہیں پالا، تو یہ تو اور بھی اچھی بات ہوئی۔ اس سے تمہارے نام کو چار چاند لگ جائیں گے کیونکہ تم پہلے شخص ہو گے، جو اپنی رہائی کے لئے اس انوکھے طریقے کو اختیار کرے گا۔"

"لیکن۔ ماسٹر ٹام! مجھے یہ شہرت نہیں چاہیئے۔ اگر سانپ کے کاٹنے سے جم چل بسا۔ تو وہ اس شہرت کو کیا کرے گا؟ نہیں صاحب۔ مجھے ایسا نام نہیں چاہیئے۔"

"تم بھی عجیب ہوتے ہو۔ آزمانے میں حرج ہی کیا ہے آخر؟ کوشش تو کرو۔ اگر سکیم کامیاب نہ ہوئی تو اسے ترک کر دیں گے۔"

"یعنی سکیم ترک کر دیں گے - اور وہ بھی اس وقت جب میرا کام تمام ہو چکا ہوگا۔ یعنی میں تو تجربہ کرتا ہی رہ جاؤں گا اور سانپ صاحب اپنا کام کر جائیں گے۔ سنو، ماسٹر ٹام! میں ہر وہ کام کرنے کو تیار ہوں - جو ناقابلِ عمل نہ ہو۔ لیکن اگر تم اور رہٹ ایک سانپ لے آؤ اور مجھ سے توقع کرو کہ میں اسے پال لوں، تو یہ رہا میرا استعفا۔"

"اچھا - اگر تم بضد ہی ہو تو۔۔ تو۔۔ چھوڑو اس سکیم کو - ایک بات ہے ہم تمہیں وہ گھریلو قسم کے بے ضرر سانپ لا دیتے ہیں - تم ان کی دم میں بٹن باندھ دینا اور فرض کر لینا کہ یہ کوڑیوں والے زہریلے سانپ ہیں - اس میں تمہیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟۔۔ یہ تو تمہیں کرنا ہی پڑے گا۔"

"ماسٹر ٹام! اعتراض تو مجھے کچھ نہیں - لیکن وہ بھی کیا رہائی ہوئی، جو بغیر سانپ کے ممکن نہ ہو؟ مجھے تو یہ علم ہی نہ تھا کہ قیدی بننا اس قدر مشکل ہوتا ہے۔"

"مشکل تو ہوگا ہی - میرا مطلب ہے اگر ہر کام قاعدے کے مطابق کیا جائے۔۔ تو۔۔ اچھا - یہ تو بتاؤ - یہاں چوہے بھی ہیں کیا؟"

"نہیں - میں نے تو نہیں دیکھے۔"

"کوئی بات نہیں - ہم ان کا بھی بندوبست کر لیں گے"

"لیکن ماسٹر ٹام! چوہوں سے تو مجھے معاف ہی رکھو - دیکھو ناں، ایک کوئی شخص سونے کی کوشش کر رہا ہو، لیکن یہ چوہے اس کے اوپر اچھلتے کودتے پھر رہے ہیں اور ادھر ادھر سرسراتے پھر رہے ہوں، تو خدا کی قسم، برداشت کی حد ہو جاتی ہے - نہیں صاحب نہیں - اور اگر یہ لوازمات ناگزیر ہیں، تو بھی ان چوہوں سے تو سانپ ہی اچھے - چوہوں سے میری توبہ۔"

"لیکن جم! - چوہوں کا ہونا تو نہایت ضروری ہے - اس کے بغیر چارہ نہیں۔ بس اب زیادہ شور مت مچاؤ - آج تک کوئی قیدی ایسا نہیں ہوا جس کی کوٹھڑی میں چوہے نہ رہے ہوں - اور یہی نہیں - قیدی چوہوں کو پچکارتے ہیں، انہیں سدھاتے ہیں - اور پھر یہ چوہے ان سے یوں مانوس ہو جاتے ہیں کہ مکھیوں کی طرح بے کھٹکے ان کے بدن پر جا بیٹھتے ہیں - ہاں البتہ ان چوہوں کو سدھانے کے لئے موسیقی کی ضرورت پڑے گی -

تمہارے پاس کوئی باجہ واجہ ہے؟

"میرے پاس تو صرف ایک بھدّی سی کنگھی، کاغذ کے ایک ٹکڑے اور چھوٹی سی بربط کے سوا اور کچھ نہیں۔ لیکن بھلا اس بربط میں ان چوہوں کو کیا دلچسپی ہوگی؟"

"کیوں نہیں؟ انہیں تو صرف راگ چاہیئے۔ باجہ چاہے کوئی بھی ہو۔ ان کے لئے تو یہ بربط بھی بہت بڑی شے ہے۔ سب جانوروں کو راگ پسند ہے۔ اور قید خانے کے اندر تو یہ جانور راگ سُن کر مست ہو جاتے ہیں۔ اور اگر راگ درد بھرا ہو، تو پھر تو کیا کہنے۔ اور اس چھوٹی سی بربط پر تو البیہ دھن کے سوا اور کچھ بج ہی نہیں سکتا —— راگ سن کر ان کی دلچسپی قیدی میں بڑھتی ہے، اور وہ یہ جاننے کے لئے بل سے باہر نکل آتے ہیں کہ آخر اسے دکھ کیا ہے —— اچھا اب تو سب کام ٹھیک ہو گیا ہے۔ رات کو سونے سے بیشتر، اور صبح اٹھ کر تم اپنی چارپائی پر بیٹھ کر یہ بربط بجایا کرنا۔ اور اگر تم یہ دھن بجا سکو "ٹوٹ گیا آخری رشتہ" تو پھر تو کہنے ہی کیا ہیں۔ اس دھن کو سن کر وہ فوراً اور یقیناً تمہارے پاس آجائیں گے۔ بس تم دو منٹ یہ دھن، بجانا پھر تمہیں پتہ چل جائے گا کہ یہ سب چوہے، اور سانپ اور مکڑیاں، اور ایسی ہی سب جاندار مخلوق تمہارے بارے میں کس قدر پریشان ہیں۔ وہ تمہارے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو جائیں گے اور مزے سے راگ سنتے رہیں گے۔"

"ہاں۔ ماسٹر ٹام! — وہ تو مزے سے راگ سنتے ہی رہیں گے۔ لیکن جم پر کیا کچھ نہ بیت جائے گی؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن اگر یہ ناگزیر ہی ہے تو پھر میں یہ بھی کر ہی لوں گا۔ میرا خیال ہے کہ مجھے اس مخلوق کو ہر حال میں مطمئن رکھنا پڑے گا تاکہ یہاں غل غپاڑہ نہ ہو ——"

ٹام تھوڑی دیر سوچتا رہا کہ ہماری سکیم میں کوئی اور کمی تو نہیں رہ گئی —— پھر بولا:

"ارے! ایک بات تو میں بھول ہی گیا — اچھا یہ تو بتاؤ، بھلا یہاں پھول بھی اُگ سکے گا کیا؟"

"کہہ نہیں سکتا۔ شاید اُگ سکے۔ البتہ یہاں اندھیرا بہت ہے۔ پھر پھول اُگانے سے فائدہ؟ اور اسے اُگانے میں محنت بھی تو بہت کرنی پڑے گی۔"

"لیکن ــــ کوشش تو کر دیکھو۔ کئی قیدیوں نے اُگائے ہیں۔"

"ماسٹر ٹام! ۔ میرا خیال ہے کہ شائد یہاں وہ بڑا سا بلّی کی دُم ایسی ڈنڈی والا مِلن پھول اُگ آئے گا۔ لیکن اسے اُگانے میں جو اتنی ساری محنت کرنی پڑے گی، اس کا فائدہ؟"

"ارے نہیں ـــــ ہم تمہیں ایک چھوٹا سا پھول لا دیں گے۔ تم اسے یہاں کونے میں بو دینا اور اسے سینچ کر بڑا کر لینا۔ اس کا نام مِلن کی بجائے "پچیولا" رکھنا۔ اگر یہ پھول قید خانے میں اُگے تو اس کے لئے یہی نام موزوں ہوگا۔ تم اسے اپنے آنسوؤں سے سینچا کرنا۔"

"لیکن یہاں اتنا سارا چشمے کا پانی جو موجود ہے"

"اس میں چشمے کے پانی سے کام نہیں چلے گا۔ تم اسے صرف اپنے آنسوؤں ہی سے سینچنا۔ سب ایسا ہی کرتے ہیں۔"

"لیکن ماسٹر ٹام! شرط رہی کہ اگر میں چشمے کا پانی استعمال کروں، اور کوئی دوسرا شخص آنسوؤں کا پانی، تو میرا پھول اس کے پھول سے دوگنا ہوگا۔"

"یہ بات نہیں۔ تمہیں آنسوؤں ہی سے سینچائی کرنی پڑے گی۔"

"اس طرح تو پھول مرجھا جائے گا۔ یقیناً مرجھا جائے گا۔ اور اس کی وجہ یہ کہ میں تو شاذ و نادر ہی روتا ہوں۔"

ٹام لاجواب ہو گیا۔ وہ بہت دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے یہ تجویز پیش کی کہ جم کو پیاز سے کام لینا چاہئیے۔ اس نے یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ خود حبشیوں کی کوٹھڑیوں میں جا کر ایک پیاز اُڑانے کا بندوبست کرے گا اور صبح اس پیاز کو چپکے سے جم کو بھیجی جانے والی کافی کی کیتلی میں ڈال دے گا۔ جم بولا کہ پیاز والی کافی پینے کی بجائے تو تمباکو ملی کافی پی لینا ہی بہتر ہے۔ اور پھر جم نے نکتہ چینی جو شروع کی تو اس نے صرف اس سکیم کو ہی نہیں بلکہ پھول اُگانے پر محنت ضائع کرنے والی تجویز، اور چوہوں کو راگ سنانے اور سانپوں اور مکڑیوں کو سدھانے، والی ان سب سکیموں کو رگید ڈالا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسی پر بس نہیں۔ اسے تو قلم رگڑنے ہیں، عبارت کندہ کرنی ہے، روزنامچہ لکھنا ہے، وغیرہ وغیرہ ۔ اور کہ قیدی بننے میں اس قدر پریشانی، اس قدر ذمہ داری اٹھانی پڑتی ہے کہ شائد

ہی کسی اور کام میں اٹھانی پڑتی ہو۔ اس کے اعتراضات سن کر ٹام کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ بولا کہ ناموری حاصل کرنے کے جو مواقع جم کو نصیب ہو رہے ہیں شاید ہی دنیا کے کسی قیدی کو نصیب ہوئے ہوں۔ اور ایک جم ہے کہ ان کو سراہنے کی بجائے اُلٹا انہیں کوس رہا ہے۔ ایسے شخص کو یہ مواقع فراہم کرنے کا مطلب تو ان کو ضائع کر دینا ہوا۔ —— خیر، جم نے معافی مانگ لی اور وعدہ کیا کہ وہ آئندہ محتاط رہے گا۔ اس کے بعد میں اور ٹام سونے کے لئے چلے گئے۔

۳۹۔ چوہے۔ نیند کے ساتھی۔ بھوسے کا بُت

اگلے روز صبح ہم گاؤں چلے گئے اور تاروں کا بنا ایک چوہے دان لے آئے۔ پھر ہم نے ایک ایسے بِل کا منہ کھول دیا جہاں، ہمیں امید تھی کہ چوہے ہی چوہے ہوں گے۔ ایک ہی گھنٹے کے اندر پندرہ موٹے موٹے چوہے ہمارے ہاتھ لگے۔ اس کے بعد ہم نے وہ چوہے دان خالہ سیلی کی چارپائی کے نیچے ایک محفوظ سی جگہ پر رکھ دیا اور مکڑیاں پکڑنے چلے گئے۔ ہماری غیر حاضری میں ننھے تھامس فرینکلن بنجمن جیفرسن الیگزینڈر فیلپس کی نگاہ کہیں اس چوہے دان پر جا پڑی، اور یہ دیکھنے کے لئے کہ چوہے باہر نکلتے بھی ہیں یا نہیں، اس نے چوہے دان کا دروازہ کھول دیا۔ چوہے فوراً باہر لپکے۔ اسی اثنا میں خالہ سیلی بھی کمرے کے اندر آ گئی۔ جب ہم واپس پہنچے تو عالم یہ تھا کہ خالہ تو چارپائی پر کھڑی چیخ و پکار کر رہی تھی اور چوہے حتی الامکان کوشش کر رہے تھے کہ اس کی تفریح کا سامان بنے رہیں۔ خیر، خالہ نے ایک ڈنڈا لے کر ہم دونوں کی خوب مرمت کی۔ بُرا ہو اس ننھے شیطان کا، اس کے بعد پندرہ سولہ چوہے پکڑنے میں ہمیں دو گھنٹے اور صرف کرنے پڑے۔ یہی نہیں۔ بعد میں پھنسنے والے چوہے ان پہلے چوہوں کی نسبت ویسے بھی کچھ گھٹیا سے تھے۔

اس کے بعد ہم نے متفرق قسم کی مکڑیوں، لیموؤں، اور مینڈکوں، اور ٹڈیوں اور اسی قسم کی دوسری مخلوق کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع کیا۔ ہمارا ارادہ تھا کہ بھڑوں کا ایک چھتہ بھی اس ذخیرہ میں شامل کر لیا جائے۔ لیکن کوئی چھتہ ہمارے ہاتھ نہ لگا۔ ایک چھتے پر ہماری نظر تھی مگر اس میں بھڑوں

کا سارا کا سارا خاندان حاضر تھا۔ ہم بہت دیر تک وہاں بیٹھے ان کے جانے کا انتظار کرتے رہے ہمارا خیال تھا کہ کبھی تو تھک ہار کر یہ بھڑیں چھتے میں سے باہر نکل جائیں گی ـــــ اور ـــ اور اگر وہ نہ نکلیں تو ہم تھک ہار کر اس تجویز کو ترک کر دیں گے۔ جیت بالآخر بھڑوں کی ہی ہوئی۔ بیٹھے بیٹھے ہمارا جسم اکڑ گیا۔ ہم نے تھوڑا سا لہسن لے کر رانوں پر مسلا اور پھر سے ترو تازہ ہو گئے۔ لیکن اب ہم سے بیٹھا نہیں جاتا تھا ـــ بالآخر ادھر سے مایوس ہو کر ہم نے سانپ پکڑنے کی سکیم بنائی۔ جلد ہی ہم نے دو درجن کے قریب گھریلو سانپ پکڑ لئے۔ اور انہیں ایک بوری میں بھر کر اپنے کمرے میں رکھ دیا۔ اب شام کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ ہم نے محنت بھی بہت کی تھی۔ اور ـــ اور ـــ کیا فرمایا آپ نے، بھوک؟ ـــ جی نہیں بھوک تو ہمیں تھی ہی نہیں ـــ خیر، جب ہم واپس پہنچے تو ان میں سے ایک بھی سانپ وہاں موجود نہ تھا۔ ہوا یہ کہ ہم نے بوری کا منہ ٹھیک طرح سے بند نہیں کیا تھا۔ سانپ موقع پا کر نکل بھاگے۔ لیکن ہم نے سوچا کہ آخر جائیں گے کہاں۔ ہوں گے تو یہیں کہیں۔ ان میں سے کچھ ایک تو پھر بھی قابو آ ہی جائیں گے۔ ویسے بھی اب کافی عرصے کے لئے گھر کے آس پاس سانپوں کی کوئی قلت نہ رہی تھی۔ کبھی وہ اوپر شہتیر سے نیچے لٹک رہے ہوتے۔ کبھی پلیٹ میں، یا کسی کی گردن پر آ گرتے۔ اور گرتے بھی اس وقت جب کوئی ان کی شکل دیکھنے کے لئے بھی تیار نہ ہوتا۔ ویسے یہ سانپ تھے جاذب نظر۔ ان کے جسم دھاری دار تھے اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ ایسے دس لاکھ سانپ بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ لیکن خالہ سیلی کو کون سمجھائے؟ اس کو سانپوں سے خدا واسطے کا بیر تھا، خواہ یہ سانپ گھریلو ہوں، یا زہریلے۔ آپ لاکھ کہئے لیکن اسے تو سانپوں سے نفرت تھی۔ جب کبھی کوئی سانپ اس کے اوپر آ گرتا، تو چاہے وہ کتنا ضروری کام ہی کیوں نہ کر رہی ہو، وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کمرے سے باہر بھاگ جاتی۔ ایسی عورت میں نے زندگی بھر نہیں دیکھی۔ ایسے موقعوں پر تو اسے شیطان کو بھی اپنی مدد کے لئے پکارنے میں عار نہ تھی۔ آپ کہتے رہئے لیکن وہ چمٹے سے بھی سانپ کو پکڑنے پر رضامند نہ ہو گی۔ اور اگر کہیں کوئی سانپ اس کے بستر میں آ جاتا، تو وہ فوراً چارپائی سے کود کر اتر آتی اور یوں چیخنے لگتی جیسے مکان کو آگ لگ گئی ہو۔ خالو تو بیچارا اس قدر تنگ آ گیا کہ وہ بار

بار یہی کہتا "کاش خدا نے سانپ نہ بنائے ہوتے۔" اس وقت بھی جب سانپوں کو گھر سے رخصت ہوئے ایک ہفتے سے اوپر ہو گیا تھا، خالہ کو ان سے ڈر لگتا رہا۔ اس کے دل سے سانپوں کا خوف ابھی تک نہیں مٹا تھا۔ اگر کبھی وہ بیٹھی کچھ سوچ رہی ہو، اور آپ چپکے سے اس کی گردن کو ایک پر سے ذرا سا چھو دیں، تو وہ فوراً اچھل کر چھت سے جا لگے گی۔ میرے لئے تو یہ بہت ہی عجیب بات تھی لیکن ٹام کا کہنا تھا کہ عورتیں ہوتی ہی ایسی ہیں اس کا خیال تھا کہ نہ جانے کیوں، خدا نے ان کی فطرت بنائی ہی ایسی ہے۔

جب کبھی کوئی سانپ اس کے راستے میں آ جاتا، تو ہماری خوب مرمت ہوتی۔ خالہ تو یہ بھی کہا کرتی تھی کہ اگر ہم دوبارہ سانپ گھر میں لائے، تو جو مرمت اس وقت ہوگی، اس کے مقابلے میں یہ مرمت کچھ بھی نہیں۔ خیر، پٹائی کا ہمیں کیا خوف ہوتا؟ اگر ہمیں کوئی فکر تھی تو صرف ان دشواریوں کی جو دوبارہ سانپ پکڑنے میں ہمیں پیش آئی تھیں۔ بالآخر ہم نے کچھ اور سانپ پکڑ ہی لیئے اور انھیں بھی دوسری مخلوقات کے ساتھ جم کی کوٹھری میں رکھ دیا۔ جب جم بربط بجاتا، تو یہ ساری مخلوق اس کے گرد جمع ہو جاتی، اور جم کی کوٹھری میں اچھی خاصی چہل پہل ہو جاتی۔ جم کو مکڑیاں سخت ناپسند تھیں۔ اور مکڑیوں کو جم۔ مکڑیاں تو جیسے جم کی تاک میں بیٹھی رہتیں اور موقع ملتے ہی اسے خوب پریشان کرتیں۔ جم کا کہنا تھا کہ ان چوہوں، اور سانپوں، اور چکی کے پاٹ نے ہی ساری جگہ گھیر رکھی تھی اور اس کے اپنے سونے کے لئے چارپائی پر ایک انچ جگہ باقی نہ تھی۔ اگر جگہ ہوتی بھی، تو بھی اس بچارے کو نیند نہ آتی، کیونکہ بستر پر تو خوب گہما گہمی رہتی۔ اور یہ گہما گہمی ہر وقت لگی رہتی۔ اس ساری مخلوق کو ایک ساتھ تو نیند نہیں آسکتی تھی۔ وہ تو باری باری سوتے تھے۔ مثلاً جب سانپ محوِ خواب ہوں، تو چوہے پہرہ دیتے رہیں گے۔ اور جب چوہے سونے لگتے، تو سانپ ڈیوٹی پر آ جاتے۔ اس طرح کوئی نہ کوئی مخلوق ہمیشہ اس کی نیند میں خلل ڈالتی ہی رہتی۔ اگر ایک گروہ چارپائی کے نیچے سویا ہوتا، تو دوسرا اس کے اوپر کلیلیں بھر رہا ہوتا۔ اگر جم اٹھ کر کسی دوسرے کونے میں جا کر سونے کی کوشش کرتا، تو مکڑیاں دھاوا بول دیتیں۔ جم کا کہنا تھا کہ

اب کی بار وہ رہا ہوے۔ پھر وہ کبھی قیدی نہیں بنے گا، چاہے اسے قید بننے کے لئے تنخواہ ہی کیوں نہ دی جائے۔

تین ہفتوں کے اندر اندر تمام انتظامات مکمل ہو گئے۔ قمیص ہم نے پہلے ہی ایک بڑی سی ڈبل روٹی میں ڈال کر بھیج دی تھی۔ جب کبھی کوئی چوہا جم کو کاٹتا وہ فوراً اٹھ کر اپنے روزنامچے کو مکمل کر لیتا تاکہ کہیں سیاہی نہ سوکھ جائے۔ قلم تیار ہو چکے تھے اور چکی کے پاٹ پر عبارت بھی نقش ہو گئی تھی۔ پائے کو چیر کر اس کے دو ٹکڑے کر دیئے گئے تھے اور برادہ ہم نے پھانک لیا تھا۔ وہ الگ بات ہے کہ برادہ پھانکنے کے بعد ہمارے پیٹ میں وہ درد اٹھا، وہ درد اٹھا کہ ہمیں امید نہ رہی کہ ہم زندہ بچیں گے۔ لیکن شکر ہے خدا کا کہ مرنے کی نوبت نہ آئی۔ یہ برادہ تو واقعی ناقابلِ ہضم ہے۔ ایسی ثقیل غذا میں نے زندگی پھر کبھی نہیں کھائی۔ ٹام بھی مجھ سے متفق تھا۔ ہاں، تو بالآخر سب بندوبست ہو ہی گیا۔ اب ہم بہت تھک گئے تھے۔ جم تو بیچارا تھک کر چور ہو گیا تھا۔ بڈھے سلاس نے دو ایک بار اورلینز کے اس فارم کو خط بھی لکھے کہ وہ لوگ آکر اپنا غلام لے جائیں لیکن اس کے خطوں کا کوئی جواب نہ آیا۔ ایسا کوئی فارم ہوتا، تو جواب آتا۔ لہٰذا اس کا ارادہ اب یہ تھا کہ سینٹ لوئیس اور نیو اورلینز کے اخباروں میں جم کا حلیہ مشتہر کر دیا جائے۔ جب اس نے سینٹ لوئیس کا نام لیا تو میرے جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔ اب ہم ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کر سکتے تھے۔ ٹام کی رائے بھی یہی تھی کہ: اب وقت آگیا ہے کہ گمنام خط لکھ دیئے جائیں۔

"وہ کیا ہوتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

وہ لوگوں کو پیشگی اطلاع کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ اطلاع تو کئی طرح دی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ کوئی نہ کوئی شخص مخبری کرتا رہے اور قلعے کے نگران کو ہر بات سے آگاہ کرتا رہے۔ جب لوئیس شش‌دہم ٹولریز کے قلعے سے بھاگا تھا تو مخبری کا فرض ایک خادمہ نے سر انجام دیا تھا۔ یہ خادمہ والا طریقہ واقعی اچھا ہے۔ ویسے تو گمنام خط والا طریقہ بھی خوب ہے۔ ہم ان دونوں طریقوں کو ہی استعمال میں لائیں گے۔ اور ہاں، عام طور پر قیدی کی ماں قیدی کے ساتھ لباس بدل لیا کرتی ہے۔ اور جب قیدی اس کے کپڑے پہن کر کھسک جاتا ہے، تو وہ اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ ہم بھی ایسا ہی کریں گے۔"

"لیکن ٹام! بھلا لوگوں کو پیشگی اطلاع دینے کی ضرورت کیا ہے؟ یہ تو ان کا کام ہے کہ ان باتوں کی ٹوہ میں رہیں۔"

"ہاں، ہاں ــــ یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ لیکن آپ کب تک ان کے بھروسے رہیں گے؟ انہوں نے تو شروع سے ہی کوئی قدم نہیں اُٹھایا۔ اور سب کام ہمیں ہی کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ لوگ تو اس قدر سادہ لوح اور احمق واقع ہوئے ہیں کہ انہیں شبہ تک نہیں ہوتا۔ لہذا اگر ہم نے انہیں اطلاع نہ دی، تو ہمارے راستے میں کبھی کوئی اڑچن آئے گی ہی نہیں۔ اور ہماری سب محنت ضائع جائے گی اور اس فرار کا چرچا تک نہ ہوگا۔ سب کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا، اور حاصلِ محنت صفر!"

"سنو ٹام! جہاں تک میرا تعلق ہے، میں خود بھی یہی چاہتا ہوں۔ کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔"

"تُف ہے تم پر۔" وہ بولا۔ ظاہر ہے اسے یہ بات سخت ناگوار گزری تھی۔ لہذا میں نے فوراً کہا:

"لیکن میں شکایت تو نہیں کر رہا ہوں۔ جو کام تمہیں جچتا ہے، وہ مجھے کیوں نہیں جچے گا؟ اچھا، خادمہ کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟"

"خادمہ تو تمہیں ہی بننا پڑے گا۔ تم آدھی رات کے وقت چپکے سے اس لڑکی کے کمرے میں جا کر اس کا فراک اٹھا لانا۔"

"لیکن ٹام! اس سے تو اگلے روز خوب واویلا مچے گا۔ میرا خیال ہے کہ اس بچاری لڑکی کے پاس یہی ایک فراک ہے۔"

"مجھے سب پتہ ہے ــــ لیکن تمہیں یہ فراک صرف پندرہ منٹ کے لئے ہی تو چاہیے۔ یعنی صرف اتنے عرصے کے لئے جس میں وہ گمنام خط صدر دروازے کے نیچے سے گھر کے اندر پھینکا جا سکے۔"

"اچھا۔ ٹھیک ہے۔ میں یہ کر لوں گا۔ لیکن یہ خط پھینکنے کا کام تو میں اپنے کپڑوں میں بھی کر سکتا ہوں۔"

"لیکن اپنے کپڑوں میں تم خادمہ تو نظر نہیں آ سکتے۔ کیوں؟"

"خادمہ تو واقعی نہیں نظر آ سکتا۔ لیکن اُس وقت کون دیکھے گا کہ میں کیا نظر آتا ہوں۔"

"لیکن اس کا ہماری سکیم کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ ہمارا کام تو صرف یہ ہے کہ اپنا فرض ادا کریں اور یہ نہ سوچیں کہ کوئی ہمیں دیکھتا ہے یا نہیں۔ ہک! تمہارا کوئی اصول بھی ہے یا نہیں؟"

"اچھا، اچھا ـــ میں اب خاموش ہوا جاتا ہوں۔ میں خادمہ ہی سہی ـــ لیکن وہ جم کی ماں کون بنے گا؟"

"میں بنوں گا۔ میں خالہ سیلی کا ایک گاؤن اڑا لاؤں گا۔"

"اچھا ـــ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب میں اور جم یہاں سے نکل جائیں گے، تو تم یہیں پیچھے رہو گے۔"

"ہاں۔ لیکن زیادہ دیر نہیں۔ میں جم کے کپڑوں میں بھوسا بھر کر اس کو چارپائی پر یوں لٹا دوں گا جیسے اس کی ماں بھیس بدل کر سوئی ہوئی ہو۔ جم اس حبشی عورت کا گاؤن میرے جسم سے اتار کر پہن لے گا۔ اور پھر ہم اکٹھے ہی فرار ہو جائیں گے۔ جب کوئی عالی مرتبہ قیدی بھاگ نکلتا ہے، تو اسے فرار کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب کوئی بادشاہ بھاگتا ہے تو وہ فرار کہلاتا ہے۔ بادشاہ کے لڑکے کے معاملے میں بھی، خواہ وہ لڑکا حلال کا ہو، یا حرام کا، اسے فرار ہی کہیں گے۔"

اس کے بعد ٹام نے وہ گمنام خط لکھا۔ میں نے اس لڑکی کا فراک اڑا لیا۔ اور ٹام کی ہدایت کے مطابق، اسے پہن کر میں نے خط صدر دروازے کے نیچے سے مکان کے اندر پھینک دیا۔ خط کا مضمون تھا:

"خبردار ـــ
گڑبڑ ہونے والی ہے۔
محتاط ـــ ہوشیار ـــ"

گمنام دوست

اگلی رات ٹام نے اپنے خون سے ایک تصویر بنائی۔ اس تصویر میں ایک دوسری کو کاٹتی ہوئی دو ہڈیاں دکھائی گئیں اور ان کے اوپر ایک کھوپڑی بنائی گئی۔ میں نے یہ تصویر پچھلے دروازے پر چسپاں کر دی۔ اس سے اگلی رات جو تصویر چسپاں کی گئی اس میں تابوت بنا تھا۔ ان تصویروں کو دیکھ کر

اس کنبے کے پسینے چھوٹ گئے۔ اگر ان کا مکان آسیب زدہ ہوتا اور بھوت ہر لحظہ ان کے پیچھے پڑے رہتے، اور چار پائیوں کے نیچے چھپے رہتے، اور ہوا میں لرزتے رہتے۔۔۔ تو بھی شائد یہ لوگ اس قدر خوفزدہ نہ ہوتے۔ جب بھی کوئی دروازہ کھٹ سے بند ہوتا، تو خالہ سیلی اچھل پڑتی اور کہتی: 'اوہ'! ۔ اگر کوئی چیز گر جاتی تو بھی وہ اچھل پڑتی اور کہتی: 'اوہ'! اور اگر اس کا دھیان کہیں اور ہو، اور کوئی اسے چھولے تو بھی وہ اچھل پڑتی اور کہتی: اوہ! ۔۔۔ خواہ اس کا منہ کسی طرف بھی ہو، اسے ہمیشہ یہی پریشانی رہتی کہ کوئی اس کی پشت پر کھڑا ہے۔ وہ دفعتاً آگے، پیچھے، اِدھر، اُدھر مڑتی اور کہتی: 'اوہ'! ۔۔۔ یہی نہیں۔ ابھی وہ گردن گھما ہی رہی ہوتی، کہ پھر منہ سامنے پھیر لیتی اور کہتی: 'اوہ'! ۔۔۔ بستر پر لیٹنے میں اسے خوف آتا، لیکن اتنی ہمت بھی نہ ہوتی کہ اٹھ کر بیٹھ جائے۔ ٹام کا خیال تھا کہ سکیم نہایت شان سے کامیاب ہو رہی ہے۔ اور کہ ایسی کامیابی اسے زندگی بھر حاصل نہیں ہوئی۔ پس ثابت ہوا کہ اس پر ٹھیک طرح سے عمل ہو رہا ہے۔

اس نے یہ بھی کہا کہ اب موقع آگیا ہے کہ اس کارِ عظیم کو سرانجام دے دیا جائے۔ پس صبح پھٹتے ہی ہم نے ایک خط اور لکھا، اور سوچنے لگے کہ اس خط کو ان تک کیسے پہنچایا جائے۔ بات یہ تھی کہ شام کے کھانے پر ہم نے یہ سن لیا تھا کہ گھر کے دونوں دروازوں پر حبشیوں کا پہرہ لگا دیا جائے گا۔ ٹام جاذبِ برق کے راستے نیچے اتر آتا کہ حالات کا جائزہ لے۔ پچھلے دروازے کا حبشی پہریدار سویا پڑا تھا۔ ٹام نے وہ خط اس کی گردن پر چپکا دیا اور واپس چلا آیا۔ خط کا مضمون تھا:

"اس بات کو خفیہ رکھنا۔ میں آپ کا خیر خواہ ہوں۔ قبائلی علاقے سے خونخوار ڈاکوؤں کا ایک گروہ آج رات آپ کا بھگوڑا حبشی غلام چرانے آئے گا۔ وہ لوگ آپ کو خوفزدہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ آپ مکان کے اندر ہی رہیں اور ان کے ارادوں میں رکاوٹ نہ بنیں۔ میں اسی گروہ کا ایک فرد ہوں۔ لیکن مجھے خدا کا خوف ہے اور میں گناہ کی زندگی ترک کر کے راستبازی کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ اسی لیے میں ان کے ناپاک منصوبوں کی مخبری کر رہا ہوں۔ وہ لوگ ٹھیک آدھی رات کے وقت شمال کی طرف سے جنگلے کے ساتھ ساتھ ہوتے ہوئے آئیں گے۔ ان کے پاس ایک کنجی ہے۔ وہ کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر حبشی کو نکال لیں گے۔ میرے

ذمے یہ کام ہے کہ ذرا فاصلے پر ٹھہرا رہوں، اور جونہی خطرہ نظر آئے، فوراً ٹین کا بگل بجا دوں۔ لیکن میں یہ کروں گا کہ جونہی وہ لوگ گھر کے اندر داخل ہوں گے میں بگل بجانے کی بجائے، بھیڑیے کی طرح ممیاؤں گا۔ اس کے بعد جب وہ لوگ اس کی زنجیر کھول رہے ہوں، تم چپکے سے باہر کا دروازہ بند کر دینا اور جب فرصت ملے، انھیں قتل کر لینا۔ جیسا میں نے کہا ہے، بالکل ویسے ہی کرنا۔ اس کی ذرا بھی خلاف ورزی نہ ہو۔ ورنہ ان لوگوں کو شک ہو جائے گا اور وہ گڑبڑ کر دیں گے۔ مجھے آپ سے کوئی انعام نہیں لینا۔ میرے لئے تو یہی کافی ہے کہ میں نے کوئی نیکی کی ہے۔"

گمنام دوست۔

۴۰۔ مچھلیاں پکڑنا۔ کمیٹی حفظِ امن۔ پُر لطف دوڑ۔ ڈاکٹر بلانے کا مشورہ۔

ناشتے کے بعد ہم بہت خوش تھے۔ ہم نے کشتی کھولی اور دوپہر کا کھانا ساتھ لے کر مچھلیاں پکڑنے چلے گئے۔ وقت خوب مزے سے گزرا۔ ہم نے بیڑے کو بھی جا کر دیکھا۔ یہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ ہمیں گھر لوٹنے میں دیر ہو گئی اور ہم کھانے کے وقت پر نہ پہنچ سکے۔ جب ہم واپس پہنچے، تو دیکھا کہ گھر کے سب لوگ نہایت پریشان ہیں۔ انہیں کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ وہ کر کیا رہے ہیں۔ ہمارے پہنچتے ہی انہوں نے ہم سے کہا کہ فوراً کھا کر اپنی اپنی چارپائی پر لیٹ جائیں۔ انہوں نے یہ بتانے کی ضرورت نہ سمجھی کہ بات کیا ہے، اور نہ ہی اس خط کا ذکر کیا۔ اگر انہوں نے ذکر نہیں کیا تو کیا ہوا؟ ہم بھی تو اس کے مضمون سے اتنے ہی واقف تھے، جتنا کوئی اور۔ خیر، جونہی ہم نے آدھی سیڑھیاں طے کیں اور خالہ سیلی نے پیٹھ موڑی، ہم لپک کر تہ خانے میں جا پہنچے اور الماری سے اچھا خاصا کھانے کا سامان اکٹھا کر لیا اور اسے باندھ کر اپنے کمرے میں لے آئے۔ اس کے بعد ہم لیٹ گئے۔ جب ساڑھے گیارہ بجنے کو آئے، تو ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ ٹام نے خالہ سیلی کے کپڑے پہن لئے،

جونہ چرا لایا تھا۔۔۔ اس کے بعد وہ اس سامان کو لے کر روانہ ہونے ہی لگا تھا کہ اسے کچھ یاد آ گیا۔ وہ بولا:

"مکھن کہاں ہے؟"

"مکھن کا پیڑا میں نے ایک روٹی پر رکھا تھا" میں نے کہا۔

"تب یہ وہیں رہ گیا ہوگا۔ یہاں تو ہے نہیں۔"

"اس کے بغیر ہی کام چلا لیں گے۔" میں نے کہا۔

"اسے لے کر بھی تو کام چل سکتا ہے۔" وہ بولا۔ "بس ذرا چپکے سے تہ خانے میں چلے جاؤ اور اسے اٹھا لاؤ۔ اس کے بعد جاذب برق کے راستے نیچے اتر آنا اور یہیں آ جانا۔ میں جا کر جم کے کپڑوں میں بھوسہ بھرتا ہوں جس سے یہ ظاہر ہو کہ اس کی ماں بھیس بدل کر سوئی ہوئی ہے۔ اس کے بعد میں بھیڑ کی طرح ممیانے کے لئے تیار رہوں گا۔ اور جونہی تم وہاں پہنچ جاؤ گے، میں بھی چلا آؤں گا۔"

وہ باہر نکل گیا اور میں تہ خانے میں اتر گیا۔ مکھن کا پیڑا (جو آدمی کی مٹھی جتنا بڑا ہوگا) وہیں پڑا تھا۔ میں نے روٹی اٹھا لی اور موم بتی بجھا کر چوری چوری سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ابھی میں تہ خانے سے نکلا ہی تھا کہ خالہ سیلی موم بتی لئے ادھر آ نکلی۔ میں نے فوراً مکھن اور روٹی اپنے ہیٹ کے اندر چھپا لی اور ہیٹ کو سر کے اوپر رکھ لیا۔ اگلے ہی لمحے اس کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ بولی:

"تم تہہ خانے میں گئے تھے؟"

"جی"

"وہاں کیا کر رہے تھے تم؟"

"کچھ نہیں"

"کچھ نہیں؟"

"جی کچھ نہیں"

"اچھا۔ تو تم وہاں کیا کرنے گئے تھے؟ ۔ اور رات کو اس وقت؟"

"پتہ نہیں۔"

"پتہ نہیں؟ ٹام! مجھے یوں جواب مت دو۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ تم وہاں کیا کر رہے تھے۔

"خالہ سیلی۔ سچ کہتا ہوں، میں وہاں کچھ نہیں کر رہا تھا۔"

میرا خیال تھا، وہ مجھے چھوڑ دے گی۔ عام حالات میں وہ چھوڑ بھی دیتی۔ لیکن ان دنوں واقعات کچھ ایسے عجیب و غریب ہو رہے تھے کہ وہ چھوٹی سی بات پر بھی جو معمول سے ذرا ساہٹ کر ہو، پریشان ہو جاتی تھی ——— وہ فیصلہ کن انداز میں بولی:

"تم ادھر دیوانخانے میں چلو اور میرے آنے تک وہیں بیٹھے رہو۔ یقیناً تم کوئی ایسا کام کر رہے تھے، جو غیر مناسب ہوگا۔ اور میں اسے جان کر ہی چھوڑوں گی۔ ورنہ تمہاری خیر نہیں۔"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی اور میں دیوانخانے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ داخل ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ لوگوں کی ایک بھیڑ سی وہاں جمع ہو رہی ہے۔ پندرہ کسان! اور ہر شخص کے پاس ایک بندوق۔ میرے بدن میں کپکپی دوڑ گئی۔ میں نے ایک کرسی کو تھام لیا اور اس پر بیٹھ گیا۔ وہ لوگ ایک دائرہ سا بنا کر بیٹھے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ دبی دبی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ تھے تو وہ سب کے سب گھبرائے ہوئے، لیکن ظاہر یوں کر رہے تھے جیسے کوئی خاص بات نہ ہو۔ البتہ ان کی پریشانی مجھ سے چھپی نہ رہی۔ وہ کبھی ہیٹ اتار لیتے۔ کبھی پھر پہن لیتے۔ کبھی سر کھجلاتے، کبھی اس کروٹ بیٹھتے، کبھی اس کروٹ بیٹھتے؛ اور کبھی بٹنوں کو مڑوڑنے لگتے۔ تھا تو میں خود بھی پریشان، لیکن میں نے اس کے باوجود اپنا ہیٹ نہ اُتارا۔

میں چاہ رہا تھا کہ خالہ سیلی آجائے اور میرے ساتھ نمٹ لے اور اگر چاہے تو مجھے پیٹ بھی لے۔ لیکن مجھے جلد از جلد یہاں سے فارغ کر دے تاکہ میں جا کر ٹام کو یہ ساری خبر پہنچا دوں، کہ کس طرح ہماری سکیم ضرورت سے زیادہ کامیاب ہو رہی ہے۔ اور یہ کہ ہم نے خواہ مخواہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال کر یہ آفت مول لے لی ہے۔ لہٰذا اب یہ حماقت ختم کر دی جائے اور پیشتر اس

کے کہ ان لوگوں کے صبر کی حد ہو جائے اور یہ ہمارے اوپر دھاوا بول دیں، ہم جھم کو لے کر یہاں سے نکل بھاگیں۔

خدا خدا کر کے خالہ آگئی اور آتے ہی لگی سوالوں کی بوچھاڑ کرنے۔ لیکن میں ان سوالوں کا سیدھا جواب کیسے دے دیتا؟ میرا ذہن اس قدر الجھا ہوا تھا کہ مجھے تو یہ بھی ہوش نہ تھی "کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ یہ لوگ اب واقعی بے صبر ہوئے جا رہے تھے۔ ان میں سے کچھ ایک تو اس حق میں تھے کہ ابھی سے جا کر ان ڈاکوؤں کی گھات میں بیٹھ جانا چاہیئے۔ ان کا کہنا تھا کہ آدھی رات میں اب صرف چند منٹ ہی تو رہ گئے ہیں۔ لیکن باقی لوگ انہیں سمجھا رہے تھے کہ بھیڑ کے ممیانے کا انتظار کر ہی لینا چاہیئے۔ ادھر خالہ تھی کہ سوالوں پر سوال کئے جا رہی تھی میں تھر تھر کانپ رہا تھا اور خوف کے مارے میرے گھٹنے نیچے ہی نیچے دھنستے چلے جا رہے تھے۔ کمرے کا درجۂ حرارت ہر لحظہ بڑھتا چلا جا رہا تھا اور میرے ہیٹ میں مکھن پگھلنا شروع ہو گیا تھا اور اس کے دھارے میری گردن اور میرے کانوں کے پیچھے بہہ رہے تھے۔ جب میں نے ایک آدمی کو یہ کہتے سنا کہ ابھی سے جا کر کوٹھڑی میں مورچہ لگا لیا جائے تاکہ انہیں آتے ہی پکڑ لیں، تو میری تو جان ہی نکل گئی اور مکھن کا ایک دھارا میرے ماتھے پر سے پھسلتا ہوا بہنے لگا۔ اسے دیکھتے ہی خالہ سیلی کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ بولی:

"ارے! اس بچے کو کیا ہو گیا ہے؟ یقیناً اسے دماغ کا بخار ہو گیا ہے اور اس کا دماغ اب پگھل پگھل کر باہر آنے لگا ہے"!

سب لوگ میری طرف لپکے۔ خالہ نے میرا ہیٹ نوچ کر پھینک دیا اور اس کے ساتھ ہی روٹی اور بچا کھچا مکھن باہر آ پڑا۔ خالہ نے مجھے بھینچ لیا اور سینے سے لگاتے ہوئے بولی:

"تم نے مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ شکر ہے خدا کا' کوئی ایسی ویسی بات نہیں۔ آج کل تو ہمارے اوپر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں۔ ایک کے بعد ایک آفت آن کھڑی ہوتی ہے جب میں نے وہ لکیر بہتی دیکھی تو مجھے فوراً یہی لگا کہ بس اب تم ہاتھ سے گئے۔ اس دھارے کا رنگ بالکل ویسا ہی تھا، جیسا اگر تمہارا دماغ ـــــ میرا لاڈلا۔ میرا لال۔ اگر تم نے پہلے ہی یہ بتا دیا ہوتا کہ تم تہ خانے میں

یہ لینے گئے تھے، تو میں کچھ نہ کہتی۔ اب جاؤ ـــــ اور جاکر سو جاؤ ـــــ بس صبح سے پہلے نیچے نہ آنا۔"

ایک ہی سیکنڈ میں میں نے سیڑھیاں طے کرلیں اور دوسرے ہی لمحے میں جاذبِ برق سے نیچے اتر کر کوٹھری کی طرف دوڑ رہا تھا۔ میں اس قدر گھبرایا ہوا تھا کہ میرے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ تاہم جتنی جلد مجھ سے ہو سکا، میں نے ٹام کو بتایا کہ یہاں سے فوراً نکل جانے میں ہی خیریت ہے اور اب ایک لمحہ بھی ضائع کرنا حماقت ہوگی کیونکہ وہاں گھر میں بہت سارے لوگ جمع ہیں اور ان کے پاس بندوقیں بھی ہیں۔

ٹام کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ بولا:

"اچھا؟ ـــــ واقعی؟ جھوٹ تو نہیں! ـــــ ارے ہک اگر کبھی یہ موقع دوبارہ ملا، تو میں دو سو آدمی اکٹھے کر دکھاؤں گا۔ اور اگر ہم اور انتظار ـــــ"

"جلدی کرو۔ جلدی!" میں نے کہا "جم کہاں ہے؟"

"یہیں تمہارے ساتھ ہی تو کھڑا ہے۔ ایک ہاتھ کے فاصلے پر۔ وہ کپڑے بدل کر بالکل تیار کھڑا ہے۔ بس اب ہم کھسک چلتے ہیں۔ اور ہاں، میں وہ ذرا بھیڑ کے ممیانے ـــــ"

لیکن اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی لوگوں کے قدموں کی دگڑ دگڑ آوازیں آنے لگیں۔ اب وہ باہر کا تالا کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک آدمی کہہ رہا تھا:

"میں نے کہا تھا ناں، ابھی کافی وقت ہے۔ وہ تو ابھی آئے ہی نہیں۔ دروازے کو تالہ لگا ہے۔ اچھا، چند لوگ ادھر کوٹھری کے اندر چھپ جاؤ۔ میں باہر سے تالہ لگا دیتا ہوں۔ تم اندھیرے میں دبکے رہنا اور جونہی وہ آئیں، بندوق داغ دینا ـــــ اور باقی کے لوگ اِدھر اُدھر بکھر جاؤ۔ اور کان کھڑے کرکے ان کے آنے کی آواز سنتے رہو۔"

وہ اندر آگئے۔ لیکن اندھیرے میں انہیں ہماری موجودگی کا علم نہ ہو سکا۔ ہم چارپائی کے نیچے گھس گئے اور ان کے پاؤں تلے کچلتے کچلتے بچے۔ تیزی سے مگر بغیر آواز پیدا کئے ہم سرنگ میں داخل ہو گئے۔ آگے آگے جم، اس کے پیچھے میں، اور سب سے آخر میں ٹام۔ یہ ترتیب ٹام کے حکم کے مطابق ہی تھی۔ ملحقہ جھونپڑی میں پہنچ کر ہم غور سے سننے لگے۔ باہر قدموں کی چاپ برابر سنائی دے رہی تھی۔

ہم رینگ کر دروازے تک گئے۔ ٹام نے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود دراڑ کے ساتھ آنکھ چپکا کر باہر دیکھنے لگا۔ لیکن باہر اس قدر اندھیرا تھا کہ کچھ نظر نہ آرہا تھا۔ وہ سرگوشی میں بولا "میں سنتا رہوں گا۔ جب قدموں کی آواز دور چلی جائے گی تو میں اشارہ کروں گا۔ اور پھر سب سے پہلے جم باہر نکلے گا۔ اور سب سے آخر میں میں" ـــــ اس نے اپنا کان دراڑ کے ساتھ لگا دیا، اور نہ جانے کتنی دیر تک سنتا رہا۔ قدموں کی آواز برابر آتی رہی۔ بالآخر اس نے اشارہ کیا اور ہم چپکے سے باہر نکلے اور سانس روکے، جھکے جھکے، بغیر آواز کیے جنگلے کی طرف بڑھے۔ ہم ایک دوسرے کے پیچھے چل رہے تھے۔ جنگلے تک تو ہم بخیر و عافیت پہنچ گئے۔ پہلے جم جنگلے سے کودا پھر میں۔ لیکن ٹام کی برجس جنگلے کے اوپر لگی لکڑی کی ایک کھپچی میں پھنس گئی۔ اور جب اس نے پیچھے آتے قدموں کی آواز سنی، تو اس نے زور لگا کر اسے چھڑانا چاہا۔ کھپچی تڑاخ سے ٹوٹ گئی، اور ٹام ہماری طرف آگرا۔ ہم بھاگنے لگے ــ فوراً ایک آواز آئی:

"کون ہے؟۔ جواب دو، ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔"

جواب دینے کی بجائے ہم اور تیز تیز بھاگنے لگے۔ وہ لوگ بھی ہمارے پیچھے دوڑے۔ بندوقیں چلنے لگیں، اور گولیاں ہمارے اردگرد سنسنانے لگیں۔

"وہ رہے۔ وہ دریا کی طرف ـــ آؤ ـــ جانے نہ پائیں ـــ کتے کھول دو ـــ"

کئی آوازیں آئیں۔

سارے کا سارا لشکر ہمارے پیچھے دوڑا۔ ان لوگوں نے بوٹ پہنے ہوئے تھے لہذا ان کے قدموں کی آواز ہمیں صاف سنائی دے رہی تھی۔ اور پھر وہ شور بھی بہت مچا رہے تھے۔ اس کے برعکس ہم ننگے پاؤں تھے اور بالکل چپ چاپ، بغیر کوئی آواز پیدا کیے چل رہے تھے۔ ہماری منزل مقصود وہ چکی تھی۔ خیر، جب وہ لوگ بہت قریب آگئے تو ہم جھاڑیوں میں دبک گئے۔ وہ تو آگے نکل گئے اور ہم ان کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ شروع میں کتے باندھ دیئے گئے تھے تاکہ وہ بھونک بھونک کر چوروں کو ڈرا نہ دیں۔ لیکن اب کسی نے انہیں کھول دیا تھا اور وہ شور مچاتے، بھونکتے چلے آرہے تھے۔ لیکن اس سے کیا؟ کتے تھے تو اپنے ہی، اور ہم سے مانوس بھی۔ ہم رک کر ان کا انتظار کرنے

لگے۔ جب قریب آکر انہوں نے ہمیں پہچان لیا تو ہم لوگوں میں ان کی دلچسپی یکسر ختم ہو گئی۔ اور وہ سیدھے اس طرف کو چلے گئے جدھر شور ہو رہا تھا۔ ہم بھی ان کے پیچھے پیچھے دوڑتے ہوئے چکی تک چلے گئے۔ وہاں سے ہم جنگل میں گھس گئے اور اس جگہ جا پہنچے جہاں میری کشتی بندھی تھی کشتی کھول کر ہم اس میں سوار ہو گئے اور دریا کے وسط کا رُخ کیا۔ ہم بہت تیز تیز، مگر نہایت احتیاط سے چپّو چلا رہے تھے، تاکہ آواز پیدا نہ ہو۔ دریا کے وسط میں پہنچ کر ہم نے سُکھ کا سانس لیا اور اس جزیرے کی طرف روانہ ہو گئے جہاں بیڑا بندھا تھا۔ وہ لوگ ابھی تک ساحل پر ایک دوسرے کو زور زور سے آوازیں دے رہے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ شور مدھم ہوتا گیا، حتیٰ کہ آوازیں آنی بالکل بند ہو گئیں۔ بیڑے پر پہنچ کر میں نے کہا:

"جم! اب تم آزاد ہو۔ اور میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اب کسی کی مجال نہیں کہ تمہیں دوبارہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے۔"

"اور ہک! یہ تو واقعی ایک معرکہ رہا ہے کیسی شاندار سکیم تھی! کس کامیابی سے یہ ساری مہم سرانجام دی گئی! کون ہے، جو ایسی شاندار اور ایسی پُرخطر سکیم تیار کر سکے؟"

ہم پھولے نہ سما رہے تھے۔ اور ٹام؟ اس کی خوشی کا تو کچھ ٹھکانہ نہ تھا، اس کی پنڈلی میں گولی جو لگی تھی!۔

اس اطلاع سے ہماری خوشی ایک دم ماند پڑ گئی۔ اسے بہت درد ہو رہا تھا، اور خون بھی بہہ رہا تھا۔ ہم نے اسے بیڑے پر بنی جھونپڑی کے اندر لٹا دیا اور ڈیوک کی قمیص پھاڑ کر پٹی بنائی۔ لیکن ٹام بولا:

"یہ پٹیاں مجھے دے دو۔ میں خود باندھ لوں گا۔ بس اب وقت ضائع مت کرو۔ رُکو مت۔ ہمارا فرار بہت شاندار طریقے سے کامیاب ہوا ہے۔ بس اب چپّو پکڑو، اور بیڑا کھول دو۔ ہم نے بہت شاندار کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ واقعی بہت شاندار! کاش ہمیں لوئی شش دہم کو چھڑانے کا موقع ملا ہوتا۔ تب اس کی سوانح عمری میں یہ نہ لکھا ہوتا: 'سینٹ لوئی کا بیٹا، جو خدا کے گھر پہنچ گیا'۔۔۔۔ جی نہیں۔ ہم تو سرحد پار کرا دیتے۔ اسے واقعی بچا لیتے۔ اور اس ساری مہم

کو نہایت شاندار طریقے سے نبھاتے ـــ خیر، چلو۔ چپو پکڑو ـــ جلدی کرو ـــ"

لیکن میں اور جم آپس میں کچھ صلاح کر رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اب کیا کیا جائے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے کہا:

"جم!۔ بولو، تمہاری کیا صلاح ہے؟"

جم بولا: "ہک! میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ اگر ہم ٹام کو قید سے چھڑا رہے ہوتے، اور اس مہم میں کسی لڑکے کو گولی لگ جاتی، تو کیا ٹام یہ کہتا: پہلے مجھے بچاؤ، اس کے لئے ڈاکٹر بعد میں بلانا ـــ کیوں؟ کہتا ٹام سائر یہ بات؟ ٹام سائر کے دل میں ایسا خیال آتا؟۔ جی نہیں۔ وہ یہ بات ہرگز نہ کہتا ـــ تو پھر؟ کیا جم یہ بات کہے گا؟ ـــ نہیں صاحب، ہرگز نہیں۔ میں اس وقت تک یہاں سے ایک قدم آگے نہیں بڑھوں گا، جب تک کہ ڈاکٹر نہیں پہنچ جاتا۔ خواہ اس کے لئے مجھے چالیس برس انتظار ہی کیوں نہ کرنا پڑے!"

مجھے تو شروع سے ہی یقین تھا کہ جم کا ظرف گوروں جیسا ہے۔ اور مجھے علم تھا کہ وہ یہی کچھ کہے گا۔ بس اب پروگرام طے ہو گیا تھا۔ جب میں نے ٹام کو بتایا کہ میں ڈاکٹر لینے جا رہا ہوں، تو اس نے سخت اعتراض کیا۔ لیکن میں اور جم اپنے فیصلے پر اڑے رہے، اور اس کی باتوں سے بالکل مرعوب نہ ہوئے۔ تنگ آ کر اس نے ہمیں یہ دھمکی دے ڈالی کہ وہ خود رینگ کر ساحل پر چلا جائے گا، اور بیڑا کھول دے گا۔ لیکن ہم نے اسے پکڑے رکھا۔ اس پر اس نے ہمیں بہت سخت سست کہا ـــ لیکن سب بے سود۔

بالآخر جب اس نے دیکھا کہ میں جانے کے لئے کشتی تیار کر رہا ہوں، تو وہ بولا:

"اگر تم نہیں مانتے تو پھر یوں کرنا کہ گاؤں میں جا کر میری ہدایت پر چلنا۔ ڈاکٹر کے گھر میں داخل ہو کر پہلے تو دروازہ بند کر لینا؛ اور پھر اس کی آنکھوں پر کس کر پٹی باندھ دینا۔ پھر اس سے قسم لینا کہ وہ اس واقعے کے بارے میں ایک لفظ بھی اپنے منہ سے نہیں نکالے گا۔ اس کے ہاتھ میں سونے کے سکوں کی ایک تھیلی دے دینا اور اسے اندھیرے میں ادھر ادھر کی گلیوں میں سے گھما پھرا کر کشتی تک لے آنا اور پھر یہاں پہنچ جانا۔ لیکن کشتی کو سیدھا مت لانا۔ بلکہ

جزیروں کے اِدھر اُدھر چکر کاٹتے ہوئے آنا۔ اور ہاں ۔ ڈاکٹر کی تلاشی لینا نہ بھولنا۔ اور اگر اس کے پاس کوئی چاک وغیرہ ہو تو اسے چھین لینا اور تب تک واپس نہ کرنا، جب تک وہ گاؤں واپس نہ پہنچ جائے۔ ورنہ وہ اس بیڑے پر کوئی ایسا نشان بنادے گا، جس سے وہ بعد میں اسے بآسانی ڈھونڈ سکے۔ یہ لوگ ایسا ہی کیا کرتے ہیں ۔"

میں نے وعدہ کیا کہ اس کی ہدایتوں پر عمل کروں گا۔ اس کے بعد میں کشتی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ یہ فیصلہ بھی کر لیا گیا تھا کہ جب جم ڈاکٹر کو آتا دیکھے، تو فوراً جنگل میں جا چھپے۔ اور جتنی دیر ڈاکٹر یہاں رہے، وہ بالکل سامنے نہ آئے۔

۱۴۔ ڈاکٹر ۔ خالو سلاس ۔ بہن ہاچ کس ۔ خالہ سیلی کا غم

ڈاکٹر ایک بزرگ سا آدمی تھا۔ میں نے جا کر اسے جگایا۔ میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ وہ بہت ہی رحمدل اور شریف ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اور میرا بھائی کل سہ پہر کو ایک جزیرے پر شکار کھیل رہے تھے۔ رات کو ہم ایک بیڑے پر سو گئے، جو ہمیں وہیں کہیں مل گیا تھا۔ آدھی رات کے قریب اُس نے خواب میں بندوق کو ٹھوکر ماردی۔ بندوق چل گئی اور گولی اس کی ٹانگ میں آ لگی۔" اور اب میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ میرے ساتھ چل کر زخم کا علاج کریں ۔ آپ کسی سے اس کا ذکر نہ کریں، اور نہ ہی کسی دوسرے شخص کو اس واقعے کا علم ہو۔ دراصل ہم یہ چاہتے ہیں کہ آج شام اچانک گھر پہنچ کر گھر والوں کو چونکا دیں۔"

"گھر والے کون؟"

"فیلپس ۔ وہ وہاں اُدھر رہتے ہیں۔"

"اوہ! ۔" وہ بولا۔ اور پھر ایک ہی منٹ بعد کہنے لگا: "کیا بتایا تھا، تم نے؟ ۔ کیسے لگی تھی گولی؟"

"اس نے کوئی خواب دیکھا تھا۔" میں نے کہا "اور اسے گولی لگ گئی۔"

"بڑا عجیب و غریب خواب ہے"۔ وہ بولا۔

اس نے لالٹین جلائی اور اپنا تھیلہ لے لیا۔ ہم چل پڑے۔ لیکن جب اس نے کشتی کو دیکھا، تو اسے کچھ تامل ہوا۔ بولا:

"یہ کشتی ایک آدمی کے لئے تو ٹھیک ہے، لیکن دو آدمیوں کا بوجھ ــــ شائد برداشت نہ کر سکے"۔ ــــ میں نے جواب دیا: "نہیں جناب۔ آپ گھبرایئے نہیں۔ اس نے ہم تینوں کا بوجھ اٹھایا ہے"۔

"کون سے تین؟"

"یہی۔ میں اور سِڈ اور ــــ اور ــــ بندوقیں۔ میرا مطلب یہی تھا"۔

"اوہ"۔ وہ بولا۔

وہ کشتی میں پیر رکھ کر اسے ہلا کر دیکھنے لگا۔ اور پھر سر ہلا کر بولا: "اوں ہونہہ۔ میں کوئی بڑی سی کشتی دیکھتا ہوں"۔ لیکن سب کشتیاں بندھی ہوئی تھیں، اور ان میں تالے لگے تھے۔ بالآخر وہ میری کشتی میں سوار ہو گیا اور بولا: "تم یہیں انتظار کرتے رہنا ــــ یا ــــ یا ــــ ادھر ادھر دیکھو شائد کوئی کشتی مل جائے۔ ورنہ گھر چلے جاؤ اور انہیں اس اچانک صدمے کے لئے تیار کرو"۔ میں نے گھر جانے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد میں نے اسے بتایا کہ بیڑا کہاں ہو گا۔ وہ روانہ ہو گیا اس کے جاتے ہی مجھے ایک خیال سوجھا۔ میں نے سوچا، فرض کیا کہ ٹام کی ٹانگ جلد اچھی نہیں ہوتی اور اسے تین چار دن لگ جاتے ہیں۔ تب ہم کیا کریں گے؟ کیا ہم وہیں جنگل میں بیٹھے انتظار کرتے رہیں تاوقتیکہ ڈاکٹر بھانڈا نہ پھوڑ دے؟ ــــ نہیں صاحب۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں یہیں انتظار کروں گا اور جب ڈاکٹر واپس آئے گا تو اس سے صورت احوال پوچھوں گا۔ اگر اس نے کہا کہ اسے پھر جانا پڑے گا، تو میں بھی وہاں کسی نہ کسی طرح ضرور پہنچ جاؤں گا خواہ مجھے تیر کر ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ وہاں ہم ڈاکٹر کو پکڑ کر باندھ دیں گے اور بیڑے کو دریا میں لے جائیں گے اور ڈاکٹر کو تب تک نہیں جانے دیں گے، جب تک کہ ٹام تندرست نہیں ہو جاتا۔ اس کے بعد ہم اسے اس کی فیس دے کر رخصت کر دیں گے۔

میں لکڑیوں کے ایک ڈھیر پر چڑھ گیا تاکہ کچھ دیر سو لوں۔ لیکن جب میں جاگا، تو دن نکلے دیر ہو چکی تھی۔ میں ڈاکٹر کے گھر کی طرف دوڑا۔ لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ تو رات کا گیا ہوا ہے اور ابھی تک واپس نہیں آیا۔ میں نے سوچا اس کا مطلب یہ ہوا کہ ٹام کی حالت کافی خراب ہے۔ میں وہاں سے بھاگا لیکن موڑ کاٹتے ہی میرا سامنا خالو سلاس سے ہو گیا۔ میری اور اس کی ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔ وہ بولا:

"ارے ٹام! تم اتنی دیر کہاں رہے؟ بدمعاش!"

"کہیں نہیں —" میں نے جواب دیا۔ "ہم تو اس بھگوڑے حبشی کی کھوج کر رہے تھے۔ میں اور سڈ۔"

"لیکن — تم گئے کہاں تھے؟" وہ بولا۔ "تمہاری خالہ بہت پریشان ہے۔"

"پریشان ہونے کی تو کوئی ضرورت نہیں تھی۔" میں نے جواب دیا۔ "ہم بالکل خیریت سے ہیں۔ ہم بھی آدمیوں اور کتوں کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔ لیکن وہ بہت آگے نکل گئے۔ پھر ہمیں ایسا لگا جیسے دریا پار سے ان کی آواز آ رہی ہو۔ ہم نے کشتی لی اور ان کے پیچھے چل پڑے ہم دریا پار بھی چلے گئے مگر وہ لوگ ہمیں کہیں نظر نہ آئے۔ ہم نے کشتی کا رخ واپس دریا کے منبع کی طرف موڑ دیا۔ چلتے چلتے جب ہم تھک گئے تو ایک جگہ کشتی کو باندھ کر سو گئے۔ ابھی ایک گھنٹہ ہوا جب ہماری آنکھ کھلی تھی۔ اور ہم کشتی میں بیٹھ کر یہاں آ گئے، تاکہ دیکھیں کہ حالات کیا ہے۔ سڈ ادھر ڈاکخانے میں کھڑا ہے، اور اس انتظار میں ہے کہ شائد کوئی خبر مل جائے۔ اور میں اس لئے ادھر آیا تھا کہ کھانے کا کچھ سامان لے لیں۔ اس کے بعد ہمیں گھر ہی تو آنا تھا۔"

ہم ڈاکخانے کی طرف چل پڑے تاکہ سڈ کو بھی ساتھ لے لیں۔ لیکن مجھے تو علم تھا ہی کہ وہ وہاں نہیں ہے۔ ظاہر ہے وہ ہمیں نہیں ملا۔ خالو نے اپنا خط وصول کیا۔ اور ہم تھوڑی دیر اور انتظار کرتے رہے۔ مگر سڈ نہ آیا۔ لہذا خالو بولا: "آؤ چلیں اسے سیر سے تھک ہار کر وہ پیدل ہی گھر آ جائے گا — اور — یا پھر کشتی کھے کر آ جائے گا — آؤ ہم گھوڑے پر چلتے ہیں۔" میں نے بہتیری کوشش کی کہ میں یہیں ٹھہر کر سڈ کا انتظار کر لوں، مگر وہ نہ مانا۔ اور کہنے لگا:

"کیا فائدہ؟ — تم میرے ساتھ چلے آؤ۔ کم از کم خالہ کو یہ تو پتہ چلے کہ تم خیریت سے ہو۔"

جب ہم گھر پہنچے، تو خالہ مجھے دیکھ کر اتنی خوش ہوئی کہ کبھی تو وہ رونے لگ جاتی، کبھی ہنسنے۔ اس نے مجھے سینے سے لگا لیا اور پیار سے مارنے لگی۔ بھلا یہ کوئی مار تھی؟ — اور پھر کہنے لگی: "بڈھے کو آ لینے دو۔ اسے بھی خوب ماروں گی۔"

مکان کے اندر بہت سارے کسان اور ان کی بیویاں جمع تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ لوگ کسی دعوت میں آئے ہوں۔ اتنا شور تھا کہ کان پھٹے جاتے تھے۔ بوڑھی مسز ہاچ کس تو بہت ہی باتونی تھی۔ اس کی زبان ہر وقت قینچی کی طرح چلتی رہتی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی:

"اری — بہن فیلپس! — میں نے اس کوٹھڑی کی اچھی طرح چھان بین کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ حبشی ذرا پگلا تھا۔ میں نے بہن ڈیمرل سے بھی یہی کہا ہے۔ کہا ہے ناں ڈیمرل! میں نے کہا تھا کہ وہ بالکل پگلا ہوگا۔ ہاں ہاں، بالکل یہی الفاظ تھے میرے! تم سب نے سنا تھا ناں؟ میں نے کہا وہ پگلا ہوگا۔ میں نے کہا اس کی ہر حرکت سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔ میں نے کہا ذرا اس چکی کے پاٹ کو تو دیکھو۔ میں نے کہا بھلا کوئی شخص جس کے ہوش و حواس درست ہوں، یہ تمام باتیں اس پاٹ پر لکھے گا؟ یعنی — یہاں فلاں فلاں آدمی کا دل ٹوٹا۔ یہاں فلاں فلاں آدمی سینتیس برس تک ایڑیاں رگڑتا رہا۔ اور ایسی ہی فضولیات! یعنی لوئیس — خدا جانے کونسا لوئیس! — کا حقیقی بیٹا — بس اسی قسم کی بکواس! میں نے کہا وہ بالکل پگلا تھا۔ میں نے پہلے بھی یہی کہا تھا، پھر بھی یہی۔ اور اب آخر میں بھی یہی کہتی ہوں۔ وہ حبشی بالکل پاگل تھا۔ میں نے کہا نیبو کوڈ نیزر کی طرح پگلا —"

"اور بہن ہاچ کس! ذرا کپڑے کی بنی اس رسی کو تو دیکھو۔" بوڑھی مسز ڈیمرل بولی "بھلا اس سے اسے کیا —؟"

"بس ابھی ایک منٹ ہوا، میں بہن اٹربیک سے یہی ذکر کر رہی تھی۔ بے شک اس سے پوچھ لو۔ جب اس نے کہا، ذرا اس سیڑھی کو تو دیکھو — تو میں نے جواب دیا: بھلا اس کا اسے کیا کرنا تھا؟ ہاں بہن ہاچ کس! —"

"لیکن وہ یہ پاٹ اٹھا کیسے لائے؟ ــــ اور وہ سرنگ کس نے کھودی؟ اور کس نے ــــ؟"

"ہاں بھائی پین راڈ! بالکل وہی بات جو میں نے کہی تھی ــــ ہاں، ذرا وہ چینی کی پلیٹ ادھر سرکانا ــــ تو میں کہہ رہی تھی کہ میں ابھی ابھی بہن ڈنلیپ سے یہی ذکر کر رہی تھی کہ وہ اس پاٹ کو کیسے لائے ہوں گے - اور یاد رہے وہ بھی بغیر کسی امداد کے - ہاں - بغیر امداد کے! ــــ یہ تو صاف ظاہر ہے - میں نے کہا تھا: کون کہتا ہے کہ اسے امداد نہیں ملی تھی؟ ــــ اس کے تو بہت سے مددگار تھے - میں نے کہا کم از کم درجن مددگار رہوں گے - میں یہاں کے ہر حبشی کی کھال کھچوا دوں گی - میں نے کہا میں یہ پتہ لگا کر چھوڑوں گی کہ یہ کرتوت کس کی ہے ــــ اور پھر ــــ"

"کیا کہا؟ ایک درجن! جو کام یہاں ہوا ہے، اس کے لئے تو چالیس آدمی بھی کم ہوں گے - ذرا ان آروں کو اور ان چیزوں کو دیکھو - کس قدر دشوار کام تھا! اور یہ پایہ دیکھو جو انھوں نے چیرا ہے! - کم از کم اسے چیرنے میں ایک ہفتہ لگ گیا ہوگا، اور چھ آریاں استعمال ہوئی ہوں گی - اور ذرا وہ بھوسے کا حبشی دیکھو جو بستر پر سویا ہے ــــ ذرا ــــ"

"بھائی ہائی کا ور! ــــ تم کچھ بھی کہو - یہی بات میں بھائی فیلپس سے کہہ رہی تھی - ہاں ہاں، خود اسی سے - بہن ہاچ کس کیا خیال ہے تمہارا؟ میں نے کہا بھائی فیلپس، ذرا اس پایے کو دیکھو کہ یہ کس طریقے سے چیرا گیا ہے - میں نے کہا ذرا دیکھو تو، یہ خود بخود تو چیرا نہیں گیا - میں نے کہا کسی نے چیرا ہی ہوگا ناں، - میری رائے تو یہ ہے مانو، چاہے نہ مانو - میری ناقص رائے تو یہ ہے - میں نے کہا میرا خیال تو یہ ہے - اگر کوئی بہتر قیاس لگا سکتا ہے، تو لگا لے - میں نے بہن ڈنلیپ سے کہا ــــ"

"ارے! جتنا کام وہاں ہوا ہے بہن فیلپس! اسے دیکھ کر تو یہی کہنا پڑتا ہے کہ حبشیوں کی پوری فوج چار ہفتے تک ہر رات کام کرتی رہی ہوگی - اس قمیص کو دیکھو - اس کے ایک ایک انچ پر خون کی سیاہی سے کسی خفیہ افریقی زبان میں خدا جانے کیا لکھا ہے - وہ لوگ بڑا ابھر کر یہاں آتے ہوں گے - اگر کوئی مجھے یہ پڑھ کر سنا دے تو میں اسے دو ڈالر دوں ــــ اور اگر مجھے وہ حبشی مل جائے جس نے یہ لکھا ہے تو میں اسے

چابک مار مار کر ——"

"بھائی مارلیز! کیا کہا؟ — اس کے مددگار — اگر آپ کچھ روز پہلے اس گھر میں ہوتے، تو آپ کو واقعی اس بات کا یقین ہو جاتا۔ ہر وہ شے جو ان کے ہاتھ لگی، اڑا لی گئی۔ اور تعجب یہ کہ سب کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہوا۔ یہ قمیص تار پر سے اڑائی گئی تھی۔ اور وہ چادر جس کی سیڑھی بنی ہے، خدا جانے کتنی بار چوری ہوئی، اور کتنی بار واپس آئی۔ اور پھر اس کے علاوہ آٹا، اور موم بتیاں، اور شمعدان، اور چمچ، اور پرات، اور ہزاروں دوسری چیزیں جن کے نام میں بھول چکی ہوں۔ اور میرا اپنا پھولدار لباس۔ اور طرہ یہ کہ میں، اور سلاس، اور میرا سام اور سِڈ، سب کے سب رات دن پہرہ دیتے رہتے تھے۔ اور جیسا میں نے کہا، کسی کو ان کا بال بھی ہاتھ نہ آیا۔ نہ کسی کو ان کی آواز سنائی دی، نہ صورت دکھائی دی۔ اور بالآخر وہ ٹھیک ہماری ناک کے نیچے سے، اور ہمیں بدھو بنا کر — ہمیں ہی کیا، قبائلی علاقہ کے ڈاکوؤں کو بھی بدھو بنا کر — اس حبشی کو لے اڑے۔ اور کوئی ان کا بال بیکا بھی نہ کر سکا۔ حالانکہ سولہ آدمی اور بائیس کتے ان کا تعاقب کرتے رہے۔ ایسا اچنبھا میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ یہ تو بھوتوں سے بھی زیادہ ہوشیار نکلے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ وہ ہوں گے ہی بھوت۔ تم لوگ ہمارے کتوں سے تو واقف ہو ہی۔ ان سے بہتر کتے آپ کو اور کہاں ملیں گے؟ لیکن یہ کتے بھی ان کا سراغ ڈھونڈنے میں ناکام رہے۔ ذرا مجھے اتنی سی بات سمجھا دو۔ یعنی — یہ۔ یہ کیونکر ممکن ہوا — کوئی سمجھاؤ تو ——"

"ہاں، یہ تو واقعی تعجب ——"

"خدایا! میں نے تو ——"

"ارے —— میں تو ——"

"چور بھی اور ——"

"اوہ خدا! —— میں تو ایسی جگہ ——"

"ایسی جگہ رہنا! مجھے تو اس قدر خوف آتا تھا کہ رات رات بھر میں سو نہیں سکتی تھی۔

سنو بہن رج دے! نہ میں سو سکتی تھی، نہ اُٹھ کر بیٹھنے کی ہمت ہوتی تھی۔ وہ تو کسی کو بھی چڑا کر — تم اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ کل آدھی رات کے وقت میری کیا حالت ہوئی۔ مجھے تو یہی ڈر رہتا تھا کہ کہیں وہ گھر کے کسی فرد ہی کو نہ لے جائیں۔ میری تو مارے خوف کے عقل ہی کام نہیں کرتی تھی۔ ہاں، اب دن کو جب مجھے وہ بات یاد آتی ہے، تو حماقت لگتی ہے۔ لیکن رات کو تو میں یہی فکر کھاتی رہی کہ میرے دو بچے اوپر کمرے میں اکیلے سوئے پڑے ہیں۔ میں اس قدر پریشان تھی کہ میں نے چپکے سے جا کر ان کے کمرے کو باہر سے تالہ لگا دیا۔ ہاں ہاں، واقعی! — میری جگہ کوئی اور ہوتا، تو وہ بھی یہی کرتا۔ کیونکہ دیکھو ناں، جب آپ اس قدر خوف زدہ ہوں اور ہر لحظہ آپ کا خوف بڑھتا ہی چلا جائے، اور عقل مفلوج ہو جائے، تو آپ واقعی عجیب عجیب حماقتیں کرنے لگیں گے۔ اور پھر آپ کو یہ خیال آئے گا کہ اگر میں لڑکا ہوتا، اور وہاں اوپر کمرے میں سویا ہوتا، اور دروازہ کھلا ہوتا، اور ——" وہ رُک گئی اور حیرت زدہ سی ہو کر دیکھنے لگی، پھر اس نے سر گھما کر آہستہ سے اِدھر اُدھر دیکھا اور جب اس کی نگاہ مجھ پر پڑی تو میں اٹھ کھڑا ہوا، اور اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

میرا خیال تھا کہ اگر میں ٹہل کر ذرا اس مسئلے پر غور کر لوں، تو شاید اس کمرے سے اپنی عدم موجودگی کا کوئی بہانہ ہاتھ آ جائے۔ میں ان کے قریب ہی ٹہلتا رہا کیونکہ دور جانے کی ہمت نہ پڑی۔ کیونکہ مجھے علم تھا کہ اگر میں ذرا بھی پرے گیا، تو وہ یقیناً مجھے پکارے گی۔ خیر، جب دن ڈھل گیا اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تو میں نے آ کر خالہ کو یہ بتایا کہ گولیاں چلنے کی آواز اور لوگوں کے شور کو سن کر ہماری آنکھ کھل گئی تھی۔ چونکہ دروازہ بند تھا اور میں اور سِڈ یہ تماشہ دیکھنے کے مشتاق تھے، لہذا ہم جاذب برق کے راستے نیچے اُتر آئے۔ ہمیں کچھ چوٹ بھی آئی تھی۔ اب ہم کبھی اس راستے سے نہیں اتریں گے۔ اور پھر میں اسے وہ سب کچھ کہہ سنایا، جو اس سے پیشتر میں خالو سلاس کو سنا چکا تھا۔ خالہ بولی: "میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے اور اب مجھے تم پر کوئی غصہ

نہیں۔ لڑکے بالے تو ایسا کرتے ہی رہتے ہیں۔ لڑکے شرارتی جو ہوئے۔" اور چونکہ کوئی نقصان نہیں ہوا تھا، اس لئے اس نے خدا کا شکر کیا کہ ہم زندہ ہیں، اور خیریت سے ہیں، اور اس کے پاس ہی ہیں۔ جو ہو گیا، سو ہو گیا۔ اس کے لئے پریشان ہونے سے فائدہ؟ — یہ کہکر اس نے میرا منہ چوم لیا اور میرے سر کو تھپتھپاتے ہوئے کسی گہری سوچ میں غرق ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ چونک کر کھڑی ہو گئی اور بولی: "ارے! رات ہونے کو آئی، اور سیڈ ابھی تک نہیں لوٹا۔ اس لڑکے کو ہو کیا گیا ہے"؟

میں نے موقع غنیمت جانا اور کہا: "میں ابھی شہر جا کر اسے لے آؤں"؟

"نہیں، تم مت جاؤ۔" وہ بولی: "تم یہیں ٹھہرو۔ ایک وقت میں ایک ہی کا غائب ہونا میرے لئے کافی ہے۔ اگر وہ کھانے کے وقت تک نہ پہنچا، تو تمہارا خالو اسے لینے چلا جائے گا"

وہ کھانے پر بھی نہ پہنچا۔ لہذا کھانا ختم ہوتے ہی خالو شہر چلا گیا۔

تقریباً دس بجے وہ واپس آیا۔ وہ بہت گھبرایا گھبرایا سا تھا۔ اسے ٹام کی کچھ خبر نہ ملی تھی۔ خالہ سیلی بھی بہت فکر مند تھی۔ لیکن خالو سلاس نے اسے دلاسہ دیا کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لڑکے تو ہوتے ہی ایسے ہیں۔ یہ لڑکا بھی صبح تک بخیر و عافیت واپس آ جائے گا — خالہ بیچاری کو مطمئن ہونا ہی پڑا۔ تاہم وہ بولی کہ وہ تھوڑی دیر اور انتظار کرے گی اور روشنی جلتی رکھے گی تاکہ اسے دور سے مکان کا پتہ چل جائے۔

اور جب میں اپنے سونے کے کمرے میں جانے لگا، تو وہ موم بتی لے کر میرے ساتھ ساتھ آئی اور مجھے بستر میں سلا کر لاڈ کرنے لگی۔ اس کی شفقت کو دیکھ کر مجھے اپنی کمینگی پر ازحد افسوس ہوا۔ میری اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اس کی آنکھ سے آنکھ ملاؤں۔ وہ بستر پر بیٹھ گئی اور بہت دیر تک باتیں کرتی رہی۔ اس کی باتوں کا موضوع ایک ہی تھا۔ یعنی سیڈ کتنا اچھا لڑکا ہے۔ وہ صرف اسی کی تعریف کرتی رہی۔ گاہے گاہے وہ مجھ سے پوچھ لیتی: کیا خیال ہے تمہارا؟ — کہیں وہ راستہ تو نہیں بھول گیا ہو گا؟ — یا شائد اسے چوٹ آ گئی ہو؟ — کہیں وہ پانی میں تو نہیں ڈوب گیا؟ — یا شائد اسے بخار آ گیا ہو، اور وہ وہیں کہیں پڑا ہو — ؟ یا مر گیا ہو —

کاش میں اس کے پاس ہوتی، اور اس کی خدمت کر سکتی" ـــــ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور بھرے ہوئے ہوئے اس کے گالوں پر پھسلنے لگے۔ میں اسے دلاسا دیتا کہ سنڈ بالکل خیریت سے ہے، اور صبح ہوتے ہی گھر پہنچ جائے گا۔ یہ سُن کر وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیتی اور میرا منہ چوم لیتی اور کہتی "کیا کہا؟ ـــ پھر کہو" اور میں بار بار یہی بات دُہراتا رہتا کیونکہ اسے سُن کر اسے کچھ چین ملتا تھا۔ وہ واقعی بہت دکھی تھی ـــــ بالآخر جب رہ جانے لگی، تو اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آہستہ سے کہا:

"ٹام! آج رات دروازہ بند نہیں کیا جائے گا ـــ کھڑکی بھی کھلی رہے گی۔ اور جاذبِ برق بھی باہر لگی ہے۔ لیکن تم تو نیک لڑکے ہو نا، نیک ہی بنے رہنا۔ جاؤ گے تو نہیں؟ ـــ میری خاطر ـــــ"

خدا جانتا ہے کہ میرا کتنا جی چاہتا تھا کہ جا کر ٹام کو دیکھوں۔ ویسے میرا ارادہ تھا بھی یہی کہ رات کو اس کے پاس چلا جاؤں گا۔ لیکن خالہ کے ان الفاظ کے بعد میرے پاؤں اس طرف نہ اٹھ سکے۔ اگر کوئی شخص مجھے تمام دنیا کی بادشاہت بھی دے دیتا، تو بھی میں وہاں سے باہر نہ نکلتا ـــــ

لیکن میں ٹھیک طرح سے سو نہ سکا۔ ساری رات مجھے خالہ اور ٹام کا ذکر لگا رہا ہے۔ دو بار میں جاذبِ برق کے راستے نیچے اترا بھی، اور چپکے سے جنگلے کے اوپر سے ہوتا ہوا سامنے کے دروازے تک چلا گیا۔ وہ وہیں بیٹھی تھی۔ اس کی کھڑکی میں موم بتی جل رہی تھی اور اس کی آنکھیں سڑک پر جمی تھیں۔ ان سے آنسو بہہ رہے تھے۔ کاش میں اس کی مدد کر سکتا! لیکن میرے بس میں تھا کیا؟ اس کے سوا کہ میں یہ قسم کھا لوں کہ آئندہ ایسی کوئی حرکت نہیں کروں گا جس سے اسے دکھ پہنچے ـــــ تیسری بار جب میری آنکھ پھر کھلی، تو پو پھٹ رہی تھی۔ میں نیچے اتر آیا۔ وہ ابھی تک وہیں بیٹھی تھی۔ موم بتی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ اس کا سفید سر اس کے ہاتھوں پر ٹکا تھا ـــ اور وہ سو گئی تھی۔

۴۲- زخمی ٹام سائر- ڈاکٹر کی داستان- ٹام کا اقبال جرم- خالہ پولی کی آمد- نکالو وہ خط!

خالو سلاس ناشتے سے پہلے ہی شہر ہو آیا تھا- لیکن اُسے ٹام کا کچھ اتا پتہ نہ ملا- وہ دونوں میز پر بیٹھے تھے ــــ خاموش، غمگین، اپنے خیالوں میں مستغرق- ان کی کافی ٹھنڈی ہوئی جا رہی تھی- ان کا ناشتہ ویسے کا ویسا ہی پڑا تھا- کچھ دیر بعد وہ بولا:

"میں نے تمہیں وہ خط دے دیا تھا؟"

"کون سا خط؟"

"وہی جو کل میں ڈاکخانے سے لایا تھا"

"نہیں تو ــــ مجھے تو کوئی خط نہیں دیا"

"تو پھر میں بھول گیا ہوں گا"

وہ جیبیں ٹٹولنے لگا، اور پھر اُٹھ کر ادھر چلا گیا، جہاں اس کے خیال میں اس نے وہ خط رکھ دیا ہو گا- تھوڑی دیر بعد اس نے وہ خط لا کر خالو کو دے دیا- وہ بولی:

"یہ تو سینٹ پیٹرسبرگ سے آیا ہے- دیدی کا ہے"

میں نے ارادہ کیا کہ اگر تھوڑا سا ٹہل لیا جائے، تو بہتر ہو گا- لیکن میری ہمّت نہ ہوئی کہ وہاں سے ہلوں- ابھی خالہ نے لفافہ کھولا ہی تھا کہ اس کی نظر کسی چیز پر پڑی اور وہ خط کو وہیں چھوڑ دوڑتی ہوئی ادھر چلی گئی- میں بھی بھاگا- یہ ٹام سائر تھا جو ایک گدّے پر لیٹا تھا- اس کے ساتھ وہی بوڑھا ڈاکٹر تھا اور جم- جم نے خالہ کا پھولدار لباس پہن رکھا تھا- اس کے ہاتھ پیٹھ پیچھے بندھے تھے- ان کے ساتھ اور بھی بہت سے لوگ تھے- میں نے وہ خط اٹھا لیا اور جو بھی شے سامنے نظر آئی، اسی کے پیچھے چھپا کر ان کی طرف لپکا- خالہ ٹام کے اوپر گر گئی اور روتی ہوئی بولی:

"اوہ!- یہ تو مر چکا ہے- مجھے پتہ ہے، یہ مر چکا ہے"

ٹام نے اپنے سر کو ذرا سا موڑ کر منہ ہی منہ میں ہونٹ سے کچھ بڑبڑایا۔ اس کا دماغ صحیح حالت میں نہیں تھا۔ خالہ نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور کہنے لگی:

"شکر ہے خدایا تیرا۔ یہ زندہ ہے۔ میرے لئے یہی بہت ہے۔" اور یہ کہہ اُس نے ٹام کا منہ چوم لیا اور مکان کے اندر بھاگ گئی تاکہ ٹام کے لئے بستر لگا دے۔ راستے میں وہ ہر شخص کو، خواہ وہ حبشی تھا یا گورا، حکم پر حکم دیتی چلی گئی۔

میں آدمیوں کے پیچھے چلا گیا تاکہ دیکھوں کہ وہ لوگ جم کا کیا حشر کرتے ہیں۔ بوڑھا ڈاکٹر اور خالو سلاس ٹام کے ساتھ گھر کے اندر چلے گئے۔ ہجوم بہت مشتعل تھا۔ اور ان کا ارادہ تھا کہ جم کو فوراً پھانسی پر لٹکا دیا جائے تاکہ ارد گرد کے سب حبشیوں کو عبرت ہو، اور وہ کبھی جم کی طرح بھاگنے کی کوشش نہ کریں۔ نہ آئندہ کوئی ایسا بکھیڑا کھڑا ہو جس سے کسی کنبے کو یوں کئی کئی دن اور کئی کئی راتیں خوف میں کاٹنی پڑیں۔ لیکن چند لوگوں کی رائے اس کے خلاف تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے کچھ مقصد حل نہ ہوگا۔ جم اس علاقے کا غلام تو تھا نہیں، لہٰذا اگر اس کا آقا آ گیا، اور اس نے معاوضہ مانگ لیا تو ــــ؟ یہ دلیل سُن کر وہ لوگ جو پھانسی کے حق میں تھے، ٹھنڈے پڑ گئے۔ دراصل دنیا کا دستور یہ ہے کہ وہ لوگ جو کسی حبشی کو اس کے کسی جرم کی پاداش میں پھانسی کی سزا دینے کے لئے بے تاب ہوتے ہیں، عموماً اپنی من مرضی کر لینے کے بعد معاوضے کے نام ہی سے گھبراتے ہیں۔

خیر، انہوں نے جم کو خوب جی بھر کے گالیاں دیں اور اس کے سر پر دو ایک مکے بھی مارے۔ جم بالکل خاموش کھڑا یہ سب کچھ سہتا رہا۔ اس نے یہ بھی ظاہر نہ کیا کہ وہ مجھے جانتا ہے۔ اس کے بعد ہجوم اسے پکڑ کر اسی کوٹھڑی میں لے گیا اور وہاں جا کر اس کو وہی پرانے کپڑے پہنا دیئے۔ اور دوبارہ زنجیر سے باندھ دیا۔ لیکن اب کی بار زنجیر انہوں نے چارپائی کے پائے سے نہ باندھی، بلکہ شہتیر میں لگے ایک بڑے سے کنڈے میں باندھ دی۔ انہوں نے اسے ہتھکڑی پہنا دی اور دونوں ٹانگیں باندھ دیں۔ طے یہ پایا کہ اسے تب تک سوکھی روٹی اور پانی کے سوا اور کچھ نہ دیا جائے جب تک کہ اس کا آقا نہیں آ جاتا، یا اس کی نیلامی نہیں ہو جاتی۔ (اگر اس کا آقا ایک مقررہ وقت تک نہ آتا، تو اس کی نیلامی کر دی جاتی)۔ سرنگ بھر دی گئی اور دو کسانوں کے ذمے یہ کام لگایا

گیا کہ وہ ہر رات بندوق لے کر کوٹھڑی کے باہر پہرہ دیا کریں۔ دن کو ایک شکاری کتا اس کوٹھڑی کے باہر بندھا رہے۔ جب سب کچھ طے ہوگیا اور وہ جانے لگے، تو بوڑھا ڈاکٹر بھی آ پہنچا۔ اس نے یہ ماجرا دیکھا اور بولا:

"اس کو زیادہ تنگ مت کرو۔ یہ حبشی بُرا نہیں۔ جب میں وہاں پہنچا جہاں یہ لڑکا لیٹا تھا تو مجھے محسوس ہوا کہ بغیر امداد کے یہ گولی زخم کے اندر سے نکلنے کی نہیں۔ اور لڑکے کی حالت اس قدر خراب تھی کہ اسے اکیلا چھوڑ کر کسی کو بلانے کے لئے جانا میرے لئے ممکن نہ تھا۔ لڑکے کی حالت لحظہ بہ لحظہ خراب ہوتی جا رہی تھی، اور تھوڑی ہی دیر میں وہ ہذیان بکنے لگا۔ مجھے تو وہ اپنے نزدیک نہیں پھٹکنے دے رہا تھا اور بار بار یہی کہتا: اگر تم نے بیڑے پر چاک سے کوئی نشان بنایا تو تمہیں جان سے مار دوں گا۔" بس لڑکا اسی قسم کی بے معنی کر رہا تھا۔ میں بالکل بے بس تھا۔ بالآخر میرے منہ سے نکلا کہ خواہ کچھ ہی ہو، کہیں سے مدد کا بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔ ادھر یہ لفظ منہ سے نکلے، ادھر یہ حبشی رینگتا ہوا ایک جھاڑی میں سے باہر نکل آیا اور کہنے لگا: میں آپ کی مدد کروں گا۔ واقعی اس نے میری بہت مدد کی اور نہایت تندہی سے میرا ہاتھ بٹایا۔ بہرحال میں نے اندازہ لگا ہی لیا تھا کہ یہ کوئی بھگوڑا غلام ہے، لیکن میں کیا کرتا؟ سارا دن تو مجھے مریض کے سہارے بیٹھے رہنا پڑا۔ میں سخت الجھن میں پڑ گیا۔ یہاں پیچھے بھی میرے دو ایک مریض سردی اور بخار میں مبتلا تھے اور میں چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح شہر آ کر انہیں دیکھ جاؤں۔ لیکن مجبوری تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں میری غیر حاضری میں یہ حبشی پھر نہ بھاگ جائے، اور اس کے فرار کے لئے مجھے ہی ذمہ دار ٹھہرایا جائے لیکن ادھر سے کوئی کشتی بھی نہ گزری کہ آدمی اسے آواز دے کر بلا لے۔ لہٰذا میں وہیں ٹھہرا رہا۔ اور آج صبح پو پھٹنے تک وہیں رہا۔ میں نے آج تک ایسا وفادار حبشی نہیں دیکھا، نہ ہی کوئی حبشی یوں تیمارداری کر سکتا ہے۔

یہ حبشی اپنی آزادی کو قربان کر کے اس لڑکے کی خدمت کرتا رہا ہے۔ خدمت کرتے کرتے یہ تھک کر چُور ہو گیا۔ اس کے علاوہ یہ بھی صاف ظاہر تھا کہ یہ حبشی کچھ دنوں سے سخت مشقت کر رہا ہے۔ مجھے تو یہ حبشی بہت نیک دکھائی دیتا ہے۔ حضرات ایسا حبشی ایک ہزار ڈالر میں بھی مہنگا نہیں۔

اس کے ساتھ اچھا برتاؤ ہونا چاہیئے۔ مجھے وہاں ہر چیز مہیا کی گئی۔ لڑکا بھی رفتہ رفتہ ٹھیک ہو رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اسے وہاں وہی آرام میسر تھا، جو اسے گھر پر ملتا۔ وہ جگہ شائد گھر سے بہتر ہی ہو گی کیونکہ وہاں شور وغل کا نام تک نہ تھا۔ لیکن میرا مسئلہ تو کافی پریشان کن تھا۔ ان دونوں کی ذمہ داری میرے کندھوں پر تھی۔ اسی لئے تو میں آج صبح تک وہیں ٹھہرا رہا۔ آج صبح کچھ آدمی ایک کشتی میں سوار ادھر سے گزرے خوش قسمتی سے یہ حبشی بستر پر بیٹھا اپنے سر کو گھٹنوں میں دیئے سو رہا تھا۔ میں نے ان لوگوں کو اشارہ کیا۔ وہ چپکے سے اس پر پل پڑے اور پیشتر اس کے کہ اسے کچھ پتہ چلے، انہوں نے اس کے ہاتھ پیر باندھ لئے۔ بس، ذرا بھی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ لڑکا سویا ہوا تھا، لہذا ہم نے چپوؤں پر کپڑا باندھ لیا تاکہ آواز پیدا نہ ہو، اور بیڑے کو کشتی کے پیچھے باندھ کر روانہ ہو گئے۔ اس حبشی نے ایک بار بھی تو احتجاج نہیں کیا؛ نہ ایک لفظ ہی منہ سے نکالا۔ حضرات یہ حبشی بہت نیک ہے۔ کم از کم میری رائے تو یہی ہے۔"

ان لوگوں میں سے ایک بولا:

"ہاں، ڈاکٹر۔ یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ آدمی لگتا نیک ہے۔"

اس کے بعد دوسرے لوگوں کا دل بھی پسیج گیا۔ میں اس ڈاکٹر کا مشکور تھا جس نے جم کے ساتھ یہ نیکی کی۔ مجھے خوشی تھی کہ ڈاکٹر کی رحمدلی کے بارے میں میرا پہلا اندازہ غلط نہیں تھا۔ میرا تو شروع سے ہی یہی خیال تھا کہ وہ دل کا بہت اچھا ہے اور یہ کہ وہ بہت نیک منش ہے۔ سب لوگوں نے اس بات سے اتفاق کیا کہ جم کی کارگزاری واقعی قابل ستائش ہے۔ اور اس کے ساتھ اچھا برتاؤ ہونا چاہیئے۔ اگر ہو سکے تو اسے انعام بھی ملنا چاہیئے۔ لہذا ہر شخص نے یہ وعدہ کیا کہ اب وہ اسے کچھ نہیں کہے گا۔

انہوں نے اسے ایک کوٹھڑی میں بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا۔ مجھے توقع تھی کہ اب شائد اس کی دو ایک زنجیریں اتار دی جائیں کیونکہ یہ زنجیریں بہت وزنی تھیں۔ میرا یہ بھی خیال تھا کہ شاید اب اسے روٹی اور پانی کے علاوہ گوشت اور سبزی بھی دی جایا کرے گی۔ لیکن ان باتوں کا ان لوگوں کو دھیان ہی نہیں آیا۔ میں نے بھی یہ مناسب نہ سمجھا کہ خواہ مخواہ اس معاملے میں دخل دوں

اب میں یہ چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح جا کر خالہ سیلی کو ڈاکٹر کا بتایا ہوا قصہ سنا دوں۔ میرا مطلب ہے جب میں اپنی الجھنوں سے فارغ ہو جاؤں، یعنی جب میں اس بات کی وضاحت کر چکوں کہ میرے بیان میں ذکر ساری رات میں اور سِڈ کشتی لے کر اس بھگوڑے حبشی کی تلاش کرتے رہے تھے، سڈ کو گولی لگنے کے واقعے کا ذکر کیوں غائب تھا، تو میں خالہ کے پاس چلا جاؤں گا۔

لیکن ابھی کافی وقت پڑا تھا۔ خالہ سیلی تو سارا سارا دن اور ساری ساری رات مریض کے کمرے میں ہی رہتی تھی۔ اگر کبھی خالو سیلاس مجھے منہ لٹکائے مل جاتا تو میں کترا کر نکل جاتا۔ اگلے روز میں نے سنا کہ ٹام کی حالت پہلے سے بہت بہتر ہے، اور خالہ سیلی اپنے کمرے میں سونے کے لئے چلی گئی ہے۔ میں چپکے سے مریض کے کمرے میں داخل ہو گیا تاکہ اگر ٹام جاگ رہا ہو، تو ہم صلاح مشورہ کر کے ایک ایسا قصہ گھڑ لیں جو ان لوگوں کو جچ جائے۔ لیکن وہ سویا ہوا تھا اور سویا بھی تھا گہری نیند۔ اس کا رنگ زرد تھا اور اس کے چہرے پر وہ سرخی نہیں تھی، جو اس روز تھی، جب لوگ اسے اٹھا کر گھر لائے تھے۔ میں بیٹھ گیا اور اس کی آنکھ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد خالہ سیلی بھی دبے پاؤں اندر آ گئی۔ اب میں پھر پھنس گیا تھا۔ اس نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ میرے پاس ہی بیٹھ گئی اور سرگوشی میں باتیں کرنے لگی۔ اس نے کہا کہ اب وہ دن دور نہیں جب ہم پھر شادماں ہوں گے، کیونکہ آثار امید افزا ہیں اور وہ کافی دیر سے آرام سے سو رہا ہے۔ اس کی حالت پہلے سے بہت بہتر ہے اور اسے کافی سکون ہے۔ خالہ کو بہت امید تھی کہ جب وہ جاگے گا، تو اس کا دماغ بالکل صحیح ہو گا۔

خیر، ہم وہاں بیٹھے انتظار کرتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ ذرا سا ہلا اور پھر اس نے آنکھیں کھولیں۔ اس کی آنکھیں اب بالکل ٹھیک ٹھاک تھیں۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر بولا:

"ہیلو! میں گھر کیسے آ گیا؟ یہ کیا ہو گیا ہے؟ بیڑا کہاں ہے؟"

"گھبراؤ نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔

"اور جم؟"

"وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے" میں نے کہا۔ لیکن یہ کہتے وقت میرا لہجہ ذرا غیر یقینی ہو گیا۔ البتہ

اسے اس کا پتہ نہ چلا۔ وہ کہنے لگا:

"بہت خوب! اب سب ٹھیک ہے۔ اور ہم بالکل صحیح سلامت ہیں۔ تم نے خالہ کو ساری واردات سنا دی ہے ناں؟" ———

——— میں 'ہاں' کہنے ہی والا تھا کہ خالہ بیچ میں بول اٹھی:

"کونسی واردات سنڈ؟"

"یہی کہ یہ تمام سکیم کیسے بنی اور کیسے عمل میں آئی"۔

"کیسی سکیم؟"

"وہی ——— ایک ہی تو سکیم ہے! یعنی کیسے ہم نے ——— میں نے اور ٹام نے ——— اس بھگوڑے حبشی کو رہا کرا دیا"۔

"ارے ——— رے ——— رے! بھگوڑا ——— ارے یہ لڑکا کیا کہہ رہا ہے؟ کہیں پھر اسے دورہ تو نہیں پڑ گیا؟"

"نہیں۔ یہ دورہ نہیں ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میں نے اور ٹام نے۔ ہم نے یہ سکیم بنائی اور اس میں ہمیں کامیابی ہوئی۔ اور کامیابی بھی کیسی شاندار!" ———

——— اور اب جب وہ بولنے لگا تو خالہ نے اسے ٹوکنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ وہیں بیٹھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی طرف دیکھتی رہی ——— وہ بولتا گیا۔ بولتا گیا ——— میں نے یہی سوچا کہ اس کی بات کاٹنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ "ہاں ہاں، خالہ۔ اس مہم میں ہمیں بہت مشقت کرنی پڑی ہے۔ ہم نے ہفتوں کام کیا۔ ہر رات جب آپ لوگ سوئے ہوتے تھے، تو ہم کئی کئی گھنٹے محنت کرتے رہے ہمیں موم بتیاں چرانی پڑیں۔ اور چادر، قمیص، اور آپ کا لباس، اور چمچ، اور طشتریاں، اور چاقو، اور پرات، اور چکی کا پاٹ، اور آٹا، اور خدا جانے کیا کیا چرانا پڑا۔ آپ تو تصور ہی نہیں کر سکتیں کہ آرے اور قلم بنانے میں، اور عبارت لکھنے میں اور ایسے ہی دوسرے کاموں میں ہمیں کتنی دشواریاں اٹھانی پڑیں۔ نہ ہی آپ یہ اندازہ لگا سکتی ہیں کہ اس تمام مہم میں ہمیں کتنا لطف آیا۔ اوہ! ہمیں کتنا کام کرنا پڑا ہے! تابوت کی تصویر بنانا، اور ڈاکوؤں کی طرف سے گمنام خط لکھنا،

اور جاذب برق کے راستے نیچے اوپر اترنا چڑھنا؛ اور سرنگ کھودنا؛ اور سیڑھی بنانا؛ اور اسے ایک بڑی سی روٹی میں چھپا کر جم تک پہنچانا؛ اور چمچ اور ایسی ہی دوسری چیزوں کو آپ کے ایپرن کی جیب میں ڈال کر ــــ"

"ارے۔ رے۔ رے! ــــ"

"اور کوٹھڑی میں چوہے اور سانپ بھرنا تاکہ جم اکیلا اداس نہ ہو جائے۔ اور پھر ٹام کا ہیٹ کے اندر مکھن رکھ کر بیٹھے رہنا وغیرہ وغیرہ۔ خالہ! اس رات آپ نے ٹام کو اتنی دیر تک اپنے پاس روکے رکھا کہ سارا معاملہ چوپٹ ہونے والا تھا۔ کیونکہ ہمارے کھسکنے سے ہی لوگ کوٹھڑی میں گھس آئے۔ ہمیں بھاگ کر جان بچانی پڑی۔ لیکن جب لوگوں کو پتہ چلا کہ ہم بھاگ نکلے ہیں تو انہوں نے گولیاں چلا دیں، اور مجھے ایک گولی لگ گئی۔ انہوں نے ہمارا تعاقب کیا لیکن ہم راستے میں چھپ گئے اور وہ آگے نکل گئے۔ پھر کتے آ پہنچے لیکن ان کتوں نے ہم لوگوں میں مطلق دلچسپی نہ لی، اور ادھر چلے گئے جدھر شور ہو رہا تھا۔ ہم کشتی لے کر بیڑے پر پہنچ گئے اور سب خیریت رہی۔ جم آزاد ہے اور یہ سب ہماری ہی محنت کی وجہ سے۔ کیوں خالہ، کیسی رہی؟"

"ارے! میں نے تو زندگی بھر ایسی باتیں کبھی نہیں سنیں۔ اچھا، تو بدمعاشو یہ سب تمہاری ہی کرتوت تھی۔ تم نے ہی ہمیں یوں پریشان کر رکھا تھا اور خوف کے مارے ہمارا بُرا حال ہو رہا تھا۔ میرا جی تو یہ چاہتا ہے کہ ابھی تمہاری کھال ادھیڑ کے رکھ دوں ــــ ذرا سوچو تو۔ یہاں رات رات بھر ــــ اچھا بدمعاش ذرا تندرست ہو جاؤ، پھر دیکھنا میں تم دونوں کی کیسی گت بناتی ہوں۔"

لیکن ٹام خوشی کے مارے پھولا نہ سما رہا تھا۔ اسے اپنے کارنامے پر اس قدر ناز تھا کہ اس کی زبان ہی قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ بولتا گیا اور خالہ اس کی بات کاٹ کاٹ کر اسے دھمکیاں دیتی رہی۔ یوں لگ رہا تھا، جیسے دو بلیاں آپس میں لڑ رہی ہوں۔ وہ بولی:

"ہاں ہاں، اب تو تم جتنا چاہو خوش ہو لو، لیکن اگر تم نے دوبارہ دخل اندازی ــــ"

"دخل اندازی؟ کس میں؟"

"کس میں؟ اسی بھگوڑے حبشی کے معاملے میں۔ اور کس میں؟"

ٹام نے متفکر ہو کر میری طرف دیکھا اور بولا:

"ٹام! تم نے تو کہا تھا کہ وہ بالکل خیریت سے ہے۔ وہ بھاگا نہیں کیا؟"

"وہ!" خالہ سیلی نے کہا: "وہ بھگوڑا حبشی! بھاگا؟ بھاگ کر کہاں جاتا۔ وہ پکڑا گیا ہے اور اب پھر صحیح سلامت اسی کوٹھڑی میں بند ہے۔ اسے سوکھی روٹی اور پانی کے سوا کچھ کھانے کو نہیں ملے گا۔ اور اب اس وقت تک اس کی زنجیریں نہیں کھلیں گی جب تک کہ اس کا آقا نہیں آجاتا، یا ہم اسے بیچ نہیں ڈالتے۔"

ٹام اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں سے انگارے برس رہے تھے اور اس کے نتھنے دھونکنی کی طرح پھڑک رہے تھے۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوا:

"ان لوگوں کو کیا حق ہے کہ اسے یوں قید کر کے رکھیں؟ جاؤ! ایک لمحہ بھی ضائع مت کرو۔ جاؤ اور جا کر اسے رہا کر دو۔ وہ غلام نہیں ہے۔ وہ بھی اتنا ہی آزاد ہے، جتنا روئے زمین پر کوئی بھی دوسرا شخص۔"

"یہ لڑکا کیا کہہ رہا ہے؟"

"خالہ سیلی، میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، لفظ بلفظ سچ ہے۔ اور اگر آپ اسے رہا نہیں کریں گی تو مجھے خود جا کر یہ کام کرنا پڑے گا۔ میں اس حبشی کو شروع سے جانتا ہوں، اور ٹام بھی اسے شروع سے جانتا ہے۔ بوڑھی مس واٹسن کو مرے دو مہینے ہو گئے ہیں۔ اسے اس بات کا رنج تھا کہ اس حبشی کو بیچ دینے کا خیال اس کے دل میں کیوں آیا، اور صرف خیال ہی نہیں آیا بلکہ اس بچاری نے اس کا اظہار بھی کیا تھا۔ اس بات پر وہ اتنی نادم تھی کہ اپنی وصیت میں اس نے جم کو آزاد کر دیا تھا۔"

"تو پھر، جب وہ پہلے سے ہی آزاد تھا، تو بھلا تمہیں آزاد کرانے کی کیا پڑی تھی؟"

"یہ تو ہوا نا سوال! اور وہ بھی عورتوں والا! خالہ، بات یہ تھی کہ میں اس مہم کو

سرانجام دینے کا لطف اٹھانا چاہتا تھا۔ خواہ مجھے خون کے دریا نہ بہانے ——— ارے۔ خالہ پولی!

واقعی یہ خالہ پولی ہی تھی۔ وہ دہلیز کے اندر کھڑی تھی اور اس کے چہرے سے فرشتوں ایسا سکون اور اطمینان مترشح ہو رہا تھا۔

خالہ سیلی لپک کر اس سے یوں چمٹ گئی کہ اس بچاری کا سر ایک طرف کو لڑھک گیا۔ خالہ سیلی اس کے ساتھ لپٹ لپٹ کر روتی رہی۔ میں بھاگ کر چارپائی کے نیچے چھپ گیا، کیونکہ اب معاملہ دگرگوں ہوا جا رہا تھا۔ کم از کم مجھے تو یہی لگ رہا تھا۔ میں چارپائی کے نیچے سے جھانک جھانک کر دیکھنے لگا۔ ٹام کی خالہ پولی نے اپنی بہن کو پرے ہٹایا اور وہیں کھڑے کھڑے عینک کے اوپر سے ٹام کو یوں دیکھتی رہی جیسے اُسے کچا چبا جائیں گی۔ پھر وہ بولی:

"ہوں ——— ن ——— ٹام! یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ اگر تمہاری جگہ میں ہوتی تو کہیں جا کر اپنا منہ چھپا لیتی" ———

"ارے!" خالہ سیلی بولی: "کیا اس لڑکے میں واقعی اتنی تبدیلی آگئی ہے کہ یہ پہچانا ہی نہیں جاتا؟ ——— ڈیڈی! یہ ٹام نہیں سڈ ہے۔ ٹام تو ——— ٹام ——— ارے ٹام کہاں گیا؟ ابھی ایک منٹ پہلے تو وہ یہیں تھا۔"

"تمہارا مطلب ہے ہک فن کہاں گیا۔ ہاں ہاں، ہک فن۔ ساری عمر میں اس بدمعاش کو پالتی رہی ہوں۔ کیا میں اسے پہچاننے میں غلطی کروں گی؟ ہک! ارے ہک! نکلو چارپائی کے نیچے سے!"

میں باہر نکل آیا۔ لیکن کاٹو تو لہو نہیں بدن میں والی بات تھی۔

خالہ سیلی حیران کھڑی یہ ماجرا دیکھتی رہی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں نے کسی کو اس قدر سراسیمہ کبھی نہیں دیکھا، شاید خالو سلاس کے سوا۔ کیونکہ جب وہ اندر آیا اور اسے یہ سب قصہ سنایا گیا تو وہ بھی بھونچکا رہ گیا۔ اس کے تو جیسے ہوش گم ہو گئے۔ سارا دن وہ یونہی سراسیمہ پڑا رہا۔ اور رات کو اس نے جو وعظ کیا اس سے اس کی شہرت میں چار چاند لگ

گئے کیونکہ جو وعظ اس نے اس رات کیا اس کا ایک لفظ تک دنیا کے سب سے جہاں دیدہ شخص کی سمجھ میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ تب ٹام کی خالہ پولی نے انہیں میرے متعلق بتایا کہ میں کون ہوں، کیا ہوں؟۔ تب مجھے بھی اپنی رام کہانی سنانی پڑی۔ کہ اس وقت جب مسز فیلپس نے مجھے غلطی سے ٹام سمجھ لیا تھا ـــــ لیکن اس نے مجھے بیچ میں ہی ٹوک دیا اور بولی: "مجھے خالہ سیلی کہہ کر ہی بلاؤ۔ اب میں اس کی عادی ہو گئی ہوں۔ لہذا اس تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں" ـــــ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ جب خالہ سیلی نے مجھے ٹام سمجھ لیا تھا، تو حالات اس قدر قابو سے باہر تھے، کہ مجھے یہ سوانگ بھرنا ہی پڑا۔ اور کرنا بھی کیا؟ اور ویسے بھی مجھے اتنا یقین ضرور تھا کہ اگر ٹام کو پتہ چل بھی گیا تو وہ برا نہیں مانے گا بلکہ اور بھی خوش ہوگا۔ کیونکہ یہ ایک جاسوسی واردات ہوتی، اور وہ اس کو بھی مہم کی شکل دیکر اس سے حتی الامکان لطف اندوز ہوتا۔ ہوا بھی یہی۔ وہ خود سڈ بن گیا۔ اور اس طرح میرا بھرم قائم رہا۔

اس کے بعد اس کی خالہ پولی نے اس بات کی بھی تصدیق کر دی جو ٹام نے مسز واٹسن کے بارے میں بتائی تھی۔ اس نے واقعی اپنی معیت میں جم کو آزاد کر دیا تھا۔ اب جاکر مجھے پتہ چلا کہ ٹام سائر جیسے شخص نے، جس کی پرورش ایسے اچھے ماحول میں ہوئی تھی، کیونکر ایک حبشی کو آزاد کرانے کا بیڑا اٹھا لیا تھا۔

پھر خالہ پولی نے یہ بتایا کہ جب خالہ سیلی نے اسے لکھا تھا کہ ٹام اور سڈ بخیر و عافیت پہنچ گئے ہیں، تو اس کا ماتھا تو اسی وقت ٹھنکا تھا کہ یہ بات کیا ہے۔ "اور میں نے سوچا کہ بس اسے اکیلا بھیجنے کا یہ پھل ملا ہے۔ اب مجھے ہی گیارہ سو میل کا سفر طے کر کے جانا پڑے گا تاکہ دیکھوں اس بدمعاش نے اب کونسا نیا شوشہ چھیڑا ہے۔ میں نے تمہیں خط بھی لکھے تھے مگر تم نے جواب ہی نہیں دیا۔"

"خط؟ مجھے تو کوئی خط نہیں ملا۔" خالہ سیلی نے کہا۔

"ہائیں! میں نے تو دو خط لکھے تھے جن میں میں نے یہ پوچھا تھا کہ سِڈ کیسے وہاں پہنچ گیا۔"

"لیکن دیدی۔ مجھے یہ خط ملے ہی نہیں۔"

خالہ پولی نے گھوم کر ہماری طرف دیکھا اور درشتی سے بولی: "ٹام!"

"کیا ہے؟" ٹام نے چڑ کر کہا۔

"مجھے یوں جواب مت دو! گستاخ! لاؤ وہ خط۔"

"کون سے خط؟"

"وہی خط۔ ورنہ میں پکڑ کر تمہاری ——"

"وہاں ٹرنک میں پڑے ہیں۔ میں نے انھیں کھولا تک نہیں۔ بالکل ویسے ہی رکھے ہیں۔ کیونکہ مجھے پتہ تھا کہ یہ ہمارے حق میں مفید ثابت نہیں ہو سکتے —— اور پھر آپ کو بھی تو کوئی خاص جلدی نہیں تھی۔ میں ——"

تم پٹائی کے بغیر نہیں مانو گے۔ اور دیدی، میں نے ایک خط اور بھی تو لکھا تھا کہ میں آ رہی ہوں۔ وہ خط ——"

"نہیں۔ یہ خط کل ملا تھا۔ مجھے اس کے پڑھنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ وہ خط میرے ہی پاس ہے۔"

میرا جی چاہا کہ اس سے دو ڈالر کی شرط لگا کر کہوں کہ وہ خط ہرگز اس کے پاس نہیں ہے۔ لیکن میں نے خیریت اسی میں سمجھی کہ خاموش رہا جائے۔

آخری باب۔ غلامی سے چھٹکارا۔ تنخواہ دار قیدی۔ آپکا مخلص ہک فن

جونہی ٹام سے اکیلے میں ملاقات ہوئی، میں نے اس سے پوچھا کہ آخر فرار ہوتے وقت اس کے ارادے کیا تھے؟۔ بالفرض یہ سکیم کامیاب ہو جاتی، اور ہم اس حبشی کو جو پہلے ہی آزاد تھا، آزاد

کرانے میں کامیاب ہو جاتے، تو پھر وہ کیا کرتا؟ ـــــ ٹام نے جواب دیا کہ جو سکیم شروع ہی سے اس کے دماغ میں تھی، وہ یہ تھی کہ اگر ہم جم کو صحیح وسلامت رہا کرا لیتے، تو پھر ہم اسے بیڑے پر بٹھا کر اوپر دریا کے منبع تک لے جاتے اور راستے میں طرح طرح کی دشواریوں کا لطف اٹھاتے۔ وہاں پہنچ کر ہم اسے بتا دیتے کہ وہ آزاد ہے اور پھر اسے اس عرصے کی تنخواہ دے کر اور اسے جہاز پر بٹھا کر بڑی شان سے واپس اپنے شہر لے جاتے۔ پہنچنے سے پہلے ہم خط لکھ دیتے تاکہ ارد گرد کے تمام حبشی اس کا استقبال کرنے کے لئے اکٹھے ہو جائیں۔ پھر ہم مشعلوں سے اس کا جلوس نکالتے، جس میں بینڈ باجہ ہوتا اور حبشی اُس کے ارد گرد ناچ رہے ہوتے۔ اس طرح وہ ہیرو بن جاتا اور اس کے ساتھ ہم بھی ہیرو بن جاتے ـــــ ویسے میری رائے اب بھی یہی تھی کہ جو کچھ ہو رہا ہے، ٹھیک ہی ہے۔

ہم نے فوراً جم کی زنجیریں اتار کر اسے رہا کر دیا۔ جب خالہ پولی، اور خالو سلاس، اور خالہ سیلی کو پتہ چلا کہ اس نے ٹام کی تیمارداری میں کس تندہی سے ڈاکٹر کا ہاتھ بٹایا تھا، تو وہ بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے اس کی بڑی عزت کی اور اسے اچھے اچھے کھانے دیئے۔ اب وہ خوب مزے میں تھا، اور اسے کوئی کام نہیں کرنا پڑتا تھا۔ ہم مریض والے کمرے میں چلے گئے اور خوب مزے سے باتیں کرتے رہے۔ ٹام نے اسے چالیس ڈالر دیئے کیونکہ اس نے ہماری خاطر قیدی بنے رہنے میں نہایت صبر سے کام لیا تھا، اور ہمارے ساتھ مکمل تعاون کیا تھا۔ جم بہت خوش ہوا اور بولا:

"دیکھا ہک! میں نے تم سے کیا کہا تھا! یاد ہے میں نے جیکسن جزیرے پر کیا کہا تھا؟ میں نے کہا تھا ناں کہ میری چھاتی پر بال ہیں اور یہ بھی بتایا تھا کہ یہ بال کس چیز کی علامت ہیں؟ میں نے بتایا تھا ناں کہ کسی زمانے میں میں امیر تھا، اور ایک زمانہ آئے گا جب میں پھر امیر ہو جاؤں گا۔ میری بات سچی ہو گئی ہے۔ یہ دیکھو۔ یہ ـــــ! اب کبھی میری بات پر شک نہ کرنا! ۔ یاد ہے میں نے کیا کہا تھا؟ میں نے کہا تھا ناں، کہ علامتیں علامتیں ہی ہوتی ہیں۔ اس وقت بھی مجھے اپنے مستقبل کے بارے میں مطلق شک نہ تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح اس بات میں مطلق شک نہیں ہو سکتا کہ میں اس وقت یہاں کھڑا ہوں۔"

اس کے بعد ٹام بہت دیر تک باتیں کرتا رہا۔ اس کی تجویز تھی کہ ایک رات ہم تینوں یہاں سے کھسک جائیں اور ضروری ساز و سامان خرید کر قبائلی علاقے میں چلیں اور وہ ایک ہفتے وہاں کی دشواریوں کا بھی لطف اٹھائیں۔ میں نے کہا کہ تجویز تو مجھے منظور ہے لیکن میرے پاس ساز و سامان کے لئے بالکل رقم نہیں۔ اور نہ ہی میں کہیں سے رقم منگوا سکتا ہوں۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ ابا واپس آ گیا ہوگا اور اس نے جج تھیچر سے ساری رقم وصول کر کے شراب میں اُڑا دی ہوگی۔

"اس نے بالکل نہیں اُڑائی"، ٹام بولا: "تمہاری رقم جوں کی توں موجود ہے۔ پورے چھ ہزار ڈالر۔ شائد اس سے بھی اوپر۔ تمہارا ابا تو اس روز کے بعد آیا ہی نہیں۔ کم از کم میرے ہوتے ہوئے تو نہیں آیا تھا۔"

اور تب جم نہایت سنجیدگی سے کہنے لگا:

"ہک! اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔"

"کیوں، جم؟" میں نے پوچھا۔

"یہ مت پوچھو، لیکن ہے یہ حقیقت۔ وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔"

جب میں نے اصرار کیا، تو وہ کہنے لگا:

"تمہیں وہ مکان یاد ہے، جو دریا میں بہتا چلا آ رہا تھا؟ اس کے اندر ایک لاش تھی جس کا چہرہ کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ تمہیں یاد ہے میں نے کپڑا اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا تھا، اور پھر تمہیں اندر آنے سے منع کر دیا تھا۔ بس اب تم جب چاہو، بے کھٹکے اپنی رقم وصول کر لو۔ وہ وہی تھا۔"

ٹام اب قریب قریب تندرست ہو گیا ہے۔ اس نے گولی کو زنجیر میں پرو لیا ہے اور اسے گھڑی کی طرح لٹکائے پھرتا ہے۔ اور بار بار یوں نکال کر دیکھتا ہے جیسے گھڑی میں وقت دیکھ رہا ہو — اب یہ کہانی بھی ختم ہوتی ہے۔ اور میں بہت خوش ہوں، کیونکہ اگر مجھے یہ علم ہوتا کہ کتاب لکھنا اس قدر دشوار کام ہے، تو میں اسے شروع ہی نہ کرتا۔

خیر، آئندہ میں ایسی غلطی نہیں کروں گا ——— اب میرا ارادہ یہ ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے، ان لوگوں سے پہلے ہی قبائلی علاقے میں کھسک جاؤں کیونکہ میں نے سنا ہے کہ خالہ سیلی مجھے متبنیٰ بنا کر سدھارنے کے منصوبے بنا رہی ہے۔ لیکن مجھے یہ جھنجھٹ پسند نہیں ——— اور پھر میں ایک بار پہلے بھی قبائلی علاقے میں رہ چکا ہوں۔ فقط

آپ کا مخلص

ہک فن

دلچسپ نئی کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
میرے سپنوں کا امریکہ	لین جانسن	۱/۰۰
رات گئی دن نکلا	اوون وسٹر	۴/۰۰
جان ایف کینیڈی	بروس لی	۱/۵۰
گردِ کارواں	کنہیا لال کپور	۳/۰۰
وویکانند	رومیں رولاں	۴/۵۰
آندھی میں چراغ	خواجہ غلام السیدین	۷/۵۰
وہ ایک لمحہ جاوداں	کشور زیدی	۲/۰۰
دلِ ناداں	کرشن موہن	۶/۰۰
ہند میں زراعت	اے سی اگروال	۳/۰۰
نیا گھر	موڈی	۲/۰۰
درّہ	جان سلمنگ	۲/۵۰
چکنے چکنے پات	مارک ٹوین	۲/۰۰
گاؤں کی کہانی	لارا انگلز	۲/۰۰
بہار کب آئے گی	الیگزینڈر رسن	۱/۰۰
ہماری منزلِ مقصود	ہیوبرٹ ہمفری	۱/۰۰
ایک عجیب تلاش	کانریڈ ڈنسٹر	۲/۰۰
خلائی جہاز	جیمز جے ہیگرٹی جونیئر	۲/۰۰
کنگ لیئر	شیکسپیئر	۲/۰۰
عورت	سیارام شرن گپت	۶/۰۰
جوئے نغمہ	ساجدہ زیدی	۱/۵۰
ہماری دستکاریاں	کشور زیدی	۲/۵۰
سائنس کی دنیا	ولیم ایچ کراؤز	۳/۰۰
خلا اور ہماری زمین	الگزینڈر مارشک	۲/۰۰
لنڈن جانسن	بوتھ مولی	۳/۰۰
جنگل میں منگل	ہنری ڈیوڈ تھورو	۳/۰۰
اخلاقی جرأت کی کہانیاں	جان ایف کینیڈی	۲/۰۰
لنکن نے کہا	ابراہیم لنکن	۳/۰۰
ایک تھا بیوقوف	چین چی ینگ	۱/۰۰